



زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوشِ لاہور

منظر نمبر

۴۹ ، ۵۰

مرتب
محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اردو — لاہور

قیمت ڈبلکس ایڈیشن: 600 روپے

ترتیب

منٹو کی غیر مطبوعہ کہانیاں

- ۱ - بان بان، ۷۱
- ۲ - مائی پنتے، ۱۰۰
- ۳ - جان کمر، ۱۵
- ۴ - بازش، ۱۹
- ۵ - انٹائے رات، ۲۳
- ۶ - اُمنہ، ۲۸
- ۷ - قصیر، ۳۳
- ۸ - ملاوٹ، ۳۷
- ۹ - بس، سٹپڈ، ۴۱
- ۱۰ - فیور، ۴۵
- ۱۱ - بدقزئی، ۵۰
- ۱۲ - تاور اتھافی، ۵۵
- ۱۳ - غلام کشی، ۶۹
- ۱۴ - پشاور سے لاہور تک، ۷۴
- ۱۵ - بجلی چلوان، ۷۸
- ۱۶ - ایک ناچارہ ایک فاحشہ، ۷۴
- ۱۷ - شیدا، ۷۷
- ۱۸ - بڑا کھوسٹ، ۸۱
- ۱۹ - زمار کی، ۸۵
- ۲۰ - کیشی، ۸۹

منٹو کی منتخب تخلیقات

- ۱ - جگ، ۹۹
- ۲ - مونڈیل، ۱۱۴
- ۳ - مٹی، ۱۳۰
- ۴ - بابو کو پی تاتھ، ۱۵۷
- ۵ - کالی مشطوار، ۱۶۹
- ۶ - ٹوپیک سنگھ، ۱۷۹
- ۷ - اس ہندوستانی، ۱۸۵

۸ - نیا قانون ۲۱۶

۹ - شید ساز ۲۲۵

۱۰ - میا جاشی ۲۶۱

منشور کا فن

- ۱ - منشور کی فن نگاری
 - ۲ - منشور کا فن
 - ۳ - منشور کا مقام
 - ۴ - نگاہ نثر شاعر
 - ۵ - نثر
 - ۶ - نثر کی حقیقت نگاری
 - ۷ - سادہ حسن نثر کی یادیں
- ممتاز شیخ پرین ۲۳۳
وقار عظیم ۲۳۹
محمد حسن عسکری ۲۴۲
عابد علی عابد ۲۴۵
ابواللیث صدیقی ۲۴۶
عبادت بریلوی ۲۴۲
ممتاز حسین ۳۱۸

منشور کی شخصیت

- ۱ - میر دوست میراوشمن
 - ۲ - منشور، میراوشمن
 - ۳ - منشور کی چند بیسیں اور چند خطوط
 - ۴ - جریک نرسکا
 - ۵ - رحمان دہشت پسند
 - ۶ - منشور ہمن کی موت
 - ۷ - منشور کی موت
 - ۸ - منشور کا ایک خط
- عصمت چغتائی ۳۲۶
اوپن درو شاہ اشک ۳۳۳
احمد ندیم قاسمی ۳۹۷
ہاجو، سرور ۳۶۶
ابومعید قویشی ۴۷۵
حامد جلال ۴۸۷
غلام عباس ۴۹۱
محمد طفیل ۴۹۳

شخصیات نمبر کے بارے میں

مولوی عبدالقادر	نیا زنجیری	عبدالحیدر سہیل
عزیز راہمدی	رشید احمد صدیقی	بانک رام
اقشام حسین	مسعود حسین	کرشن چندر
ٹاکر سید اباجا حسین	ایس اے رتن	خواجہ احمد رادقی
غلام عباس	آغا انصاری	شاد مارتی
مہتاب امتیاز علی	نور تونسوی	ایچ ایشا
غفار بخاری	جیلانی بانو	غلام صدیقی

طُلُوع

”یار منظرِ فیر نکالو۔“

”جی آ“

”میں کتا ہوں۔ نقوش کا منظرِ فیر نکالو۔“

”آج یہ آپ کیسے باتیں۔“

”تھکادار خیال یہ ہے کہ میں نقشہ میں ہوں اور بکواس کو رہا ہوں۔“

”آخر اتنی جلد ہی کیا ہے چھپ جائے گا۔“

”میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا۔ کر پلے رکے دکھاؤں پھر فرمائیے۔“

”مرنے کا نام نہ لیجیے ابھی آپ کی بڑی۔“

”آپ بھی کبھی کیا کروں گا۔ آپ تو میں کو دھرنے پر راضی ہو گیا ہوں۔“

”اچھا یہ بتائیے اس فیر میں کیا کیا ہو گا؟“

”آپ تک پہنچنا لایا لی نہیں۔ وہ سب سے پہلے کہیں گی۔ اور جتنے پر قزوں نے میری کمر بھٹ کی ہے۔ وہ

سب سے آخر میں چھپے گی۔ سچ میں میرے بھی چار منظر صوفیہ فلسفے کے انداز میں ہوں گے۔ بہر حال تمیں زیادہ

شکوک نے کی ضرورت نہیں۔ یہ فیر تمیں میں مرتب کروں گا۔“

”اگر آپ مرتب کروں گے۔ تو میں کیا کروں گا؟“

”تم جبک اورتا۔“

”اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجددِ مرتبہ کریں۔ اور اسے کتابی صورت میں چھاپ دیں۔“

”میں پاپتا ہوں۔ نقوش کا منظرِ فیر نکالے۔“

”تو پھر آپ اس فیر کی ترتیب و تدوین سے کوئی تعلق نہ ہو گا میں کسی کدوائے ملک برداشت نہیں کر سکتا۔“

”تو اپنے آپ کو گھٹا لیا ہے۔ کیا تو مجھ سے زیادہ قائل ہے۔“

”تابیئت کو چھوڑ دیجئے۔ یہ معاملہ برداری کا ہے۔“

”فرداری کو چھوڑو۔ یہ معاملہ تابیئت کا ہے۔“

”اس معاملہ میں مجھے آپ کی تابیئت سے اتفاق ہے۔“

”اچھا تو تم جو جیسے میری درگت بنائی پارتے ہو۔ میری زندگی ہی میں بنانا ٹالو۔“

”اگرچہ ہوا تو ایک برس پہلے کا ہے۔ لیکن میں آج بھی یہ فیر منظر کی زندگی ہی میں شائع کر رہا ہوں۔“

”اس لیے کہ منظرِ فیر کے خیال میں مابہر تو مابہر، میرے نزدیک نہیں رہا۔“

محمد طفیل

(۱)

منٹو کی غیر مطبوعہ کہانیاں

بائی بائی

نام اس کا ناظر تھا پر سب اسے پھاڑتے تھے۔ باخمال کے درے کے اس طرف اس کے باپ کی یہی جگہ تھی جو بڑا
مسادہ لوح مقرر آدمی تھا۔

دن بھر وہ اس پر چلتی کے پاس بیٹھی رہتی۔ پھاڑ کے دامن میں چھوٹی سی جگہ تھی جس میں یہ پہلی لگائی گئی تھی۔ پھاڑ کے باپ
کو دو تین روپے روزانہ مل جاتے رہا جس لیے کافی تھے۔ پھاڑا بھرتا ان کو کافی کھیتی تھی اس لیے کہ اس کو بناؤ سنگھ کا شوق تھا۔
وہ چاہتی تھی کہ امیروں کی طرح زندگی بسر کرے۔

کام کاج کچھ نہیں کرتی تھی۔ بس کچھ کھلی دھندلاؤ سے باپ کا ہاتھ بٹا رہی تھی اس کو اُسے سے نفرت تھی اس لیے کہ وہ بٹاؤ
اُس کی ناک میں لٹس جاتا تھا۔ وہ بہت تھنبھلائی اور باہر نکل کر کھلی جوار میں کھوٹا شروخ کوڑتی، باچناب کے کنارے جا کر پانچ منہ ہاتھ
دھوتی اور عجیب قسم کی غنڈہ کی محسوس کرتی۔

اُس کو چناب سے پیار تھا اس نے اپنی سیٹیوں سے شہر رکھا تھا کیونکہ وہ عاشق کا دریا ہے جہاں سہولتی میسر نہ آتی تھی
کا شوق مشہور تھا۔

بہت خوبصورت تھی اور بڑی مضبوط جسم کہ جہاں لڑکی ایک پہلی جگہ والے کی بیٹی شاندار لباس تو نہیں کھتی۔ پہلی شکل اور
اچھے چہرہ کرتے۔ وہ پٹہ خداداد۔

تذکرہ حیات گزارنے سے لے کر باخمال تک اور بعد اسے کشنور تک خوب گھومنا پھرتا تھا اس نے جب پہلی بار پھاڑ کو دیکھا تو
اُسے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ جب اُس نے دیکھا کہ پھاڑ کے کرتے نچلے تین ٹہن نہیں ہیں اس کی جہاں پھاتیاں باہر بھاگ رہی ہیں۔
تذکرہ نے اس علاقے میں ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ وہاں کی عورتیں ایسی نکلیں یا کرتے پہنتی ہیں جن کے نچلے ٹہن غائب
ہوتے ہیں اس کی کچھ شہ نہیں آتا تھا کہ زیادہ دانستہ بٹاؤ لے جاتے ہیں زیادہاں کے دھولے ہی ایسے ہیں جہاں کوئی نہ لگتی ہیں۔

تذکرہ نے جب پہلی بار سیر کرتے ہوئے پھاڑ کو دیکھا تو اس کی ٹہنوں والی قمیص میں دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گیا وہ جہاں تھی۔ ناک نقوش
بہت اچھا تھا۔ عجیب ہے کہ وہ میل برہنے کے باوجود چلتی تھی اس کا لباس بہت گندہ تھا۔ مگر تذکرہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہاں کی عورتوں کی کو
لکھا ہوا ہے۔

تذکرہ وہاں ایک آثار و گرد کی تخلیق رکھتا تھا۔ دھرت کشمیر کے دیہات دیکھنے اور ان کی سیاحت کرنے آیا تھا اور قریب قریب
تین مہینے سے اس کا وہرہ کھوم پھر رہا تھا۔

اُس نے کشنواز دیکھا، بعد وہ دیکھا، لکھنوت میں کئی مہینے گزارے، مگر اسے چاقو یا حبس کیس نظر نہیں آیا تھا۔

خانہ لکھنوی پہنچنے کے باوجود اُس نے چاقو کو تین ہفتوں سے بے نیاز کرتے ہیں دیکھا تو اُس کے دل میں آئی کہ وہی قیس کے سارے جی میٹرہ کرے اور اُس کی قیاس اور چاقو کو اکثر آہیں میں غلط جوبائیں، کچھ اس طرح کہ وہ لوں کچھ نہ کچھ بھی نہ آئے۔ اُس سے ملنا تیر کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اس لیے کہ اُس کا باپ دلی بھر گندم، کئی اور جوار پیسے میں مشغول رہتا تھا۔ اور وہ قیاس جنس نکھر۔ ہوا دی سے کھل کر اُت کرنے والی۔ بہت جلد کھنکھناتے ہو جاتی تھی۔ چنانچہ تیز کر اُس کی قربت حاصل کرنے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوتی چند ہی دنوں میں اُس نے اُس سے واہ ورم سہارا لیا۔

یہ واہ ورم قصور ہی پر ہی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ پاس ہی جناب جیسے عشق کا دریا کہتے ہیں اور جس کے پانی سے چاقو کے باپ کی ہر بات سنی تھی۔ اس دریا کے کنارے میٹرہ کو تیز پاس کو نہاد ل نکال کر رکھا تا تھا جس میں سوائے محبت کے اور کچھ بھی تھا۔ چاقو کو سستی — اس لیے کہ وہ اُس کے جذبات کا ذوق اُڑانا چاہتی تھی — اسل میں وہ قیاس ہی منسور۔ ساری زندگی وہ کبھی ہونڈی نہ تھی اُس کے اس باپ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہماری بیٹی کبھی نہیں میں کبھی نہیں ہوتی۔

تیز اور چاقو اُس محبت کی پیشکش کرتی تھی۔ تیز چاقو کو دیکھتا تو اُسے یہی محسوس ہوتا کہ اُس نے اپنی نوجوان کھس آجینے میں دیکھ لیا ہے۔ اور چاقو تو اُس کی گروہ تھی اس لیے کہ وہ اُس کی بڑی خاطر داری کرتا تھا اُس کو بے چیز — جسے محبت کہتے ہیں۔ پہلے کھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ خوش تھی۔

بائبل میں تو کوئی اخبار ملتا نہیں تھا اس لیے تیز پر کثرت جان بڑھاتا تھا۔ وہاں وہ در تک ڈاک خانے کے اندر بیٹھا رہتا۔ ڈاک آتی تو خبر پڑھ کر کھس کی ہل پر چلا آتا۔ قریب قریب پچھیل کا حاصل تھا۔ مگر تیز پاس کوئی خیال نہ کرتا یہ کہتا کہ ہوا دی میں ہونگی جب وہ وہی ہوگی کہ پاس ہی چاقو تھا کھس۔ کھس سامنے سے باہر نکلتی آتی اور دونوں جناب کھس پاس پہنچ جاتے تھے ضرور پڑھ لیتے۔ چاقو اُس سے کہتی: "بھیر — کچ کی خبری سناؤ۔"

اُس کو خبری سننے کا خط تھا۔ تیز اخبار کھنکھاتا اور اُس کو خبری سناتا شروع کرتا۔ ان دنوں وقتہ راز فسادات تھے۔ اتر سے یہ فقر شروع ہوا تھا جہاں کھس نے مسلمانوں کے کئی محلے جلا کے ڈکھ کر دیے تھے۔ وہ یہ سب خبری اُس کو سنا آتا۔ وہ کھسوں کو اپنی گنوازدان میں ہوا بھلا کہتی: "تیز خا سوش رہتا۔"

ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستان قائم ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں میٹرہ ہو گیا ہے۔ تیز پر کثرت کاظم تھا، مگر جب اُس نے پڑھا کہ ہندوستان نے ریاست مانگول اور مانا دار پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا، مگر اُس نے اپنی اس پریشانی کو چاقو پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

دونوں کا عشق اب بہت استوار ہو چکا تھا۔ اس کاظم چاقو کے باپ کبھی ہو گیا تھا وہ خوش تھا کہ میری لڑکی ایک سوزناور شریعت کھنکھ میں چلے گی۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی سیا کھنکھ نہ بنے، جہاں کا تیز رہنے والا تھا، اس کی بہن، جس قیاس کو تیز پاس کے پاس ہے۔ دولت نہ کر لیا ہے — بلکہ کھی کھی پاس کا فی زمین پڑی ہے۔ اُس پر ایک چھوٹا سا مکان بنوے اور وہ دونوں پاس پر ہی اُس

مائی جنتے

مائی جنتے سیدہ شہناز کی تھیں۔ کچھ اس انداز میں اپنے بیٹے کے بطن میں داخل ہوئی کہ اس کو سب گھوڑیوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ آگئی ہے۔ وہ جتنی اس گھڑی میں چڑھ کر بیٹھ کر رہی تھی، اپنے بیٹے کا تھا، اپنے بیٹے کا تھا، ایک چورہ اور دو جوان بچیاں چھوڑ گیا تھا، آدمی ہائی دھن کا تھا، جوشی پر لڑکیاں کوس برس کی ہوئیں، ان کو گھر کی چار دیواری میں بٹھار دیا اور پھر وہیں ایسا کہ وہ کھڑکی تک کے پاس کھڑی نہیں ہو سکتیں، اگر جب وہ لڑکی بیٹا ہوا تو ان کو آہستہ آہستہ تھوڑی سی آزاد دی ہو گئی، اب وہ ایک چٹاپ کے کونوں میں بیٹھتی تھیں، اپنے کہنے کے بعد اسے بند کر کے لڑائیوں سے ایک ملک میں لگاتی تھیں۔ اس کے پاس ولایت کی کسی ہوائی اگلیا میں نہیں — معلوم نہیں، سب چیزیں کہاں سے لی گئی تھیں، ہر حال ان کا خوب ہے، کہ ان کی ماں کو چاہیں ایک اپنے لڑکے کے حصے کو قبول نہ سکی تھی ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا، وہ زیادہ تر لڑائی جھگڑا کی علامت اور ناچنے وقت کی نمائندوں کی اور لڑائی میں مصروف رہتی اور اپنے مرحوم طور پر کہہ دو گا تو آپ سے بچنا ہی رہتی،

گھر میں کوئی بود کو کر نہیں تھا، مرحوم کے باپ کی زندگی میں، زمرہ مرحوم کے زمانے میں، انہوں نے کہا کہ انہوں نے شہادت ہے، عام طور پر ایک یادو طرز میں ہوتی تھیں، چ باہر سے سورا سلت بھی لایا، اور گھر کا کام بھی کریں۔

دوسری جماعت خود مرحوم نے لڑائی جھگڑوں کو بڑھا کر اس کو اپنی تھی، کالج کی تعلیم کے وہ کچھ خلاف تھے، وہ ان کی فوراً شادی کر دینا چاہتے تھے، مگر یہ تمنا ان کے دل میں نہ رہی، ایک دن اچانک خالی گرا۔ اس غمزدی مرض نے ان کے دل پر اثر کیا، وہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنی ملک عدم ہو گئے۔

باپ کی وفات سے لڑکیاں بہت کوس رہنے لگیں۔ انھوں نے ایک دن ماں سے اجازت کی کہ وہ ان کو کسی کالج میں داخل کر دیں، یہ حسب زیادہ اور زیادہ انھوں نے کئی دن کھانا نہ کھایا تو اس نے مجھ کو ان کو ایک زمانہ کالج میں داخل کر دیا۔

مائی جنتے نے وعدہ کیا کہ ہر روز ان کو صبح کالج چھوڑ آئے گی، سارا وقت وہیں رہے گی اور جب کالج بند ہو گا تو انھیں اپنے ساتھ لے آیا کرے گی، اس نے اپنی ماں سے یہ وعدہ کیا، ایسے پُر غلوں انداز میں کیا کہ وہ وعدہ بانو مرحوم خراجہ کر کے پیش کی، یہ وہ یہ پیش کیا خود اس کی سچی ہیں۔

اس نے سبوی پیشوں کو بڑے میں رکھنے کی عادت میں اپنے انداز میں عموؤں کی طرح ایک ہی جڑی تقریر بھی کی، لیکن پھر یہ کہا، تعلیم بھی ضروری ہے کہ اسلام اس سے منع نہیں کرتا۔ پر وہ کچھ بحال بہت ضروری ہے، جہاں جہاں ہیں، ان پر بڑی کڑی لگائی ہوتی چاہیے — میں تو ان کے پاس کوئی کتھی بھی نہ چھٹنے دوں، کوئی دس دس شہادت کریں گی تو وہ کان انھوں نے کہہ دیا، انھیں کی اور یاد کریں گی کسی بڑھیا سے پالا پڑا ہے — لیکن یہ کیوں کہنے لگیں، شریف خاندان کی ہیں — بڑے غماز کی پابندیوں —

اور بے گھر بھی نہیں۔ ایک وہاں بھی طرح بگھٹی ہیں۔

دونوں لوگوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک دوسرے کے فرق کے بعد ہی بھولتی جس کا نام لسترنی تھا یہاں ہوتی تھی بڑی کامیابی تھی۔
 دونوں خوبصورت تھیں۔ چہرے سر سے خاص بھی۔ تو دونوں کی شکل ایسی ہی کافی ممتی تھی۔ دونوں ہر وقت کشتی کھیتیں مگر دونوں
 کا نام نہ مگر عوام پر چکا تھا۔ اب جوانی کی شروعات کے دن تھے۔ کالج میں جاتے ہی انھوں نے ہر پڑھنے لکھنے اور ہر صوفیائی تہذیب کی طرح میں کو
 کسی پھول کی تلاش ہو۔ اور وہاں پر ٹھہرا شروع کر دیا۔

مائی بھنتے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ کالج کی بڑی بچہ چارس کے ساتھ اس وقت حقہ تھی۔ رتہ چار پاس ہی کالڈ میں رہتی تھی۔ دونوں کم عمری کے
 باعث بہت بلند سری سیلیاں ہیں مگر تھیں۔ جب دونوں ایک ساتھ چھتیں تو اس زمانہ تک باتیں چھڑا تیں جب کہ وہ بھی ان تھیں۔ چار اس کو کس
 لڑکی سے رغبت یا محبت نہیں تھی۔

وہ مائی بھنتے کو بڑی پرانی کہانیاں سناتی تھیں۔ اس میں ایک سچے شری کوئی کوئی کہتا ہوئی شکل سے لگا دیا۔ پرنسپل صاحب کو اس پر راز
 اور بے رحمت کے لئے اس کا سزا سن رہے۔ ہر سال ایک کالج جوڑے کوئی کھوٹا تھی اس سے دونوں کے مولی صاحب کا کشتی ہو گیا۔
 چنانچہ تو تھیں اس لڑکی کو دل چاہا۔ پکڑے گئے کہ کالج سے واپس ہو رہے۔ دونوں پوس کے ہاتھوں میں۔ ڈارمی تو پانچ سال کی تیرہ بھلت رہی
 ہے۔ معلوم نہیں اس دشمن برائی کیا کیا ہوا۔ لڑکی کو اس باتوں میں دھیان ہی نہیں دیتی۔ مجھے کیا فرض پڑی ہے کہ ان تھیں کہ کلاں
 ہر پانچ وقت خالی کر دیں۔

مائی بھنتے نے بھنتے کی لئے سڑے ایک کر دی۔ نہ تو اس باتیں نہیں کیا کرتے۔ وہ کیا کہات ہے کہ کوئی شمس اور ہے جو نہیں لگا
 اور وہ کوئی سڑے ہے جو نہیں لگا۔ خود تھا دیکھا کرے۔ ہم لگا کر کاشوش ہی رہنا چاہیے اور اذیتیں دے دے مگر انی پیانچے کر
 دیکھیں کی ہوئی کوئی کرے کاموں کی طرف نہ دے جائے۔ ان کی حقارت اور اپنے کم سے بھلائے گئے۔

چار اس اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی کہ کشتی ایک عورت ہے۔ اس کو دل ہی میں بڑی مذمت ہوتی کہ اس نے اتنی فکروں میں
 کھلے ڈالے۔ وہ ان کے دماغ نشا کیے۔ اس نے چار کو فراموشی بھنتے سے معافی مانگی۔ ان کے کانوں کو تھکایا کہ آئندہ وہ اس باتوں سے متاثر نہ رہے
 گی۔ کسی لڑکی کے بارے میں اسے کچھ نہ بھولی کہ کیا تو وہ وہی زمانہ نہ دیکھے گی۔

مائی بھنتے نے اسے بڑی شاباشیاں دیں۔ نتیجہ میں کالج چھوٹ گیا۔ اس نے ہر دوسرے کو ساتھ لیا اور گیٹ سے باہر جا کر اس
 نے ان سے کہا۔ آج تھیں شام کو یہاں نہیں آنا پڑے گا؟
 پر وہی نے جواب دیا۔ اب میں تو کسی نے نہیں کیا؟

اس میں تم دونوں بہت بے وقوف ہو۔ دھیان سے بہت متناکر۔ میرا تھیں کسی سے بچہ کو بتا دیں گی۔ گھر پر
 مائی بھنتے نے ان کے لیے ہاتھ تیار کی ہوئی چھوٹی سے چیز پر لگا دی۔ چہرہ ان کی دل کے پاس اپنی پر لگے۔ کوئی کھوٹا لڑکی اس سے بہت باتیں
 اس کی ممتی تھیں۔ وہی شمس اور اس نے تھیں اس کو شہرہ دیا کہ پر لگے۔ آج آنا ہوا ٹھیک نہیں۔ میرا خیال ہے آپ کسی لڑکے کا
 بندوبست کر دیں تو ٹھیک رہے۔ پیدل پیدل۔ تو کوئی فخر نہ کھاسی۔ رگوں سے بیٹوں کے ساتھ۔

انی پتے کو مشورہ دیا معتدل تھا چنانچہ لائے کا بندوبست دوسرے ہی روز ہو گیا۔ انی پتے نے ایک ٹانگے والے سے بیٹھ کر کرایہ لے کر لیا۔

دوسرے قیسے روز بھی بالکل وحیدہ باکو کے خبرستانی کرڈوس میں دوا کے ساتھ جو رنگ نکال ہوئی تھی اس میں نے کرایہ دار آن پیسے میں۔

وحیدہ بانو نے پوچھا، کون لوگ ہیں؟

تھانے ہادی۔ ہوں گے کوئی اس سے غیرے، بخیر خرے۔ میں نے انکس سے پوچھا نہیں۔

ایک دن دوسری طرف سے کوٹھے پر کسی شخص نے ایسے ہی جھانک کر ان کے صحن میں دیکھا۔ ایک جھنگر مرنے پڑے گا۔ انی پتے کہیں باہر گئی تھی وحیدہ بکلم نے فرما کر ان کی اوٹ میں کوٹھے پر کوٹھے کے ایک چھوٹے سے اوٹ کو دیکھا اور کہہ کر ڈوس دے مکان میں جوتے کر لے کر آئے ہیں، انکس کوئی عورت جو تو ان سے کہو آپ کی ہسانی بیگم صاحب آپ سے درخواست کرتی ہیں کہ کھڑی کے لیے تشریف لے آئیے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

لاکھو بیگم نے کہہ دیا کہ کوئی آگے گھٹنے کے بعد ہوا سے پردہ نکال ہوئی۔ پروین اور سرین اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں اس لیے اس نے خود زور کھولا۔ ویسے ایک سفید برقع پوش خاتون کھڑی تھی۔ اس نے ہنسے لاکھ بیگم صاحبہ سے پوچھا کیا آپ ہی نے مجھے اور فرمایا ہے؟

وحیدہ بکلم نے جواب دیا ہاں۔ تشریف لے آئیے۔

وہ اندر چلی آئی۔ دروازہ بند کر کے تخت پر بیٹھ گئیں۔ وحیدہ بکلم کی کچھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے۔ دروازے پر چند لمبات ایک دوسرے کی شکل عورت ہر کچھ غور کاہانہ رہتی ہیں۔ آخر ہسانی نے مہربانی کر ڈی اور پوچھا فرمائیے آپ نے مجھے روت کٹا میں کیسے بلایا؟

اس پر وحیدہ بیگم کو زنی شکوت کے اظہار کا موقع مل گیا اور اس نے بڑی کندی اور تحمل سے سب کا معلوم بیان کر دیا اور پوچھا تو کوئی صاحبزادہ ہیں جو اس طرح پرانے گھر میں آگ جھانک کرتے ہیں؟

یہ لاکھ بیگم سے۔ وہ تو یہاں نہیں۔ فرما شریک ہے۔ چونکہ کم نئے نئے اٹھ کر یہاں آئے ہیں اس لیے اس نے کوٹھے پر چڑھ کر کھانا کھا کر اس پر اس کا برا۔ ویسے میں اس کو سن کر دہوں گی کہ خبردار تم نے بدھ کر کیا کسی بھی عورت نظر اٹھا کر دیکھا۔ بڑا غور و زحمت ہے۔ خود سرے حکم کی تعمیل کہے گا میں نے اگر اس کے باپ سے آپ کی شکایت کی تو وہ تو اس کو مار کے کھال آڈی کرے گا۔ بڑے سخت کی ہیں وہ اس سے ملے ہیں۔ ویسے مجھے افسوس ہے۔

”نہیں میں نے صرف آپ کے کانوں تک یہ بات پہنچائی تھی کہ وہ بڑی زبرد۔ یہ کہہ کر وحیدہ بیگم اٹھی اور کھڑی ہو کر چلی۔“

فصل دوم اور آخر آؤ خدا۔

دروازوں ایک کو باہر نکلیں، لیکن ایک نادیدہ عورت کو روک کر کھٹک گئیں۔ دوپٹے کے بغیر غور اندر بھاگیں اور دوپٹے اوڑھ

کر یا ہر آئین، انوار و حریت کو جھک کے سلام کیا اور اپنی ماں سے پوچھا، کیوں تھی جہاں بے

وسیدہ، یکم نے اپنی مہمانی سے اپنی بیٹیوں کو استعارت کر لیا۔ اُس نے ان کو کھانہ کھانہ عاتیں دیں اور ان کی آنکھوں کی بڑی تعریف کی کہ انشاء اللہ چند سے آفتابِ جنت سے اسبابِ پیوستہ نے کیا تیرا سلیم، بالکل انہی کی طرح شریف اور خوشیلا ہے۔ چند دنوں ہی میں وحید ملازم مہمانی میں کام آتا، نئی عظیم خدیجے گھر سے گھر کے وحیدہ یکم ان کے یہاں تیس جاتی تھی، اُس نے نازی یکم سے کیا، میں سرگھوں پر آتی۔ سرور و فخر آتی، پر جب سفار جہ صاحب کا انتقال ہوا ہے کہ میں غلامی میں کم کھالی تھی، اس گھر سے باہر ایک قدم نہ رکھوں گی۔ میں دیکھو خدا کے لیے مجھ کو نہ کرنا۔

اس شان میں، کالج میں شام تک نکلتی رہتی تھی، کبھی کوئی ہاتھ ہے کبھی بیٹن شہ ہے، کبھی شاد ہے۔ کبھی کبھی کچھ پروین اور نسرتی دونوں ہی پر دو گلوں میں شامل ہوتی تھیں، مگر مانی جتنے ساتھ ہوتی اور ان کو لے کر بھگت واپس گھر آتی، غلام جلدی انوار ورت سے۔ عید سے چار روز پہلے سلیم واپس آیا، ساتھ اُس کے اُس کا بھتی دوست تانور تھا، وحیدہ یکم نے اُس کو مندر پر پاؤں کا تھک کے بد چپ اُس نے اتفاقاً وحیدہ یکم کے صحن کو رک رکھ دیا، مگر انوار و بیچو یا تھا، ہاں اُس کے والد کی بانی اجا اور ملاک تھیں۔ اُس نے اپنے سے غلام کو رکھ لیا تھا کہ عید سے پہلے پہلے یہاں لاہور پہلے آئے، وہ آگیا اور ساتھ اپنے بھتی دوست کو بھی لے آیا، گھر میں سب سے پہلے تھے اس لیے کہ وہ انکھے اسکول اور کالج میں پڑھے۔ یہاں لاہور میں اُنھارے کی صورت ایک دوجاتی کہ تسلیم کے والد اُس کے لیے اپنے انوار ورت سے کوئی انچس ملازمت تلاش کرنا چاہتے تھے۔

دوسرے روز شام کو تانور نے تسلیم سے کہا، تھو لدا، آج عیاشی کریں۔ گھر انوار میں کیا پڑا ہے۔

تسلیم نے پوچھا، عیاشی کیس ہے؟

تانور دسکرایا، تم تو رے کھرے چند۔ چلو آؤ باہر تھیں بتاتا ہوں۔ دیکھیں گے، قسمت میں کیا لکھا ہے۔

دونوں دوست چلے گئے۔ اتنے میں وحیدہ یکم کے پاس اُس کی مہمانی آئی۔ اس نے اصرار دھر کر باتوں کے بعد اپنا سر ہٹا دیا کہ وہ اپنے تسلیم کے لیے نصیرین کا شہرہ مانگنے آئی ہے۔

نزیہہ، میل و جہت کوئی بھی نہ ہوئی۔ وحیدہ اُن لوگوں کے حقوق سے بہت متاثر ہوئی، چند رسی باتیں برتن، اس کے بعد دونوں رضامند ہو گئیں کہ اُن کا نکاح عید کی تقریب میں ہو جائے اور نصرتی ایک ماہ کے بعد۔

رات کو تسلیم در سے آیا، مگر اس کی ماں نے کوئی باز پرس نہ کی کہ نگہ و خوش تھی کہ اتنی جلدی اُس کے بیٹے کی شادی کا معاملہ نصیرین اور نسرتی میں رجیل اور باجیا لڑکی سے طے پا گیا، اُس نے چنانچہ تسلیم کو خوش خبری سنائی، وہ بھی بہت خوش ہوا۔ تھوڑے کی زندگی اور بیکاری سے وہ تنگ آگیا تھا، اُس نے سوچا، وہ یہ میرا پ کے پاس کافی ہے، کیا پورا ہے، ملازمت کی نگر ہوتی ہوگی۔ اس کو دوست واپس گھر انوار چلا آیا، اس لیے کہ اُس نے عید اپنے گھر منانا تھا۔ تسلیم نے اپنی ماں سے کہا، دیکھیے ائی جان،

میں نے آپ کی بات کوئی جلدی مان لی۔ اب آپ میری مانجیے۔

اس کی ماں نے پوچھا، کیا بیٹا۔

”مجھے نرسزین کی ایک جھلک دکھا دیجیے۔۔۔۔۔ خواہ وہ ٹھوڑی سی ہے کیوں نہ ہو“۔ اُس کے بچے میں انتہائی تیز خیال ہے کہ وہ اسٹارکرس تو اُس کا کوئی فوٹو ہی دکھا دیجیے۔۔۔۔۔ آخر وہ کل یا پیر سون بیری ہونے والی ہے۔“
 اس کی ماں کو سلیم کی یہ درخواست ناپسند نہ ہوئی۔ ”تیس پوری کوشش کروں گی مثلاً۔“
 سید آگئی مگر تصویر نہ آئی۔۔۔۔۔ لیکن سلیم نے کسی عقل کا انکار نہ کیا۔ نکاح کی رسم بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ جب جوہر باہر نکلا تو اُس کی ماں نے گواڈرڈا سا کھولا اور اُس کو آواز دی۔ وہ ٹھہر گیا۔ ہاتھ باہر نکال کر اُس نے سلیم سے کہا تیرا غفاڑے لو۔۔۔۔۔ دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔“

سلیم بھگ گیا۔۔۔۔۔ اُس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ اس میں تباہ انتظار کیسے ہوتا۔ اُس نے غفاڑوں میں کھڑے کھڑے کھولا۔۔۔۔۔ دھڑکتے ہوئے دل سے تصویر باہر نکالی۔ باد صحرانہ دھڑکھٹا اور تصویر پر پہل نظر ڈالی۔ اُس کا رنگ ہلکی کی طرح زرد ہو گیا۔ تصویر اس کے کانچتے ہاتھوں سے گر پڑی۔۔۔۔۔ اس نے سانسے والا دوا زہ جس میں سے اُس کی ماں نے ہاتھ نکالا تھا کھٹکا اور ڈھیانکل۔
 سلیم نے اُس کو بیزارت زہ آنکھوں سے دیکھنا مائی۔ تم یہاں کیسے پہنچ گئیں۔۔۔۔۔ وہ تو اُس رات تم ہی۔۔۔۔۔
 اس نے اس سے اور زیادہ کہہ نہ کیا اور تصویر زمین پر چھوڑ کر تیز قدموں سے اپنے لیک دوست ڈاکٹر جمیل کے پاس گیا۔
 اور ساری بات بتادی۔ جمیل نے اُس کو ہسپتال میں داخل کرادیا، جہاں اس کے جھوٹ ٹوٹ کے مرض کا علاج ہوتا رہا۔۔۔۔۔ آخر ڈاکٹر جمیل نے سلیم کے والد کو بلا کر چٹکیوں میں کہا کہ یہ شادی نہ ہو۔ آپ کا والا صحت کے قابل نہیں ہے۔

(۱۲۔ مئی ۱۹۸۷ء)

جان محمد

میرے دوست جان محمد نے جب میں رہا تھا میری بڑی خدمت کی اور تین مہینے ہسپتال میں رہا اس دوران میں وہ ایک حادثہ شام کو آ رہا۔ بعض اوقات جب میرے کو کراچیل جرتے آدھ رات کو میں دیر طرزا، تاک میری خبر گیری میں کوئی کوئی نہ ہو۔

جان محمد بہت افسوس دوست ہے میں قریب قریب میں رہتا تھا کہ ہر حال رہا تھا اس دوران میں وہ آتا — یکنے لگے اس کا علم نہیں تھا جب لگے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت پریشان تھا، دہائی تھا اس نے کو میری حالت بہت ناراض تھی۔ تب وہ اس کو دل ہر گاہ کہ بات چیت کر سکوں، تو اس نے مجھے یہ کہا: آپ کو شکایت تو کسوس نہیں ہوئی؟ میرے اعتقاد اعلیٰ نظر سے جو کہ تھے معلوم نہیں کتنی اور کتنی شے لگے بھر رہے تھے، جو کہ میں نے اس سے کہنا ہوا تھا — میرا نام کیا تھا؟

اس نے فوراً میری خبر سے کہا: الٰہی زین کو کراچیل ملگا دیکھیو — میں سمجھنے لگے ایش کو یاد کروں گا؟

زین کو کراچیل لایا اور جان محمد بھی اس نے میرے سارے بدن پر مائش کی قریب قریب دو گھنٹہ اس کا اس وقت میں سوت ہوا لگے بڑی راحت محسوس ہوئی۔

اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ ہر روز دفتر پہننے سے پہلے ہسپتال میں آتا اور میرے بدن پر مائش کرتا — مجھے راحت ضرور ہوتی تھی۔ لیکن وہ اس زور سے اپنے ہاتھ چمکا کہ میری نیند ان تک اُٹھنے لگیں اچانک میں اس سے اکثر شب و رات لیجوس کہتا تھا جس لمحہ تم قریبی جان سے لو گے۔

یہ کون کونہ شکاوت یا غمناک صاحب، آپ قریب سے سخت جانی ہیں — اس شخص جانی سے گھبرائے؟

میں غامض ہر جاتا، اس لیے اس کی شخص جانی میں کوئی چارہ نہ ہو نہیں تھی، بلکہ تریا یا غلوس تھا۔

تین مہینے ہسپتال میں کاشتے کے بعد گھبرا گیا — جان محمد بہ طور ہر روز آتا رہا۔

میری اس کی دوستی اتنا بڑا ہو گئی تھی۔ ایک روز میں گھر میں بیٹھا تھا کہ ایک ماٹسٹو کے چھوٹی چھوٹی رنجشوں سے وہیں سال مونسے ہوا سے بروٹھک دی میں جب اس کو اندر کرے میں داخل کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ میرا راج ہے۔ غمناک صاحب — میں نے آپ کو صورت اس لیے طیف دہی ہے کہ میں آپ کو ایک نظروں کی بنا چاہتا تھا — میں نے قریب قریب آپ کی سب تصانیف پڑھی ہیں۔

میں نے اس کی بنا سب و صورتوں الفاظ میں رکھی طور پر شکریہ ادا کیا تو اس کو بڑی حیرت ہوئی غمناک صاحب — آپ تو رسم و تقریر

کے قائل ہی نہیں پھر یہ تکلف نہ کریں؟

خاموش رہا۔ کچھ اس طرح کمرے کوئی سہانہ نہ لے۔

اس کے بعد دوسرے دن رات کے دس بجے میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر آؤ پر صدمہ اٹھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ جان محمد ہے۔ خیریت خستہ حالت میں۔ میں بہت پریشان ہوا اور اس سے پوچھا: کیوں جان محمد — خیریت تو ہے؟

اس کے ہوشوں پر عجیب سی سلاہٹ پیدا ہوئی، جس سے میں بالکل نا آشنا تھا، خیریت ہے — مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے میں آپ کے پاس چلا آیا۔

مجھے صحت خند آ رہی تھی، مگر جان محمد ایسے شخص دوست کے لیے میں اُسے قربان کرنے کے لیے تیار تھا، مگر جب اُس نے آؤٹ پلاننگ باتیں شروع کیں تو مجھے دھشت کرنے لگی۔ اُس کا دماغ غیر متوازن تھا۔ کبھی وہ آسمان کی بات کرتا، کبھی زمین کی میری بھجھ میں نہیں آتا تھا کہ اچانک اُسے ہر کیا گیا۔

ایک دن پہلے جب وہ مجھ سے ملا تو اچھا بھلا تھا۔ ایک مہم اس میں اتنی تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی؟

ساری رات اُس نے مجھے بگاڑنے رکھا۔ آخر صبح میں نے اُس کو غسل کرنے کے لیے کہا۔ اپنے کپڑے اُسے پہننے کے لیے دیے۔ کوئٹہ کے منیجنگلٹ تھے۔ پھر اس کو لاریوں کے آؤ سے پرے گیا کہ وہ سیالکوٹ اپنے والدین کے پاس چلا جائے۔

غلطی میں نے یہ کی کہ اُس کو لاری میں نہ بٹھایا۔ کرایہ وغیرہ میں نے اُسے دے دیا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے گا، مگر اسی دن رات کے تین بجے دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی میں باہر صحن میں سو رہا تھا۔ ہڑپا کر اُٹھا، سوچا کہ شاید کوئی تانا یا جو۔ دروازہ کھولا تو سامنے جان محمد — میرے اوصاف خطا ہو گئے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سیالکوٹ کیوں نہیں گیا، اُس نے اس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دیا، اُس کا دماغ پہلے سے زیادہ غیر متوازن تھا، نفرش پریٹ کر رہی بنیٹھیل پر زور زور سے گھونسنے مارنے لگا۔

میری بھجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں، وہ یقیناً جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا میں نے سر جاپا یہ محبت سے کام لیا چاہیے چنانچہ بہت دیر تک میں اُس کا سر سلاتا رہا۔ اس کے بعد اُس سے پوچھا: جان محمد تھیں کیا تکلیف ہے؟

اُس نے کوئی جواب نہ دیا مگر نفرش دوسری بھجھوں کے جوابی بڑے ہوئے تھے، اُن سے کھینٹنے لگا۔ اس کے بعد اُس نے ہڑپا کر کوسیدہ کیا اور رونے لگا۔

میں نے پھر اُس سے بڑی محبت سے پوچھا: جان محمد، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

اُس کی آنکھیں سرخ آنکھ تھیں جیسے کئی دنوں سے شراب کے نشے میں دھست ہے، اُس نے مجھ پر آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا: تم اتنے بڑے نصیحت نگار رہتے ہو — کیا یہ نہیں جان سکتے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟

”میں آپ تک انکی تسلیم کرتا ہوں — اب تم خود بتاؤ۔“

جان محمد سرکرایا: ”مجھے شرم ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”اب بھی مطلب پر پہنچتے ہیں آپ؟“
 میں نے اس سے کہا: ”جتنی شہیم کوئی بیماری تو نہیں؟“
 جان محمدؒ بہت بڑی عادی ہے منشی صاحب — یہ کئی دنوں کو بوجھتی ہے۔ اُن میں سے میں بھی ایک ہوں —
 پہلے ڈھبڑی میں جوتی تھی — اب یہاں لاہور چلی آئی ہے۔“
 میں بھڑکیا — جان محمدؒ کئی برس ڈھبڑی میں رہ چکا تھا اور شہیم میں — لیکن میں نے اس سے کہا: ”میں اب تک نہیں سمجھتا۔“
 تم اب سو جاؤ۔ چلاؤ — امد صوفی پر میٹ جاؤ۔ خبردار جو تم نے شہر دیا۔“
 وہ اندر چلا آیا اور صوفی پر بیٹھ گیا — میں سوجھ بوجھ کا عادی ہوں۔ سارے چار بجے کے قریب اُٹھا تو دیکھا کہ
 جان محمدؒ غائب ہے۔ سات بجے پتہ چلا کہ شہیم بھی اپنے قریب میں نہیں ہے — کیس غائب ہو گئی۔
 (۱۳ مئی ۱۹۵۴ء)

بارش

کوسا دھار بارش جو رہی تھی اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھا جل تھل دیکھ رہا تھا — باہر بہت بڑا لانی تھا جس میں دو درخت تھے۔ ان کے منہ پر تھے بارش میں نہلا رہے تھے۔ اُس کو ایسا محسوس تھا کہ وہ پانی کی اس برسات سے خوش ہو کر ناچ رہے ہیں۔ اور سٹیل فون کا ایک کلب گراؤ اٹھلاؤس کے ٹیبلٹ کے مین سائے پر بھی بڑا مسرور نظر آتا تھا حالانکہ اس کی سترت کی کوئی چیز معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اس بے جا شے کو بہا مسرور کیا ہوا تھا — یہی تھی خیریت جو کہ بہت معلوم تھا، یہی محسوس کیا کہ اُس کے اُس پاس جو رہی شے ہے، خوشی سے تاج گاری ہے۔

ساون گڈر چکا تھا اور بارش رحمت نہیں جوئی تھی۔ لوگوں نے مسجدوں میں اکٹھے ہو کر دعائیں مانگیں۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بادل آتے اور جاتے رہے۔ مگر اُن کے تھنوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پڑا۔

آخر ایک دن اچانک کانے کانے بادل آسمان پر گھیرائے اور چھائیوں پانی برسنے لگا۔ تقریر کو بادلوں اور بارشوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی — اُس کی زندگی پیشیل میداں ہی چلی تھی جس کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ بھی کسی نے نہ پڑھایا ہو۔

دوبس پہلے اُس نے ایک لڑکی سے جس کا نام ثریا تھا، محبت کرنا شروع کی۔ مگر ایک طرف محبت تھی۔ ثریا نے اُسے دوزخ و عذاب ہی نہ سمجھا۔

ساون کے دن تھے۔ بارش جو رہی تھی۔ وہ اپنی کوشی سے باہر نکلا، جا لگی ہیں کہ کہ نہائے اور بارش کا ٹکٹ اٹھائے۔ آم باٹھی میں پڑے تھے۔ وہ ایک لڑکیا اُنھیں پوس رہا تھا کہ اچانک اُسے گرجیں اور قہقہے سنائی دیے۔

اُس نے دیکھا کہ ساتھ والی کوشی کے لان میں دو لڑکیاں بارش میں نہا رہی ہیں اور خوشی میں خود بچا رہی ہیں۔ اُس کی کوٹھی اور ساتھ والی کوشی کے درمیان صرف ایک جھاڑیوں کی دیوار سائل تھی۔

تقریر اٹھا — آم کا رس جڑتے جڑتے وہ بارش کے پاس گیا اور خود سے ان دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔ دونوں میں مل کے کُتے پئے تھیں جو اُن کے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ شلواریں جو کہ ٹٹھے کی جین اس لیے

تقریر کا اُن کے بدن کے چلے حصے کے صحیح انداز میں لپکتے نہ چل سکا۔

اُس نے پہلے کسی عورت کو کسی نظروں سے کبھی نہیں دیکھا تھا، جیسا کہ اُس روز جب کہ بارش جو رہی تھی، اُس نے اُن دونوں لڑکیوں کو دیکھا — درجہ وہ اُن کو دیکھتا ہوا بارش میں بیگ بیگ کہ خوشی کے نعرے بند کر رہی تھیں۔

تقریر نے اُن کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہ وہ بڑا گھبراہٹ میں تھا کہ وہ کسی لڑکی کو بڑی نظروں سے دیکھا تھا

سمجھتا تھا، مگر اُس نے اس روز بڑی چھائی نگاہوں سے اُن کو دیکھا۔ دیکھا ہی نہیں، بلکہ اُن کے جیسے بدن میں اظہارِ ہن کر رہے کی طرح چمک کر اُڑا۔

تھوڑی عمر اُس وقت میں برس کے قریب ہو گئی، نا تجربہ کار تھا۔ ذہنی میں اُس نے پہلی مرتبہ جوان لڑکیوں کے شباب کو پہلی نظر سے دیکھا، تو اس نے یوں محسوس کیا کہ اُس کے خون میں چنگاریاں دوڑ رہی ہیں۔

اس نے اُن لڑکیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا چاہا۔ ————— ورنہ وہ خود اُڑا رہا۔ ————— ایک لڑکی بڑی شریعتی تھی۔ دوسری اُس سے کم۔ اُس نے سوچا شریعتی ہی نہ ہے گی جو اُس کو شرارتوں کا سبق دے سکے۔

یہ شریعتی رو کی خوبصورت تھی، اُس کے بدن کے اعضا میں بہت مناسب تھے۔ بدن میں سناٹا، جل پڑی معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی رو کے لیے متعزیر خاصہ بن گیا، اُس نے کبھی اس طور پر نہیں سوچا تھا لیکن اس لڑکی نے جس کا کرتہ دوسری کے مقابلے میں بہت زیادہ مہین تھا، اُس کا ایسے ایسے شعر یاد کروا دیے جن کو بعد بڑا مہول چکا تھا۔

اس کے علاوہ ریڈ لٹری پڑھنے ہوئے تھی گاؤں کی دھنیں بھی اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں اور اُس نے باڑے کیسے پڑھیں گے کا شروع کیا کہ وہ اٹھک کر مارے۔ ————— ویسے کمار ہے۔ ————— پھر اُسے کاسنی کو کٹھن اور مٹی جیونت کا خیال آیا۔ ————— مگر اُس نے جب اُس لڑکی کی طرف اس غرض سے دیکھا کہ اُس میں کاسنی کو کٹھن اور مٹی جیونت کے اندر خیال نظر آجائیں تو اس نے ان دونوں اور کٹھنوں پر غصہ بھیجی۔ ————— وہ ان سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ ————— اس کے عمل کے کرتے میں جو شباب تھا، اس کا مقابلہ، اس نے سوچا، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

تقریر نے اُمّی سے جلد کر لیا اور اُس لڑکی سے جس کا نام پر دیں تھا، عشق لڑانا شروع کر دیا۔

شروع شروع میں اُسے بڑی مشکلات پیش آئیں، اس لیے کہ اُس لڑکی کا پسند سائی تھی مگر اُس کا سان نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پھر اسے اپنے والدین کا بھی ڈر تھا، اس کے علاوہ اُسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اُس سے محبت ہوگی یا نہیں؟

بست ورنہ کمار وہاں ہی الجھنوں میں گرفتار رہا۔ ————— راتیں جاگتا۔ ————— چھ لڑکیوں کی پست قدم بھاڑ کے پاس جاتا۔ مگر وہ نظر نہ آتی۔ گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا، اور وہ بارش والا منظر دیکھتا تھا، آنکھیں بند کر کے ذہن میں دہرا کر رہتا۔

بست دونوں کے بعد آخر اُس کو ایک روز اُس سے علامات کرنے کا موقع مل گیا، وہ اپنے باپ کی کار میں گھر کے کسی کام کی غرض سے جا رہا تھا کہ پر دیں سے اُس کی منہ بھیر ہو گئی۔ وہ کار اسٹارٹ کر چکا تھا کہ ساتھ والی کوئی مٹی میں سے تھوڑے کھنڈوں کی شہزادی نکلی، اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ موٹر روک لے۔

تقریر گھبرا گیا۔ ————— ہر عاشق ایسے موقعوں پر گھبرا ہی جایا کرتا ہے، اُس نے موٹر کچھ ایسے ہیڈ سے انداز میں روکی کہ اُس کو زبردست دھچکا لگا۔ ————— اس کا سر زور سے اسٹریٹک وپل کے ساتھ ٹکرایا، مگر اُس وقت وہ شراب کے نشے سے زیادہ غمزدگ تھا۔ اُس کو اُس کی محبوبہ نے خود غلط کیا تھا۔

پندرہ دن کے ہوشوں پر اُس نے گھر سے شریعت رنگ کی لپ اسٹک بھیجی ہوئی تھی۔ اس نے شریعت مسکراہٹ سے کہا،

مصلحت فرمائیے گا بیشک آپ کو تکلیف دی ————— بادشہ جلد ہی ہے ————— تاکہ اس دُور دروازہ جگہ غنا محال ہے ————— اور مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ آپ میرے ہمسایے ہیں، اسی لیے آپ کو یہ نصیحت دی ہے۔

تو ترے کہا، زحمت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ————— میں تو ————— میں تو ————— اس کی زبانیں لو کھڑکی، آپ سے میرا تعارف تو نہیں، لیکن آپ کو ایک بار دیکھنا تھا۔

بدویں وہی سرخ مسکراہٹوں کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی اور توڑے سے پوچھا آپ نے مجھے کب دیکھا تھا؟
تو ترے جواب دیا، آپ کی کوشی کے لای میں ————— جب آپ ————— جب آپ اور آپ کے ساتھ ایک اور روٹی آرٹش میں مناری تھی؟

بدویں نے اپنے گھر سے سرخ لمبوں میں سے تھوڑا سا آواز نکالی پائے ————— آپ دیکھ رہے تھے؟
”یہ کتنا سخی میں نے ضرور کی ————— اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔“

بدویں نے ایک ادا کے ساتھ اُس سے پوچھا، آپ نے دیکھا کیا تھا؟

یہ سوال ایسا تھا کہ تو تر اُس کا جواب نہیں دے سکتا تھا، اُنیں دس دس شاخیں کو کے رہ گیا تھا کچھ نہیں ————— بس آپ کو یہاں مطلب ہے کہ وہ لوگ ایسا تھیں جو بادشہ میں مناری تھیں اور ————— اور خوش ہوتی تھیں ————— میں اُس وقت اُم چوس رہا تھا۔

بدویں کے گھر سے سرخ لمبوں پر شرع مسکراہٹ پیدا ہوئی، آپ اُم چوتے کیوں ہیں ————— کلاٹ کر گئیں نہیں کہاتے؟
تو تر نے موڑا اشارت کر دی، اس کی بکھر میں نہ آیا کہ اس سوال کا جواب کیا دے چکا ہو وہ لوگ لکھا تھا: آپ کو میں کہاں ڈال کر دوں؟

بدویں مسکرائی، آپ مجھے کہیں بھی ڈال کر دیں، وہی میری منزل، بزرگی۔

تو تر نے یوں محسوس کیا کہ اُسے اپنی منزل مل گئی ہے، وہ کی جن اُس کے پہلوں میں بیٹھی ہے، اب اُس کی ہے، لیکن اُس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اُس کا ہاتھ باندھے، یا اُس کی لکڑی میں ایک دو سیکنڈ کے لیے اپنا بازو نہانی کر دے۔

بادشہ جلد ہی تھی، موسم بہت خوشگوار تھا، اس نے کافی دیر سوچا، ہر شے کی رفتار اُس کے خیالات کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی گئی، پھر اس نے ایک جگہ سے روک لیا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کو اپنے ساتھ چلا لیا، اُس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیرست کر دیے ————— اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کوئی بہت ہی نفوذ اُم چوس رہا ہے، بدویں نے کوئی مزاحمت نہ کی ————— لیکن فوراً تیز کر دیا کہ اس بڑی شدت سے جبراک سے فخر بڑی تاثرات سے حرکت کی ہے، اور غالباً بدویں کو اُس کی بہ حرکت پسند نہیں آئی، دھچکا چھ ایک دم بنیوہ ہو کر اُس نے کہا، آپ کو کہاں جانا ہے؟

بدویں کے چہرے پر یوں غشائی کے کوئی آثار نہیں تھے، لیکن تو تر اُس محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ اُس کے غم کی پیاسا بدویں نے اُسے بتا دیا کہ اسے کہاں جانا ہے ————— جب وہ اس جگہ پہنچا تو اُس سے معلوم ہوا وہ روٹیوں کا چکر ہے۔

— جب اس نے پردہ کو مٹوئے آگے تو اس کے ہونٹوں پر گہرے لال رنگ کی مسکراہٹ بکھر رہی تھی۔ اس نے کوٹھے کے کنارے ٹھیک کرسیوں کے اندر میں اس سے کہا، شام کریں یہاں ہوتی ہوں — آپ بھی منور تشریف لائیے ۔
 تنہا جب بھر چکا ہو کہ اپنی عرش کی طرف بڑھا، تو اسے ایسا لگا کہ وہ بھی ایک کبھی عورت ہے، جیسے وہ ہر روز چلا آتا ہے۔
 اس کی لال چلی لب اسٹک ہے، ہر چہین نے ہونٹوں پر چھیا ہوتی تھی۔
 وہ دالیں اپنی کوشی چلاتا — بارش ہو رہی تھی — اور تنہا بے حد غم تھا۔ — اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں کے آئینہ بارش کے قطرے بن کے ٹپک رہے ہیں۔

(۴۱۔ مئی ۱۹۵۲ء)

افشائے راز

”تیرا لکھی کسے نہ لکھی، تے ٹکڑی نوں جگ جاندا“

”یہ آپ نے گانا کیوں شروع کر دیا ہے“

”ہر آدمی گانا پڑھتا ہے — کڑا گانا کیا ہے؟“

”کل آپ غسل خانے میں لکڑی کی گیت گادے تھے“

”غسل خانے میں تو ہر شے آدمی اپنی استطاعت کے مطابق گاتا ہے — اس بچے کو وہاں کوئی سنیے والا نہیں ہوتا — میرا خیال ہے، تمہیں میری آواز پسند نہیں آتی“

”آپ کی آواز تو ماشاء اللہ بڑی اچھی ہے“

”مجھے بند ہی ہو — مجھے اس کاظم ہے کہیں کئی سڑکوں پر میری آواز میں کوئی کشش نہیں — کوئی بھی اسے پٹے بانس کی آواز نہ کہہ سکتا ہے“

”مجھے تو آپ کی آواز بڑی سُر کی معلوم ہوتی ہے، باقی اللہ بتا دے گا — لیکن میں پوچھتی ہوں، اب وقت بے بجا ہی ہوئی“

”مجھے اچھی لگتی ہے — لیکن تم کو اگر ادب اور شعر سے خدا سا بھی شغف ہو —“

”یہ شغف کیا بلا ہے — آپ ہمیشہ ایسے مفاد میں گفتگو کرتے ہیں جسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا“

”شغف کا مطلب — بس تم یہ سمجھ لو — کہ اس کا مطلب لگاؤ ہے“

”مجھے شاعری سے لگاؤ کون ہو — ایسی داریات چیز ہے“

”یعنی شاعری بھی باک چیز ہوگئی — یہ تمہاری بڑی زیادتی ہے — فرصت کے لمحات میں اپنے اندر مذاق پیدا کیا کرتے“

”مجھے بچے پیدا کر چکی ہوں — اب میں اللہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتی“

”میں نے تم سے کئی دیر کہا کہ معاملہ ختم ہونا چاہیے، پر تم ہی نہیں مانتی — چہ بچے پیدا کر کے تم شک کنی ہو، تمہارے بڑوں میں مسرت و قیوم رہتی ہیں، اس کے گیارہ بچے ہیں“

”آں کا مطلب ہے کہ میں بھی گیارہ ہی پیدا کروں“

”میں نے یہ کب کہا ہے — میں تو ایک کا بھی تامل نہیں تھا“

”میں ابھی طرح جانتی ہوں — جب میرے تجرے ہو تو آپ اسی ہانے سے دوسری شادی کر لیتے۔“
 ”میں تو آپ ہی شادی سے بھرپور ہوں — تم ساری زندگی کے لیے کافی ہو — میں دوسری شادی کے متعلق
 سوچ ہی نہیں سکتا۔“

”تو یہ بھائی بولی کس لیے گائی جا رہی تھی۔“
 ”بھئی میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے یہ پسند ہے — تمہیں ناپسند ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں — میری ٹکدی کسے نہ رکھی
 — تے ٹکدی توں ہلک جاذا۔“

”آپ بول میں آپ کو کیا لذت محسوس ہوتی ہے۔“
 ”میں اس کے متعلق دو ترقی سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“
 ”آپ نے اب تک کوئی بات دقت سے نہیں کہی۔“
 ”دقت نہیں — دقت — یعنی یقین کے ساتھ۔“
 ”آپ نے ابھی تک کوئی بات ایسی نہیں کہ جس میں یقین پایا جاتا ہو۔“
 ”وہ آج ہی یہی بات سنی — میری باتوں پر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔“
 ”تمہوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیلئے ہے؟“
 ”تمہوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا — ٹکڑی میں تو دھڑکی میں داخلہ — آپ ہی پھاڑتی ہیں آپ ہی رنڈ کرتی ہیں۔
 مجھ میں نہیں آتا کہ آج کی بڑی کس بات پر ہے۔“

”آپ ایسے دایات گیت گاتے رہیں اور میں چپ رہوں — اب سے وہ قرآن دوسراں آپ نے جیشہ مجھ سے
 بے اعتنائی کی — میری مجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو غزوں اور گیتوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے — ابھی پچھلے دنوں آپ مسلسل
 شعر گنگنا رہے۔“

سننا ہے درجینوں کو بھی کچھ
 مروت کے قرینے آرہے ہیں
 مجھے اس پر سخت اعتراض ہے — کوئی شریف آدمی ایسے شعر نہیں گاتا — آپ ے
 تیری ذات ہے اکبری سروری
 میسری بار کیوں دیر تہی کری
 نہیں گھٹتے۔“

”لا حول ولا — تم بھی کہیں اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہو۔“
 ”یہ باتیں گرا آپ کے نزدیک اوٹ پٹانگ ہیں؟ — اس لیے کہ پاکیزہ ہیں؟“

”دنیا میں ہر چیز پاکیزہ ہے۔“

”آپ بھی؟“

”میں تو بیٹھ صاف مسترا ہوں۔ تم نے کئی مرتبہ اس کی تعریف کی ہے۔ لیکن میں دوستوں کے لئے بے بدعا ہوں۔ سخت سڑی بھی ہو غسل کرتا ہوں۔ تم تو تین چاروں چھوڑ کے نہاتی ہو۔ تمہیں پانی سے نفرت ہے۔“

”ابھی واہ۔۔۔ میں تو ہر شے بامعاہہ نہاتی ہوں۔“

ہر شے کا نہانا تو سفید جھوٹ ہے — قرآن کی قسم کھا کے بتاؤ، تمہیں نہانے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں؟

”میں قرآن کی قسم کھانے کے لیے تیار نہیں — آپ بتائیے، کب غسل کیا تھا۔“

”آج صبح۔“

”جھوٹ — آپ کا اول جھوٹ، آخر جھوٹ — آج صبح تو غسل میں پانی ہی نہیں تھا — میں نے سارے نوبے کے قریب دو خشک منگول تھیں۔“

”تین جھول گیا — واقعی آج میں نے غسل نہیں کیا۔“

”آپ کو جھول جانے کا مرض ہے۔“

”جھوٹا انسان کی لطرت ہے — اس پر تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں — چند روز ہوئے تم دس کا نوٹ کہیں، دیکھ کے جھول گئی تھیں۔ اور پھر الزام لگایا کہ میں نے چوری کر لیا ہے — یہ کتنی بڑی لڑاؤ آتی تھی۔“

جیسے آپ نے میرے دوسرے کبلی نہیں چرائے — پچھلے مہینے میری الماری سے آپ نے سوروپے نکالے اور غائب کر گئے۔“

”ہو سکتا ہے وہ کسی اور نے چرائے ہوں — اگر تمہیں بچہ پر شک تھا تو بتا دیا ہوتا — یہ بھی ممکن ہے کہ تم نے وہ سوروپے کا نوٹ کسی غصوٹا جگہ رکھا ہو اور بعد میں جھول گئی ہو — کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔“

”کب؟“

پچھلے سال، اسی مہینے تم نے میری سوروپے کے نوٹ، اپنے چمک کے بستر کے نیچے چھپا رکھے تھے اور تم ان کے متعلق بالکل جھول گئی تھیں — پھر پر الزام لگایا گیا تھا کہ میں نے چرائے ہیں، آخر میں نے یہی نکاش کر کے نکالے اور تمہارے حوالے کر دیئے۔“

کیا پتہ ہے کہ آپ نے چرائے ہوں اور بعد میں میرے شور مچانے پر اپنی جیب سے نکال کر بستر کے نیچے رکھ دیئے ہوں؟

”میری بکھرئی تمہاری یہ منطق نہیں آتی۔“

”آپ کی بکھرئی تو کوئی چیز ہی نہیں آتی — کل میں نے آپ سے کہا تھا کہ وہی کھانا آپ کے لیے مفید ہے، لیکن آپ نے مجھے ایک کچھلا دیا کہ وہی فضول چیز ہے۔“

”وہی تو میں ہر روز کھاتا ہوں۔“

کھٹا کھانے ہیں۔

”یہی، کوئی آٹھ سیر“

”میں ہر روز سیر منگواتی ہوں۔۔۔ باتی پڑا جبکہ ادا رہتا ہے۔“

”وہی کو جبکہ مارنے کی ضرورت ہے۔۔۔ بروہی جانتا ہے۔ اس کی تم کو کسی بات چنی ہو۔“

”جیس وی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ کڑھی بناتی ہوں تو اس بات کا شہرت ہے کہ میں سیر منگوانا عادت ہوں۔۔۔ میں نے آپ سے سب ادا کیا تھا کہ آپ آج کل ایک خاص پنجابی بولی کیوں ہر وقت گاتے رہتے ہیں۔“

”اس بے کو مجھے پسند ہے۔“

”کیوں پسند ہے؟۔۔۔ اس کی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔“

”تھیں کلا رنگ کیوں پسند ہے۔۔۔ اس کی وجہ بتاؤ۔۔۔ تھیں بھٹیاں مرغوب ہیں۔ کیوں؟

تھیں سینا دیکھنے کا شوق ہے۔۔۔ اس کا جوا پیش کرو۔۔۔ تم مجھے کی بجاتے دیکھ کر اس پر ہنسی ہو اس کی کیا وجہ ہے؟

”آپ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ مجھ سے اس قسم کے سوال کریں۔۔۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔“

”اپنی مرضی کا مالک میں ہوں۔ کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ شوگر بھی مجھے پسند ہو، اپنی بھونڈی آواز میں دن رات گاتا ہوں۔“

”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ لیکن میں سمجھتی ہوں۔۔۔“

”میک کیوں نہیں؟“

”تو دیکھیے۔ آپ میری زبان نہ کھلوائیے۔۔۔ میں نے آج تک آپ کو کچھ نہیں کہا، حالانکہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔“

”تم میرے متعلق کیا جانتی ہو؟“

”سب کچھ۔“

”کچھ مجھے بھی بتا دو، تاکہ میں اپنے متعلق کچھ جان سکوں۔۔۔ میں تو سا اسی سال کے غور و فکر کے بعد ہی اپنے متعلق کچھ

جان نہ سکا۔“

”آپ کو اس پنجابی بولی میں جو آپ مسلسل گنگتاتے رہتے ہیں۔۔۔ سب کچھ جان سکتے ہیں۔“

”تم اس قدر شاک کیوں ہو؟“

”ہر روز بے ہوش ہوتا ہے۔“

”میں نے تم سے کیا بے وفائی کی ہے۔۔۔ اصل میں حکمرانیں جاوے جا اپنے شہروں پر شک کرتی رہتی ہیں۔“

”شہریت۔۔۔ دوا دے پر دستک ہوئی ہے۔۔۔ میرا خیال ہے، ڈاکٹر ہے۔“

”یہ خط میرا ہے — لاؤ اور صر!“
 ”میں کھولتی ہوں — پڑھ کے آپ کے سرائے کر دوں گی۔“

”تھیں میرے خط پڑھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔“

”میں ہمیشہ آپ کے خط پڑھتی رہی ہوں — یہ حق آپ نے کب سے چھین لیا؟“
 ”اچھا یہ بتا دو کہ خط کس کا ہے۔“

”آپ ہی کا ہے؟“

”کس نے لکھا ہے؟“

”آپ کی ایک سہیلی نے — جس کا نام عدنا ہے — وہ پنجابی بولی جو آپ لگاتے پھرتے ہیں اس کاغذ کی پشتانی پر لکھی ہے۔“

میری نگاہیں کسے نہ دیکھی دے — تے ٹنڈی نوں جگ جاندنا

یہ ٹوٹ ہی جائے تو بتر ہے ۔

(۱۵ مئی ۱۹۵۲ء)

آمنہ

تو دیکھ پیٹنے ہوئے دھان کے گہرے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے کانڑاں اور کانڈے گئے ہوئے دھان کے پوائے اٹھا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گا بھی رہا تھا

دھان کے پائے دوسرے دروازے

بھر بھر تھے

کھیت سنوڑا دھان دولت دے۔

”بندو کا باپ بچا، گاؤں میں بہت مقبول تھا۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اس کی بیوی سے بہت پیار ہے۔ ان دونوں کا شوق گاؤں کے ہر شخص کو معلوم تھا۔ ان کے دو بچے تھے ایک بندو جس کی عمر تیرہ برس کے قریب تھی اور سارا جند۔

سب خوش و خرم تھے۔ مگر ایک روز اچانک چمکے کی بیوی پیار پر لگی حالت بہت نازک ہو گئی۔ بہت علاج کیے گئے مگر اٹھا نہ، مگر اُس کو کوئی افادہ نہ ہوا۔ جب مرض ملک ٹھل اختیار کر گیا تو اُس نے اپنے شوہر سے بیعت لیچوں کیا، تم مجھے بھرتی کما کرتے تھے اور خود کو بھرتی ————— ہم دونوں نے دو بچے پیدا کیے ————— اب یہ تمہاری بھرتی مر رہی ہے ————— کہیں جیسا نہ ہو کہ میرے مرنے کے بعد تم کوئی اور بھرتی اپنے گھر لے آؤ۔“

تھوڑی دیر کے بعد اُس بیوی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جتنے آٹھ گھنٹوں سے آفسروں تھے اور اس کی بیوی پولیس میں جا رہی تھی۔ تم بھرتی لے آؤ گے ————— وہ سوچے گی کہ جب تک میرے بچے زندہ ہیں تم اس سے جنت نہیں کرو گے ————— چنانچہ وہ اُن کو ذرا بچ کر لے کھا ہلے گا۔“

جتنے نے یہی بیوی سے بڑے پیار کے ساتھ کہا، لیکن وہیں تم سے وعدہ کیا، مگر ان کی زندگی بھر وہی شادی نہیں کروں گا مگر تمہارے دشمن مرے۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

لیکن کچھ ہفتوں پر مژدہ سی سکلا ہٹ خود مر گئی۔ اس کے فوراً بعد اُس کی تدفین قبرستان صغریٰ سے ہوا اور لڑکی بچا بہت رونا۔ جب اُس نے اپنے ہاتھوں سے اس کو دفن کیا تو اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس نے اپنی زندگی میں سب کچھ لگا دی ہے

اب وہ ہر وقت غم و رنج کا کام کاج میں اُسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ ایک دن اُس کے ایک رفا دار مزار سے اُس سے کہا: ”نیکار بہت دھن سے آپ کی یہ حالت دیکھ رہا ہوں اور آپ کی محنت میں کڑھنک رہی ہوں۔ راج مجھ سے نہیں، آگیا، تو آپ سے عرض کرتے کیا ہوگا؟“ آپ اپنے بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اپنی زمینوں کی حالت کوئی توجہ نہیں دیتے ————— آپ کو اس کا علم بھی نہیں، مگر ان نقصان ہر

ہوتا ہے :

”جتنے بڑی بے قراری سے کہا تمہارے دو — مجھے کسی چیز کا شوق نہیں“

”سہرا — آپ بڑھاپے میں آئے — چاروں طرف دشمنی ہی دشمنی میں ایسا زہر وہ آپ کی فطرت سے فائدہ اٹھا کر آپ کی زمینوں پر قبضہ کر لیں، آپ سے مقدمہ بازی کیا ہوگی — میری تو یہی خواہش تھی کہ آپ دوسری شادی کریں — اس سے آپ کے غم کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور آپ کے لڑکوں سے پرورشیت بھی کرے گی۔“

”مجھے کوہست غصہ آیا۔ بھروسہ نہ کرو وصال ہی تم مجھے نہیں کہ سترہلی ماں کیا ہوتی ہے اس کے علاوہ تم یہ بھی تو سوچو میری بیوی کی رنج کو کتنا بڑا درد پہنچے گا۔“

بہت دنوں کے بعد اس کے بعد از وصال اپنے آقا کو دوسری شادی پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب شادی ہو گئی تو اس نے اپنے دو لڑکوں کو ایک غصہ مکان میں بھیج دیا — ہر روز وہاں کئی کھینٹے رہتا اور چند روز بعد وہی لڑکے تڑپا۔

نئی بیوی کے بات بہت ناگوار گزری۔ ایک بات اور بھی تھی کہ کھنٹوں کو وہ کافر خیر خواہ اس کے سر پہ بیٹھ کر اس کے پاس چلا جاتا تھا اس سے وہ بہت غمی میں کھڑی رہتا کہ اس کے ایک لڑکے کو دیکھ لیں۔

ایک دن جتنا جب کھینٹوں سے وہیں آیا تو اس کی نئی بیوی کو وہ دیکھ لے لی۔ ”جتنے سزاوارہ دیکھی کہ وہ بیوی تو اس نے کہا تم مجھے ہرانا نہیں کہتے — اسی لیے تجھے کو وہ سے مکان میں بھیج دیا میں ان کی ماں جو ان کوئی دشمن تو نہیں ہوں مجھے بہت دکھ رہا ہے۔ جبیں سترہلی میں کہ پہلے سے دیکھ رہے ہیں۔“

”نجان باتوں سے بہت متاثر ہوئی اور دوسرے ہی دن جتنے روز چند دیکھ لے آیا اور انہی کو سترہلی ماں کے حوالے کر دیا جس نے ان کو اتنے ہیاد رحمت سے رکھا کہ اس پاس کے تمام لوگ اس کی تعریف میں روپ اٹھانے لگے۔“

نئی بیوی نے جب اپنے خاوند کے دل کو یہی طرح سمجھ لیا تو ایک دن ایک مرد کو بلا کر اکیلے میں اس سے بڑے دلنما ماز لیمے میں کہا : ”تم سے ایک کام ایسا چاہتی ہوں — جو کرو گے :“

اس خاوند نے اس کا نام شہزادی تھا، اچھا بڑا کرکٹا، سہرا وہ اپنی باپ ہیں — جان تک حاضر ہے :“

”نئی بیوی نے کہا : ”دیکھو، کل دیا کہ اس بہت بڑا میل لگ رہا ہے — میں اپنے سر پہ بیٹھ کر آپ کو قہارے ساتھ بچھوں گی ماں کو کشتی کی سیر کرانا اور کسی نہ کسی طرح جب کوئی اور دیکھتا ہے جو انھیں گھر سے پانی میں ڈبو رہا :“

”شہزادی کی ذہنیت غلامانہ تھی، اس کے علاوہ اس کو بہت بڑے انعام کا لالچ دیا گیا تھا۔ وہ دوسرے روز چند روز بعد دیکھا کہ اپنے ساتھ لے گیا، انھیں کشتی میں بٹھایا، اس کو خود کھینچنی شروع کیا اور اس میں دو رنگ چلا گیا، جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا — اس نے چاہا کہ انھیں دھکا دے کہ ڈوبو، مگر ایک دم اس کا غمیر جاگ اٹھا۔ اس نے سر اٹھا، ان بچوں کا کیا قصور ہے — سوائے اس کے کہ ان کی بی بی اس کی چٹاب سے سترہلی ماں کے غم کو کم پر ہیں، بستر ہی ہے کہ میں انھیں کسی شخص کے حوالے کر دوں اور سترہلی ماں سے جا کر کہ دوں کہ وہ وہاں ڈوب چکے ہیں۔“

دیا کہ سرے کدے اتر کر اُس نے بندو اور چندو کو ایک تاج کے سوا لے کر دیا۔ — جس نے اُن کو غلام رکھ لیا۔
 بڑا دلکش بندو کھیل کر کاحادی، محنت و مشقت سے بہت کھراتا تھا۔ — تاج کے ہاں سے بھاگ نکلا، پیدل چل کر دوسرے
 شہر میں پہنچا، مگر وہاں اُسے ایک صورت مند کی کے ہاں جس کا نام تقدیر بیگ تھا بندہ لینا پڑی، تقدیر بیگ نیک دل آدمی تھا، اُس نے چاہا
 کہ بندو کو اپنے ہاں تو کر رکھ لے چنانچہ اُس نے اُس سے پوچھا: ”خود دار کیا تجھ کو لگے؟“
 بندو نے جواب دیا: ”جناب میں تجھ کو نہیں لوں گا۔“
 تقدیر بیگ کسی قدر حیرت ہوئی، لڑکا شکل و صورت کا اچھا تھا، اس میں گنہگار بھی نہیں تھا، اُس نے پوچھا: ”تم کس خاندان
 کے ہو۔۔۔ کس شہر کے باشندے ہو؟“

بندو نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا، پھر رونے لگا، تقدیر بیگ نے اُس سے مزید استفسار کرنا مناسب نہ
 سمجھا، جب بندو کو اس کے یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تو تقدیر بیگ اُس کی غرض اطواری سے بہت متاثر ہوا، ایک دن اُس
 نے اپنی بیوی سے کہا: ”بندو مجھے بہت پسند ہے۔ میں تو سوچتا ہوں، اس سے اپنی ایک لاکھ بیاہ دوں۔۔۔“
 بیوی کا اپنے خاندان کی یہ بات بُلا لگی، لیکن آخر اس نے کہا: ”آپ سے اس کے خاندان کے تعلق تو دریافت کیجیے۔“
 تقدیر بیگ نے کہا: ”میں نے ایک مرتبہ اُس سے اُس کے خاندان کے تعلق پوچھا تو وہ زار و قطار رونے لگا۔۔۔ پھر میں
 نے اس موضوع پر اُس سے کبھی گفتگو نہیں کی۔“

’بندو کوئی دس تھوڑے ایک کے ہاں رہا۔ جب بیس برس کی ہو گیا تو تقدیر بیگ نے اپنا سارا مال و بار اُس کے سپرد کر دیا، کافی عرصہ
 گزر گیا، ایک دن بندو نے بڑے عذاب سے اپنے آقا سے درخواست کی: ”دیا کے اُس پار دُور جا ایک گاؤں ہے، وہاں میں چھوٹا سا
 مکان بنوا چاہتا ہوں۔۔۔ کیا مجھے آپ اتنا دیر پر محنت فرما سکتے ہیں کہ میری یہ خواہش پوری ہو جائے؟“
 تقدیر بیگ نے اُس کا نام بندو پر یہ چاہو لے سکتے ہو، لیکن یہ جانو کہ تم دیبا یا اتنی دُور مکان کیوں بنوانا چاہتے ہو؟“
 بندو نے جواب دیا: ”تیرا ذات آپ پر مضرب کھل جائے گا۔“

بندو اور چندو کا باپ اپنے بیٹوں کے فراق میں کھل کھل کے مریچکا تھا، فرزندوں کی بڑی باتر حالت تھی، اس بچے کو زمینوں
 کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

بندو، بہت سادہ پسے کر، اپنے گاؤں پہنچا، ایک چمکا مکان بنوایا اور مزدوروں کو خوش سال کر دیا۔
 بندو کا بھائی چندو جس شخص کے ہاں غلام ہوا تھا، اُس نے اُس کو بیٹا بنا لیا تھا، ایک دفعہ وہ خطرناک طور پر بیمار ہو گیا تو
 تو اس شخص کی بیوی نے جس کا نام صدقا تھا، اپنی بیٹی آمنہ سے کہا کہ وہ اُس کی تیمارداری کرے۔
 آمنہ بڑی نازک اندام حسین لڑکی تھی، دن رات اُس نے چندو کی خدمت کی، آخر وہ صحت مند ہو گیا تیمارداری کے اس
 دُور میں وہ کچھ اس طرح کھل لی گئی کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔
 گو چندو سوچتا تھا کہ آمنہ ایک دولت مند کی لڑکی ہے اور وہ محض کنکلا، اُن کا آپس میں کیا جوڑ ہے، اُس کے والدین

جھلکے ان کی شادی پر راضی ہوں گے۔ لیکن آئندہ کسی تقدیر میں تھا کہ اس کے والدین راضی ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ چند کو بڑی اچھی لگا ہوں سے دیکھتے تھے۔

ایک دن چندو گائے بیسنوں کے روڑ کو جو ٹہر پرانی پلار تھا کہ آئندہ رتی ہوئی آئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ نٹھا سا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے خوش خوش چندو سے کہا: ایک بہت اچھی خیر لائی ہوں۔ آج میری ماں بھد باب میری شادی کی بات کر رہے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ اس لیے انھیں میرے ساتھ بیاہ دینا چاہیے۔ چندو اس قدر خوش ہوا کہ اس نے آئندہ کو اٹھا کر ناچنا شروع کر دیا۔

ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام بھیل رکھا گیا۔

جب بندو اپنے گاؤں میں اچھی طرح جم گیا تو اس نے بھائی کا پتہ لیا۔ ہلکے اس سے ۱۵۔ ۲۰ دن بہت خوش ہوئے۔ چندو نے اس سے کہا: اب اللہ کا فضل ہے۔ چلو میرے ساتھ اور واپسی سمجھا لو میں چاہتا ہوں تمھاری شادی اپنی سالی سے کروں۔

— بڑی پیاری لڑکی ہے۔

چندو نے اس کو بتایا کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے۔ سارے حالات سے کہ چندو نے اس کو کھجایا۔ بندو بیگ بنے بندو چندو آئی ہے۔ اس کی لڑکی سے شادی کرو۔ ساری عمر پیش کر دے۔ آئندہ کے باپ کے پاس کیا پڑا ہے؟

چندو اپنے بھائی کے ہاتھ میں کڑا لے گیا۔ اور دولت مند آئندہ کو چھو لیا۔ طلاق نامہ کس کے ہاتھ لگا دیا اور اس سے ملے بغیر چلا گیا۔

چندو کے بعد ہی بندو نے اپنے بھائی کی شادی عقد بیگ کی چھوٹی لڑکی سے کرادی۔ آئندہ حراں و پریشان غمی کڑا کھپا۔ چندو ایک دم کہاں غائب ہو گیا۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ مجھ سے بہت کرتا ہے۔ ایک دن ضرور واپس آجائے گا۔ بڑی دیر اس نے اس کی واپسی کا انتظار کیا اور اس کی یاد میں آئندہ بھائی رہی جب وہ آیا تو آئندہ کے باپ نے میل کو ساتھ لیا اور بندو کے گاؤں پہنچا۔ اس کی ملاقات چندو سے ہوئی۔ وہ دولت کے نشے میں سب کو قبول چکا تھا۔

آئندہ کے باپ نے اس کی بڑی منت سماجت کی اور اس سے کہا: آؤ مجھے نہیں کہ اپنے اس کم بہن بیٹے کا خیال کرو۔ تمھارے بغیر اس بچے کی زندگی کیا ہے؟

چندو نے یہ کراہ کر اب دیا میں اپنی دولت اور عزت اس بچے کے لیے چھوڑ سکتا ہوں؟ — جاؤ اسے لے جاؤ اور میری نظروں سے دور کر دو۔

جب آئندہ کے باپ نے اور زیادہ منت سماجت کی تو چندو نے اس پڑھے کو دھکے دے کر باہر نکلا دیا۔ ساتھ ہی اپنے بچے کو بھی۔

پڑھا باپ غم و اندوہ سے چمکھڑا ہوا۔ آئندہ کو ساری داستان سنادی۔ آئندہ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ بالکل ہو گئی۔

چندو پر پے در پے اتنے مصائب آئے کہ اس کی ساری دولت اُڑ گئی۔ بھائی نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ جیوی لڑکھنڈا

اپنے چکر لگائی اب اُس کو تڑپا دیا۔ وہ اُس سے ملنے کے لیے اس کا بیٹا قریل، بیٹوں کا ٹھکانہ، اس سے گھر کے باہر ملا۔
اُس نے اُس کو پیار کیا اور آہستہ کے ضلع اُس سے پوچھا۔

جیل نے اُس سے کہا، آؤ تمہیں بتانا ہوں، میری ماں آج کل کہاں رہتی ہے۔

وہ اُسے فورے گیا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے یہاں رہتی ہے آہستہ آہستہ۔

(۱۶ مئی ۱۹۵۳ء)

تصویر

”بچے کہاں ہیں؟“

”مر گئے ہیں!“

”سب کے سب؟“

”ہاں، سب کے سب — آپ کو آج ان کے شعلے پر چھنے کا کیا خیال آگیا؟“

”ہیں، آج کا آپ ہوں۔“

”آپ ایسا باپ خدا کے کبھی پیدا ہی نہ ہو۔“

”تم آج اتنی خفا کیوں ہو — میری کجمر میں نہیں آتا، لڑکی میں رتی لڑکی میں ماشہ ہوتا ہی ہو — دفتر سے تھکا کر آیا ہوں اور تم نے میرے رخ شروع کر دی ہے —“

”بستر تھا کہ میں وہاں دفتر ہی میں چلنے کے بجائے آگام کرتا۔“

”پہلے کیا ہوا بھی ہے — آپ آرام طلب ہیں — میں آرام فرما سکتے ہیں۔“

”تمہارا لڑکھائی نہیں چاہئے گا — میرا خیال ہے کہ یہ چیز تمہیں ہمیشہ میں ملی گئی۔“

”میں کتنی ہوں کہ آپ مجھ سے اس قسم کی خرافات نہ بولائیگیے — آپ کے وردوں کا تیرا لڑکی ٹھہل گیا ہے۔“

”یہاں تو سب کچھ ٹھہل گیا ہے — تمہاری وہ جوانی کہاں گئی؟ — میں تو اب ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے سو برس کا بڑھ چکا ہوں۔“

”آپ کے احوال کا ترجمہ ہے — میں نے تو خود کو کبھی عمر رسیدہ محسوس نہیں کیا۔“

”میرے احوال اتنے سیاہ تو نہیں — اور پھر میں تمہارا غور ہر مرتبہ کرتے ہوئے کیا اتنا بھی محسوس نہیں کر سکتا کہ تمہارا شباب اب

”وہ بہ منزلت ہے۔“

”مجھ سے کسی زبان میں گفتگو کیجیے جس کو میں سمجھ سکوں — یہ توجہ نہ مل گیا ہوا۔“

”چھوڑو اسے — آؤ، مجھ کو بیاد رکھنا باتیں کریں۔“

”آپ نے ابھی دیکھی تو کہا تھا کہ آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سو برس کے بڑھے ہیں۔“

”بھئی دل تو مر رہا ہے۔“

”آپ کے دل کو میں کیا کہوں — آپ اسے بدل کتے ہیں، بلکہ سے کوئی بڑھے تو میں ہی کہوں گی کہ سچہ کرایا تک ملتا ہے جو

اس شخص نے اپنے سپرد کردہ کام کو اور دلیلیں کراہے کہ اس میں بہت بھری ہوئی ہے۔ ————— آپ بہت کم کیا جانیں۔ —————
بہت آسرت عورت ہی کہہ سکتی ہے۔

”آج تک کتنی عورتوں نے مردوں سے بہت کم کیا ہے۔ ————— ذرا تیرے کام کو دیکھو۔ ————— ہمیشہ مردوں ہی نے عورتوں سے
بہت کم کیا ہے۔ ————— عورتیں تو ہمیشہ بے وقار ہی ہیں۔“
”جھوٹ۔ ————— اس کا ذوق جھوٹ، اس کا ذوق جھوٹ۔ ————— بے وفائی تو ہمیشہ مردوں نے کی ہے۔“
اور وہ ہر انگشتان کے ارشاد سے ایک کمری عورت کے لیے تختہ و تاج چھوڑا تھا۔ ————— وہ کیا جھوٹی اور فرض
دوستی ہے۔“

”میں ایک مثال پیش کر دی اور مجھ پر صوبہ ڈال دیا۔“
”جی نہیں کہہ سکتی کہ میں نے اس میں کچھ نہیں کیا ہے۔ ————— مردوں کی عورت سے عشق کرنا ہے تو وہ بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ کم بہت
لہجہ جان تو رہا کہ وہ ہے گا، مگر اسے بھروسہ نہ تھا کہ اس میں کچھ نہیں دے گا۔ تم نہیں جانتی ہو مردوں کی عورتوں کو فائدہ پہنچانے کی کتنی
تسلیم جانتی ہیں۔ ————— آپ نے تو کل اناری کا تاج پہنا اور دھڑکی نہیں کھل سکا۔ ————— آخر مجھے ہی زور لگا کر کھولنا پڑا۔“
”دیکھو، جانم۔ ————— تم زیادتی کر رہی ہو۔ ————— تمہیں معلوم ہے کہ میرے دل میں ہاتھوں میں رکھا اور دھڑکیاں اُس دن وہ فتنہ
نہیں کیا تھا اور سارا دن اور ساری رات پڑا اور ہاتھ رہا تھا۔ ————— تم نے یہ کوئی خیال نہ کیا اور اپنی سیڑیوں کے ساتھ سینہ دیکھنے سے گریز کیا۔“
”آپ تو ہمارے رہے تھے۔“

”کامیاب۔ ————— یعنی میں ہمارے کام کو دھڑکیاں دے کے اسے میرا مال ہو رہا ہے اور تم کتنی ہو کہ میں ہمارے کام کو دھڑکیاں دے۔“
”معت جلد ہی زندہ کی۔“

”یہ معت مجھ پر بھی گئی ہے۔“
”تمہاری عقل پر تو چھڑ گئے ہیں۔ ————— میں اپنی زندگی کا دھڑکا دے رہا تھا۔“
”آپ تو بہت دھڑکتے ہی رہتے ہیں۔“

”تم تو سنستی رہتی ہو۔ ————— اس لیے کہ تمہیں کسی کی پروا ہی نہیں۔ ————— بچتے جاتیں، ہم میں۔ ————— میرا جنازہ نکل جائے۔ ————— یہ مکان
بل کر رکھ ہو جائے، مگر تم ہنستی رہو گی۔ ————— اس لیے کہ عورت میں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔“
”کتنی عورتیں دیکھی ہیں آپ نے اب تک؟“

”جہازوں، لاکھوں۔ ————— سڑکوں پر تو آج کل عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں۔“

”جھوٹ نہ بولے۔ ————— آپ نے کوئی نہ کوئی عورت خاص طور پر دیکھی ہے۔“

”خاص طور پر سے تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”میں آپ کے دادا کو دیکھنا نہیں چاہتی۔ ————— میں اب بڑی ہوں۔“

”کہاں؟“

”ایک سیٹی کے پناہ — اُس سے اپنا دکھڑا بیان کروں گی۔ خود دلوں کی، اُس کو بھی رلاؤں گی — اس طرح کچھ ہی ہلکا ہو جائے گا۔“

وہ دکھڑا جو تھیں اپنی سیٹی سے بیان کرنا ہے، مجھے ہی بتا دو — میں تمہارے نظم میں شریک ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔“

”آپ کے وعدے؟ — مجھی ایسا ہونے ہیں؟“

”تم بہت زیادتی کر رہی ہو — میں نے آج تک تم سے بڑی وعدہ کیا یا کیا — ابھی پچھلے دنوں تم نے مجھ سے کہا کہ چلے گا ایک سیٹ لا دو — میں نے ایک دوست سے دوپہے عرض لے کر بہت عمدہ سیٹ خرید کر تھیں لا دیا۔“

”بڑا احسان کیا بھری — وہ تو دراصل آپ اپنے دوستوں کے لیے لائے تھے — اُس میں سے دو پیسے کس نے کرٹسے تھے؟ فوراً یہ تو بتائیے؟“

”ایک پیسہ تمہارے بڑے لٹکے نے توڑا — دوسرا تمہاری چھوٹی بچی نے۔“

”سارا الزام آپ ہمیشہ انھیں پر دھرتے ہیں — اچھا اب یہ بحث بند ہو — مجھے نہادھو کر کپڑے پہناؤ بڑا کرنا ہے۔“

”دیکھو میں نے آج تک کسی گنت گیری نہیں کی میں ہمیشہ تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آتا رہا ہوں، مگر آج میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ باہر نہیں جاسکتیں۔“

”ابھی داہ — بڑے آئے، بچہ پر حکم چلانے والے — آپ ہیں کون؟“

”اتنی جلدی بھول گئی ہو — میں تمہارا خاوند ہوں۔“

”میں نہیں جانتی، خاوند کیا بڑتا ہے — میں اپنی مرضی کی مانگ ہوں — میں پہر جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔“

”ہوں، مجھے کون روکتا ہے۔“

”تم نہیں جاؤ گی — بس یہ فیصلہ ہے۔“

”فیصلہ اب عدالت ہی کرے گی۔“

”عدالت کا یہاں کیا سوال پیدا ہوتا ہے — میری سمجھ میں نہیں آتا، آج تم کہیں آؤ، پٹانگ باتیں کر رہی ہو۔“

”تک کی بات کرو — جاؤ خالوتا کہ تمہارا دامغ کس حد تک ٹھنڈا ہو جائے۔“

”آپ کے ساتھ رہ کر میں تو سرست پیر تک ہوتی ہوں۔“

کوئی علت، اپنے خاندان سے غرض نہیں ہوتی، خواہ وہ بچہ، کہتا ہی شریعت کیوں نہ ہو — اُس میں کیشے ڈھانڈو

کی سرشت میں داخل ہے — میں نے تمہاری کئی خطا میں اور غلطیاں معاف کی ہیں۔“

”میں نے خدا خیراتہ کوئی سی خطا کی ہے؟“

”پچھلے برس تم نے ظلم کی شب دیگ بڑے ٹھاٹ سے چکانے کا ارادہ کیا — شام کو پٹھے پر بٹھایا رکھ کر کہا میں سو رہی کہ جس

اٹھ کر جب میں باورچی خانے میں گیا تو دیکھا کہ کچہرچی میں سارے ظلم کو گے بنے ہوئے ہیں۔ — اسی کو نکال کر میں نے انجینئر مسگانی اور پائے تیار کی۔ — تم سو رہی تھیں۔“

”میں نے بکواس مٹھنے کے لیے تیار نہیں۔“

”اس لیے کہ اس میں جھوٹ کا ایک ذرہ بھی نہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ طاقت کو کچ اور حقیقت سے کیوں بڑھ ہے۔ میں اگر کہ دوں کہ تمہارا بایاں گال تمہارے دائیں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ مرٹا ہے، تو شاید تم مجھے ساری عمر بھٹو — گریح حقیقت ہے، مجھے شاید تم بھی ایسی طرح محسوس کرتی ہو۔ — دیکھو میری دیش وہیں دکھ دو۔ — اٹھا کے میرے سر پر ہے، اور تمہارا تھنول جو جائے گا۔“

”میں نے میری دیش اس لیے اٹھایا تھا کہ آپ کے چہرے کے عین مطابق ہے۔ — اس کے اندر جو ہمارے بیٹے سے ہیں، وہ آپ کی آنکھیں ہیں۔ — اور یہ جو لال سی چیز ہے، وہ آپ کی ناک ہے، جو ہمیشہ شرمناک رہتی ہے۔ — میں نے جب آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو مجھے ویسا لگا تھا جیسے آپ کی آنکھوں کے نیچے جو گائے کی آنکھیں ہیں، ایک کو کرورج اور دوسرے کو بڑھتا ہے۔“

”تمہارا جی ہلکا ہو گیا؟“

”میرا جی کبھی ہلکا نہیں ہوگا۔ — مجھے آپ جانے دیجیو۔ — نانا دھو کر میں شاید یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں۔“

”جانے سے پہلے یہ تو بتا بناؤ کہ یہ جانا کس بناؤ ہے؟“

”میں بتانا نہیں چاہتی۔ — آپ تو اولاد کے بے خرم ہیں۔“

”بھئی، تمہاری اس ساری گفتگو کا مطلب ایسی ناکسیری سمجھ میں نہیں آیا۔ — معلوم نہیں، تمہیں مجھ سے کیا شکایت ایک دم پیدا ہو گئی ہے۔“

”تو اپنے کوٹ کی اندونی جیب میں ہاتھ ڈالیے۔“

”میرا کوٹ کہاں ہے؟“

”لاقی ہوں۔ — لاتی ہوں۔“

”میرے کوٹ میں کیا ہو سکتا ہے۔ — رکن کی بڑائی تھی۔ — وہ تو میں نے باہر خیمہ کے کسے پیسک دی تھی۔ — دیکھو، ہو سکتا ہے رو گئی ہو۔“

”بیجے، آپ کا کوٹ یہ رہا۔“

”آپ میں کیا کروں؟“

”اس کی اندکی جیب میں ہاتھ ڈالیے۔ — اور اس ملاکی کی تصویر نکال لیں جس سے آپ آجکل مشتق ہوا رہے ہیں۔“

”تو اولاد۔ — تم نے میرے اوسان نکال کر دیے تھے۔ — یہ تصویر میری جان، میری بہن کی ہے جس کو تم نے ابھی تک نہیں دیکھا۔“

”افریقہ میں ہے۔ — تم نے یہ خط نہیں دیکھا۔ — ساتھ ہی تو تھا۔ — یہ لو۔“

”ہائے، کتنی خوبصورت لڑکی ہے۔ — میرے بھائی جان کے لیے بالکل شیک رہے گی۔“

۱۸ مئی ۱۹۵۲ء

ملاوٹ

امرت سر میں اعلیٰ عمر کی مناری کی دکان تھی۔ چھوٹی سی، مگر اس میں ہر چیز موجود تھی، اُس نے پچھرا سقرینے سے سامان دکھا تھا کہ ٹھنسا ٹھنسا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

امرت سر میں دوسرے دکاندار بیک کرتے تھے، مگر اعلیٰ عمر کی منار پر اپنا مال فروخت کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ لوگ قدر و قدر سے اُس کے پاس آتے اور اپنی ضرورت کے چیزیں خرید کرتے۔

وہ فربہ کی قسم کا اعلیٰ تھا، زیادہ منافع لینا اس کے نزدیک گناہ تھا۔ کہلی جان تھی، اس کے بے جا رونا فغا ہی کافی تھا۔ سداوی دکان پر بیٹھا گا بکوں کی بیڑ لگی رہتی، اُس کو بعض اوقات اسوس جتنا جب وہ کسی گاہک کو سٹاکٹ صلا کی ایک ٹیکہ نہ دے سکتا، یا کہلی فربہ کی بولی کی زل۔ مگر کبھی چیزیں اُسے محدود تعداد میں ملتی تھیں۔

بیک رنگ کے بارہو فروکش حال تھا، اس نے دو خیر روپے ہیں، انکار کرتے تھے جہاں تھا۔ ایک سو دو دکان پر بیٹھے تھے، اس نے سر پر کراب شادی کر مٹی چابیے۔ بڑے بڑے خیال مند غ میں آتے ہیں۔ شاوی کروں گے، ان کی اس لطافت پیدا ہو جائے گی، بال بچے ہوں گے، اُن کی پردوش کے لیے میں اور زیادہ مکافعتی کرشش کروں گا۔

اُس کے والدین حرم ہوا، اللہ کو یاد ہے ہر جگہ تھے، اُس کی کوئی بہن تھی نہ بھائی۔ وہ بالکل کیلا تھا، شروع شروع میں جب کہ وہ دس برس کا تھا، اُس نے اختیار نیچے شروع کیے، اُس کے بعد خراج نڈر لگا، افسوس! اب بھی جب اُس کے پاس ایک ہزار روپے جمع ہو گئے، اُس نے ایک چھوٹی سی دکان کرا لیے، پرے لی اور مناری کا سامان خرید کر بیٹھ گیا۔

اُن کی یاد انداز تھا، اُس کی دکان تھوڑے ہی عرصے میں بولی نکلی۔ جہاں ایک سو دوں کا تعلق تھا، وہ اس سے بے فکر تھا، مگر وہ چاہتا تھا، گھر لے لے، اس کی جڑی ہو، نیچے ہوں، اوروہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ مکافعتی کرشش کرے۔ اس لیے کہ اُس کی زندگی خیر میں ہی رہی تھی، صبح دکان کھولنا گاہک آتے، اُنھیں سزا دیتا، شام کو دکان بند کرتا، اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں جہاں نے شریفیت پیدا ہوئی، بے شک تھی، سرجانا۔

مجھے کاہر ملی تھا، اس میں وہ کھانا کھاتا، صوف ایک وقت۔ صبح ناشتہ جھیل گھسے کے کٹورے میں شادبے سلا کی کی دکان میں کرتا تھا، کھوتا اور شام تک اپنی گوی پر بیٹھا رہتا۔

اس کے بعد شاوی کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ لیکن سہاوی یہ تھا کہ اس معاملے میں اس کی مدد کوں کرے، اور سر میں اُس کا کوئی دوست یا راجی نہیں تھا جو اُس کے لیے کرشش کرتا۔

وہ بہت پریشان تھا، شریف پورہ کی کوٹھڑی میں رات کو سوتے وقت وہ کچھ ترسہ دیا کہ اس کے اس باپ اتنی جلدی کیوں کرتے۔
انہیں اور کچھ نہیں تو اس لیے ضرور زندہ رہنا چاہیے تھا کہ وہ اس کی شادی کا بندوبست کر جائیں۔

اس کی بھوسہ میں اس آقا تھا کہ وہ شادی کیسے کرے۔ بہت بڑبڑک سوچتا رہا۔ اس کو دیکھیں اس کے پاس تو میں ہزار روپے جمع ہو گئے۔ اُس نے ایک چھوٹے سے گھر کو جو اچھا خاصا تھا کرایہ پر لے لیا مگر تھکا مخریفہ پرے ہی میں تھا۔

ایک دن اُس نے اخبار میں ایک اشتہار دیکھا جس میں لکھا تھا کہ شادی کے خواہش مند حضرات ہم سے رجوع کریں۔ بی۔ اے۔ پاس کیا بیڈی ٹاکٹر، ہر قسم کے رشتے موجود ہیں، خط و کتابت کیجیے یا خود آکر ملے۔

اتوار کو وہ مکان نہیں کھوٹا تھا، اُس دن وہ اُس پتھر پر گیا اور اُس کی ملاقات ایک دائرگی والے بزرگ سے ہوئی۔ علی گڑھ پانا معاہدہ کیا۔ دائرگی والے بزرگ نے بیز کا دروازہ کھولی کہ میں تمہیں تصویریں دکھائیں وہ اس کو ایک ایک کر کے دکھائیں کہ وہ ان میں سے کوئی پسند کرے۔

ایک لڑکی کی تصویر ملی تو کہہ دیا کہ پسند آتی۔ چھوٹی عمر کی اور خوبصورت تھی۔ اُس نے شادیاں کرانے والے ریجنٹ سے کہا: جناب — یہ لڑکی مجھے پسند ہے۔

ریجنٹ نے مسکرایا، تم نے ایک بڑی سچی لیا ہے۔

علی گڑھ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ لڑکی اُس کی آنکھ میں ہے۔ اس نے گھٹنا شروع کر دیا۔ تمہیں — جناب آپ بات کہی کر دیجیے۔
ریجنٹ سمجھ بھول گیا، وہ کھو بھر ہزار — یہ لڑکی تم نے سچی ہے، ملائے حسین ہونے کے بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن تم سے زیادہ نہیں نہیں مانگوں گا۔

آپ کو کئی فوائد ہیں — میں تم پر کام کروں گا۔ آپ کو ساری عمر اپنا باپ کہوں گا۔
ریجنٹ کے ہاتھوں میں جو بڑی بڑی مسکراہٹ نمودار ہوئی، جیسے درجہ — میں تم سے صرف تین سو روپے نہیں لوں گا۔
علی گڑھ نے بڑے خوشگوارہ لہجے میں کہا: جناب کا بہت بہت شکریہ — مجھے منظور ہے۔

یہ کہہ کر اُس نے عجیب سے تین نوٹ سو سو روپے کے نکالے اور اُس بزرگ کو دے دیے۔

تاریخ تقریر ہو گئی، علاج ہوا، مریض بھی ہوئی۔ علی گڑھ نے وہ پچھڑا سا مکان کرایہ پر لے لیا تھا، اب وہ اس میں بڑے چارے سے اپنی زندگی کے کر آیا، پہلی رات کا قصہ معلوم نہیں اس کے دل دوا میں کس قسم کا تھا، مگر جب اُس نے وہیں کو گھر گھٹ کا پختہ ہاتھوں سے اٹھایا تو اُس کو خوش سا آگیا۔

نہایت بد شکل حالت تھی — صریحاً اس مرد بزرگ نے اُس کے ساتھ دھوکا کیا تھا، علی گڑھ اور کھڑا کرے سے باز نہ آ گیا اور شریف پورہ جا کر اپنی کوٹھڑی میں بڑبڑک سوچتا رہا کہ یہ بھوکا ہے۔ لیکن اس کی بھوسہ کچھ بھی نہ آتا۔

اُس نے اپنی دکان نہ کھولی — وہ ہزار روپے وہ اپنی بھری کاسی میں لے کر آیا تھا تین سو روپے اُس ریجنٹ کو دے کر اُس کے پاس صرف سات سو روپے تھے — وہ اس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ اُس نے سوچا شہر ہی چھوڑ دے۔ ساری رات جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ آخر

اُس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ صبح دس بجے اُس نے اپنی دکان ایک شخص کے پاس پانچ ہونے والے میں بیٹھنے والے دھولے بچے کی ہڈی نکالتے ہوئے دیکھا۔

اور جاتے ہوئے گاڑی میں کسی جیب کترے نے بڑی معافی سے اُس کے تمام روپے غائب کر دیے۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ لیکن اُس نے سوچا کہ شاید خدا کو کچھ منظور تھا۔

اور سچے سچے اُس کی دوسری جیب میں ایک تھری شیل گولی تھی صوف دس روپے اور گیارہ گانے تھے۔ اس سے اُس نے چند روز گزار دیے لیکن بعد میں خاتون کی قربت آ گئی۔

اس دوران میں اُس نے کہیں نہ کہیں ملازم ہونے کی بہت کوشش کی، مگر کام نہ ہوا۔ وہ اس تعداد میں ہو گیا کہ اُس نے خود کوئی کام نہ کر لیا، مگر اُس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ اس کے باوجود ایک رات وہ ریل کی ٹیڑھی پر بیٹھ گیا۔ ٹرین آ رہی تھی مگر کاشا بدلا اور وہ دوسری گاڑی پر چڑھ گیا۔ اُسے ادھر ہی جانا تھا۔

اس نے سوچا کہ رات بھی دھوکا دے جاتی ہے، چنانچہ اُس نے خود کو کٹی کا خیال چھوڑ دیا اور جلدی اور چھپ چھپنے والی ایک گاڑی میں بیٹھ کر دوبارہ پر طاقت اختیار کر لی۔

یہاں سے پہلے ہی وہ معلوم ہو گیا کہ دنیا دھوکا ہی دھوکا ہے۔ جلدی ٹرین پٹری کی کھٹ کی جاتی تھی، اور چروں میں سُرخ انٹرن کی۔ وہ برس تک وہاں چلی میں کام کرتا رہا۔ اُس کا نام کبھی نہ پڑا۔ وہاں کے تمام سوداگر اُس کا نام نہ پڑا۔ وہاں کے تمام سوداگر اُس کا نام نہ پڑا۔ وہاں کے تمام سوداگر اُس کا نام نہ پڑا۔

پس انداز کر لیے تھے۔ ایک دن اُس نے سوچا کہ جب ساری دنیا میں غریب ہی غریب ہے، تو وہ بھی کیوں نہ غریب کرے۔

اس نے چند ایک ٹھکانے پر جا کر اُس میں چروں اور جلدی میں کھٹ کا کام شروع کر دیا۔ اُس کی آمد و رفت کافی مختل تھی۔ اُس کو شادی کا کتنی بد خیال کیا، مگر جب اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کی رات کا نقشہ آیا تو وہ کانپ کانپ گیا۔

مٹی اور غول تھا۔ اُس نے غریب کاری پر ہی طرح سیکھ لی تھی۔ اُس کو اب اس کے تمام گھر و ملوٹ پر گھٹتے۔ ایک میں مال چروں میں کتنی انڈیاں پھینچی چاہئیں، جلدی میں کتنی دھوکا کی مٹی ڈالنی چاہیے اور پھر وہاں کا حساب یہ ہے کہ اُس کو کتنی طرح معلوم تھا۔

لیکن ایک دن اُس کی ہڈی پر پڑی اس کا چھاپا پڑا جلدی اور چروں کے غرنے والوں میں شامل کر دینا چاہیے تھے۔ اور جب کبھی اگر مینٹر کی دھڑکتی آواز میں کھٹ ہے تو اُسے گرفتار کر لیا گیا۔

اُس کا کام میں کون تھا جو اُس کی ضمانت دیتا۔ کئی دن عداوت میں بند رہا۔ آخر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور اُس کو تیس سو روپے پر مجرمانہ اور ایک مہینے کی قید با مشقت کی سزا دی۔

جڑانہ تو اُس نے ۱۱ کر دیا، لیکن ایک مہینے کی قید با مشقت اُسے جھگڑائی پڑی۔ یہ ایک عینہ اُس کی زندگی بہت کڑا اور کٹھن تھا۔ اس دوران میں وہ اکثر سوچتا تھا کہ اُس نے بے وفائی کیوں کی، جب کہ اُس نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنالیا تھا کہ وہ کبھی غریب کاری نہیں کرے گا۔

پھر وہ پرموچنا کا اُسے اپنی زندگی ختم کر دینی چاہیے، اس لیے کہ وہ ادھر کا رہاؤ دھوکا اُس کا گوارہ مضبوط نہیں ہے۔

کو مر جائے تاکہ اس کا ذہنی اضطراب ختم ہو۔

جب وہ بیل سے باہر نکلا تو وہ مضبوط ارادہ کرچکا تھا کہ خودکشی کرے تاکہ سارا بوجھٹ ہی ختم ہو۔ اس غرض کے لیے اُس نے سات روز فوری کی اور دو تین روپے اپنا ریٹ کاٹ کر جمع کیے اس کے بعد اُس نے سربا کوئی ساڑھے چار کلو کارآمد جو سکا تھا اُس نے مریت ایک ہی ذہن کا نام لٹا تھا جو بڑا فائدہ تھا ہے۔ — سکھیا۔ مگر یہ سکھیا کہاں سے ملتی؟ اُس نے بہت کوشش کی۔ آخر اسے ایک ٹوکراں سے سکھیا مل گئی اُس نے عشاء کی نماز پڑھی۔ غصہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی کہ وہ بھری دھڑچوں میں غلط کرتا رہا۔ پھر بات کو سکھیا کھائی اور فٹ پاتھر پر سو گیا۔

اُس نے سنا تھا سکھیا کھانے والوں کے منہ سے جھانک نکلتے ہیں، فطرتی کے طور سے پڑتے ہیں۔ ہمارے ہوتا ہے۔ مگر اُسے کچھ بھی نہ ہوا۔ ساری رات وہ اپنی مریت کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آئی

صبح اٹھ کر وہ اُس دکاندار کے پاس گیا، جس سے اس نے سکھیا خریدی تھی اور اُس سے پوچھا، بھائی صاحب، یہ آپ نے مجھے کیسی سکھیا دی ہے کہ میں ابھی تک نہیں مر رہا۔

دکاندار نے آہ بھر کے بڑے انصاف سے لہجے میں کہا، کیا کموں میرے بھائی — آج کل ہر چیز نقل و نقل ہے — یا اُس میں غلطی ہوئی ہے۔

۱۹ مئی ۱۹۵۲ء

بس اسٹینڈ

دو بس اسٹینڈ کے پاس کھڑی اسے ٹوٹ والی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے پاس کچھ روکھڑے تھے۔ ان میں ایک اُسے بہت بُری طرح گھور رہا تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ شخص برسے سے اُس کے دل و دماغ میں چھید بند ہے۔

اُس کی فریسی ٹیس بائس برس کی ہوگی۔ لیکن اس پختہ سالی کے باوجود وہ بہت گھرا ہوا ہی تھی۔ جاتوں کے دن نئے پر اس کے باوجود اُس کے کئی مرتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پڑھتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ بس اسٹینڈ سے چل جائے۔ کرائی ہوگا۔ بے۔ یا واپس اپنی سیٹل کے پاس چلی جائے۔

اس کی یہ سیٹل کئی نئی نئی تھی۔ ایک پارٹی میں ان کی ملاقات ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی گردیدہ ہو گئیں۔ یہ پہلی بار تھی کہ وہ اپنی اس نئی سیٹل کے علاوہ برسے پر اُس کے گھرائی تھی۔

تو کہہ دیا تھا۔ مگر جب اس سیٹل نے اتنا اصرار کیا تھا، تو وہ اکیلے ہی اُس کے پاس چلی گئی۔ دو گھنٹے میں گپ ٹرائی ہیں۔ پُراقت برسے دے دیں گے۔ اُس کی سیٹل جس مقام شادہ تھا، اس سے جاتے وقت کہا۔ سلی اب تصادی شادی ہو جاتی ہے۔

سلی شادی گئی۔ کیس بائیں کرتی ہو شادہ — مجھے شادی نہیں کرانا ہے۔

”تو کیا ساری عمر گھمراہی رہو گی۔“

”گھمراہی رہنے میں کیا حرج ہے۔“

شادہ مسکائی۔ میں بھی یہی کہہ کرتی تھی۔ لیکن جب شادی ہو گئی تو دنیا کی تمام نقوش بھی پر آشکار ہو گئیں۔ — یہی تو عمر ہے۔ سب دیکھ لے۔ یہی طرح شادی کی لحاظاتوں سے حلقہ انداز ہو سکتا ہے۔ — تم میرا کہاؤ۔ — بس ایک دو بیٹے کے اندر دو دھن ہی جاؤ۔ — تھا۔ ہے ہاتھوں میں مندی میں غور رکھو گی۔

”بہنو! اس پچھڑائی کو۔“

شادہ نے سلی کے گال پر ہلکی سی بہت لگائی۔ یہ پچھڑائی ہے؟ — اگر یہ پچھڑائی ہے تو ساری دنیا پچھڑائی ہے۔ — دوا و عیت کو شریعت بھی فضول ہے۔ — میری گھمراہی نہیں آتا کہ تم ایک ذلی اور راجہ ہی دھتے سے منکر کیوں ہو؟ — دیکھو گی کہ تم نے بیٹے کیسے زندہ رہو گی۔ — خدا کی قسم بال ہر جاؤ گی۔ — بالکل؟

اچھا ہے جو بال ہر جاؤں۔ کیا بالوں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ — اتنے سارے بال ہیں۔ مگر وہ تو میری انہی۔ ہے جس نے۔

”جوں توں بیچے میں کیا مزا ہے پیاری سلی — میں تم سے کتنی ہوں کہ جب سے میری شادی ہوتی ہے میری گایابی پلٹ گئی ہے۔“ یہ (خاندانہ) بہت پیار کرتے والا ہے۔
”کیا کام کرتے ہیں؟“

”مجھ صاحبت کرتے ہیں۔ یہی ان کام ہے۔“ کاویا بہت کہہ ہے۔ — میرا ہاتھ انھوں نے کبھی تنگ ہونے نہیں دیا۔
”سلی نے یوں محسوس کیا کہ اس کا دل تنگ ہو گیا ہے۔“ شاہدہ مجھے غلط نہ کہو مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔ مجھے وہاں نفرت ہے۔
”کیوں؟“
”بس ہے۔“

”آپ میں تم سے کیا کموں۔ مردوں سے مجھے بھی نفرت تھی، لیکن جب میری شادی ہوئی اور مجھ سے میرے خاندانہ نے پیار محبت کیا تو میں نے پہلی مرتبہ جان کر مردانہ محبت کے لیے کتنا لازمی ہے۔“
”ہمارے — مجھے اُس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

شاہدہ ہنس سلی، ایک دن تم ضرور اس بات کی مثال بر ملاؤ گی، کہ مردانہ محبت کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بغیر وہ ایسی گاڑی ہے جس کے بیچے نہ ہوں۔ میری شادی کر لیگ برس بچا ہے۔ اس ایک برس میں مجھے جتنی ستر تیں اور ساتھیں میرے خاندانہ نے پہنائی ہیں، یہ بیان نہیں کر سکتی۔ خدا کی قسم وہ فرشتہ ہے۔ فرشتہ۔ مگر یہ جان چھوڑنا ہے۔“

”سلی نے یہ سن کر یوں محسوس کیا کہ جیسے اُس کے سر پر فرشتوں کے پر نظر پڑا رہے ہیں۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ شاید مردانہ محبت کے لیے لازمی ہی ہو۔ لیکن فوراً بعد اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اُس کی نقل نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔ مردانہ ضرورت ہی کیا ہے؟۔ کیا عورت اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔“

جیسا کہ شاہدہ نے اُس کو بتایا تھا کہ اُس کا شوہر بہت پیار کرنے والا ہے، بہت نیک خلعت ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت تو نہیں ہوتا کہ وہ شاہدہ کے لیے لازمی تھا۔

”سلی، جیسے تھی، ابھر ابھر کر، ابھرے ابھراؤں، کشادہ پیشانی، گھٹنوں تک لمبے کالے بال، ستواں ناک اور اس کی پینٹنگ پر ایک سلی۔“

جب وہ اپنی سلی سے اجازت مانگ کر غسل خانے میں گئی تو اُس نے اپنے سینے میں خود کو بڑے غم سے دیکھا، اور اسے بڑی الجھی محسوس ہوئی، جیسے اُس نے سوچا کہ خیر، یہ شخص، یہاں جاکر کس لیے ہیں۔ قدرت کی ساری کارگر مانی اکارت، بدلی ہے۔

”گنیم پیدا ہوا ہے۔“ تو وہی اس سے اپنے پیش پاتے ہیں۔ اس کی جوانی بھی تو کسی کیمت میں آگئی تھی۔ اگڑے سے کوئی کھانے کا نہیں، تو لگ بھگ نہیں چلنے لگی؟

وہ بہت درد تک غسل خانے میں اپنے کے سامنے سر جھکی، یہی اُس کے ذہن میں اُس کی سسلی کی تمام باتیں گونج رہی تھیں۔
”مردانہ محبت کے لیے بہت ضروری ہے۔“

اس کا خاندان اس سے بہت زیادہ گناہ ہے۔

وہ فرشتہ ہے۔

سکھائی ایک لمحے کے لیے محسوس کیا کہ اُس کی شہرہ اور اس کا دور پہ فرشتوں کے زیرِ نگین تھے۔ وہ گھر گئی اور پھر یہ انداز ہو کر پھر نکلی گئی۔

باہر آ کر اُس کے سر میں کھسکیاں جھینکا، وہی قیاس سہلی کو ایسا نکال کر یہ بھی فرشتے ہیں جو ہمیں بدل کر آئے ہیں۔

پھر جب اُس کی سہلی رنج کو کھنٹی سے لٹھوہ باغ میں اُس نے گئی اور وہاں اُس نے چن چنکیاں دیکھیں، کوہو بھی اُسے فرشتے دکھائی

دے۔ — بلکہ اُس نے کئی مرتبہ سوچا کہ ایسے رنگیں اور ایسے نقشے مٹے فرشتے کیسے ہو سکتے ہیں۔

اُسے بہت دیر تک فرشتے ہی فرشتے دکھائی دیتے رہے۔ جو اُس کے قریب آتے، اُس سے زیادہ کہتے، اُس کا سر جڑتے، اُس کے

پیسے پر ہاتھ پھرتے، جس سے اُس کو بڑی راحت ملتی، بلکہ ان فرشتوں کے ہاتھ بڑی تندہی سے ایک طرف جھٹک دیتی اور اُن کے کئی جوتے

چلے جاؤ یہاں سے۔ — تمہارا گھر تو آسمان پر ہے۔ — یہاں کیا کرنے آئے ہو؟

وہ فرشتے اُس سے کہتے، ہم فرشتے نہیں۔ حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ وہی بزرگ جو رحمت سے نکالے گئے تھے۔ پر ہم

نقص پھر رحمت میں رہنا چاہتے کا وعدہ کرتے ہیں۔ چلو ملے ساتھ۔ وہاں دودھ کی خوری بھی ہیں، اور صند کی بھی۔

سہلی نے اُن محسوس کیا کہ اُس کے پیٹ میں سے دودھ کے نقشے مٹنے شروع ہو گئے ہیں اور کچھ ہوشِ شمس میں بیٹھ رہے ہیں۔

شاید وہ اس سے بار بار اپنے خاندان کی تعریف کرتی، اصل میں اُس کا مدعا یہ تھا کہ اُس کے بھائی کے ساتھ سہلی کا رشتہ قائم کرے۔

گو گھر پر یہ پہلی حکمت تھی، اس لیے وہ کھنٹی کے بات نہ کر سکی۔ بہر حال اُس نے اطمینان کیا اور میں کئی پر یہ واضح کر دیا کہ اُس کا نواز جو بہت شریف

اور رحمت کرنے والا آدمی ہے، اُس کا بھائی اس سے ملے گا کہیں زیادہ شریف انھیں ہے۔

سہلی نے یہ یاد دلوا دیا کہ اُس کے والدین نے اُس سے صرف اتنا کہہ دیا تھا کہ اُس کے دل میں کئی شریف آدمیوں کا مدعا

ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ انھیں ایسا خاندان مل گیا جہاں ہر آدمی نیک اور شریف ہے۔

اُس سے کہ اس وقت میرے خاندان گھر میں موجود نہیں، وہاں میں تم سے انھیں ضرور ملاتی۔

”بھئی پھر سہلی — کیا کام کرتے ہیں؟“

”اے، انھیں کیا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ — لاکھوں روپے کا جائیداد ہے۔ — مکانوں اور دکانوں سے گزری ہوئی بیٹھو

بزرگ کے قریب وصول ہو جاتا ہے۔ — اس کے علاوہ اشاء اللہ زمینیں ہیں۔ وہاں کی آمدن اٹک ہے۔ — اناج کی کوئی وقت نہیں

— منوں گندم گھر میں پڑا رہتا ہے۔ — چاول بھی — ہر قسم کی ترکاری بھی ہر وقت میسر ہو سکتی ہے۔ — اللہ کا ہوا فضل کم

ہے۔ — اُن کا چھوٹا بھائی جو آج کل لندن میں ہے، نہایت کے صنعت کار ہے کیا میسر رہا ہے۔ — ایک بیٹے تک وہاں رہا ہے

— وہ اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں زیادہ خوشصورت ہے۔ — تم اُسے دیکھو گی۔ — تو —

سہلی نے گھبراتے ہوئے بھی میں کہا اُن، ہاں۔ — جب وہ آئیں گے تو اُن سے ملے گا اتفاق ہو جائے گا؟

شاید وہ نے کتا پڑا شریف لڑکا ہے۔ — بالکل اپنے بڑے بھائی کی مانند۔

بھی ہاں — خیر، آخر طریقہ خانہ خان سے تعلق ہے ۔
تو ہنس آئے ہی رہا ہے — تم مجھے اپنی ایک تصویر رو سے دو :
”کیا کرو گی ؟“

”بس شہر تلکے چائے کروں گی۔“

یہ کہہ کر شاہد نے سٹوکی کا منہ چوم لیا اور پھر اپنے خاندان کی تعریفیں شروع کر دیں۔ سٹوکی تلک آگئی، اُس نے تصویر ڈیر کے بعد
کوئی سناہ بنا کر شخصیت چاہی اور بس اسٹیٹ پر پہنچ گئی، جہاں اُس نے دوپٹ لٹی میں بیڑا بٹھائی۔

وہ جب وہاں پہنچی تو ایک مرنے والے سے بہت بُری نگاہوں سے گفتگو ناشروع کر دیا — وہ پریشانی ہو گئی۔ چاٹوں کے منہ
تھے، مگر اُس نے کئی مرتبہ اپنی پریشانی سے پسینہ پونچھا۔

اسٹیٹ پر ایک بس آئی، اُس نے اُس کا خبر نہ دیکھا اور جب چند مسافروں سے تو وہ فرما اُس میں سوار ہو گئی — وہ آدمی بھی اُس میں
میں داخل ہو گیا، اُس کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ بس کے، انجین میں کوئی غزال پیدا ہو گئی، جس کے باعث اُسے رکنا پڑا، سب مسافروں سے کہہ دیا گیا کہ وہ
اُتر جائیں، کیونکہ کہانی ڈیر تک ہے بس نہیں چل سکے گی۔

سٹوکی نے بچے آخری تو وہ آدمی جس سے بہت بُری طرح گفتگو کرتا تھا، وہ بھی اُس کے ساتھ رہنا ہرگز نکلا — سڑک پر ایک کاروبار ہی تھی
اُس نے اُس کے ڈرائیور کو تار دئی، ”امام رہی۔“

امام رہی نے سٹوکی کو ایک دم روک لیا، اُس آدمی نے سٹوکی کا ہاتھ پکڑا اور اس سے کہا پیسے — یہ میری کار ہے — جہاں بھی تپ
جانا چاہتی ہیں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔

سٹوکی آنکھ نہ کر سکی۔ سٹوکی میں بیٹھ گئی، اُس کو ماٹرن قانون جانتا تھا، مگر وہ اُسے کیسے اور بے گیلہ — اور — !

* * * * *

سٹوکی نے محسوس کیا کہ مرد واقعی عورت کے لیے لازم ہوتا ہے — اس نے اپنی زندگی کا بہترین دن گزارا — گواہی نے پیسے
بہت جیل و جنت اور اختیاج کیا، گواہی نے اُسے رام کر دی۔ !

قیس چار شخصوں کے بعد جب سٹوکی نے اُس شخص کا بغور کھول کر دیکھا تو اُس میں ایک طرف شاہد کا نور ٹپکا تھا۔ اس
نے پہنچا ہٹ کے ساتھ پوچھا : یہ — یہ — عورت کی ہے ؟

اُس شخص نے جواب دیا، میری بیوی۔

سٹوکی کے حلق سے سچ نکلتے نکلتے رو گئی، آپ کی بیوی ؟

شاہد کا خاندان مسکراتا، یکسر وہوں کی بیویاں نہیں ہوتیں ؟

منشیہ

تالیفوں کے شعور میں پچھل اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور طلبہ اور طالبات سے مخاطب ہوتا ہے ۔

یہ رسم جب سے میں اس کالج میں پرنسپل مقرر ہوا ہوں۔ ہر سال باقاعدہ دہائی جاتی ہے۔ ہر سال اس موقع پر تالیفوں کے شمع کے ساتھ میں اپنی کرسی سے اٹھتا ہوں اور قریب قریب وہی تقریر کرتا ہوں جو میں نے آج سے دس سال پہلے کی تھی۔ انھیں دیکھ کر میرے دل میں ہنسی جھپٹتا پیدا ہوتے ہیں جو سلسلے کے آغاز میں ہوتے تھے۔ آج جب میں نے غور کیا ہے تو مجھے دسبا عرصہ میں ہوتا ہے کہ میں پوسٹ ماسٹروں اور ڈاکٹی کی پر جڈنگ بک بکسٹ ڈاکٹر کے خانہ۔ تم سب خطوط جو مجھے دیکھ کر اس جڈنگ میں روکنا چاہتے تھے کہ انہیں بچا دیے جاتے ہو۔ تم میں سے کچھ بزرگ ہو جاتے ہیں جس کے باعث تمہارے والدین کو خیر مانا اور کرنا پڑتا ہے۔ کچھ غلط آئے ہیں کی وجہ سے ادھر ادھر بٹھکتے رہتے ہیں۔

بہ حال یہ کھیل ہے بہت دلچسپ۔ ہر سال امتحانوں کا ایک چکر شروع ہوتا ہے۔ اس میں کچھ کامیاب ہوتے ہیں کچھ ناکام۔ حسرت اور غم کی ٹی ٹی ٹی میں ہر سال دیکھتا ہوں اس وقت میرے سامنے ایسے کئی چہرے ہیں جو کامیابی کے باعث تمہارے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں چند ایسے چہرے بھی دیکھتا ہوں جو ناکامی کے صدمے سے مرجھاتے ہوئے ہیں۔ غراں اور بیمار۔ کایہ پہلا موسم ہر سال آتا ہے اور گند جاتا ہے۔ وہ دکانیاں اور لڑکے جو بی اے کا امتحان پاس کر چکے ہیں یا تو اپنی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی بڑے کالج میں داخل ہو جاتے ہیں یا تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے دوسری کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں گے۔ وہ جو اس امتحان کی دیوار میں چاند کے دروازہ کو کھینچ کر ہیں گے۔ جو یہاں سے جا رہے ہیں، ان کو میں انوار کا کتا ہوں اور ان کی کامیاب زندگی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ جرنے آئے ہیں۔ میں ان کو خوش آمدید کہتا ہوں اور ان کے خانہ کے لیے کہتا ہوں کہ اس تعلیم کا وہاں داخل ہوتے وقت ان لوگوں کو ایک غور و فکر دیکھیں جو باہر جا رہے ہیں۔ جو خواہش کے باوجود اپنی کنوینینس کے باعث یا کسی اور وجہ سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان سے مجھے پوری پوری ہمدردی ہے۔ خاص طور پر فقیر سے جو محنت کے باوجود اس سال بھی امتحان میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ خدا کرے آئندہ سال فقیر کامیاب ہو جائے۔

تقریر ختم کرنے کے بعد جلسہ بزمِ صحت ہو جاتا ہے۔

کالج کی دکانیوں میں چھ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

ذکر۔ فرخندہ — کیا نیکر ہال میں موجود تھی۔

فرخندہ۔ نہیں تو۔

ذکر۔ تو پھر وہ آئی ہی نہیں۔

فرخندہ - بے چاری خود سے ٹھہرا ہوا ہے۔

ذکیہ - ایک بار نکل ہوئے ہی سے آدمی کی کمرٹ جاتی ہے۔ وہ بے چاری تو دوسری مرتبہ نکل رہی ہے۔

فرخندہ - محنت تو بے سود کرتی تھی۔

ذکیہ - اصل میں یہ سب اُس کے خراج کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ کسی سے دو لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ امتحان ہونے سے اور جینے پٹے میں نے کچھ بد اُس سے کہا۔ فیچہ تم میرے گھر آیا کرو، میں تمہیں ساری اکٹو کس اور کلوں کی — بس یہ سنتے ہی جیسے اُس کے سر میں تلک گئیں — کہنے لگی، تم اپنے آپ کو بہت وہ سمجھنے لگی ہو۔ تمہارے بغیر گویا اکٹو کس کسی کو آجی نہیں سکتی — میں آگدھی ہوں۔ یہ وقت ہوں۔ اب فرخندہ تم ہی بتاؤ کیا فیچہ بھڑکانی کے لیے اُس کو اپنی مدد پیش کی تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ اکٹو کس میں بالکل منہر ہے۔ بس داغ ہی چڑھایا ہے، کوئی اچھی بات بھی کرے تو اُسے بُری لگتی ہے۔

فرخندہ - میرے ساتھ جی بالکل ایسا ہی ہوا میں نے کہا۔ دیکھو فیچہ، ایسا نہ ہو تمہارا سا بیگلا جی کا پرچہ کدورہ جاتے، کو تو میں اپنے کیے ہوئے نوٹ دے دوں۔ میں یہ سنتے ہی بگڑ گئی۔ نوٹوں کی تو اُس کو ضرورت ہوتی ہے جو کہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ملے۔ دیکھو بازار میں عام کتے ہیں۔ کوئی اتنی بڑی رقم خرچ تو نہیں کرتی — بھئی دو دن اور آج کا وہی میری زبان چلے جو میں نے پچھلے اُس سے ایسی بات کی ہو۔

جمیلہ - کسی کو کیا پڑی ہے جو —

ذکیہ - بڑی دڈی کی بات نہیں جمیلہ — ہمارے دل چتر کے تو نہیں اُس کو دیکھ کر کہے دیکھ نہیں جوتا — اور ایسے حالات میں منہ سے ہمدردی کا کوئی کلمہ نکل ہی جاتا ہے۔

فرخندہ - ہمارے تو ہمدردی کی ضرورت ہی نہیں — کاشے کو روڈ آتی ہے مگر اُس سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہ دیا جاتے۔ ذکیہ - جاتے اُس کے خراج میں تلک کہاں سے آگئی۔

جمیلہ - اے تلک! کچھ ڈو۔ سب کو معلوم ہے کہ بے مددگی ہے۔ ایک اگر اُس سے کہو، فیچہ تم ہر روز سبز سا ڈھکی ہی کھوڑتی ہو تو بڑا کراہا ہے۔ دے گی میرے پاس ایک — نہیں، ایسی کئی ساڑھیاں ہیں۔ مجھے یہ رنگ پسند ہے۔

فرخندہ - سر میں تلک ایسا ڈھکی ہے کہ اُس کی بدبو سے ناک چٹ جاتی ہے۔ اُس سے پوچھو تو یہی کہے گی۔ یہ خاص تیل ہے اس سے بال لہجے ہوتے ہیں۔

جمیلہ - لیے ہاؤں کی کچھ۔

ذکیہ - نہیں، فیچہ، ایسا نہ کہو — اس کا دھندل پڑی دود ہو جائے تو اُس جیسی اچھی سیل نہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہ۔

لو کیمرہ میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک لڑکا آؤ اور دوسرے گھڑا کافی

خوبصورت تھا، اُس نے سب سے پوچھا کیا باتیں ہو رہی ہیں؟

ذکیہ۔ ہم فقیر کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ دوستوں وغیرہ سے مل چکے۔

انور۔ دوستوں وغیرہ سے تو نہیں ملا۔ البتہ فقیر سے مل کے آ رہا ہوں۔

فرخندہ۔ کہاں ہے وہ ؟

انور۔ باہر باغ میں۔

جمیلہ۔ چلو ذکیہ چلیں۔

انور۔ نہیں اس وقت آپ اس کے پاس نہ جائیں۔ اس کی طبیعت بے حد غموں ہے۔ کسی نے اس کو ذرا بھی ٹھیکہ فرماؤ تو بہت برا ہو چکا گی

ذکیہ۔ یہ بڑی مصیبت ہے۔ اب اگر کوئی اس سے بددردی کا اظہار کرنا چاہے تو کیا کرے۔

انور۔ میں خاموش رہے

ذکیہ۔ کیسے۔

انور۔ باطل پیری عرج۔ بانیچے کی عورت میرا گندہا تھا اس نے دیکھا کہ وہ بیچ پریشی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں آنسو ہیں۔

میرے قدم رک گئے۔ اس نے میری ہڈی دیکھا اور اس نے اس کی ہڈی اس کے نامکمل آنسو کیل کی آنسو میں ڈال دئے۔

اور میں یہاں چلا آیا۔

ذکیہ۔ تو مجھے اس کے پاس نہیں جانا چاہیے ؟

انور۔ وہ اس وقت غضب ناک حالت میں ہے۔ نا کامیوں کا اثر ایسے آدمیوں پر اسی قسم کا ہوتا ہے، جنہیں ضرورت سے زیادہ خود پر

اعتماد ہوتا ہے۔ واصل میں کوشش کے باوجود فقیر کو نہیں بھروسہ کیا۔

ذکیہ۔ لیکن کلاس میں اس سے آپ کا سلوک ویسا ہی تھا جیسے ایک باپ کا بیٹا بڑی سے ہوتا ہے۔

انور۔ لیکن اس کے باوجود وہ میری شفقت ٹھکراتی اور میری بددردی کو بدعتی کہتی تھی۔ کچھ گویا میں نہیں آتا اس کی کا انجام کیا ہوا۔

تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس قدر غلطی ہو گئی ہے۔ اس کی قبروں باہر لگائی تھیں۔ میں اکثر سوجھتا ہوں ایک دن وہ اپنی زندگی کے

بڑے سزا کا تجربہ لڑائی لڑائی تھا۔ ہی جاتے گی۔

یہ کہہ کر انور ان ذکیہوں سے غصت لے کر چلا گیا۔ اس کے قدم غیر ارادی

طور پر اسے بانیچے کی عورت سے گئے۔ فقیر بیچ پریشی تھی۔ انور اس کے پاس نہ گیا۔

انور۔ فقیر۔ کیا میں تم سے اس آسکتا ہوں ؟

فقیر۔ نہیں کس نے دعا ہے۔

انور۔ تم یہاں بہت دیر کی بیٹھی ہو۔

فقیر۔ کہتے ہو تو اٹھ کر چل جاتی ہوں۔

انور۔ یہ کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں پوچھتا ہوں تنہائی میں تم کیسا اکل نہیں کھلاتی ہو۔

فیصلہ: کبھی تنہائی — میں اہل تنہا نہیں

الور: ہاں۔ اب تم تنہا نہیں ہو۔

فیصلہ: اس سے پہلے بھی تنہا نہیں تھی — تم چلے جاؤ گے تو پھر بھی تنہا نہیں ہوں گی — تم بیٹھ مجھے غلط سمجھتے رہے — تم کیا سب کے سب — مجھ میں کیا نقص ہے — کیا خرابی ہے جو دوسروں کے دل میں غواہ غواہ جو ردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے — جو دھوکا — جاؤ اس جو ردی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

الور: تم خود ناشرواع کرو یا۔

فیصلہ: بیٹھتے رہتے ہو تم — میں تو نہیں رہی ہوں — تم کہتے ہو کہ میں تنہا ہوں ہے یا وہ مدگار ہوں — اسی لیے تم مجھے اپنی جو ردی کے شرکے کوٹھے دیتے ہو — میں یہ بیک نہیں بیٹھا چاہتی — جاؤ — جاؤ — یہاں پہلے جاؤ۔ اور محسوس کرنا ہے کہ اگر اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی تو شاید فیصلہ کا دماغی توازن نہ بگڑ جائے، اس لیے وہ خاموشی سے پناہ جاتا ہے۔ فیصلہ بیٹھ بیٹھتے کے وہ ناشرواع کر دیتی ہے، مگر کوئی تھراپی پیدا نہیں کرتی۔ اور بے لگو رہا گیا۔ وہ اکثر فیصلہ کے بارے میں سوچتا، اس نے کئی بار اس کو خط لکھے، مگر اس کو اس کا ٹیڈر میں معلوم نہیں تھا۔ اس لیے بھاڑ دیے۔

ایک دن وہ باہر آدھ سے میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا کہ تو کر ایک خط آیا — یہ فیصلہ کا تھا جس میں صرف ایک سطر تھی — مقررہ — میں مرنے کے قریب ہوں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔

اور سخت گھبراہٹ میں اٹھا اس کا سراجم لڑا تھا اس نے اپنے آپ کی موٹرل شیطریں ڈیڈس میں موجود تھا۔ وہاں پہنچا۔ فیصلہ اور غریب سا گروہ تھا — الور کو کچھ نظر آیا۔

الور: فیصلہ، فیصلہ — کہاں ہو تم۔

فیصلہ: آ جاؤ — ادھر میرے پاس آ جاؤ۔

پانچویں میں الور کو سہائی دینے لگا تھا اس نے دیکھا کہ ایک شکستہ سی چارپائی پر فیصلہ کی بیویں کا ڈھانچہ بیٹھا ہے۔ الور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

فیصلہ: تمہیں حیرت ہو رہی ہے اس غریب کو کہہ کر رکھو — دے دو کیسوریاں جس نے کو بھی دیکھو گے، تمہیں حیرت ہوگی — سب سے بڑی حیرت اٹھیں چڑھیں ہوں — مجھے دیکھو اور جتنا حیرت زدہ ہونا چاہو ہو۔

الور: یہ کیا ہو گیا تمہیں؟

فیصلہ: الور میری کششِ پاش پر مبنی ہے — پینڈے اور چرائوں کے بغیر اسے کبھی برس نہجدار میں کھیتی رہی ہوں۔ اب میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی — اور — کیا وہاں اس کی مرمت ہو جائے گی؟ — تم بولتے نہیں۔

الور: میں سن رہا ہوں۔

نیمبر۔ میں اپنی اس ٹوٹی ہوئی کشتی کے لیے باہر دروازے پر بیٹھ کر کے بار بار باقی باقی رہی، لیکن طوفان نے بڑی پے لگی سے ان کو چرچھا کر دیا۔ انور! مجھے بتاؤ۔ یہ طوفان ان سے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟ انور۔ طوفان ہمیشہ بے رحم ہوتے ہیں نیمبر۔

نیمبر۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے بہت تکلیفیں برداشت کیں، صرف اس لیے کہ اپنی اس کا امتحان پاس کروں اور خود گلہ کے قابل ہو جاؤں۔ لیکن ان تمام قربانیوں کا انجام تمہارے سامنے ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں بیٹھ ہے۔

نیمبر کی دوا بہت آہستہ آہستہ دم ہوتی جا رہی تھی۔ انور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

نیمبر تین مہرہ جوں انور اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اب ایسا کرنا کہ میری یہ دوسری سڑھیاں جو اسٹول پر چڑی ہیں اور یہ ساری کتاؤں، اٹھ کر میرے ساتھ کیا دفن کرونا۔ ٹھیک ہے وہاں یہ چیزیں اور بھی نرودہ مٹی ملیں۔ میں نے بڑی مہینوں سے خریدی تھیں۔ اور دیکھو کسی اور کہ میری موت کی خبر نہ ہو۔ مجھ سے اب نرودہ اور کتا نہیں جاتا۔ میرا خیال ہے مجھے اور بھی کچھ کہنا تھا۔

انور نے دیکھا کہ اس پر حالت نزاع طاری ہے۔ اس نے زار و آواز دنا شروع کر دیا، نیمبر نے جس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور انور کے آنسو اپنے میلے دھڑے سے پرچھے اور کہا مجھے یاد آ گیا ہے۔ جو مجھے تم سے کہنا تھا۔ انور! کیا کہنا تھا؟

نیمبر سوائی ایک بے وقوفی کی بات ہے۔ اپنے ہونٹ میرے نرودہ ہونٹوں کے ساتھ لگا دو۔

انور نے اس کی تعمیل کی۔ نیمبر کو جو حسرت حاصل ہوئی وہ اس کی ناپ نہ لاسکی اور اپنا آخری سانس اس لمبے کے پڑو کر دیا۔

(۲۱ مئی ۱۹۵۴ء)

بد تمیزی

”میری بھجڑ میں نہیں آنا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤں۔“

”تجربہ کرنی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو کھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔“

”آپ تو بس ہر بات پر گھگھوٹ دیتے ہیں۔ آپ نے یہ تو پوچھ لیا ہر نامک میں آپ سے کیا کھانا پاتا ہوں۔“

”اس کے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بس فقط لڑائی مہل لینا چاہتی ہوں۔“

”رائی میں مہل لینا چاہتی ہوں کہ آپ — سارے ہمسائے لڑکی طرح جانتے ہیں کہ آپ آئے دن مجھ سے لڑنے لگتے رہتے ہیں۔“

”خدا جھوٹ نہ بولائے تو ایک برس تک میں تم سے کوئی تلخ بات کہے نہ شیریں۔“

”شیریں بات کہنے کا آپ کو سلیقہ ہی کہاں آتا ہے۔ لڑکوں کو دوسرے کرہلوں کے تو سارے گلے کو تہ پہل جانے لگا کہ آپ

اُسے گولی سے ہلک کرنا چاہتے ہیں۔“

”میرے پاس بندوق ہی نہیں — ویسے میں غریبوں کو ماروں، گناہوں کو چلانے لگاؤں؟ — میں تو پلاسٹک سے ڈرتا ہوں۔“

”آپ بچے نہیں۔ میں آپ کو لڑکی طرح جانتی ہوں۔ یہ تو لڑکیوں کے ساتھ نہیں چلے گا آپ کا۔“

”اب میں غریب بن گیا؟“

”آپ ہمیشہ سے غریب تھے۔“

”یہ فیصلہ آپ نے کی وجہ پر کیا؟“

”آپ جب باغیچہ میں چلتے تھے، تو کیا آپ نے آیا ہی کی وجہ سے دوسرے نہیں نکالے تھے؟“

”نکالے تھے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ بھنگی کی ڈال کی ضرورت تھی۔“

”اس لیے کہ وہ بھنگی کی ڈال تھی — بہت تیز — والہ صاحب لڑکا جانا تو وہ بھی ایک میری ہی اُسے نہ دیتے

میں نے اسی لیے مناسب سمجھا کہ ان کے کوٹے سے دوسرے کمال کاس کو دے دوں — یہ کوئی گناہ نہیں۔“

”جی ہاں — بہت بڑا ثواب ہے — باپ کے کوٹے پر چھاپا کہ آپ کو اپنے خیال کے مطابق جنت میں رہنی سیکھ

کو چکے ہوں گے، لیکن میں آپ سے کہہ دیتی ہوں کہ اس کی سزا آپ کو اتنی لڑکی ہے کہ آپ کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔“

”طبیعت قہریری پر روز صاف کی جلی ہے — اب اتنی صاف ہو گئی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس طبیعت کو کچڑ میں لٹ پت کردوں، تاکہ قہار مشعل جاری رہ سکے۔“
 ”کچڑ میں تو آپ ہر وقت تھکڑے دپتے ہیں۔“
 ”یہ سرسبز بتاں ہے۔“

”بتاں کیا ہے — حقیقت ہے — آپ سرے پاؤں تک کچڑ میں دھنسنے ہوئے ہیں — آپ کو کسی نفیس چیز سے دلچسپی ہی نہیں، بات کریں گے تو غلاطت کی — نہاتے آپ نہیں۔“
 ”غضب خدا کا — میں تو دل میں تین مرتبہ نہلاتا ہوں۔“
 ”وہ بھی کوئی نہانا ہے — بدن پر دو ڈونگے پانی کے ڈاڑے — تو مجھ سے اپنا نیم خشک جسم پرچھا اور غسل نہانے سے باز نظر آتے —“

”دو ڈونگے تو نہیں، کم از کم میں ہوتے ہیں۔“
 ”تو ان سے بھی کیا ہوتا ہے — کیا آپ نے آج تک کبھی صابن استعمال کیا ہے؟“
 ”میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ صابن چلنے کے لیے بہت مضر ہے۔“
 ”کیوں؟“

”اُس لیے کہ اس میں ایسے تیزابی مادے ہوتے ہیں جو چلنے کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔“
 ”میری چلنے تو آج تک ستیاناس نہیں ہوئی — آپ کی چلنے بہت ہی نازک ہوگی۔“
 ”نازک ہونے کا سوال نہیں — یہ ایک سائنٹیفک بحث ہے۔“

”میں سائنٹیفک و آئیٹھنٹک پکڑ نہیں جانتی — بس میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ صابن کیوں استعمال نہیں کرتے؟“
 ”بھئی، تمہیں بتا چکا ہوں کہ مضر ہے۔“
 ”تو آپ نہانے کس طرح ہیں۔“

”نہانے کا سہرت ایک ہی طریقہ ہے — پانی ڈالتے کتے اور نہاتے کتے۔“

”جسم پر آپ کوئی چیز نہیں تھتے — میرا مطلب ہے، صابن نہیں تو کوئی اور چیز؟“
 ”کا کرتا ہوں۔“

”کیا؟“

”بیس۔“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”اوسے، بھئی، چپے کا اٹا۔“

”آپ کی جرات ہے، زوالی ہے — میں تو آپ ایسے سکی سے خدا قسم تلک آگئی ہوں — میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان جاؤں۔“

”اپنے بچکر پل جاؤ — وہاں نصیص اپنی ہم خیال مل جائیں گی۔“

”میں کیوں جاؤں وہاں — میں یہیں رہوں گی۔“

”میں نے تم سے رنج ہی کیا — اس لیے کہ تم ہا کو مرتد مجھے یہ دھکی دیتی رہی ہو کہ میں پل جاؤں گی اپنے بچے۔“

”مجھے جب جانا ہو گا پل جاؤں گی۔“

”آج تمہاری طبیعت نہیں چاہتی؟“

”آپ مجھے چڑانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟“

”میں نے تو کوئی کوشش نہیں کی — اگر تم چاہتی ہو کہ کوشش کروں، تو یقیناً تو، تم بھی آگے بڑھ کر ایشیہ پہنچ جاؤ گی۔“

”کوشش کر کے دیکھ لیجئے — میں یہاں سے ایک اینچ نہیں ہٹوں گی — یہ میرا گھر ہے۔“

”آپ کا ہے — آپ کے باپ دادا کا ہے — لیکن یہ تو بتائیے۔“

”میرے باپ دادا کا نام ست بیبیہ — ان بیچادوں کا کیا قصور تھا؟“

”قصور تو سارا میرا ہے — لیکن بیگم، تم بھی کسی آغا تو خود کر لیا کرو کہ میں نے آخر تمہیں کون سا ہائی مال نقصان پہنچایا ہے کہ

تم اٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جاتی ہو۔“

”تھو تو ہمیشہ آپ کے ہاتھوں رہا ہے — میں تو اسے اٹھا بھی نہیں سکتی۔“

”تم بڑے سے بڑا گورا تھا سکتی ہو — تم ان لوگوں میں بلا کی قوت ہوتی ہے — تم غلاب ہو — تمہارے سہنے

زیر کی حیثیت ایک چڑیا کی سی ہے۔“

”باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے — آپ چڑیا ہیں — سبحان اللہ، جب کو کہتے اور گرجتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے

کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔“

”اس طیر کو پہلے ایک نظر دیکھو۔“

”کیا دیکھوں؟ — پندرہ برس سے دیکھ رہی ہوں۔“

”یہ خاکسار شیر ہے کیا؟“

”شیر ہے، مگر خاک میں پلٹا ہوا۔“

”اس تقریب کا شکریہ — اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کتنا کیا چاہتی تھیں؟“

”آپ اتنے فائق فائق بنے پھرتے ہیں — مجھے کہ میں کیا کیا چاہتی تھی۔“

”تمہاری باتیں نہ صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے — میں کیا سمجھوں گا۔“

”خدا کر سچ میں کیوں لاتے ہیں۔“

”خدا کو اگر سچ میں نہ لایا جائے تو کوئی کام ہم ہی نہیں سکتا۔“

”بھلے آتے ہیں آپ خدا کو ماننے والے۔“

”خدا کو تو میں ہمیشہ سے ماننا کرتا ہوں۔ وہ طاقت جو دنیا پر کنٹرول کرتی ہے۔“

”کنٹرول تو آپ مجھ پر کرتے آئے ہیں۔“

”کس قسم کا؟“

”ہر قسم کا۔ میں آج تک اپنی مرضی کے موافق کوئی چیز نہیں کر سکی۔ کپڑے پہنا ہوں، تو اس میں آپ کی مرضی کو

داخل ہوتا ہے۔ کھانے کے بارے میں بھی آپ کی مرضی چلتی ہے۔ آج یہ کچے، اگلے وہ کچے۔“

”اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟“

”اعتراض کیوں نہیں۔ میرا جی اگر کبھی چاہتا ہے کہ وہ بھڑی کھاؤں تو آپ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔“

”وہ بھڑی بھی کوئی کھانے کی شے ہے۔“

”آپ کیا جانتے، کتنی مزیدار ہوتی ہے۔ پٹنوں میں ڈال کر اسے صاف کر دیا جاتا ہے، اس کے بعد بھی طرح طرح میں

کھا جاتا ہے۔ اللہ قسم خراا جاتا ہے۔“

”لا حول ولا۔ میں ایسی غلط چیز کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔“

”اور ٹیٹھسے؟“

”بکواس میں۔ ہسٹری کی سب سے بڑی توہین میں۔ ان میں کوئی رس ہوتا ہے نہ لذت۔ بس فقط ٹیٹھسے ہوتے ہیں۔“

میری بھڑ میں نہیں آتا کہ وہ پیدائش غرض کے لیے کیے گئے تھے۔ نہایت عادیات ہوتے ہیں۔ میں تو اکثر یہ دُعا

مانگتا ہوں کہ ان کا وجود دوسرے ہی سے خائب ہو جائے۔ بڑے بے جا بن جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تو بدتر جہانتر ہے۔

حالا نگہ وہ بھی مجھے سخت نا پسند ہے۔“

”آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟“

”ہر بھی چیز میں آپ کیلئے ڈالتے ہیں۔ بھڑی آپ کو پسند نہیں کہ اس میں

یس ہوتی ہے۔ اگر بھی آپ کو نہیں بھائی کہ اس میں یہ نقص نکالا جاتا ہے کہ بدبو ہوتی ہے۔ لہذا آپ کو اچھے نہیں لگتے،

اس لیے کہ اس کے چھلکے ہضم نہیں ہوتے۔“

”تم ان باتوں کو چھوڑ دو۔ ٹیٹھسے، اگر بھی وہ لٹاڑ جاتی ہیں جن میں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کتنا کیا چاہتی تھیں۔“

”کچھ بھی نہیں۔ بس ایسے ہی آگئی۔ میں نے دیکھا کہ آپ کوئی کام نہیں کر رہے، تو آپ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔“

”بڑی نوازش ہے آپ کی۔ لیکن کچھ کچھ تو ضرور کتنا ہو گا آپ کو۔“

”آپ سے اگر کچھ کہہ بھی دیا تو اس کا حاصل کیا ہو گا۔“

جو آگے آپ کو حاصل ہوتا رہا ہے، اُس حساب سے کچھ بھی حاصل ہو جائے گا۔ آپ یہاں سے کچھ حاصل کیے بغیر نکلیں گی کیسے؟
 ”میں آپ سے ایک خاص بات کہنے آئی تھی۔“
 ”کیا؟“

”میں — میں یہ کہنے آئی تھی، کہ میری جگہ میں نہیں آتا، میں آپ کو کیسے بھانڈاؤ؟“
 ”آپ کیا بھانڈے آئی تھیں مجھے؟“

”آپ کو خدا بھانڈے گا۔ میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ پتھر ہیں کہ اُس کے ٹپس ہاتھ میں بندھ گیا کریں، ہمسایوں کو سخت اعتراض ہے، یہ بہت بُری بات تھی ہے۔“

۲۲ مئی ۱۹۵۲ء

مقام اقصائی

عیدان والی اگرے وال چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی ماں ذہرو جان نے اُس کا نام اسی مناسبت سے عیدان رکھا۔ ذہرو جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی۔ بڑی دُور دُور سے رئیس اُس کا غزل گانے کے لیے آتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ برہنہ کے ایک تاجر عبداللہ سے جو لاکھوں میں کھیلتا تھا، اُس سے محبت ہو گئی۔ اُس نے چنانچہ اسی جذبہ کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبداللہ بہت متاثر ہوا اور اُس کی ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ کوئی تین سو روپے کے قریب۔ چھٹے شہر میں رہنے لگا۔ اُس کے پاس آٹا اور بات غلامانچ سور سے وہاں سے دکان نہ ہوتا۔

جو شخص ذہرو جان کو جانتے ہیں اور اگرے کے رہنے والے ہیں، ان کا بیان ہے کہ اُس کا چاہنے والا ایک بڑا مٹی کا گروہ آگ میں نہیں لگاؤ تھی۔ وہ بے چارہ ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے چھ گنے گنے کے ذہرو جان کے پاس جاتا مگر وہ اُسے دھتکار دیتی۔

آخر ایک روز اُس نے مٹی کو ذہرو جان سے متعلق گفتگو کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ اس لیے کہ اُس پر اپنی محبوبہ کے غم کی گاری تھی، لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے بعد جرأت سے کام لیا اور اُس سے کہا:-

”ذہرو جان — میں غریب آدمی ہوں، مجھے معلوم ہے کہ تُو بے دھن والے تھا۔ اُسے پاس آتے ہیں اور تجھ کی ہر آواز پر سیکڑوں روپے پھینک دیتے ہیں — لیکن تھیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ غریب کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے — میں تم سے محبت کرتا ہوں — معلوم نہیں کیوں؟“

ذہرو جان ہنسی اُس ہنسی سے بڑھ کر دل کا دل عروج ہو گیا۔ تم ہنستی ہو — میری محبت کا مذاق اُڑاتی ہو، اس لیے کہ یہ کھٹکے کی محبت ہے جو کلکریاں چیر کر اپنی نوزی کھاتا ہے — یاد رکھو، یہ تھا کہ اُس لاکھوں میں کھیلنے والے تھیں وہ محبت اور سادگی دے سکتے، جو میرے دل میں تھا کہ اُسے بچے ہو جادے۔“

ذہرو جان اُٹا اُٹا گئی۔ اُس نے اپنا ایک پیرائی کوڑا لیا اور اُس سے کہا کہ بڑھئی کو باہر نکال دیا۔ لیکن وہ اس سے پیٹ ہی چلا گیا۔ ایک برس کے بعد عیدان پیدا ہوئی — اس کا باپ عبداللہ تھا یا کوئی اور اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو میٹر کے گھٹے سے ہے — کسی کے نقطہ سے بھی ہو، مگر بالکل خوبصورت تھی۔ اُدھر ذہرو جان کی عمر چھلنی گئی، اُدھر عیدان جوان ہوئی گئی۔ اُس کی ماں نے اُس کو موسیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی۔ لڑکی ذہین تھی، کچھ استادوں سے اُس نے سیتھ لیے اور اُن سے دہر واصل کی۔

زہرہ جان کی ٹھراب چالیس برس کے قریب ہو گئی۔ وہ اب اُس منزل سے گزر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے۔ وہ اپنی اکلوتی لڑکی عیدن کے سہارے بی رہی تھی۔ ابھی تک اُس نے اُس سے بھلائییں کرایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب پر جس کا اختتام کوئی راجہ نواب کرے۔

عیدن باقی کے شئی کے چرچے عام تھے۔ خود لڑکھائی میں اس کے نوکرے ہوتے تھے۔ وہ اپنے بچپنوں کو زہرہ جان کے پاس بیٹھتے اور عیدن کی فحش نگارنے کے لیے اپنی لڑکی پیش کش بیٹھتے، مگر اُس کو اتنی جلدی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے۔ اُس کی لڑکی لاکھوں میں ایک تھی۔ سانسے شہر میں اُس جیسی عیدن لڑکی اور کوئی نہیں تھی۔

اُس کے شئی کی نمائش کرنے کے لیے وہ ہر جمعرات کی شام کو اُس کے ساتھ پیول باہر سر کر جاتی۔ عشق چٹہ مرد اس کو دیکھتے تو دل تمام تمام بیٹے۔

پچھلی پچھلی چوٹی میں گدی یا ہوا جریں، سٹول بانیں، غزلی انگلیاں جن کے نازوں پر بیٹا بیٹھا ہو، ایسا رنگ لٹکا سا تہہ گھسکا پے بال — قدم قدم پر قیامت ڈھاتی تھی۔

آخر ایک دفعہ زہرہ جان کی اتید بر آئی۔ ایک نواب عیدن پر ایسا تلو ہوا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو گیا۔ زہرہ جان نے اپنی بیٹی کی سستی کی رسم کے لیے بڑا اہتمام کیا۔ کئی دیکھیں پلاؤ اور شئی کی چڑھائی گئیں۔

شام کو نواب صاحب اپنی ٹمگی میں آئے۔ زہرہ جان نے اُن کی بڑی آؤ جھکت کی — نواب صاحب بہت خوش ہوئے۔ عیدن دو دھن پی جاتی تھی۔ نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق اُس کا بھر شروع ہوا — پھٹ پھٹے والا شاپ تھا جو ٹوٹو سرائی تھا۔

عیدن اُس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ہر جنبش، ہر ادا، اُس کے گانے کی ہر نثر زوہنگی تھی۔ نواب صاحب گاؤٹھکے کا سارا لیے بیٹھے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ آج رات وہ جنت کی سیر کریں گے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بے حکم سا آدمی اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بہت بھڑائی۔ وہی بڑھئی تھا — اس کا عاشق راز بہت سیلے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب کو بہت افاست پسند آئی۔ انھوں نے زہرہ جان سے کہا: یہ کون بدگزیر ہے؟

بڑھئی سکرایا، حضور، میں ان کا عاشق ہوں۔

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ کتد ہو گئی۔ زہرہ جان، نکلا اس حیران کو باہر۔ بڑھئی نے اپنے قبیلے سے آدمی نکالی اور بڑی مضبوطی سے زہرہ جان کو پکڑ کر اُس کی گردن پر تیزی سے چلانا شروع کر دی۔ نواب صاحب اور سرائی وہاں سے بھاگ گئے۔ عیدن بے ہوش ہو گئی۔

بڑھئی نے اپنا کام ٹہرے المیناں سے ختم کیا اور لو بھری آدمی اپنے قبیلے میں نکال کر سیدھا تھانے گیا اور اقبال بزم کر لیا۔

— کہا جاتا ہے کہ اسے عرق قند کی مٹا ہو گئی تھی۔

عید کی کوئی ماں کے قتل ہونے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ دوڑا بھاگتی جیسے تنکے زیادہ سی۔ ٹو اکٹوں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی، مگر آہستہ آہستہ اُس کی طبیعت سنبھلنے لگی اور وہ اس کاہلی ہو گئی کہ پہل پھر سکے، ہسپتال میں اُس کی تیمارداری صرف اُس کے استاد اور میراٹنی ہی کرتے تھے۔ وہ فریادیں اور ریس جو اُس پر اپنی جان چڑھتے تھے، بھروسے سے ہی اُس کو لپٹنے کے لیے نہاتے — وہ بہت دلی برداشت ہو گئی۔

وہ اگرچہ چھوڑ کر چلی گئی تھی — مگر اس کی طبیعت اتنی ٹھوس تھی کہ اُس کا جی قطعاً ہجر کرنے کو نہیں چاہتا تھا، اُس کے پاس یہی یہ کہیں ہزار روپے کے زلیقات تھے جو میں ہر سے اُس کی مقتول ماں کے تھے۔ وہ انہیں بچتی رہی اور گذارہ کرتی رہی۔

عزت کو زیر و بڑے عزت پر ہوتے ہیں۔ اُس کو رُڈاؤ کمزور تھا جب وہ کوئی چوڑی یا نکلس اونے پر نے دلوں پہنچتی تھی — لیکن آخر کیا کرتی اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ راگ، رنگ کی غلطی قائم کرے۔

ان دنوں پاکستان کے قیام کا مسئلہ بڑے اندرونی پر تھا۔ آخر ایک دن یہ اعلان ہوا جو عیدین نے یہ سچا پہنچ دیا اور ٹیڑھے طور پر خاکہ ہندوستان کے درجے ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد ضمانت شروع ہو گئے۔ ہندو مسلمانوں کو کہتے، مسلمان ہندوؤں کو — جب عالم تھا، یوں پانی سے بھی اور اداں ہو رہا تھا۔

مسلمان دھڑا دھڑا پاکستان جا رہے تھے کہ اُن کی جانیں محفوظ ہیں جتنی نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ وہاں نہیں رہے گی، لاہور چلی آئے گی۔ بڑی شکلوں سے اپنے کئی زلیقات پہنچ کر وہ لاہور پہنچ گئی۔ لیکن دستے میں اُس کی تمام پیش قریستیں ٹھوس اور بالی ماندہ زلیقات کے اپنے بھائی مسلمانوں ہی نے غائب کر دیے۔

جب وہ لاہور پہنچی تو وہ ٹھیک ٹھیک تھی — لیکن اُس کا جسم ویسے کا ویسا تھا۔ وہاں سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں لپٹائی ہوئی لکھنؤ نے اُس کی طرف دیکھا، مگر اُس نے بے ہمتی برتی۔

وہ جب لاہور پہنچی تو اُس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہوگی؟ اُس کے پاس تو چھ کھانے کے لیے بھی چند پیسے نہیں تھے لیکن لڑکی تو نہیں تھی سیدھی اُس جگہ پہنچی، جہاں اُن کی ہم جیڑہ رہتی تھیں۔ یہاں اُس کی بڑی آؤ بھلت کی گئی۔

ان دنوں لاہور میں دبیر عام تھا۔ ہندو جو کہ یہاں چھوڑ گئے تھے، مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا۔ ہر منڈی کے دوا سے نیارے تھے۔

عیدین کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اُس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھر اُس کو سینکڑوں گانے سننے والوں کی فرمائشیں پس کی گئی تھیں۔ صبح چار بجے کے قریب جب کہ اُس کی آواز جواب نہ ملتی تھی، وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی اور زور سے سڑائی چار بجا کر پڑھتی۔ یہ سلسلہ قریب قریب ٹھہر کر ہی جاری رہا — عیدین اس کے بعد ایک مسئلہ کو شاکر کیسے پرے کر دیا اور اٹھاتی، چونکہ یہاں وہ مقیم تھی، اُس تاکہ کہ اسے اپنی آدمی آدھن دینا پڑتی تھی۔

جب اُس نے مسئلہ وہ اپنے کو ٹھپے پر غور کیا تو شروع کیا تو اُس کی آنکھوں میں اندازہ ہو گیا۔ اب اُسے ہر قسم کی درخست حاصل تھی، مگر نے کئی زلیقات بنائے، کپڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کرالیے۔

اسی دور میں اُس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بیک مارکیٹ کا بادشاہ تھا۔ اُس نے کم از کم دو کروڑ روپے کما گئے تھے۔ خوبصورت تھا۔ اُس کے پاس تین کاریں تھیں۔ پہلی ہی ملاقات پر وہ عیدین کے جشن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنی کھلی سفید دیکار اُس کے پاس لے کر دی۔

اس کے علاوہ وہ ہر شام آتا اور کم از کم دو دو سالی سو روپے اُس کی نذر منو کرتا۔ ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی قدر مریلی تھی۔ اُس نے عیدین سے پوچھا: کیا بات ہے، آج تمہاری چاندنی اتنی گندی ہے؟ عیدین نے ایک اور کے ساتھ جواب دیا۔ آج کل ٹھکانا ملتا ہے؟ دوسرے دن اُس بیک مارکیٹ بادشاہ نے چالیس تھانے لٹکے کے ہمارے لیے۔ اس کے تیسرے روز بعد اُس نے ٹھکانے بٹلر دے دیے کہ عیدین اپنے گھر کی کداحل کا سامن خریدے۔

عیدین کو چھ گوشت کھانے کا بہت شوق تھا جب وہ اگسے اور واپس آتی تھی تو نہ سے عودہ گوشت نہیں ملتا تھا، مگر وہ میریں اُسے قاتلا تصانی بہترین گوشت میاں کرتا تھا۔ بغیر پیٹھ کے۔ ہر ٹیڈی کی ہوتی تھی جیسے رستم کی بیٹی ہو۔ وہاں پر پینا شاگرد شاگرد کا نام سب سے آتا تھا۔ نہ سیر گوشت جس کی بوٹی بوٹی چکر رہی ہوئی عیدین کے ہاتھ لگتا تھا۔ اُس سے وہ سب باتیں کرتا کرتا جو عام عودہ پر گوشت ہی کے بارے میں ہوتیں۔

بیک مارکیٹ کا بادشاہ جس کا نام ظفر شاہ تھا عیدین کے جشن میں بہت بڑی طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک شام عیدین کے گھر کو دوا پختی ساری جامد اور مشغور اور غیر مشغور اُس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے۔ اگر وہ اس سے شادی کرے۔ مگر عیدین نہ مانی ظفر شاہ بہت دیریں ہوتا۔

اُس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدین اُس کی ہر جائے، مگر ہر بار سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بڑے سے نادر خاں ہر کرات کے دو تین بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں۔

ایک رات جب ظفر شاہ اپنا غم غلط کر کے۔ یعنی شراب پی کر پیوڈل ہی چلا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سائیں — کے گچھے کے باہر عیدین ایک نہایت بدلا آدمی کے پاؤں پر کڑے التجا میں گر رہی ہے کہ خدا کے لیے مجھ پر نظر کر کم کر۔ میں دل دھان سے تم پر تھا ہوں — تم اتنے ظالم کیوں ہو — اوروہ شخص جیسے خود سے دیکھنے پر ظفر شاہ نے پہچان لیا کہ گھوڑا تصانی ہے۔ اُسے دھککا دیا ہے۔ چا — ہم نے آج تک کسی کفری کو سزا نہیں لگایا — مجھے تنگ نہ کیا کہ گاؤں اُسے تھک کریں، مادہ یا اور عیدین اسی میں لذت محسوس کرتی رہی۔

خودکشی

زادہ صوفی نام ہی کا زاید نہیں تھا۔ اُس کے زہد و تقویٰ کے سبب قائل تھے۔ اُس نے میں کبھی برس کی عمر میں شادی کی۔ اُس نے نہ میں اُس کے پاس دس پونڈ پیسے کے قریب تھے۔ شادی پر پہنچ کر زہد و تقویٰ کے ساتھ ہی رہا۔

زادہ بہت خوش تھا۔ اُس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی۔ اُس کو اُس سے بے پناہ محبت ہو گئی۔ وہ بھی اُس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد اُن کے ایک لڑکے پیدا ہوئے۔ جو ماں پر تھی۔ یعنی مریسی ہی حسین بڑی بڑی غلامی، انکھیں، ان پر لبی چمکیں، میں اب رو ہجو ڈا سب اویں۔ اس لڑکے کا نام سوچنے میں کافی دو رنگ آئی۔ زادہ اُس کی بیوی کو دوسروں کے بتوں کے ہرست نام پسند نہیں آتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ زود زادہ نام بنائے۔

زادہ کو ایک سوچنا کہ ہر ایک اُس کے دماغ میں ایسا کوئی مفرد نام مناسب نام نہ آیا جو دہائی دہائی کے لیے منتخب کرتا۔ اُس نے لڑکی بیوی سے کہنا: اتنی جلد ہی کیا ہے — نام رکھ دیا جائے گا۔

بیوی نے صبر کی کہ نام مفرد رکھا جائے۔ میں اپنی بیٹی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی۔

وہ کہتا: اُس میں کیا سوج ہے — جب کوئی ایسا نام نہیں ملتا ہے تو اس کی لڑکی کے ساتھ ٹھیک دس لے۔ پھر میں اسے کیا کہہ کر بچاؤں؟ — مجھے بڑی اچھی ہوتی ہے۔

”فی الامال بیٹا کہہ دینا کافی ہے۔“

”یہ کافی نہیں ہے — میری بیٹا کا کوئی نام ہونا چاہیے۔“

”تم خود ہی کوئی منتخب کر لو۔“

”یہ کام آپ کا ہے، میری نہیں۔“

تو تھوڑے دن انتظار کرو — میں اُنہو کی گفت و باتوں — اُس کے پہلے صفے سے اتنی صفحے تک خود سے دیکھوں گا — یقیناً کوئی ایسا نام مل جائے گا۔

”میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں کے نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں۔“

”نہیں میری جان نکالتے ہیں — میرا ایک دوست ہے۔ اُس کے جب بچے پیدا ہوئے تو اُس نے فوراً اُنہو کی گفت و باتوں اور اس کی درستی گردانی کرنے کے بعد ایک نام چن لیا۔

”کیا نام تھا؟“

”حکمت۔“

”اُس کے معنی کیا ہیں؟“

”خوشبو۔“

”بڑا اچھا نام ہے۔ حکمت — یعنی خوشبو۔“

”قریبی نام رکھو۔“

”واہل کی بیوی نے زندگی کو بوسہ دیا ہی تھی ایک نظر دیکھا اور کہا، نہیں — میں اپنی بیٹیا کے لیے پرانا نام نہیں چاہتی — کوئی نیا نام تلاش کیجیے — جاسینے ڈسٹری لے آئیے۔“

”ناہرہ مسکرایا لیکن میرے پاس پیسے کمال ہیں۔“

”واہل کی بیوی بھی مسکرائی، تیرا پر س الٹا ہی میں ڈال رہا ہے، اُس میں جتنے روپے آپ کو چاہیں، نکال دیجیے۔“

”آہ! نہ بہت بہتر تھا! اب ملاری کھولی گا اُس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا اور دس روپے کا ایک ٹوٹے لے کر واہل روانہ ہو گیا کہ گفت خرید لے۔“

”وہ کئی شب فروش دکانوں میں گیا۔ کئی گفت دیکھے۔ بعض تو بہت قیمتی تھے، جن کی تین تین جلدیں تھیں، کچھ بڑے

ناقص — آخر اُس نے ایک گفت جس کی قیمت دو چھی تھی خرید لیا اور راستے میں اُس کی دقت گروائی کر لیا، تاکہ نام کا مسئلہ حل ہو جائے۔“

جب وہ اندر گلیں سے گزرا، ہاتھ اس کا ایک دوست لگ گیا۔ وہ اُسے اپنی برائوں کی دکان میں لے گیا — وہاں

اُسے قریب قریب ایک گھنٹے تک بیٹھا پڑا اور کچھ بہت دیر کے بعد اُس سے ملاقات ہوئی تھی جب اُس کے دوست کو دورانِ گفتگو

میں پتہ چلا کہ آہل کے ہاں لاکھ ہوتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ تجوری میں سے گیارہ روپے نکالے اور آہل سے کہا، یہ اُس کی گولہ دینا، اگلا

تھامے چھانے دیجئے میں — نام کیا رکھا ہے اُس کا؟

”آہل نے گفت کہ بات دیکھا جس کی جلد بال رنگ کی تھی ابھی تک کوئی اچھا نام شرمجھا نہیں۔“

اُس کے دوست نے ہنستے کہہ پڑے سے صاف کہتے ہوئے کہا، یا نام رکھنے میں دقت ہی کیا پیش آتی ہے، شمیم ہے،

شامین ہے، نصیر ہے، الماس ہے۔“

”واہل نے جواب دیا، یہ سب مجھ کو اس ہے۔“

اُس کے دوست نے پورا ٹاپے میں دیکھا، تو اب جو بکس تم کرو گے، وہ بھی ہم میں لے گئے، اس کے بعد اُنھوں نے آہل کو گلی

سے نکال دیا اس کی عمر دوا کر کے — نام ہو نہ ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”ناہرہ جب دکان سے باہر نکلا تو اُس نے سوچا شرم دیا کیا کوئی نام میں کیا رکھا ہے، خیر آئی کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ بڑی عزت

کرتا ہے، عقیدہ کیا ہے — اور گھیشٹا — کیا اُسے لوگ گھیشٹا شرم دیا کریں — اور سدا لدو — شرم دیا؟

اُس کے جی میں اتنی کوفت کسی گندی اور سی میں پسیدہ دے اور گھر جا کر اپنی بیوی سے کہے میری جان، نام میں کچھ نہیں پڑا۔ بس یہ دوا کرو کہ کچھ کی طرف دوا نہ ہو۔“

وہ مختلف خیالات میں غرق تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں اُس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑکا رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی پرانے خیالی کا باعث ہے۔ تقدیری دُور چلنے کے بعد اُس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کو گھر پہنچے اور زندگی کی کچھ مشافیر ہوئے۔

بغل میں غفلت تھی۔ اس کو اُس کو کئی بار دیکھنے کی کوشش کی، مگر اس کا دل دواغ ستوازی نہیں تھا۔ اس نے تیز تیز چٹا شروع کر دیا۔ مگر تھوڑا سا صلے کرنے کے بعد ہی بہت بُری طرح ہانپنے لگا اور ایک دکان کے قطرے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک خالی آئینہ آیا، اُس نے اُس کو ٹھہرایا اور اس میں مچھ کر تانگے دے کے کہا تھوڑا سا سیر کرو۔ لیکن جلدی پہنچاؤ گئے وہاں ایک بڑا ضروری کام ہے۔“

مگر گھوٹ بہت ہی سُست رہا تھا۔ شاید زہر کا ایسا محسوس ہوا کہ اُس کو غفلت تھی۔ وہ برق رفتاری سے گھر پہنچا جہاں تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ تانگے سے سخت سُست الفاظ کہے، جو وہ برداشت کر گیا، آخر جب اُس کی برداشت کا پتہ نہ ہو سکا گیا تو اُس نے زہر کو تانگے سے اتار دیا۔ ہائی کوٹ کے قریب۔ اُس نے زہر سے کہ یہ بھی طلب نہ کیا۔

زہر اور زہر زیادہ پریشان ہوا۔ وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر چل کر کھڑا ہوا۔ اتنے میں ایک پشاور سی آگے آیا اس میں بیٹھ کر وہ مزہنگ پہنچا کر آیا اور ایک اور گھر میں داخل ہوا۔

کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں جو غالباً ہمسائی تھیں۔ وہ دوا داز سے کہ پاس رک گیا۔ ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی، منتقلی سے بچے کی پیچیدگی — قرضے کے زہر سے بڑے خطرناک ہیں۔“

زہر اُن عورتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے دوا داز اندر بھاگا اور اُس کے کمرے میں پہنچا جہاں دوا داز اُس کی بیوی رہتے تھے۔ زہر داخل ہوتے ہی اُس نے اپنی بیوی کی غلگ شگاف و بھج سنی۔

اُس کی بیوی دم توڑ پکی تھی۔ اور اُس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ زہر نے اپنا سر پیٹا شروع کر دیا۔ ہمسائیاں پروے کو کھڑا کر کے اختیار اندر چلی آئیں اور زہر کو اُس کے کمرے سے باہر نکال دیا۔

ایک ہمسائی کے شوہر کے پاس موٹر تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر لے آیا۔ اُس نے زہر کو کچھ بیوی کا ایک دوا بخش لگائے جن سے وہ ہوش میں آ گئی۔

زہر ایک ایسے عالم میں تھا کہ اُس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں معطل ہو گئی تھیں۔ وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا، بغل میں غفلت دوائے غلامیں دیکھ رہا تھا، جیسے وہ اپنی بچی کے لیے کوئی نام تلاش کرنے میں مصروف ہے۔

بچی کو دفنا کے وقت آیا تو زہر باہر ہوش ہو گیا۔ اُس نے کوئی آنسو نہ بہایا، گھٹن میں پڑی پکی کر ڈھایا اور اپنے دوستوں اور ہمسایوں کے ہلو قبرستان روانہ ہو گیا۔ وہاں قبر پر پہنچے سے تیار کرا لی گئی تھی۔ اس میں اُس نے خود اُسے ڈھایا اور اُس کے ساتھ

لغت دکھادی۔

لوگوں نے کہا، قرآن مجید ہے، انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ مہدوں کے ساتھ قرآن کریم بھی کرتا ہے۔ یہ تو سراسر کفر ہے،
لیکن ان میں سے کسی نے بھی زہاد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا۔ بس آپس میں کھسکھسکاتے رہے۔
بچی کو زندہ کر جب گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو بہت تیز بخار ہے، سر سام کی کیفیت ہے۔
فوراً ڈاکٹر کو بلا دیا گیا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا اور زہاد سے کہا حالت بہت نازک ہے — میں علاج تجویز کیے دیتا
ہوں، لیکن میں صحت کی بحالی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

زہاد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس پر کیلی آن کر رہی ہے، لیکن اس نے منہ بند کر ڈاکٹر سے پوچھا، تکلیف کیا ہے؟
ڈاکٹر نے جواب دیا، بہت سی تکلیفیں ہیں — ایک تو یہ کہ انھیں بہت صدمہ پہنچا، دوسری یہ کہ ان کا دل بہت
کمزور ہے — تیسری یہ کہ انھیں ایک سوسائٹی ڈگری بخار ہے۔
ڈاکٹر نے چند ٹیکے تجویز کیے، دوسٹھے پلانے والی دوائوں کے کلمے اور پلا دیا۔
زہاد فدا یہ سب چیزیں لے آیا۔ ٹیکے لگاتے دوائیں بڑی شکل سے علق ہیں پچکائی گئیں — لیکن مریضہ کی حالت
بشرط ہوئی۔

دس پندرہ روز کے بعد اسے تھوڑا سا ہوش آیا، بذریعہ کیفیت بھی ڈور ہو گئی۔ زہاد نے امینان کا سامن لیا، اس کی
پیاداری جیسی بیوی نے اسے بلایا اور بڑی خیمت آواز میں کہا، تیرا اب آخری وقت آگیا ہے — میں چند گھنٹوں کی صاف
ہوں۔

زہاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، کیسی باتیں کرتی ہو تم — تمھیں خدا غافل ستا اگر کچھ ہو گیا تو میں کہاں زندہ رہو گا۔
زہاد کی بیوی نے بھی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں — میں مرنے والی دوسری آج صبح
کی — خدا آپ کی کردار کرے — اور — اور —

اس نے چمکی لی اور ایک سیکڑ کے اندھا اندھ اس کی نوح پیدا کر گئی — زہاد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا، اس
کے گھٹن دفن سے فارغ ہو کر دودھات کو گھر سے باہر نکلا اور دریچے سے ٹائم ٹیبل دیکھ کر دریچے سے باہر نکلا۔
رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب ایک گاڑی آئی تھی۔ وہ منہ پرہ کی طرف روانہ ہو گیا، تاکہ وہاں پٹریری پریٹ سٹاپ
اور اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ گاڑی آئے گی تو اس کا خاتمہ ہو جائے گا — مجھے بسی عمر کی کوئی خواہش نہیں — یہ جتنی جلدی
مقرر ہو، اتنا ہی اچھا ہے، میں اب اور زیادہ صدمے برداشت نہیں کر سکتا۔

جب وہ دریچے سے باہر نکلا تو اسے گاڑی کی تیز روشنی جو انجن کی میٹانی پر برقی ہے دکھائی دی — لیکن
ابھی وہ ڈور ہی تھی، اس نے انتظار کیا کہ جب قریب آئے گی تو وہ پٹریری پریٹ سٹاپ جائے گا۔
تھوڑی دیر کے بعد گاڑی قریب آ گئی — زہاد اگے بڑھا، مگر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی کیس سے نمودار ہوا اور

پشاور سے لاہور تک

وہ انٹر کلاس کے زمانہ ڈبے سے نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ جاوید پشاور سے اُسے دیکھتا چلا رہا تھا۔ روپینڈی کے ایشیائی پر گاڑی کافی دیر ٹھہری تو وہ ساتھ والے زمانہ ڈبے کے پاس سے کئی مرتبہ گزرا۔

لوکی جیسی تھی۔ جاوید اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اُس کی ناک کی کھنکھ پر چھوٹا سا نقل تھا۔ لکالوں میں تھیں تھیں گڑھے تھے جو اُس کے چہرے پر بہت چھلے لگتے تھے۔

روپینڈی ایشیائی پر اُس لوکی نے کھانا منگوا دیا۔ بڑے اطمینان سے ایک ایک نوالہ اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتی رہی۔ جاوید فور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُس کا ہنچا ہوتا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ بیٹھ جائے اور دونوں مل کر کھانا کھالیں۔

وہ یقیناً اُس کے پاس پہنچ جاتا تو مسیبت یہ تھی کہ ڈبہ زمانہ تھا۔ عورتوں سے بھل بھلا ایسی وجہ ہے کہ برأت نہ کر سکا۔ لوکی نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے، جو بہت نازک تھے، ایسی لمبی خردلی انگلیاں، جن کو اُس نے اچھی طرح صاف کیا اور اٹیچی کیس سے تویہ نکال کر اپنے ہاتھ پر پٹھے۔ پھر اطمینان سے اپنی سیٹ پر لیٹی گئی۔

جاوید گاڑی چلنے تک اُس کی عورت دیکھتا رہا۔ آخر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا اور اُسی لوکی کے خیال میں مرنے ہو گیا۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ ڈبے اچھے گھولنے کی ہے۔

دولوں کلر ٹھلڈ میں قریب قریب بارہ بارہ سولے کی چوڑیاں ہوں گی۔ کانوں میں ٹاپس بھی تھے۔ دوا انگلیوں میں، اگر میرا اندازہ غلط نہیں، میرے کی انگریزیاں ہیں۔ لباس بہت عمدہ۔ ساٹن کی شلوار۔ گتھیا کی قمیض۔ سفینوں کا دوپٹہ۔

حیرت ہے کہ گتھیا درجہ میں کیوں سفر کر رہی ہے ؟

پشاور سے آئی ہے — وہاں کی عورتیں تو سخت پردہ کوئی ہیں — لیکن یہ برقعے کے مفیدواں سے گاڑی میں

سوار ہوئی۔ اور اُس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں — ذکوئی عورت۔ اکیلی سفر کر رہی ہے۔ آخر یہ قصہ کیا ہے ؟

میرا خیال ہے، پشاور کی رہنے والی نہیں — وہاں کسی عزیز سے ملنے گئی ہوگی — مگر اکیلی کیوں ؟

کیا اسے ڈر نہیں لگا کہ اٹھا کر لے جائے گا کوئی — ایسے تنہا شخص پر تو ہر مرد جھپٹا اڑا چاہتا ہے۔

پھر جاوید کو ایک اندیشہ ہوا — کہ شادی شدہ تو نہیں ؟

وہ دو ماصلہ دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس لوکی کو بچھا کر سے لگا اور وہاں لوہا کر اُس سے شادی کرے گا۔ وہ حرام کاری کا

بالکل خائف نہیں تھا۔

نئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ اُسے صرف دواول پنڈی تک جانا تھا کہ وہاں ہی اس کا گھر تھا، مگر وہ بہت آگے نکل گیا۔

ایک اسٹیشن پر چکی تک پہنچی، جس کے بائیں اُسے جہان آباد کرنا چاہا، مگر اُس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ ٹھٹھٹ چکی نے رُخ کیا، آپ کو کہاں تک جانا ہے؟

جاؤ یہ سکوڑا بھی، ابھی تک معلوم نہیں۔ آپ لاہور کا ٹھٹھٹ بنا دیجیے کہ وہی آخری اسٹیشن ہے؟ ٹھٹھٹ چکی نے اُسے لاہور کا ٹھٹھٹ بنا دیا۔ روپے وصول کیے اور دوسرے اسٹیشن پر آ کر گیا۔ جاؤ یہ بھی اترا کہ ٹریس کو ٹرام ٹیبل کے مطابق پانچ منٹ ٹھہرا تھا۔

ساتھ والے کپار ٹھٹ کے پاس گیا۔ وہ لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی دانتوں میں غلام کر رہی تھی۔ جاؤ یہ کی طرف جب اُس نے دیکھا تو اُس کے دل و دماغ میں عجیبیاں مٹھنے لگیں اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی موجودگی سے ناخوش نہیں ہے۔ کچھ گپ ہے کہ وہ بار بار صوفے سے ہی دیکھنے آتا ہے۔

جاؤ یہ کہہ کر وہ مسکرائی اُس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ مگر جاؤ یہ غلط جذبات کی وجہ سے فرما رہا ہے کہ ہٹ کر اپنے ڈبے میں چلا گیا اور دواول کی کوئی اسکرین کے پاس لگا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے پاس کی تمام چیزیں ٹھسکا رہی ہیں۔

ٹریس کا کچھلا مسکوڑا رہا ہے۔ کھڑکی سے باہر تار کے کچھلے مسکوڑا ہے۔ ابھی کی سیٹی ٹھسکا رہی ہے۔ جاؤ یہ بدعورت مسافر جو اُس کے ساتھ بیٹھا تھا، اُس کے موٹے موٹے جوتوں پر بھی مسکرا ہٹ ہے۔ اُس کے اپنے جوتوں پر مسکرا ہٹ نہیں تھی، لیکن اُس کا دل ٹھسکا رہا تھا۔

اگلی اسٹیشن پر جب وہ ساتھ والے کپار ٹھٹ کے پاس گیا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اُس کا دل دھک سے رو گیا کہاں چل گئی؟۔ کیوں پچھلے اسٹیشن پر تو نہیں آ کر گئی جہاں اُس نے ایک ٹھسکا ہٹ سے کچھ نوازا تھا؟۔ نہیں نہیں غفل تھا۔ میں ہوگی۔

وہ واقعی غفل خانہ ہی میں تھی، ایک منٹ کے بعد وہ کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ جاؤ یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور اچھٹ کے اشارے سے اس کو بڑھایا۔

جاؤ یہ کا پتا نہ لڑا کھڑکی کے پاس پہنچا، اُس لڑکی نے ٹری میں صبر اور سُرخ آواز میں کہا ایک تکلیف دہنا چاہتی ہوں آپ کو۔ مجھے دوسیب لاد دیجیے۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنا پرس نکالا اور ایک روپے کا نوٹ جاؤ یہ کی طرف بڑھا دیا۔

جاؤ یہ نے جو اس غیر متوقع ہلاکے سے قریب قریب ہتی زدہ تھا، ایک روپے کا نوٹ پکڑ لیا، لیکن فوراً اُس کے ہوش محسوس ہوئے۔ تو وہ اُس سے کہہ کر اُس نے اُس لڑکی سے کہا، آپ یہ رکھیے۔ میں سبب لے آتا ہوں۔ اور چیت غامی ٹریس ریڑھی کی طرف دوڑا جس میں چیل پیچے جاتے تھے۔ اُس نے جلدی جلدی چھ سبب خریدے، دیکھو نکو دسل بہر کی تھی۔

وہ دوڑا دوڑا وہ اُس لڑکی کے پاس آیا۔ اُس کو سبب دیے اور کہا تعاف کیجیے گا۔ دسل بہر ہی تھی اس لیے میں

اچھے سیب بچیں نہ سکا :

لڑکی مسکراتی۔۔۔ وہی دل غریب مسکراہٹ۔ گاڑی حرکت میں آئی۔ جاؤید اپنے کپڑاؤں میں داخل ہوئے
گو کانپ اٹھا۔ لیکن بہت خوش تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اُس کو دھڑکن چلیں لگے ہیں۔ اُس نے اپنی زندگی میں کبھی
کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ اس کی قدرت سے کھٹک اٹھ رہا ہوا تھا۔

اُس کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ اُس نے سوچا کہ اتنی دیر میں کتنا خفکھار ہوا۔ آج سلوم خواہے کہ محبت انسان کتنی
توڑنا دہنا دیتی ہے۔ وہ سیب کھا رہی ہوگی۔ لیکن اُس کے گال تو خود سیب ہیں۔ میں نے جو سیب اُس کو
دینے ہیں کیا وہ اُن کو دیکھ کر شرمندہ نہیں ہوں گے۔

وہ میری محبت کے اشاروں کو سمجھ گئی۔ ابھی تو وہ مسکراتی، اور اُس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بُلایا اور کہا کہ میں اُسے
سیب لادوں۔

مجھ سے اگر وہ کتنی کڑاڑی کاٹخ پلٹ دوں تو میں خدا کی قسم اُس کی خاطر یہ بھی کر دیتا۔ گو مجھ میں اتنی طاقت نہیں لیکن
محبت میں آدمی بہت بڑے بڑے کام سر انجام دے سکتا ہے۔ فرماؤں شیریں کے لیے پاؤں کاٹ کر نہ نہیں لکھو دی تھی؟
میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ اُس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم میں کچھ لیا ہوتا کہ تمہیں کہاں تک جانا ہے۔ خیر
میں لاہور تک کا ٹکٹ تو ضرور چکا ہوں۔ ہر اسٹیشن پر دیکھ لیا کروں گا۔

وہ اب مجھے یہ بتائے جانے لگی تھیں۔ شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ میرے ہندو محبت سے اُسے
کافی متاثر کیا ہے۔ سیب کھا رہی ہے کاش کہیں اُس کے پاس بیٹھا ہوتا۔ ہم دونوں ایک سیب کو یک وقت اپنے
دانتوں سے کاٹتے۔ اُس کا سر میرے منہ سے کتنا قریب ہوتا۔

میں اُس کے گھر کا پتہ لوں گا۔۔۔ فوراً اور باتیں کروں، پھر واپس پشٹی پہنچ کر اتنی سے کہوں گا کہ میں نے ایک لڑکی
دیکھ لی ہے، اُس سے میری ملاوی کر دیجیے۔ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔ بس ایک دو بیٹے کے اندر اندر شادی ہو
جائے گی۔

اگلے اسٹیشن پر جب جاؤید اُسے دیکھنے گیا تو وہ پانی پی رہی تھی۔ دو عورت کر کے آگے بڑھا اور اُس سے مخاطب
ہوا آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو فرما دیجیے۔

لڑکی مسکراتی۔۔۔ وغریب مسکراہٹ۔ مجھے سگڑٹ لاد دیجیے۔

جاؤید نے بڑی حیرت سے پوچھا، آپ سگڑٹ لیتی ہیں؟

وہ لڑکی پھر مسکراتی ابھی نہیں۔ یہاں ایک عورت ہے، پودہ دار، اُس کو سگڑٹ پینے کی عادت ہے۔

اور!۔۔۔ میں ابھی لایا۔۔۔ کس برائے کے سگڑٹ ہوں پتہ

سمیرا خیال ہے، وہ گڑھ نیکسٹ ہوتی ہے۔

”میں بھی حاضر کیجیے دیتا ہوں نہ یہ کہہ کر ہائیڈر اسٹیل کی طرف دوڑا۔ وہاں سے اُس نے دو پکٹ لیے اور اُس لڑکے کے حوالے کر دیے۔ اُس نے خلیں اُس عورت کی طرف سے ادا کیا جو سگریٹ چبے کی عادی تھی۔

جاوید نے ہر دو بھی غرض تھا کہ اُس لڑکے سے ایک اور عورت ہو گئی۔ مگر اس بات کی بڑی اہمیت تھی کہ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ خود کو کوسا کہ اُس نے نام کہیں نہ پوچھا۔ اتنی باتیں ہوئی ہیں، ایک سے وہ اُس سے اتنا بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ نام بتاؤ۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ اگلے اسیشن پر جب گاڑی ٹھہرے گی تو وہ اُس سے نام پوچھ لے گا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ فوراً بتا دے گی، کیونکہ اُس میں کہا صحت بھی کیا تھی۔

اگلے اسیشن بہت دور کے بعد آیا، اس لیے کہ فاصلہ بہت لمبا تھا۔ جاوید کو بہت کوفت ہو رہی تھی اُس نے کئی مرتبہ ناظم ٹیبل دیکھا، گٹھری بار بار دیکھی۔ اُس کو یہی چاہتا تھا کہ وہی کوئی رنگ ہا جس کا وہ ڈاکر جلدی اگلے اسیشن پہنچ جائے۔ گاڑی ایک دم دیکھی معلوم ہو کر اگلے کے ساتھ ایک بیٹس بنگلہ گئی ہے۔ وہ اپنے کیا ڈسٹ سے آ کر راز کھاتہ دے ڈالے کہ اس پہنچا، مگر لڑکی اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔

مسالوں نے وہی کئی ہوئی بیٹس کو پٹری سے جٹلنے میں کافی پریشانی دے رکھی تھی وہ لڑکی م غائب ہو مری طرف کھانسا دیکھنے میں مشغول تھی آئی اور اُن سے ملنے لگی تھی۔ جاوید پہچانے کہ اُس کی نظر اُس کی طرف سے ٹپکسائی — وہی اظہار ہو سکتا ہے۔

ہاتھ دھو کر کھانے کے پاس گیا، مگر اُس کا نام نہ پوچھ سکا۔

لڑکی نے اُس سے کہا ”میں یہیں کیوں گاڑی کے نیچے آجاتی ہیں؟“

جاوید کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ گاڑی چلنے والی تھی، اس لیے وہ اپنے کیا ڈسٹ میں پھانسا گیا۔

کئی اسیشن آئے مگر وہ نہ آتا۔ آخر کار سہرا گیا۔ بیٹس غلام پر جب گاڑی کی تو وہ جلدی جلدی باہر نکلا۔ لڑکی ابھی تھی۔ جاوید نے اپنا سامان نکال دیا اور اُس نے جس نے ہاتھ میں لپی کس پکڑا ہوا تھا کہا ”آئیے یہ لپی کیس مجھے دے دیجئے۔“

اُس لڑکی نے لپی کیس جاوید کے لئے کر لیا۔ لٹی نے جاوید کا سامان اٹھایا اور دو لوں باہر نکلے تاکہ وہ جاوید نے لپی کیس چھاپ کر کہاں جاتا۔ لڑکی نے بڑے نرم و نازک لیچر میں جواب دیا ”جی، ارادی دوڑ۔“

پہلے میں آپ کو وہاں چھوڑ آتا ہوں۔“

بہت بہت شکریہ۔“

تاکہ رات ہی دوڑ سے گزرا تھا۔ جاوید نے اُس لڑکی سے پوچھا کہاں جائیے گا اب آپ؟

لڑکی کے ہونٹوں پر وہی دلچسپ مسکراہٹ پیدا ہوئی تھی جیسے مٹھی۔“

جاوید پر کھل سا گیا کیا آپ وہاں رہتی ہیں؟

لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا — ”جہاں — میرا مکان دیکھ لیں آج رات میرا مکان سے ضرور آئے گا۔“

جاوید پرشاد سے کہہ کر ہر شک پہنچا، اُس نے اُس کا نام اُس کے طرف سے لے کر چھوڑا اور اُس نے اسے یہ کہہ کر دیکھا کہ اُس نے اُس کا نام لے لیا۔

نجلی پہلوان

بجلی پہلو ان کے متعلق بہت سے قصے شہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ برقی رفتار تھا بجلی کے انشا پر نے دشمنوں پر گزرتا تھا اور انھیں بھسم کر دیتا تھا۔ لیکن جب میں نے اُسے مٹی بازار میں دیکھا تو وہ مجھے بے ضرر لگتا کہ وہ انشا خطرناک یا بڑا پچیس سا۔ تو نہ باہر نکل پرتی، بند بند ٹھیلے۔ گال ٹپکے جرتے۔ اب اس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔

وہ مثل بازار میں ایک بزرگ کی دکان پر آتی پانچ لاکھ بیسواقت میں نے اُس کو خریدے رکھا، مجھے اُس میں کوئی ختمہ نہیں نظر آیا۔
حالانکہ اُس کے متعلق مشہور یہ تھا کہ ہندوؤں کا وہ سب سے بڑا ختمہ ہے۔

وہ غنڈہ ہرجی نہیں سکتا تھا، اس لیے کٹاؤں کے خود خلائ اس کی نفعی کرتے تھے۔ میں تصویریں دیر سنانے والی کتابوں کی دکھائی کے پاس کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ راستے میں ایک مسلمان عورت جو بڑی منگھس دکھائی دیتی تھی، بڑا بڑا کی دکھائی کے پاس چلی۔ پہلی پہچان سے اس نے کہا ”مجھے پہلی پہچان صاحب سے ملتا ہے۔“

بجلی پھولان لے ہاتھ جوڑ کر اُسے پر نام کیا ماما، میں ہی بجلی پھولان ہوں۔“

”اُس عورت نے اُس کو سلام کیا خدا تمہیں سلامت رکھے۔ میں نے سنا ہے کہ تم بڑے دلاور ہو۔“

بھلنے بڑی انکساری سے کہا گاتا، دیا اور پیشور ہے۔ میں کیا یا کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے بتاؤ کہ میں کیا سیکھا کر سکتا ہوں۔
 ”جیسا، مجھے رشی جہان لڑا کی کاہنیا کرنا ہے۔ تم اگر سری کچھ مدد کر سکو تو میں ساری عمر تمہیں دعاؤں دوں گی۔“
 بھلنے نے اس عورت سے پوچھا: کتنے دنوں میں کام چل جائے گا؟

عورت نے جواب دیا: ”جیسا کہ تم کہہ رہی ہو۔“ — یہی تو ایک بھکاری کی کہ تھکے پاس آئی ہوں۔“

بھلی نے کہا تب جانور منہ سے ڈنگو — میرا فرض ہے کہ میں تمہاری مدد کروں۔ "اس کے بعد اس نے منہ سے جو تھاں تھرک رہا تھا کھالڑی سی — دلا ہوا رو پچے نکالیے۔"

”آہ! — بھلا ان کرے کہ تمھاری بیٹی کے بھاگ اچھے ہوں۔“

وہ عورت چند لمحات کے لیے، نوٹ باتھ میں لیے بُت بٹا کھڑی رہی۔ غالباً اُس کو اتنے سوچے ایک دم مل جانے کی توقع ہی نہیں تھی۔

جب وہ شہنشاہی قرائن نے بجلی پیلوئن پر دھماکوں کی برصیحا بکرو دی۔ میں نے دیکھا کہ پیلوئن ٹوٹی الجھن محسوس کر رہا تھا، آخر میں

نے اُس نے اُس عورت سے کہا تھا، مجھے شرمندہ نہ کرو۔۔۔۔۔ جانو، اپنی بیٹی کے دان و سبز کا انتظام کرو۔۔۔۔۔ اُس کو میری اظہارِ بادشاہی۔

میں سوچ رہا تھا کہ جس قسم کا خٹہ دان بد معاش ہے جو وہ ہزار روپے ایک ایسی عورت کو بڑا سلطان ہے اس سے وہ جانتا نہیں۔ وہ ہزار روپے کچا دیتا ہے۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا خیر ہے۔ ہر بیٹے ہزار روپے دان کے طور پر دیتا ہے۔ مجھے جو کہ اُس کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اس لیے میں نے کافی چھان بین کے بعد پہلی پہلو ان کے متعلق کئی معلومات حاصل کیں۔

مغل بازار کی اکثر دکانیں اُس کی تھیں۔ عوامی کی دکان ہے، ہزار کی دکان ہے، شربت بیچنے والا ہے، ٹیشے فروخت کرنے والا ہے، دوسری ہے، غرض کہ اس سے اُس سے سب کچھ جہاں وہ ہزار کی دکان میں بیٹھا تھا، اُس نے ایک لائن آف کمرنکیشن قائم کر رکھی تھی۔ تاکہ اگر وہ جس چھاپہ مارنے کی غرض سے آئے تو اسے فوراً اطلاع مل جائے۔

دراصل اُس کی دو پیشگوئیاں میں ہزار کی دکان کے بالکل سامنے تھیں، بہت بھاری تھا جوتا تھا۔ ہر روز ہزاروں روپے مال کی صورت میں اُسے وصول ہو جاتے تھے۔

وہ خود بخود نہیں کھینچتا تھا، شراب پیتا تھا مگر اُس کی پیشگوئی میں شراب ہر وقت ملی سکتی تھی۔ اس سے بھی اُس کی آمد کافی تھی۔ شہر کے پتے بڑے بڑے خٹہ تھے، اُن کی اُس نے ہفتہ مقرر کر رکھا تھا، بیٹی ہفتہ وار انھیں ان کے مرتبے کے مطابق تحفہ دہی جاتی تھی۔ میرا خیال ہے، اُس نے یہ سلسلہ بطور تحفہ یا مقدم شروع کیا تھا کہ وہ خٹہ بڑی خطرناک قسم کے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کہ وہ خٹہ سب کے سب سلطان تھے، زیادہ تر باقی دواڑے کے۔ ہر پتے پہلی پہلو ان کے پاس جاتے اور ہائی تنخواہ وصول کر لیتے۔۔۔۔۔ وہ ان کو بھی ناامید نہ ہوتا، اس لیے کہ اُس کے پاس وہ یہ عام تھا۔

میں نے سنا کہ ایک دن وہ ہزار کی دکان پر جب معمول بیٹھا تھا کہ ایک ہندو خیا جو کافی مالدار تھا، اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی پہلو ان ہی، میرا لاکھا خراب ہو گیا ہے۔ اُس کو شیک کر دیکھے۔

پہلو ان نے مسکاکر اُس سے کہا میرے دواڑے ہیں۔ بہت شریفانہ۔ لوگ مجھے خٹہ اور بد معاش کہتے ہیں، لیکن میں نے انھیں اس طرح پالا پلو سا ہے کہ وہ کوئی بڑی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ حاضری یہ آپ کا قصور ہے، آپ کے بڑے لاکے لائیں۔

بچے نے ہاتھ جوڑ کر کہا پہلو ان ہی۔۔۔۔۔ میں نے بھی اُس کو اسی طرح پالا پلو سا ہے۔ پر اُس نے اب چوری چوری بہت بڑے کام شروع کر دیے ہیں۔

پہلی نے پتا فیصلہ نہ دیا، اس کی شادی کر دو۔

اس واقعے کو دس روز گئے تھے کہ پہلی پہلو ان ایک نوجوان لڑکی کی بہت سی گرفتار ہو گیا، حالانکہ اُس قسم کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکی کی سروسٹروورس کے لگ بھگ ہر گاہ اور پہلی پہلو ان سے آہر ہو گیا، آہی با آہر مالدار تھا۔ لڑکی کے والدین ماضی ہو گئے چنانچہ شادی ہو گئی۔

اس نے شمر کے باہر ایک عالی شان کوٹھی بنائی تھی۔ وہ اس کو جب اس میں لے کر گیا، تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام بھاڑ ہر ماہ اس میں گھس گئے ہیں۔

وہی بہت خوبصورت تھی۔ پہلی رات بگل پہلوان نے کسرت کرنا چاہی، مگر نہ کر سکا، اس لیے اس کے داغ تین انچ لمبی چری کا خیال کوڑوں سے رہا تھا۔ اس کے دو جوان لڑکے تھے، جو اس کو گلی کے ایک کمرے میں رہ رہے تھے، یہاں رہ رہے تھے۔ اُس نے اپنی پہلی چری کو کہیں باہر بیچ دیا تھا۔ اس کو اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اُس کے ہاتھ کی دوسری ٹانگیوں پر ہے۔ بگل پہلوان سوچتا تھا کہ اسے اور کچھ نہیں تو اپنی پہلی ستری کو منسلک کر دینا چاہیے تھا۔

ساری رات سخت گرمی تھی، چاروں کمرے میں سردیوں کے قہر تھی، چاروں کمرے میں بگل پہلوان کی ٹانگیوں کی ٹانگیوں پر تھیں۔ سنی چری، اُس کی کمرے میں نہیں آتا تھا کہ یہ ٹانگیوں کا ہے، کہا اسے ہر روز اس قسم کی باتیں سننا ہوتا تھا۔

"اگر میں چاروں کمرے میں آتا تو اس کے کمرے میں رہتا اور لڑائی لڑتا۔"

"تم ہی سہی ہو۔"

"میری کھال کی، یا پھر؟"

"سارا اٹھو کھجور کھا رہا ہے۔"

"اگر کوئی میں چاروں کمرے میں آتا تو اس کے کمرے میں رہتا۔"

کتنے لوگ چاروں کمرے میں تھے۔ ایک منٹ میں انتظام ہو جائے گا۔

"تیسرے دو جوان لڑکے ہیں، بہت شریف۔ تم ان سے جو کام لینا چاہو سکتے ہو، وہ تمہارا حکم مانیں گے۔"

وہ اس ہر روز اس قسم کی باتیں سنتی رہی، حتیٰ کہ چھوٹے بچے گھر گئے۔ بگل پہلوان دن بدن اُس کی محبت میں غرق ہوتا گیا۔ وہ اُس کے پیچھے پیچھے نقل و حرکت کرتا رہتا تھا، ساری پہلوانی بھول جاتا۔

اُس کی پہلی چری بد شکل تھی، ان منٹوں میں کہ اُس میں کوئی کشش نہیں تھی، وہ ایک عام کھڑی تھی جو ایک بچے کے بعد ہی بدلتی ہو جاتی ہے۔ لیکن اُس کی دوسری چری بڑی شرمیلی تھی، اس بچے پیدا کرنے کے بعد بھی وہ ثابت و سالم رہ سکتی تھی۔

بگل پہلوان کا ایک روز دوست تھا، اُس کے پاس وہ کئی دنوں سے جا رہا تھا، اُس نے بگل کی لڑکیوں کو دیا کہ اب کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پہلوان خوش تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، اُس نے کئی ایکسپس تیار کیں، راستے میں ٹھانی خریدی۔ سونے کے دو ٹوکے بڑے خوشنما کرٹے لیے، بارہ فیصد اور بارہ فیصد لوگوں کے لیے بہترین کپڑا قیمت اور کچھ فیض حاصل کیا، اس لیے کہ وہ لوگ جو دکان کے مالک تھے، اس سے خوب تھے اور قیمت لینے سے انکار ہی تھے۔

شام کو سات بجے وہ گھر پہنچا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں گیا، دیکھا تو وہاں اُس کی دوسری چری نہیں تھی، اُس نے سوچا، شاید منسل خانے میں ہوئی، چنانچہ اُس نے اپنا بوجھ میرا طلب ہے، وہ تھا کہ وہ بگل پہلوان کو منسل خانے کا

سُج گیا۔ مگر وہ خالی تھا۔

بھلی چلوں بڑا سخت ہوا کہ اُس کی بیوی کہاں گئی۔ طرح طرح کے خیالات اُس کے دماغ میں آئے مگر وہ کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔ اُس نے رید کی دی ہوئی گولیاں کھائیں اور پینک پر بیٹھ گیا کہ اُس کی بیوی آجائے گی۔ آخر اسے جانا کہاں ہے ؟ وہ گولیاں کھا کر ہنگامہ پر بیٹھا قبیعوں کے کپڑوں کو انگلیوں میں مسل مسل کر دیکھ رہا تھا کہ اُسے اپنی بیوی کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا۔ اُٹھ کر اُس کے کمرے میں گیا جہاں اُس نے اپنے بڑے لڑکے کو رہنے دیکھا تھا۔ اندر سے اُس کی بیوی اور اُس کے بیٹے کی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔

اُس نے دستک دی ————— لیکن دوازہ نہ کھلا۔ پھر بڑے اندر سے چلا تاٹھورا کیسا کہ دوازہ کھولو۔ اُس وقت اُس کا خون کھول رہا تھا۔

دوازہ پھر مٹی نہ کھلا ————— اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کمرے کے اندر اس کی بیوی اور اُس کے بڑے لڑکے نے سانس لینا بھی بند کر دیا ہے۔

بھلی چلوں نے بڑے کمرے میں جا کر کونکھی زبان میں ایک دھوکھا جس کی عبارت اُدھر میں کپڑوں پر ہو سکتی ہے۔

یہ کونکھی اب تمھاری ہے ————— میری بیوی کونکھی اب تمھاری بیوی ہے خوش رہو۔

———— تمھارے لیے کچھ تحفے لایا تھا۔ وہ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔

یہ دھوکھ کہ اُس نے ساتھی کے تھکان کے ساتھ ملا کر دیا۔

(۲۷ مئی ۱۹۵۳ء)

ایک زاہد، ایک فاحشہ

جاریہ مسخو سے یہ لاتا گیا کہ وہ ستانہ تھا کہ میں ایک قدم بھی اُس کی مرضی کے خلاف اٹھا نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھ پر شاہ تھا۔ میں اُس پر۔ ہم ہر روز قریب قریب دس بارہ گھنٹے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

وہ اپنے دشتے داروں سے خوش نہیں تھا۔ اس لیے جب بھی وہ بات کرتا تو کبھی اپنے بڑے بھائی کی بُرائی کرتا اور کتنا سنگ باش، برا و خور و جہاںش۔ اور کبھی کبھی گھنٹوں خاموش رہتا۔ جیسے خلا میں دیکھ رہا ہے۔ میں ان کے ان لمحات سے تنگ آ کر جب دور سے نکلتا، تب آویزا یہ کیا ہے ہر دم کی ہے۔

وہ ایک دم چڑھتا اور مفردت طلب کرتا اور — سعادت بھائی، سعادت کرنا — اچھا تو یہ کیا تھا۔
وہ اُس وقت بالکل خلیا لہر میں ہوتا — میں کتا بھی جاوے دیکھو — مجھے تعذیب و تنگ آؤ تو غلاموں نہیں کی گزریں
میں کھوجانا بالکل پسند نہیں — مجھے تو ڈر تھا ہے، ایک دن تم پائل ہو جاؤ گے۔

یہ سب کچھ اویزید بہت ہنسنا پائل ہوا بہت مشکل ہے سعادت —
لیکن آہستہ آہستہ اُس کا خفا میں دیکھنا بڑھتا گیا اور اُس کی خاموشی طویل سکوت میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ ہلکی سی مسکراہٹ جو اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت کیسلی رہتی تھی، بالکل عین کی پڑ گئی۔

میں نے ایک دن اُس سے پوچھا، آخر بات کیا ہے — تم تھیرا پانی بن گئے ہو — ہوا کیا ہے تمہیں؟ — میں
تھکا اور دست ہوں — خدا کے لیے مجھ سے تو پتا دار نہ چھپاؤ۔

جاریہ خاموش رہا۔ جب میں نے اُس کو بہت سی طعن کی تو اُس نے اپنی زبان کھولی۔ میں کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب آؤں گا۔ اُس وقت تمہیں جو پوچھنا ہو گا، بتا دوں گا۔

وعدہ کے مطابق وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے میرے روم آیا۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ بے حد خوبصورت، اُس میں
نفسانیت کی جھلک تھی۔ پڑھائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے میں وہ آوارہ گرد تھا۔ لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل
کر رہا تھا۔

میں اس کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ جب میں نے اُس کو سگڑ چوٹی کیا تو اُس نے مجھ سے کہا تم میرے روم کے متعلق پوچھنا
چاہتے تھے؟

میں نے کہا مجھے معلوم نہیں — روم ہے یا سوگ، بہر حال تم نازل حالت میں نہیں ہو — تمہیں کوئی ذکوہ نہیں

تھکت ضرور ہے ؟

وہ مسکرایا، ”جے — اس بے کر مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے ؟“

محبت ! — میں بوکھلا گیا — جانور کی طرح شکل اشارہ برس کی ہوگی — خود ایک خرمبو لڑکی کے مانند، جس کو کس لڑکی سے محبت ہو سکتی ہے، دیا ہو گئی ہے۔ وہ تو کمزوری لڑکیوں سے کیوں زیادہ شرمیلا اور پکھلا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا، تو مجھے ہوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک دہشتناک دو شیرازہ ہے جس نے پہلی دنگ کوئی مشتعل فلم دیکھا ہے۔ آج وہی لمحہ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔

میں نے پہلے سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے، مگر اُس کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ فکر کی انتہاء گسٹریوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخر میں نے پوچھا، کس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے تھیں ؟

اُس نے کوئی بھی نہ سنا محسوس نہ کی، ”ایک لڑکی ہے زائدہ — ہمارے پڑوس میں رہتی ہے، میں اُس سے محبت ہو گئی ہے۔“
 ہے عرصہ برس کے قریب ہے۔ بہت خوبصورت ہے اور بھولی بھالی — چور کا چھپے اُس سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں، اُس نے میری محبت قبول کر لی ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا تو پھر اس کا مطلب کیا ہے جو تم پر ہر وقت چھانی رہتی ہے ؟

اُس نے مسکرا کر کہا، ”معاذت، تم نے کبھی محبت کی ہو تو جانو — محبت اُسی کا دوسرا نام ہے — ہر وقت آدمی کھو یا کھو یا سا رہتا ہے، اس لیے کہ اُس کے دل و دماغ میں مروت خیال یا رہتا ہے — میں نے زائدہ سے تعارف کر لیا اور اور اُس سے کہا، کہ تمہارے بعد اگر کوئی ہستی مجھے عزیز ہے تو وہ میرا دوست معاشرت ہے۔“
 ”یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی ؟“

”بس، میں نے کہہ دیا — اور زائدہ نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ میں تھیں اُس سے ملاؤں، اُسے میری دھڑکنے پر
 جے سمجھیں پسند کرتا ہوں — روز، چلو گے اپنی بھالی کر دیکھنے۔“

میرے کچھ میں کچھ نہ آیا کہ اُس سے کیا کہوں، اُس کے پتے پتے نازک برٹریوں و نغصہ بھالی جتنا نہیں تھا۔
 ”میرے بات کا جواب دو۔“

میں نے سرسری طور پر کہہ دیا چلیں گے — ضرور چلیں گے — پر کہاں ؟

”اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کل شام کو پانچ بجے کسی ہالے سے لائسنس گاڑی آئے گی — آپ اپنے پیارے دوست کو ضرور ساتھ لائیے گا — اب تم کل تیار رہنا — بلکہ خود ہی پانچ بجے سے پہلے پہنچے وہاں پہنچ جانا، جم جھانڈ کلب کے اس طرف ملاؤں میں تمہارا انتظار کرتے ہوں گے۔“

میں انکار کیسے کرتا، اس لیے کہ مجھے جانتا تھا، میں نے وعدہ کر لیا، لیکن مجھے اُس پر کچھ ترس آ رہا تھا میں نے اُس سے اچانک بڑھو لڑکی شریف اور پاک باز ہے نا ؟

جاوید کا چہرہ غصے سے تنہا نے لگا۔ میں زائدہ کے بارے میں ایسی باتیں سن سکتا ہوں، اسی مکتا ہوں — تھیں اگر اُس سے منا ہے تو کس شام کو تمکین لپٹا بیچے لادوس گاؤں زبیر بیچ جانا — خدا حافظ —

جب وہ ایک دم اُٹھ کر چلا گیا، تو میں نے سوچنا شروع کیا۔ مجھے بڑی مذمت محسوس ہوئی کہ میں نے کبھی اُس سے ایسا سوال کیا، جس سے اُس کے جذبات مروج ہوئے — آخر وہ اُس سے محبت کرتا تھا، اگر کوئی لڑکی اس سے محبت کرے تو ضروری نہیں کہ وہ بیکار ہو۔ جاوید اُس سے اپنا غصہ تین دو دوست یقین کرنا تھا میں وجہ ہے کہ وہ ناراضی کے باوجود اُس سے برہم نہ ہوا اور اُس کو جانتے ہوئے کہ گیا کہ وہ شام کو لادوس گاؤں نہ آئے۔

میں سوچنا تھا کہ زائدہ سے مل کر میں اُس سے کس قسم کی باتیں کروں گا بے شمار باتیں ہرے ذہن میں آئیں، لیکن وہ اس قابل نہیں تھیں کہ کسی دوست کی محبوبہ کی باتیں میرے متعلق خدا معلوم وہ اُس سے کیا کہو کہ چکا تھا — یقیناً اُس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرے والا نہ طور پر کہا ہوگا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زائدہ کے دل میں میری طوٹ سے حسد پیدا ہو گیا ہو، کیونکہ وہ تو اس سے عاشقوں کی محبت جتنے نہیں دیکھ سکتی، شاید میرا مذاق اُڑانے کے لیے، اُس نے جاوید سے کہا کہ تم مجھے اپنے پیارے دوست ضرور ملانا۔ ہر حال مجھے اپنے عزیز ترین دوست کی محبوبہ سے ملنا تھا — اس تقریب پر میں نے سوچا کہ کوئی تحفہ تو بے جانا چاہیے۔

رات بھر غور کرتا رہا، آخر ایک تحفہ مجھ میں آکر سوئے کے ٹیپس ٹیک کر میں گئے، انارکلی میں گیا تو سب دکانیں بند معلوم ہوا کہ انارکلی تعطیل ہے — لیکن ایک جہیز بری کی دکان کھلی تھی اُس سے ٹاپس خریدے اور وہاں گھر آیا۔ چار بجے ٹیک شش دہریچ میں بٹکرا ہوا، کہ باؤں باز لڑکیوں۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہوتا ہے — لڑکیوں سے بے تکلف باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا، اس لیے مجھ پر گہرا ہٹ کا نام مل رہا تھا۔ درہر کہ کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دوسرا بچا ہوا، لڑکیوں میں بدنامی ٹاپس میرے کچے کے نیچے پڑے تھے۔ دس لگتا تھا کہ دو دیکتے ہوئے انگڑے ہیں — اُٹھا — غسل کیا۔ اس کے بعد شیو — پھر نہنایا اور کپڑے بدل کر بڑے کمرے میں کلاک کی جگہ ٹیک بیٹھنے لگا۔

تین بج چکے تھے۔ اخبار اُٹھایا — مگر اُس کی ایک خبر بھی نہ پڑھ سکا — عجیب مصیبت تھی، عشق پر دوست جاوید کو دنا تھا اور میں ایک قسم کا مجنون بن گیا تھا۔

میرا بہترین شوٹ، ریگن کا سا ہوا میرے بدن پر تھا۔ دو بال نیا خرچہ تھے — میں نے یہ سیکھا اس لیے کیا تھا کہ جاوید نے جو تعریف کے بلی زائدہ کے سامنے باندھے ہیں، کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔

سارے چار بجے میں اُٹھا۔ (خدا دے کہ بزم سنا بکلی فی اہا ہستا ہستا لادوس گاؤں روانہ ہو گیا، جم خانہ کلب کے اس طوفان میں مجھے جلد پید کرائی دیا وہ لگتا تھا، اُس نے زور کا غور بند کیا، میں جب سائیکل پر سے اُترتا تو وہ میرے ساتھ چھٹ گیا۔ کہنے لگا، تم پہلے ہی پہنچ گئے۔ بہت دھماکیا — زائدہ اب آتی ہی ہوگی — میں نے اُس سے کہا تھا کہ میں اپنی کاریبچ دوں گا۔ مگر وہ رشتہ مند نہ ہوئی، سا لگے میں آئے گی۔

جاوید کے باپ کی ایک کراچی۔ بے بی سٹن، خدا معلوم کس صدی کا موڈل تھا، یاد تو رہ جاوید میری کے متعلق میں آتی تھی۔

اور اس کا راز نر میں داخل ہوتے وقت یہ عجیب و غریب شور مچا دیتی تھی۔ میں نے اس سے کہا: ”کوئی شہر جاؤ۔“

لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ مجھ سے کہنے لگا: ”تم لیا کرو۔“ باہر گریٹ پر جاؤ۔ ایک تانگہ آگے گا، جس میں ایک ڈبلی بیکل دو کی سیاہ برتن پسنے ہوگی، تم تلگے والے کو شہر لایا اور اس سے کہنا: میں باقیہ کا دوست سہادت ہوں۔ اس نے مجھے خدا سے استفادہ کے لیے بھیجا ہے۔“

منہی جاتی رہ۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔“

• لاہور والے۔ جب تم نام بتا دو گے تو اسے چوک کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوگی۔ خدا کی برکت کا سوا ہی کسی پیدا ہوتا ہے۔ یاد زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہوتی چاہیے، جسے بعد میں یاد کر کے آدمی مفلح و کامیاب ہو سکے۔ جب لاہور سے میری شادی ہو چکی تھی تو ہم آج کے اس واقعے کو یاد کر کے خوب ہنسا کریں گے۔ جاؤ میرے بھائی۔ وہ اس اب آتی ہی ہوگی۔ میں جاؤ دیکھ کا کہنا کیسے ہوڑ سکتا تھا۔ بادل خواستہ چلا گیا اور گریٹ سے کچھ دور کھڑا ہو کر اس تلگے کا انتظار کرنے لگا، جس میں تانگہ اکیلے کا محلہ مرتضیٰ ہو۔

اور اسے گھٹنے کے بعد ایک تانگہ دور داخل ہوا، جس میں ایک لڑکی کا لے کر مٹی پر قہقہے مارتی ہوئی نشست پر ٹانگیں پھیلاتے بیٹھی تھی۔

میں جھینپا، ہنستا، ڈرتا، آگے بڑھا اور تلگے والے کو روکا۔ اس نے زوراً اپنا تانگہ روک لیا، میں نے اس سے کہا یہ سوائی کہاں سے آئی ہے؟

”تانگے والے نے ذرا سختی سے جواب دیا، تعین اس سے کیا مطلب۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“

برقع پوش لڑکی نے میں سے آنکھیں نہا کر اس تلگے والے کو تانگہ تم شریف آدمیوں سے بات کرنا بھی نہیں جانتے۔“

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی آپ نے تانگہ کچھ دنوں کا تھا جناب۔“

میں نے ہنسنے کے جواب دیا جاوید۔ جاوید۔ میں جاوید کا دوست سعادت ہوں۔ آپ کا نام یاد ہو جاتا۔“

اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا جی ہاں!۔ میں آپ کے متعلق اس سے بہت سی باتیں سن چکی ہوں۔“

”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے اسی طرح ملوں اور دیکھوں کہ آپ مجھ سے کس طرح پیش آتی ہیں۔ وہ ادھر

جم خانہ کلب کے پاس گھاس کے حقے پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“

اس نے اپنی نقاب اٹھائی۔ تجھی خاصی شکل صورت تھی، مسکرا کر مجھ سے کہتا آپ اگلی نشست پر بیٹھ جائیے۔ مجھے ایک

ضروری کام ہے۔ ابھی چند منٹوں میں لوٹ آئیں گے۔ آپ کے دوست کو زیادہ دیر تک گھاس پر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔“

میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگلی نشست پر کوئی اور ان کے ساتھ بیٹھ گیا، تانگہ اکیلے والے کے پاس سے گذر تو میں نے تلگے والے

سے کہا تھا میں صاحب یہاں کوئی سگرت والے کی دکان ہو تو زوراً پر کے لیے ضروری نام میرے سگرت تم ہو گئے ہیں۔

زوراً آگے بڑھے تو سڑک پر ایک سگرت دان والا بیٹھا تھا۔ تانگے والے نے اپنا تانگہ روکا، میں اترا اور زوراً دے کر کہا آپ بھوں

تکلیف کرنے ہیں۔ یہ تانگے والے آئے گا :

میں نے کہا : اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ اور اُس ہان گھٹ والے کے پاس پہنچ گیا۔ ہانگہ بڑا گڑبڑاٹیک کی لی ایک بچہ اور دو بچہ۔ سب پانچ کے نوٹ سے بال بچے کے گھڑا تو کچھ ان میرے بچے کھڑا تھا۔ اُس نے اپنی بیٹی ہاتھ سے کہا : جھوڑا اس صورت سے بچ کر رہے گا :

میں بڑا بیرون ہوا کیوں ؟

کچھ ان نے بڑے وٹوق سے کہا : ناسخ ہے۔ اس کا کام ہی یہی ہے کہ شریف اور فوجان لوگوں کو جانتی رہے۔
— میرے تانگے میں اکثر جھٹتی ہے :

یہ سن کر میرے ارمان بھلا ہو گئے میں نے تانگے والے سے خدا کے لیے تم اسے وہیں چھوڑاؤ، جہاں سے لائے ہو کہو دنیا کہ میں اُس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ میرا دوست وہاں اُن لوگوں کا ڈنڈہ نہیں اُٹھاتا کر رہا ہے۔
تانگے والا چلا گیا۔ معصوم نہیں اُس نے زائدہ سے کیا کہ میں نے ایک دو سڑا تانگہ لیا اور سیدھا اُن لوگوں کا ڈنڈہ پہنچا دیا کہ جو باوید ایک نو بہورت لوکی سے جو گفتگو ہے۔ بڑی شرمیلی اور بھلی تھی میں جب پاس آیا تو اُس نے فوراً اپنے دوپٹے سے سر چھپا لیا۔
جاوید نے بڑی خوشی آمیز بھڑک میں مجھ سے کہا : تم کہاں غارت ہو گئے تھے۔ تمہاری بھابی کب کی آئی تھی میں :
مجھ میں نہ آیا کیا کہوں۔ سخت ہلکا ہوا۔ اس ہلکا ہٹ میں یہ کہہ گیا تو وہ کون تھیں جو مجھے تانگے میں بیٹیں ؟
جاوید ہنسنا مذاق نہ کر رہا تھا۔ میں نے بڑا جاؤ اور اپنی بھابی سے باتیں کر رہے تھے کہ بہت مشتاق تھیں :
میں بڑھ گیا اور کوئی سیٹھ کی بات نہ کر سکا اس لیے کہ میرے دل دو داغ پردہ لوکی و صورت مستطیل برنگی تھی جس کے شعلہ تانگے والے نے مجھے بڑے غمزے سے بتا دیا تھا کہ ناسخ ہے۔

(۲۸۔ مئی ۱۹۵۷ء)

شیدا

جیتے کے سعلق، ان سرسبز پریشور تھا کہ وہ چٹان سے چٹا ٹکڑے کھتا ہے۔ اُس میں ہلائی پھرتی اور طاقت تھی، کوئی دوش کے کندھے سے وہ ایک کمزور انسان، کمزور انسان، ایک ہر ترس کے مارے غصے اُس سے غوث کھلتے وہ اُس کی حیرت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

فریاد کو چوک، معلوم نہیں فسادات کے بعد اُس کی کیا حالت ہے عجیب و غریب جگہ تھی۔ یہاں شام بھی تھی، ٹھکانہ حکیم بھی، موری اور بھلا ہے، جواری اور بدینہ عاشق، نیک اور پرہیزگار بھی یہاں بستے تھے، ہر وقت کہا گئی رہتی تھی۔

جیتے کی سرگرمیاں چوک سے باہر ہوتی تھیں یعنی وہ اپنے علاقے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا جس پر اُس کے محلے والوں کو اعتراض ہو۔ اُس نے جتنی لڑائیاں لڑیں، دوسرے غنڈوں کے محلے میں۔

وہ کہا کرتا تھا اپنے محلے میں کسی دوسرے محلے کے غنڈے سے لڑنا نامرہی کی نشانی ہے۔ مزا تو یہ ہے کہ اُس کی اپنی جگہ پر مارا جائے۔

اور یہ صحیح تھا، ایک بار چڑنگوں سے اُس کی ٹھن گئی، وہ کئی مرتبہ چوک فریاد سے گندے — جڑیں مارتے، نعرے لگاتے جیتے کہ گالیاں دیتے، وہ یہ سب سن رہا تھا، مگر اُس نے اُس سے بڑھ کر مناسب نہ سمجھا اور خاموش رحمان نامہ دیک کر کہاں میں چٹھا مارا۔

یہیں دو گھنٹوں کے بعد وہ چڑنگوں کے محلے کی طرف دوڑا نہ بھاڑا۔ اکیلا — بالکل اکیلا اور بچہ ترستہ۔

وہاں جا کر اُس نے ایک تنگ خشک نعرہ بلند کیا اور چڑنگوں کو کہ اپنے کام میں مصروف تھے ٹھکانہ اظہر مہر — تھکادی

.....

دس پندرہ چڑنگ لاشیاں لے کر باہر نکل آئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ میرا خیال ہے، شیدا گلے اور سرٹ کا ماہر تھا، اُس پر لاشیاں برساتی گئیں، لیکن اُس نے ایک بھی ضرب اپنے پر نہ گھنے دی۔ ایسے مہینے بدلتا کہ چڑنگوں کی ٹھن گم ہو گئی۔

آخر اُس نے ایک چڑنگ سے بڑی جاکھنٹی سے لاشی چھینی اور چند آدمیوں کو مار مار کے اوجھڑا کر دیا۔

دوسرے روز اُسے گرفتار کیا گیا — دو برس قید با مشقت کی سزا ہوئی، وہ جیل چلا گیا، جیسے وہ اُس کا اپنا گھر ہے۔

اس دوران میں اُس کی بیٹی ماں و تانہ فرقا ملاقات کے لیے آتی رہی۔

وہ مشقت کرتا تھا، لیکن اُسے کوئی کوفت نہیں ہوتی تھی، وہ سوچتا تھا کہ چلو وڑھ جو، ہی ہے صحت خراب رہے گی۔

اُس کی صحت باوجود اُس کے کہ کھانا کھا لیا، بیات، جوتا تھا، پھلے سے بنترتی اُس کا وزن بڑھ گیا تھا لیکن وہ بعض اوقات غمور ہوتا اور اپنی کوٹھڑی میں ساری رات جاگتا رہا، اُس کے برٹوں پر پنجابی کی یہ بولی ہوتی ہے

گی کچھے تیسری باری
منان منان ہو کے ٹٹ گئی

ایک برس گزر گیا، مشقت کرتے کرتے — اب اُس کی افسردگی کا انداز شروع ہوا، اُس نے خلقت بولیاں گا نا شروع کر دیں مجھے ایک قیدی سے بتایا جو اُس کے ساتھ والی کوشٹری میں تھا کہ وہ بولیاں گایا کرتا تھا، دے بھو جان گے یار گرا ہے
ٹھیکے نے کئے بھان دے

اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنا گوشہ محبوب مل جائے گا اگر تو دریا کے ساحل پر کشتیاں چلانے کا ٹھیکہ کر لے۔

گلابی کوٹ جاندی جھان دسی بریم وال
مٹھنے نے جاندے اور نہاں دی ڈور کوٹ کے

یعنی جی کی جنت کا تھک کٹ جاتا ہے تو رک کے باغے برا خود جاتے ہیں اور ان کی ڈور کوٹ کر لے جاتے ہیں۔

میں اب اور بولیں گا تو کہ نہیں کروں گا، کیونکہ ان سب کا جو بیسے کے ہونٹ پر ہوتی تھیں، ایک جہاں کا معلوم ہے۔
اُس قیدی نے مجھ سے کہا ہم مجھ گئے تھے کہ شاید کسی کے عشق میں گرفتار ہے — کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ اُسے آہیں بھرتے ہی دیکھا — مشقت کے دوران میں وہ بالکل خاموش رہتا، ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی دور دنیا کی یہ کر رہا ہے — خود سے تھوڑے
دھنوں کے بعد ایک ہلکی آواز بھرتا اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتا۔

ڈیڑ برس کے بعد جب شیدا خود کئی کارندہ کو چکا تھا، اور کوئی ایسی ترکیب سوج رہا تھا کہ اپنی زندگی ختم کر دے گا تو اطلاع ملی کہ ایک جوان لڑکی تم سے ملنے آئی ہے، اُس کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ جوان لڑکی کیوں ہو سکتی ہے، اُس کی تو معرفت ماں ہی ماں تھی جو اُس سے اپنی مناکے باعث ملنے آجایا کرتی تھی۔

ملاکات کا انتظام ہوا، شیدا سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا، اُس کے ساتھ مستح سیاسی لڑکی کو بٹایا گیا، شیدے نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ ایک مرتبہ پوش محبت آنی خود بخوبی کی طرف بڑھ رہی ہے، اُس کو ملنی تک یہ حیرت ملی کہ یہ صرف لڑکیوں کو ہو سکتی ہے۔
سفید برقع تھا جب وہ پاس آئی تو اُس نے نقاب اٹھائی — شیدا چیخا تم — تم کیسے؟

زینیا جو کہ چڑھوں کی لڑکی تھی، زارہ تھا، وہ نے ملی، اُس کے حلق میں نفخا، ٹپک ٹپک گتے میں تم سے ملنے آئی ہوں —
یہی — یہی — مجھے صاف کر دینا اتنی دیر کے بعد آئی ہوں — تم — خدا معلوم — اپنے دل میں میرے متعلق کیا سوچتے ہو گے :

شیدے نے سلاخوں کے ساتھ سرنگار کیا، نہیں میری جان — میں تمہارے متعلق سوچتا ضرور ہوں — یہی میں جانتا تھا کہ تم مجھ پر توجہ نہ کرنا دیتے ہوئے کیا میں اتنی مجبور تھی — یہی آج مجھے موقع ملا تو میں آگئی، پہچانتی ہوں میری دل کسی چیز میں نہیں گستا تھا،
”یہ موقع تمہیں کیسے مل گیا؟“

زینک انکھوں سے آنسو رواں تھے میرے آبا کا انتقال ہو گیا ہے۔ کل اُن کا چامیساں تھا۔
 شید امرحوم سے اپنی ساری خاصیت بھول کر خدا انھیں جنت بخشے — مجھے یہ خبر سن کر ڈاٹھا افسوس ہوا۔ یہ کتنے ہونے
 اُس کی آنکھوں میں آنسو گئے قبر کو درختا — اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں !
 زینک نے اپنے سفید برقعے سے آنسو روک لئے میں نے بہت سہر کیا ہے۔ شید ہے۔ اب اور کتنی رو کرنا پڑے گا — تم
 یہاں سے کب نکلو گے ؟

بس چھ بیسہرہ گئے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بہت پہلے ہی پھیر ڈالیں گے یہاں کے سب غریب پر مرزا ہیں۔
 زینک اُن اور میں جنت کا بے پناہ بندیر پیدا ہو گیا جلد ہی آنسو بارے — مجھے اب نکھاری ہونے میں دو کئے والا کوئی
 نہیں۔ خدا کی قسم اگر کسی نے تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں خود اس سے نہٹ لوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پر بھی مصیبت
 میں گرفتار ہو جاؤ !

شعری نے کہا کہ وقت ختم ہو گیا چنانچہ اُن کی ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ زینک خدا کی دقت چلی گئی اور شید اول میں مسترد اور انکھوں
 میں آنسو بے چیل کے اندر پڑ گیا، جہاں اُس کو شقت کرنا تھی۔ اُس دن اُس نے اتنا کام کیا کہ جیلر دنگ رہ گئے۔

دو بیسوں کے بعد اُسے رہا کر دیا گیا۔ اس دوران میں زینک دوسری اُس سے ملاقات کرنے آئی تھی۔ اُس نے آخری ملاقات
 میں اُس کو بتا دیا تھا کہ وہ کس تاریخ کو جیل سے باہر نکلے گا چنانچہ وہ گنگہ باس واقعہ پہنچے تھی۔ دونوں فرما دیتے ہیں آنسو ہانے لگے۔

شید نے مانگ لیا۔ دونوں اس میں سوار ہوئے اور شعری کی جانب چلے۔ لیکن شید کے کہیں نہیں آتا تھا کہ وہ زینک کو کہاں
 لے جائے گا۔ زینک انھیں کہاں جانا ہے؟ زینک نے جواب دیا ”مجھے معلوم نہیں — تم جہاں لے جاؤ گے، وہیں چلی جاؤں گی“

شید نے کچھ دیر سوچا اور زینک سے کہا ”میں — یہ شیک نہیں۔ تم اپنے گھر جاؤ“ — ”وہاں مجھے گھڑہ کسے ہے لیکن
 میں تمہیں جان کر طریقے پر حاصل کرنا چاہتا ہوں — تم سے باقاعدہ شادی کروں گا“
 زینک نے پوچھا کب ؟

”بس ایک دو بیسے لگ جائیں گے — میں اپنی جوئے کی میٹک پھر سے قائم کروں۔ اس طرح میں آزاد رہ سکتا ہوں
 ہائے گا کہ میں تمہارے لیے نوکر کر کے خرید سکوں —“

زینک بہت متاثر ہوئی تم کتنے اچھے برو شیدے — تمہیں دو تم کو لگے ہیں اُس گھڑی کے لیے انتقال کروں گی جب میں تمہاری برجاؤں گی۔

شید خدا بجا بآئی ہو گیا تانی۔ تم اب بھی بری ہو — میں بھی تمہاری ہوں — لیکن میں چاہتا ہوں کہ کام پر طور طریقے سے جو —
 میں اُن لوگوں سے نہیں جو دوسروں کی جہاں کندی کو زلا کر خراب کرتے ہیں — مجھے تم سے جنت ہے جس کا سبب بڑا ثواب ہے کہ تمہارا

عاطف میں نے انکھاں اور ترب قریب دو برس جیل میں کاٹے — خداوند پاک کی تم کھا کے کتابوں، ہر وقت میرے بڑوں پر تمہارا نام تھا؟
 زینک نے کہا میں نے کبھی نارا نہیں پڑھی تھی لیکن تمہارے لیے میں نے ایک بھائی سے سکھی اور بلانا خدا پر خوں وقت پڑستی

رہی — ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ خدا تمہیں ہر آفت سے محفوظ رکھے !

شیدے نے شہر پہنچے ہی دوسرا لشکر لے لیا اور زرتقا سے جدا ہو گیا، تاکہ وہ اپنے گھر جانے اور وہ اپنے شیدے نے ڈیڑہ ماہ کے اندر خدا ایک ہزار روپے پیدا کر دیے۔ ان سے اُس نے زرتقا کے لیے سونے کی پڑیاں اور انگرشیاں بنائیں۔ گے کے لیے ایک مجلس بھی لیا — اب وہ پوری طرح یس تھا۔ ایک دن وہ اپنے گھر میں اُپر بڑی پریشا گھانا کھانے لگا تھا کہ نیچے سے کسی عورت کے میں کہنے جیسے آواز آئی۔ وہ اُسے پکار کر بھی گئی اور ساتھ ساتھ کوستے بھی دے رہی تھی۔

شیدے نے اُنھ کو کھڑکیوں سے نیچے جھانکا، تو ایک بڑھیا تھی جو اُس کے محلے کی نہیں تھی۔ اُس نے گردن اٹھا کر اُپر دیکھا اور پوچھا کیا تم ہی شیدے ہو۔

”ہاں ہاں۔“

”خدا کرے زور جو اس دنیا کے تختے پر — تمہاری جوانی ٹوٹے — تم پر بھل کر رہے۔“

شیدے نے کسی قدر غصے میں بڑھیا سے پوچھا بات کیا ہے ؟
 بڑھیا کا بھر اور زیادہ تلخ ہو گیا تو میری بچی تم پر جان چڑ کے اور تجھیں کچھ بتا ہی نہیں۔
 شیدے نے حیرت سے اُس بڑھیا سے سوال کیا، کون ہے تمہاری بچی ؟

”زلیخا اور کون ؟“

”کیوں کیا جو اُس کو پتا“

بڑھیا رو سننے لگی وہ تم سے ملتی تھی، تم غصے ہو، اس لیے ایک تھانیدار نے زبردستی اُس کے ساتھ اپنا سر لگا لیا۔
 خیدے کے ہوش و حواس ایک محلے کے لیے غائب ہو گئے، مگر سبھی کو اُس نے بڑھیا سے پوچھا کیا نام ہے اُس تھانیدار کا ؟
 بڑھیا کانپ رہی تھی کرم داد — تم یہاں اُپر مڑے میں بیٹھے ہو بہت بڑے غلٹے بنے پھرتے ہو۔ اگر تم میں تھوڑی سی غیرت ہے، تو جاؤ اور اس تھانیدار کا سر گٹھا سے سے کاٹ کے رکھ دو۔“

شیدے نے کچھ دھکا بکھڑکی سے بٹ کر اُس نے ٹوٹے الینان سے کھانا کھایا بیٹ بھر کے، دو گلاس پانی کے پیئے اور ایک کونے میں رکھی ہوئی کھاناڑی لے کر باہر چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد اُس نے زرتقا کے گھر دھانڈے پر دستک دی۔ وہی بڑھیا باہر نکل — شیدے کے ہاتھ میں خون آلود کھاناڑی تھی۔ اُس نے بڑے پُر سکون بیچوس اُس سے کہا ماں — جو کام تم نے مجھ سے کنا تھا کر لیا ہوں — زرتقا سے یہ اسلام کتنا — میں اب چلتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ سیدھا کو تو ال گیا اور خود کو پریس کے حوالے کر دیا۔

مذہب کا کھوسٹ

یہ جنگ غنیم کے خاتمے کے بعد کی بات ہے جب براہِ روبرو تریبی دوست فٹنٹ کرائی ٹیڈ سلیم شیخ داب، ایراب، حواقی اور دوسرے نمازیوں سے جوتا جوتا بھیجے بچھاؤ اس کو اچھی طرح معلوم تھا میرا ٹیڈٹ کہاں ہے، ہم میں گاہے گاہے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن اس سے کچھ مزاحمتیں آتا تھا، اس لیے کہ ہر خط سلسلہ ہوتا ہے۔ (دوسرے جاتے، یا ادھر سے آتے) عجیب مصیبت تھی۔

مگر اب ان مصیبتوں کا ذکر کیا کرنا۔ اُسے یہی کہنے کو دینی اینڈ سی، آئی، اے کے ٹیڈسینس پر اس کی پوشنگ ہوئی اُس وقت وہ صرف ٹیڈٹ تھا۔ ہم دونوں وسیع و عریض درلوے اٹھیش کے بُرے میں بیٹھ گئے اور دوسرے بار ایک بچے تک اٹھٹی ٹیڈٹی پیر پیر پیتے رہے۔ اُس نے اس دور میں مجھے کئی کہانیاں سنائیں، جن میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اس نے ایراب، حواقی اور نندا معلوم کن کن ملکوں کے اپنے معاشقے سنائے۔ میں سننا رہا پشاور عاشق کو کالج کے زمانے سے تھا، اس کی داستانیں اگر میں سنناؤں تو ایک غنیم کتاب ہی جاسے۔ بہر حال آپ کو ثابتانا ضروری ہے کہ اُسے لڑکیوں کو اپنی طرف منترجہ کرنے کا اگر معلوم تھا۔

گوڈن کالج دلا پینڈی میں وہ داہراند تھا، اُس کے دیہاتیں وہاں کی تمام بریاں بجا عرض کرتی تھیں — خوبصورت تھا، کافی خوبصورت، مگر اس کا حسن مردانہ حسن تھا۔ تپتی اور گل ناک جو یقیناً اپنا کام کر جاتی ہوگی پھولی پھولی کمرے بھر سے رنگ کی انگلیوں پر اُس کے چہرے پر کئی تھیں، بڑی ہر تین تو شاید اس کے چہرے کی ساری کشش مادی جاتی۔

وہ کلنڈرا تھا جس طرح لڈڈا ہارن صرف کچھ حصے کے لیے کچھ سے دلچسپی لیتا تھا اور پھر اُسے چھڑا کر اگے بٹھ جاتا، جیسے وہ اُس کی زندگی میں کبھی آتی ہی نہیں، اسی طرح کا سلوک وہ اپنے چال میں بخشی ہوئی لڑکیوں سے کرتا، مجھے اُس کا یہ رویہ پسند نہیں تھا کہ یہ میری نظر میں بہت ظالمانہ ہے۔ مگر وہ بے پروا تھا، کہا کرتا اُتو کے چلے — غائب پڑھو وہ کیا کرتا — اُسے متنی یا کبھی نہیں رہتا تھا، مگر اُس کا منہم اپنے الفاظ میں ادا کر دیا کرتا — وہ کہتا ہے، وہی شاخ طوبے اور جنت میں وہی ایک خور — واللہ زندگی اجیرن ہو جائے گی — شمد کی تھکی بنو، کلی کلی کا دس چوسو — کھٹی کسی مری کی خور ہو تو میں چپک کر وہ جاسے۔ پھر اُس نے اقبال کے ایک شعر کا حوالہ دیا، میر کا گلاس خالی کرتے ہوئے دیا کیا کہا ہے اقبال نے —

تو ہی ناداں چند کیلوں پر قناعت کر گیا

ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داناں بھی تھا

ثابت ہوا کہ تم نہ صرف ناداں ہو بلکہ درجہ اول بنا سکتی تھی کی طرح درجہ اولیٰ پسند بھی ہو — اب جاناؤ اس کی کتہ

میں نے یہ دیکھا اس اس طرح ثنائی جس طرح میرے نے میری بیز کی خالی بولی

بیشتر اس کے کہ میں اس کہانی کی طرف آؤں۔ میں آپ کو طرح تسلیم سے متعلق ایک بہت دلیلیب واقعہ سنا ہوں۔ ہم گردن کا کجی میں لی۔ اسے غائب نہیں ہر جتنے تھے کہ کرمس کی جھپٹوں میں ایک کتنی کی شادی کی اڑتی اڑتی افراد میں لی۔ یہ کتنی ہلکی رہا کسی کلاس میں ہر جتنی تھی اور کچھ عرصہ پہلے ہی طرح شیخ تسلیم پر فریفتہ شکل صورت اس کی دیکھی تھی۔ مگر میرا دوست شمس کی تھا چنانچہ وہ جیسے ان کا معاشرہ چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ اس سے بالکل الگ نہیں ہو گیا۔

جب اس کو تیرا گیا کہ کتنی جو تھا رہی مجھ پر بھی اور جس کی خاطر تم نے اتنے جھگڑے اپنی کلاس کے طالب علموں سے کیے۔ وہ اگر وہی بگڑی رہی جائے تو وہ سپرد ————— لیکن تم تیرا جانتے ہو۔ ڈرلے کا کام ہم اپنے فے جیتے ہیں۔

شیخ تسلیم کو اس قسم کی باتیں عمر کا تھا جاتی تھیں اس نے اپنی میں میں ہر چھوٹوں کو تاؤ دینے کی کوشش کی اور کہا اچھا تم دیکھ لینا کیا ہوگا۔

اس کی پارٹی کے ایک قوی بیکل لڑکے نے پوچھا کیا ہوگا؟
شیخ تسلیم نے اس کو جھاک کی طرح بھڑایا ہوگا تھا یہاں کا سر ————— جب شادی کا دن آئے گا۔ دیکھ لیتے ————— پہلو آؤ میرے ساتھ مجھے تم سے چند باتیں کرنی ہیں۔

ثنائی کا دن آگیا۔ بات جب دو ماہوں کے گھر کھڑا سوئی کو کئی شخصیں سر پر سرے باندھے بڑے اچھے گھوڑے پر سوار اندر داخل ہو گیا۔ دو ماہوں میں تھا جس پر چھوٹوں کا بال بنا ہوا تھا۔

گھوڑا سوار سرے سے لڑا چند اٹا میلے کے پاس تھا۔ گھوڑا خود دو ماہ بنا ہوا تھا۔ دو من کا باپ اور اس کے رشتہ دار آگے تھے۔ گھوڑے کا ہانک بھاگ بھاگ آگیا تھا اس سرے سے لڑے ہوئے آدمی کو اس بگڑا ہوا گیا، جہاں دو من کو کسی ساتھ بیٹھنا تھا بیچ میں ہلکے تھا جس میں چھوٹی چھوٹی کڑیوں کے گھڑے مل رہے تھے۔ انھوں نے ننگے برقع اٹھ کر دو من کو تیرا دہری اندر اس سے کتا سر دیکھی دو من کو جلد بگڑے۔ صورت ہو گیا ہے۔

فرز آدمی بیچ کی اد کچھ عرصے کے لیے دو ماہ کے ساتھ بھاری گئی۔ چنڈت ہی نے کچھ بڑھا جس کا مطلب میری بھڑم نہ آیا۔ ————— لیکن ایک دم شادی کے اس جلسے میں ایک بڑا رنگ سجی گئی، جب کار سے ایک دو ماہ اعلیٰ کر سائے آگیا اور بلند آواز میں تمام حاضرین کو مخاطب کیا میرے ساتھ دو سو کا ہجرا ہے۔ ————— میں دینی دانگوں گا۔

وہ دو ماہ جو اتھ پڑ کر دو من کو اٹھارہ تا بڑی غوغا میں چلتا رہا۔ بے جا بے دعوے وار کرنے کے کچھ گئے۔ ————— یہ کہہ کر اس نے اپنے پیروں کا گھونگٹ اٹھا دیا اور ان ہزار کے قریب آدمیوں سے بڑھائی دے کے کچھ گئے کچھ کچھ بھاگا۔ ————— مگر تھکاک ایک سندر میں مارنے لگا۔ ————— دھری پارٹی کے آدمی بھی ان قسموں میں شریک ہوئے کیونکہ جب یہ پیروں کا پردہ اٹھو ہوا تو انھوں نے دیکھا کہ طرح تسلیم ہے۔

پر سب میں آرن سے ہاتھ دھو کر کھانا کھا لیا۔ سارے رات کو سو گیا۔ بڑی مہینگی تھی۔ نقش سب چھوٹے چھوٹے نقشے لگتے تھے۔ آرن سے کسی ہاتھ میں اور ہڈیوں کو پیش نظر رکھتے تو یہ کہتے کہ اس کے ہاتھ تو بلی کے تھوڑے ہیں گے۔ اس کی انگلیاں آٹھ مٹی ہوں گی جیسے کسی دوست کے ہوں۔ اگر نہیں دوست اس کے ہاتھ بڑے نرم و نرم تھے۔ اور اس کی انگلیاں تہہ بہہ نوکریاں کی گونا گونی تصویروں کی غراہی لابی نہیں۔ مگر تکیا کی نہیں۔ میں تو اس پر نہایت ہر گیا۔ چند روز کی ملاقاتوں میں اس کے سرے تعلقات بے تعلقی کی مدد کب بڑھ گئے :

یہاں تک پہنچ کر شیخ زک گیا۔ ایک خیار بیگ کلاس میں لانا اور سٹو، ملا کر ٹھانٹا ہی گیا تو ایک نوکریہ تھوڑے۔ میں نے اس کے کٹا غشت صاحب، آپ نے خود ہی کر شروع کیا تھا :

اس نے اچھے تروری ترور کا سری طوفان کھا۔ ایک اور بیگ اپنے کلاس میں تھیں ہار بیگ ہر قول میں باقی بچ گئے تھے۔ اختلاف ہے کلاس میں ڈالے اور خود کھائی جیسے انگریزی میں بیٹ کتے ہیں پی گیا اور کلاس کلاس کر اپنا برا مالی کر لیا۔ لغت جو تم پر !

" یعنی یہ کیا تو تھا مجھ پر لغت بھیجے گا "

اس کی کھانسی اب بند ہو گئی تھی اور وہ دھال سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا کھڑے چھویری جان — دوسرے روزات کو کرل صاحب دانات ہوئی — انہوں نے بڑے طنز سے کہا، کو صابن کو صابن سے بے باک کھینچے ہو۔ وہ تم نے ضرب اٹھائی تھی —

نیا ایک دن، اپنا نام سون — میں نے ان سے عرض کی کرل صاحب، آپ کا میرا کیا مقابلہ — گرمی نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ کجغت اس حقیقت سے اب تک داخل ہے کہ کرل میں پاؤں دکھانے میں ملتا ہے اور عشق فرما رہا ہے۔

میں تو خدا کی قسم جس طرح کرلوں گا تو خود کھائی کرلوں گا — اس منہ کے ساتھ میں آدھے دانت مصنوعی ہیں۔ میری آنکھیں پر ٹکاؤں ملانے بیٹھا ہے۔ کرل جیسا کہ اپنے گھر میں اس نے کبھی پھوٹس کی بات کی تو ایک ایسا گھونسا بھلاؤں گا اس کی سوچی کرلی پر کرل کا باہر آجائے گا :

دیر تک اس بڑے کھوسٹ سے آرن — نہایت ہی پیاری آرن کے منتظر رہتی رہیں اور وہ طنز کرنے سے باز نہ آیا۔ دیکھی کہ تو تھا اندر چل رہا تھا۔ میں نے اپنے برقعوں پر بڑی فزائیہ اور گرم کی سکرابٹ پیٹا لگا کر اس سے کہا کرل صاحب جو آپ کو بڑھا کے، وہ خود بڑھا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ دھان پاؤں ہیں :

یہ غفلت ختم ہوئی تو بہت غرض ہوا آرن نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے روز غفلتوں میں شامل کو سات بجے ملے گی۔ اس میں خوشیوں کو اجازت تھی۔ آواز تھا، اس لیے میں دودی کے کاجے نہایت اعلیٰ ٹیوٹ ہیں کو وہ اپنا پہنا۔ سات بجے میں ابھی نوٹس باقی تھے۔ میں ٹاٹنگ مال میں داخل ہوا۔ کرل میرے پاؤں دھو کر کھانسی کو دیاں گئے۔ کرل حتمی صاحب اس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے داخل آئی کہ ٹاٹا ابوسے رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کرل سے کسی زیادہ بڑھا کھٹ

انارکلی

نام اُس کا سلیم تھا، مگر اُس کے زیادہ ست اُسے شہزادہ سلیم کہتے تھے۔ خدا بااُس لیے کہ اس کے خردِ خالِ خنی تھے خوبصورت تھا۔ چال و حال سے دُورست چمکتی تھی۔

اُس کا باپ بی، ڈیپس، ڈی کے دُورستین ملازم تھا۔ تنخواہ زیادہ سے زیادہ سو پچیس روپی، مگر ٹسے ٹھٹھا سے رہتا تھا۔ ہرچہ کہ ضرورت کھا آتھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتا۔ چپ خیرچ بھی اُس کو کافی ملتا۔ اس لیے کہ وہ اپنے والدین کا اکوتاڑ لگا تھا۔ بستہ ہی ٹھس کے رہتا۔ اُس کے پاس کئی شرطے، کئی ٹھیس بھی تھیں۔ جو وہ بدل بدل کے پہنتا۔ شوکم از کم بیس کے قریب ہوں گے۔ جب کالج میں تھا تو کئی لڑکیاں اُس پر چرباں پھرتی تھیں۔ مگر وہ بے اعتنائی رہتا۔ آخر اس کی آنکھ ایک شوخ و شنگ لڑکی جس کا نام سیتا تھا، لڑ گئی۔ سلیم نے اُس سے راز و رمز پیدا کرنا چاہا۔ اُسے ٹھیس تھا کہ وہ اس کی انتقامات حاصل کرے گا۔۔۔۔۔ نہیں وہ تو یہاں تک جھٹکتا تھا کہ سیتا اس کے قدموں پر گر پڑے گی اور اُس کی مٹھون دشتگر ہوگی کہ اُس نے جنت کی لٹا ہوں سے اُسے دیکھا۔

ایک دن کالج میں سلیم نے سیتا سے پہلی بار محال ہو کر کہنا آپ کہ توں کا اتنا بوجھ اٹھانے ہوئی ہیں۔ لائیے مجھے دے دیجیے۔ میرا مانگہ باہر موجود ہے۔ آپ کو اور اس بوجھ کو آپ کے گھر تکسہ پہنچا دوں گا۔۔۔۔۔ سیتا نے اپنی بھاری ہوس کو کٹا میں منسل میں داجتے ہوئے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا آپ کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ ہر حال شکرتہ ادا کیے وقت ہی ہوں۔۔۔۔۔

شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بُرا صدمہ پہنچا۔۔۔۔۔ چند لمحات کے بعد وہ اپنی خفت طائرہ اُس کے بعد اُس نے سیتا سے کہا صورت کو مرد کے سمارے کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میری پیشکش کو کسوں ٹھکرا دیا؟۔۔۔۔۔ سیتا کو ابھرا اور زیادہ خشک ہو گیا۔ خود توں کو مرد کے سمارے کی ضرورت ہوگی۔ مگر انی اعمال مجھے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ آپ کی پیشکش کو شکریہ میں ادا کر گئی ہوں۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟۔۔۔۔۔ یہ کہ کہ سیتا پہلی گئی۔ شہزادہ سلیم جو انارکلی کے خواب دیکھ رہا تھا، آنکھیں جھپکاتا رہ گیا۔ اُس نے بستہ بُری طرح شکست کھائی تھی۔ اس سے قبل اُس کی زندگی میں کئی لڑکیاں پہنچا تھیں، جو اُس کے اردو کے اشارے پر ملتی تھیں۔ مگر یہ سیتا کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔۔۔۔۔ اس میں کوئی خشک نہیں کہ خوبصورت ہے۔ جتنی لڑکیاں میں نے اب تک دیکھی ہیں، ان میں سب سے زیادہ حسین ہے، مگر مجھے ٹھکرا دینا۔۔۔۔۔ یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔۔۔۔۔ میں خود اس سے بد لڑوں گا۔۔۔۔۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔۔۔۔۔

خزاندہ تسلیم نے اس سے بدلہ لینے کی کئی ایکیں بنائیں۔ مگر بار آور ثابت نہ ہوئیں، اس لیے یہاں تک سوچا کہ اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ وہ یہ جرم کر بیٹھا، مگر اسے سیسے کے چرے پر یہ ناک بہت پسند تھی۔ کوئی ڈر سے بڑا مقصد بھی ایسی ناک کا تقصیر نہیں کر سکتا تھا۔

سیتیم کو اپنے اولاد میں کامیاب نہ ہوا، مگر تقدیر نے اس کی مدد کی، اس کی والدہ نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ نگاہ انتخاب آخر سیا پر پڑی جو اس کی سیل کی سیل کی لڑکی تھی۔

بات کی ہو گئی، مگر سیتیم نے انکار کر دیا۔ اس پر اس کے والدین بہت نادامد ہوئے۔ گھر میں دس بارہ روز تک جنگا مچا رہا۔ سیتیم کے والدہ ذرا سخت طبیعت کے تھے، انہوں نے اس سے کہا دیکھو، تمہیں ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہو گا۔

سیتیم ہٹ دھرم تھا، جواب میں یہ کہا آپ کا فیصلہ کوئی بات کو دھکا نہیں دے گا۔ پھر میں نے کیا جرم کیا ہے جس کا آپ فیصلہ سننا رہے ہیں۔

اس کے والد کریم کریش آگیا تھا راجہ جرم کو کم تاخلف ہو۔ اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتے۔ عدول مکی کرتے ہو، میں تمہیں حاق کروں گا۔

سیتیم کا گوش تھوڑا سا ٹھنڈا ہو گیا لیکن اباجان دھیری شادی مرضی کے مطابق تو مونی چلے ہے۔

”ہناؤ، تمہاری مرضی کیا ہے؟“

”اگر آپ ٹھنڈے دل سے نہیں تو عرض کروں۔“

”میرا دل کافی ٹھنڈا ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے فوراً کہنا دو۔ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔“

سیتیم نے رک رک کے کہا ”مجھے — مجھے — ایک لڑکی سے محبت ہے۔“

اس کا باپ گرجا کس لڑکی سے؟

سیتیم تھوڑی دیر جھپکایا، ایک لڑکی ہے۔

”کون ہے وہ؟ — کیا نام ہے اس کا؟“

”سیتا — میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔“

میاں افتخار الدین کی لڑکی؟

جی ہاں، اس کا نام سیتا افتخار ہے۔ میرا خیال ہے وہی ہے۔

اس کے والد بے تحاشہ جسنے نئے خیال کے بچے — تمہاری شادی اسی لڑکی سے قرار پائی ہے — کیا وہ تمہیں

پسند کرتی ہے؟

سیتیم بوکھلا سا گیا — یہ سلسلہ کیسے ہو گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہیں اس کا باپ جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا؟

— سیتیم سے ہر سوال کیا گیا تھا اس کا جواب اس کے والد کریم نے دیا تھا، چنانچہ انہوں نے کوئی کر تو چھوڑا، سیتیم مجھے بتاؤ کیا سیتا

”قیس پسند کرتی ہے؟“
”سیتم نے کہا جی نہیں۔“

”تم نے یہ کیسے جانا؟“

”اُس سے۔ اُس سے ایک بار میں نے مختصر غلطی میں — محنت کا اظہار کیا — لیکن اُس نے مجھے —“
”قیس درخور اعتناء سمجھا۔“

جی ہاں — بڑی بے زنجی برقی۔“

سیتم کے والد نے اپنے گئے سر کو تفتیشی دیر کے لیے کھڑا اور کتا توہرہ رشتہ نہیں ہونا چاہیے — میں تمہاری ماں سے
کتا ہوں کہ وہ لڑکی والوں سے کہہ دے کہ لڑکا رضامند نہیں۔“

سیتم ایک دم جذباتی ہو گئی نہیں، آبا جہاں — ایسا نہ کیجیو گا شادی ہو جائے تو سبہ شیک ہو جائے گا میں اُس
سے محنت کرتا ہوں۔ اور کسی کی محنت نکالت نہیں جاتی — لیکن آپ لوگوں کو — میرا مطلب ہے یہ سنا کیونچہ زینے دیکھنے کا اُس
کا بیاد مجھ سے ہو رہا ہے جس سے وہ بے رشتی اور بے اعتنائی کا اظہار کر چکی ہے۔“

اُس کے باپ نے اپنے گئے سر پر ہاتھ پھیلا دیں اس کے متعلق سوچیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ چلے گئے کہ اُنھیں ایک ٹھیکیدار سے مدد ضرورت وصول کرنا تھی۔ اپنے بیٹے کی شادی کے اخراجات کے مسئلے میں۔

شمنواز سیتم جب رات کو چٹک پر سونے کے لیے بیٹھا تو اسے اندر کی کلیاں ہی کلیاں نظر آئیں، ساری رات وہ ان کے خواب
دیکھتا رہا۔

تھوڑے پر سوار باغ میں آ رہا ہے — شامان بازاس پہننے۔ اس پر بازی سے اُتر کر بارنگ کی ایک روش پر جا رہا ہے
کیا رکھتا ہے کہ ستارا اندر کے بوٹے کی سب سے اُنہی شاخ سے ایک لوزخ کی آتش لے کر کشش کر رہی ہے — اُس کی بھاری بھر کم کتابیں
نوبس پر بکھری پڑی ہیں — اُنھیں اُلٹی ہوئی ہیں۔ اور وہ اُچک اُچک کر اُس شاخ تک اپنا ہاتھ پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے، مگر ہر بار نام
رہتی ہے۔

وہ اُس کی طوٹ بڑھا۔ اندر کی بھاری کے پیچھے چھپ کر اُس نے اُس شاخ کو کچلا اور جھکا دیا۔ سیتانے وہ کلی توڑ لی جس کے پیچھے
آئنی کوشش کر رہی تھی — لیکن فوراً اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ شاخ کے نیچے کیسے ٹھک گئی۔

وہ ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ شمنواز سیتم اُس کے پاس پہنچ گیا۔ سیتانہ کھڑی گئی، لیکن سنبھل کر اُس نے اپنی کتابیں اُٹھائیں اور بغل
میں داب میں اُٹار لی اپنے ٹھکانے میں اُس کی اور یہ خشک الفاظ کہہ کر وہاں سے چل گئی آپ کی امداد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں —
بہر حال شکریہ ادا کیے دیتی ہوں۔“

تمام رات وہ اسی قسم کے خواب دیکھتا رہا۔ سیتا اس کی بھاری بھر کم کتابیں، اندر کی کلیاں اور شادی کی دھرم دھام۔
شادی ہو گئی۔ شمنواز سیتم نے اس تقریب پر اپنی انار کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پائی تھی وہ اُس لمحے کے لیے تڑپ رہا تھا

جب سیماس کی آنکھیں کھلیں، وہ اُس کے اتنے پیارے لگا کر وہ تنگ آکر دونا شروع کر دے گی۔

سیماس کو رونے والی لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ اُس کا یہ فلسفہ تھا کہ موت جب دوری ہو کر موت جیسی ہو جاتی ہے۔ اُس کے آنسو جسم کے قطروں کے مانند ہوتے ہیں جو مرد کے جذبات کے پتھروں پر چپکتے ہیں جن سے اُسے ایسی راحت، ایسی فرحت ملتی ہے جو اور کسی وقت نصیب نہیں ہو سکتی۔

رات کے دس بجے دولہن کو جھڑپوں میں داخل کر دیا گیا۔ سیماس کو بھی اجازت ملی گئی کہ وہ اُس کمرے میں جا سکتا ہے اور رات کی چھیر چھا ناہور رسم و رسوم صنفِ ختم ہو گئی تھیں۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔

پتھروں سے کچی ہوئی مسسری پر دولہن گھونگھٹ کاڑھے رنگم کی گھنٹھری سی بنی ٹپٹی تھی۔ شہزادہ سیماس نے خاص اہتمام کر دیا تھا کہ پتھروں، اناج کی کلیاں ہوں — وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسسری کی طون بڑھا، اور دولہن کے پاس بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک وہ فرضی بیوی سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی عقل میں کتا نہیں ہوں گی، جی کو وہ اٹھنے نہیں دے گی۔ آخر اُس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اُس سے کہا: "سیما۔"

یہ نام جیسے ہی اُس کی زبان خشک ہو گئی۔ لیکن اُس نے پھر سیرات فراہم کی اور اپنی دولہن کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا دیا اور بھونچکا رہ گیا۔ "یہ سیماس نہیں تھی، کوئی اور ہی لڑکی تھی۔" اناج کی ساری کلیاں، اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ فرج کھلی گئی ہیں۔

(ایکم جون ۱۹۵۷ء)

کیشن

دروازہ کھلتا ہے۔ چوہا رتیں مرتبہ فرش پر اپنی لاشیں سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوہا لڑو۔ باادب، بالاحظ ہوشیار، نظریں آلودہ، شہنشاہِ عالم پنج کے لیے تشریف لارہے ہیں۔ شہنشاہِ عالم کے قدموں کی بجاوری چاہ سٹائی دیتی ہے، اس کے ہمدرد تشریف لاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ بیڈ ٹلر کہاں ہے ؟

چوہا ریاک بست بڑی ڈش پر سے سر پوش اٹھاتا ہے، بیڈ ٹلر پھٹک کر باہر نکلتا ہے اور فرشِ سلام عرض کرتا ہے۔

بیڈ ٹلر۔ غلام سیلوٹ بجااتا ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ دسترخوان پر مابدولت کے کیا کیا چیز حاضر ہے ؟

بیڈ ٹلر۔ گوشت پلاؤ، مابی پلاؤ، مٹر پلاؤ، نارنگی پلاؤ، پنجنی، برمانی، اندوہ، دوغن، جوش، قورمر، ٹماٹر گوشت، بھنڈی گوشت، مٹر گوشت، پائے کا شوربہ، قیمر، بیجا چکن کٹس، پوٹو کٹس، چکن چا پس، مٹن چا پس، پوٹو کٹس چا پس — اور خدا جہاں پناہ کو سلامت رکھے — اور ہر کی دال۔

شہنشاہ۔ (نہتے ہیں) اور ہر کی دال مابدولت کو باطل پسند نہیں۔

بیڈ ٹلر۔ یورمجیٹی — آج پنج پر تین اشتراکی دلا تھوں کے وزیر اعظم مدعو ہیں — اس لیے —

شہنشاہ۔ (خوش ہو کر) مابدولت تمھاری فراست کی داد دیتے ہیں اور غول جو کہ خداوند متعال سے بھرنے کا حکم جاری کرتے ہیں بیڈ ٹلر۔ میری سائنس ڈک جانے گی عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ (مسکرا کر) تم بہت ذہین ہو — اچھا مابدولت تمہیں سرکار خطاب عنایت فرماتے ہیں۔

بیڈ ٹلر۔ جہاں پناہ کی اس قدر افزائی نے دوسرے کو آفتاب بنا دیا۔

شہنشاہ۔ اور کس صفائی سے — بیگن گل نہ پھلکڑی

بیڈ ٹلر۔ غلام سیلوٹ بجااتا ہے یورمجیٹی۔

دوازدہ گھنٹا ہے۔۔۔ جو بدترین مرتبہ فرشل پر اپنی لاشیں سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چو بدادر۔ بالوب، بالاسط، ہوشیار۔ نظریں دُورو۔ بالوب، بالاسط، ہوشیار۔ نظریں دُورو۔ ملکہ عالیہ کی سوار علی آتی ہے۔
چوٹے چھوٹے قدموں کی چاب منائی دیتی ہے۔ ملکہ عالیہ کی سوار علی آتی ہے۔

ملکہ جہاں پناہ کو زیادہ دیر تو میرا انتظار نہیں کرنا چڑا؟۔۔۔ میں اپنی عداوتوں کے سر میں جو کس ٹولہ اور ہی تھی۔
شہنشاہ۔ کیوں؟

ملکہ۔ رعایا کے لیے میں ایک بڑا بینک کھولنا چاہتی ہوں۔

شہنشاہ۔ امور سلطنت سے تھاری یہ دلچسپی باندولت کے لیے باعثِ مسرت نہ ہوتی۔

ہیڈ ٹیکر۔ رعایا کتنی خوش نصیب ہے کہ آپ ایسا مجلس بادشاہ اور آپ ایسی مجلس ملکہ اُس پر حکمران ہیں۔

شہنشاہ۔ پتھر پتھر شورش تھا کہ نالوں بادشاہ کے علاج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ لیکن ہمارے راج

میں ایسے کئی گھاٹ موجود ہیں جہاں شیر اور بکریاں اکٹھے پانی پیتے ہیں اور اس کو سلفہ اسکان میں لانے کے لیے باندولت

کو تمام شیروں کے دانت ٹھکڑے اور تمام بکریوں کے سینگ کٹوانے پڑے۔

ہیڈ ٹیکر۔ اس میں کیا شک ہے۔

گھنٹی کی آواز آتی ہے

شہنشاہ۔ چونکہ کہ یہ کس نے جیس بلایا۔۔۔ یہ کون فریادی ہے، جس نے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر کو جھٹل دی؟

ملکہ۔ جہاں پناہ، کیا اسی وقت جھروکے میں تشریف لے جائیں گے؟

شہنشاہ۔ اسی وقت، اسی گڑھی۔ جب تک ہم اس فریادی کی فریاد نہیں سنیں گے، اور ہر کی وال ہم پر حرام۔ ہم ابھی جھروکے

میں جا کر فریادی سے ملاقات کریں گے۔ خود اس پر کوئی ظلم نہ ہے۔

چو بدادر۔ بالوب، بالاسط، ہوشیار۔ نظریں دُورو۔ شہنشاہ عالم فریادی کی فریاد سننے کے لیے تشریف لائے ہیں۔

شہنشاہ۔ ملکہ اور ہیڈ ٹیکر تینوں جھروکے میں تشریف لے جاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ یہ کون تھا، جس نے ہمارے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر کاٹی اور ہمارا انصاف چٹا کر

فریادی۔ یہ غلام انصاف کا طالب ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ تمہارے ساتھ پورا انصاف ہر جا فریادی۔۔۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا ہمارا کام ہے۔

فریادی۔ عالم پناہ۔ آج کل ایک سیر دودھ میں صحت دو قطرے دودھ کے ہوتے ہیں، باقی سب پانی ہوتا ہے۔

شہنشاہِ مہمکن ہر فریادی۔ دودھ کے یہ دو قطرے بھی ٹھنڈہ کر کے دکھا دیے جائیں گے۔ ہا۔ ہا۔ بے خوف و خطر ہو کے بروکر تھیں کس نے ایذا پہنچائی ہے۔ کیا مغلّہ عالم کے بتوں سے تھاری بیوی.....

فریادی۔ نہیں عالی جاہ۔ مغلّہ عالم کے بسترول سے میری بیوی پاک نہیں ہوئی۔

شہنشاہ۔ تاریخ نے اس کا مطلب ہے خود کو نہیں دہرایا۔ یہ بھی ایک بہت بڑی بات ہے۔ بروکر تم کام کیا کرتے؟

فریادی۔ عالم پناہ کے سایے تلے اس غلام نے ایک بہت بڑی لائڈری کھول رکھی ہے۔

شہنشاہ۔ کچھ بے گناہوں پر تم دھوتے ہو؟

فریادی۔ نہیں عالم پناہ۔ یہ ذلیل کام میں نے دوسروں کے سپرد کر رکھا ہے۔

شہنشاہ۔ ایسا ہی جزا پنا ہے۔ اب تمہیں کیا دکھ پہنچا ہے؟

فریادی۔ جہاں پناہ، مجھے بہت بُرا دکھ پہنچا ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو میں بیان کر سکوں۔

شہنشاہ۔ ہوں، تھوڑی دیر خود فکر کرنے کے بعد، فریادی تم کوئی ٹکڑہ کرو۔ ہم الفاظ کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ یہاں بڑا

ہیڈ ٹیکر۔ غلام حاضر ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہم نے سر کے خطاب سے تمہیں سرسرا کر دیا تھا۔

ہیڈ ٹیکر۔ غلام اس قدر انفرادی کا شکر ادا کر چکا ہے۔

شہنشاہ۔ اب خود کو اس قدر انفرادی کا حق دانا بہت کم۔ ہم تمہیں وزیرِ اعلیٰ کا تہ تیغیے ہیں، تاکہ تم اس فریادی کی فریاد کو فاسد و

موزوں الفاظ میں ترتیب دے کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔

ہیڈ ٹیکر۔ غلام اس فرض سے سبکدوش ہونے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

شہنشاہ۔ تم مہمکن ہر فریادی؟

فریادی۔ میں بالکل مہمکن ہوں عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ وزیرِ اعلیٰ جاہ، فریادی کی فریاد پر لپٹ کی صورت میں پیش کرو۔

ہیڈ ٹیکر۔ کام کی اہمیت کے پیش نظر غلام ایک ماہ کی محنت کے لیے درخواست کرتا ہے۔

شہنشاہ۔ مہدوتِ دو ماہ کی محنت عطا فرماتے ہیں۔

ہیڈ ٹیکر۔ شکریہ!

فریادی۔ شکریہ۔

دوا نہ کھلتا ہے چچا ہار میں ترے فرش پر لڑی دھڑکی سے آواز دینے لگا ہے اور

اعلان کرتا ہے۔

چوتہ بدامرد، بااوب، بالاسلطہ — ہرشیار — نظریں دُوبو — شہنشاہ عالم دوسینے کے بعد لائڈری داسے کیس کے متعلق بیڈٹلر
الحدوتہ وزیرِ اٹھان کی رپورٹ سننے کے لیے تشریف لائے ہیں۔
شہنشاہ و جھروکے میں تشریف لائے ہیں۔

شہنشاہ۔ وزیرِ اٹھان۔ لائڈری داسے فریادی کی رپورٹ موزوں و مناسب الفاظ میں تیار ہوئی۔
بیڈٹلر۔ دو مہینے کی مسلسل محنت و محنت اور محنت کی بھرتی کے بعد یہ پچھلے دنوں ایک کروڑ اٹھان کی رپورٹ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا
جسے جو بیگم کی اکائی کے لیے حکمرانی پر پیش کر دی ہے۔

شہنشاہ۔ فریادی — وزیرِ اٹھان کے اس کام سے کیا تم مطمئن ہو؟
فریادی۔ قطعی طور پر عالی جاہ — کام بڑے سلیقے سے ہو رہا ہے۔

شہنشاہ۔ وزیرِ اٹھان — ہم قصور سے عرصے کے لیے تمہیں وزیرِ خلاصہ بنا کر اس رپورٹ کا تمہیں پڑھنا چاہتے ہیں جو بیگم
کی اکائی کے لیے پیش کر دی ہے۔

بیڈٹلر۔ رپورٹ کا اصل خلاصہ یہ ہے عالم پناہ — فریادی ایک بہت بڑی لائڈری کا مالک ہے۔ اس لائڈری میں تمام
پڑے صابن سے نہیں کسی اور چیز سے دھوئے جاتے ہیں، جس کا نسخہ صرف فریادی ہی جانتا ہے۔

فریادی۔ یہ نسخہ سینہ سینہ پھلا رہا ہے عالم پناہ۔
شہنشاہ۔ خوب!

بیڈٹلر۔ ڈرائی کیلنگ کے کام میں بھی فریادی پٹرول استعمال نہیں کرتا۔
فریادی۔ غلام پٹرول کا ساڈا کوٹا ایک ملا کیٹ میں بچ دیتا ہے۔

شہنشاہ۔ بہت خوب۔
بیڈٹلر۔ فریادی کی لائڈری میں ساڑھے سات سو دھوبی کام کرتے ہیں۔ ان کو سینہ بر سینہ چنے والے اصول کے مطابق

تھاڑھ ملتی ہے جو مغلیہ بادشاہوں کے عصر میں دھوبیوں کو ملا کرتی تھی۔ فریادی نے چار مہینے بھرے محسوس کیا اگر اس
کے یہ پتھر وہ پانے داسے اس کا صابن کھا رہے ہیں۔

شہنشاہ۔ فریادی نے یہ کیسے محسوس کیا۔
فریادی۔ ان کا رنگ دی بدن اُجلا ہو رہا تھا جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ درست!
بیڈٹلر۔ انہوں نے صابن کھانے ہی پر اکتفا نہ کی — اس غریب کا پٹرول پینا بھی شروع کر دیا۔

شہنشاہ۔ فریادی — پٹرول پینے کے متعلق کیسے معلوم ہوا؟
فریادی۔ عالم پناہ — ان کی دھواں دھار تقریروں نے غمازی کی۔

شہنشاہ۔ درست۔

ہیڈ ٹیکر۔ اپنے تنخواہ پانے والے ملازمین کی اس بلا خودی اور جانوش سے تنگ اگر فریادی نے ایک اور کپڑے سکھانے کے لیے اُن کو اس میدان کی طرف روانہ کر دیا جہاں شہزادیاں چلناری دیکھتی ہیں۔

شہنشاہ۔ (مکرمند ہو کر) والاشان شہزادیوں نے ان بے گناہوں کو ہلاک کر دیا؟

ہیڈ ٹیکر۔ ایسا ہی حوا جہاں پناہ — شہزادیوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ وہ ساڑھے سات سو دھوئی جنگلی انسانوں کی وہ یکمپیپ جو والاشان شہزادیوں کا نشانہ درست کرنے کے لیے ہر پختے فراہم کی جاتی ہے۔

شہنشاہ۔ دھوئیوں اور جنگلی انسانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ہیڈ ٹیکر۔ حال پناہ کا ارشاد بالکل صحیح ہے — ساڑھے سات سو دھوئیوں کے ماحققین چند فریادی کو اُن کی ہلاکت کا نوہوا کر گواہتے ہیں۔

فریادی۔ غلام کا تصور صرف اتنا ہے جہاں پناہ کو اس نے تنگ کر اُن کو اس میدان کی طرف بھیج دیا جہاں والاشان شہزادیاں نشانہ درست کرتی ہیں — لیکن ان کی افسوسناک ہلاکت کے بعد جب ٹوکر کیا تو معلوم ہوا کہ فریادی طعہ پر اس غلام نے جہاں پناہ کو انصاف کرنے کا ایک بہت ہی اچھا موقع فراہم کر دیا ہے۔

شہنشاہ۔ ٹوکر کرنے کے بعد بادولت بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں — تاریک میں اس سے پہلے جہاں ٹوکر کا ایسے عرصے سے دو چار جزا پڑا تھا۔ لیکن ہم عہد جدید کے شہنشاہ ہیں — جہاں ٹوکر عدلی زماہ کوئی حقیقت نہیں کہتا — ٹوکر کا بدلہ صرف ٹوکر ہے۔

ہیڈ ٹیکر۔ کیا والاشان شہزادیاں، خاتم بدہن —

شہنشاہ۔ سڈیر اٹھنا، ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دو۔

چوہدار نہیں مرتبہ فرض پر لاشی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوہدار۔ باادب، باحاطہ، ہوشیار — نظریں نہ دو — ملکہ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکہ عالیہ کی سواری بال کھوئے ہوئے آتی ہے

حکمران جہاں پناہ — یہ میں کیا شہنشاہی ہوں۔

شہنشاہ۔ ٹوکر کا بدلہ ٹوکر — ہماری حکومت کے ہر دہو دار سے یہی صدا آ رہی ہے۔ غریب کا بدلہ غریب — کوئی غریب ہمارے ملک

ملکہ۔ جہاں پناہ!

ہیڈ ٹیکر۔ خاتم پناہ!!

فریادی۔ ساڑھے سات سو دھوئیوں کے گیتی پناہ۔ ٹوکر کا بدلہ ٹوکر نہیں چاہتے — فی دھوئی پانچ روپے کا پیسہ۔

شہنشاہ۔ نہیں — بادولت اپنے دامن عدل پہ چھا لیکر طرح کوئی دھتہ نہیں گئے دس گے — ٹوکر کا بدلہ ٹوکر ہے —

خون بہا نہیں۔ وزیر اعلیٰ والا شانِ شہزادیوں کی تعدلو کیا ہے ؟
 ہیڈ ٹیکٹر۔ پچھلے برس کے اعلانہ شمار کے مطابق والا تعدل شہزادیوں کی تعدلو ایک سو بیس تک پہنچی تھی
 ملکہ۔ ان میں میری کوئی دختر نیک اختر شامل نہیں۔ پھر ہی جہاں پناہ سے درخواست کرتی ہوں کہ۔
 شہنشاہ۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دو ملکہ۔ خون کا بدلہ خون ہے۔
 فریادی۔ جہاں پناہ۔ اُن ساڑھے سات سو دھویوں میں خون کا صرت ایک قطرہ تھا۔
 شہنشاہ۔ تجھے مجھے معلوم ہے ؟

فریادی۔ ان کا سارا خونِ نچوڑ کر میں نے صرت ایک ایک قطرہ باقی چھوڑ دیا تھا تاکہ میں زندگی کی حق باقی رہے۔
 شہنشاہ۔ ابدیت کی نگاہِ عدل میں خون کے قطرے اور خون کے ایک سمندر میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے پیشتر کہ بھت پسند
 قریں میں گراہ کریں۔ مملکت کے طول و عرض میں بیڈیا اور خیابانوں کے ذریعے سے اعلان کر دیا جائے کہ ہم لاٹھری
 والے کیس کا فیصلہ کرنے میں اپنی مثالی خیر جانبداری برتنے گے۔ خون کا بدلہ خون ہے۔ اس میں کوئی
 شک نہیں کہ والا شانِ شہزادیوں کی رگوں میں ہمارا نیلا خون دوڑ رہا ہے۔ لیکن اسے دھویوں کے سرخ خون
 کا بدلہ دینا ہوگا۔ ہر چہ دارا کائنات اعلان کر دیا جائے کہ ابدیت کے لیے اس سنگین مقدمے کا فیصلہ رتبہ کرنے
 کے لیے ایک کمیشن بٹھا دیا ہے۔

ہیڈ ٹیکٹر۔ کمیشن ؟

ملکہ۔ کمیشن ؟ ؟

فریادی۔ کمیشن ۹۹۹

شہنشاہ۔ اہ۔ کمیشن۔ یہ کمیشن ملک کے چار ٹرے دھویوں۔ وہ سب سے بڑے ڈرائی کلینروں
 اور چر خطاب یا نذر سرکاری لوگوں پر مشتمل ہوگا۔ ہیڈ ٹیکٹر جس کرم نے پہلے سر کا خطاب منایت فرمایا تھا اور
 بعد میں وزیر اعلیٰ بنا دیا تھا۔ اس کمیشن کا صدر ہوگا
 ہیڈ ٹیکٹر۔ غلام سے اتنا بڑا کام سر انجام نہیں دیا جاسکے گا اور بھیجی۔

شہنشاہ۔ ابدیت کو اس کا علم ہے۔ تمہاری صدارت میں تحقیقاتی کمیشن جو جی اپنی رپورٹ رتبہ کرے گا۔ عوام
 کو کائناتی تشفی کے لیے ابدیت اس کمیشن پر ایک اور کمیشن بٹھا دیں گے۔ تاکہ عدل و انصاف کی نگاہ سے کوئی
 گزشتہ کوئی کوئی پوشیدہ نہ رہے۔

ہیڈ ٹیکٹر۔ عالم پناہ عوام کی تشفی پھر ہی نہیں ہوگی۔ انکھان کی مرشدت میں داخل ہے۔

شہنشاہ۔ ملکہ مند ہو کر عوام کی تشفی بہت ضروری ہے۔ سب سے مقدم ہے۔ ہم اُس وقت تک کوئی
 فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جب تک اس معاملے میں ہماری تشفی نہ ہو کہ عوام ہماری طرف سے بالکل مطمئن ہیں

_____ ہوا انسانی کسک کر چنا پھر جم سب سے پہلے، سب سے ضروری کیش بجاتے ہیں۔ اس کا نام
شانی کیش ہو گا۔

سیٹر بلکر۔ عالم پناہ زندہ باد۔

حکمر۔ عدل و انصاف زندہ باد!!

قریادی۔ شانی کیش جو زندہ باد۔

(۲ جون ۲۰۲۲ء)

سیاہ حاشیے

قصائد کے بارے میں منٹو نے جی جی علیقت باتوں کو دیکھا اور سنا انھیں بھی تب تک نہ کرنا تھا۔

مُجھوتا

جو مرنے ترخ بدلا اور سرنگھلام کے بُت پر پل پڑا۔ لاشیاں برساتی گئیں، انہیں اور پتھر پھینکے گئے ایکے منہ پر تار کو لٹایا۔ دوسرے نے ہت پرانے پتھر جمع کیے اور ان کا ہار بنا کر بُت کے گلیوں میں ڈالنے کے لیے آگے بڑھا۔ اور وہیں آگئی اور گولیاں چٹنا شروع ہوئیں۔
بُتوں کا ہار پٹانے والا دشمنی ہو گیا چٹا پنہر مر رہا تھی کے سے اُسے سرنگھلام ہسپتال لے جایا۔

حلال اور حشاکا

”میں نے اس کی شہرہ گ پر چھری رکھی۔ ہوئے ہوئے پھیری اور اس کو حلال کر دیا۔“
”یہ تم نے کیا کیا؟“

”کیوں؟“

”اس کو حلال کیوں کیا؟“

”مزا آتا ہے اس طرح۔“

”مزا آتا ہے کے پیچھے، تجھے جھٹکا کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح۔“
اور حلال کرنے والے کی گردن کا جھٹکا ہو گیا۔

رعایت

”میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔“
”چلو اسی کو مان لو۔ کپڑے آتار کر ہانک دو ایک طرف۔“

آرام کی ضرورت

”مرنا نہیں۔ دیکھو ابھی جان باقی ہے۔“
رہنے دوار۔ میں تھک گیا ہوں۔“

(۲)

منٹو کی کہانیوں، ڈراموں اور مضامین کا انتخاب

(یہ انتخاب بھی منظر کا ہے)

جب میرے اوڈنٹور کے دو بیان منظرِ نمبر چھاپنے کی بات چیت ہوئی تھی تو
 میں نے کچھ منتخب تخلیقات کی شمولیت پر بھی غور دیا تھا۔ اس وقت انہوں
 نے جی جی کما انہوں کے نام بتائے تھے، وہ جی پیش کی جا رہی ہیں۔ سُنئے
 ”تیا قانون شہید ساڑا اور ”سیاہ عا شیعے“ کے چند لطیفوں کے۔
 (محمد طفیل)

کی بہت بُری حالت تھی۔ نگاہِ آلودہ سونیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے سرکونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے میں اُپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں بٹری تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا دھڑکتے ہوئے دھڑکتے ہوئے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گینٹل جی کی نشوونما رنگ تصویر تھی جو آواز اور سُور کے ہوتے پنوں سے ملدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے آکر فریم میں جڑوائی گئی تھی اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پیکچر بے حد چمکتا ہو رہا تھا۔ ریل کی ایک پیراں دھری تھی جو دینے کو روشن کرنے کے لیے وہاں دکھی گئی تھی۔ پاس ہی دریا پڑا تھا جس کی نور و سندر ہونے کے باعث ماتھے کے ٹک کے اندر سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر دھوپ کی چھوٹی بڑی موٹیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہن کی قتی تھی تو اُس سے گینٹل جی کی اس صورت سے وہ بے چھن کر اُدھر پہنچنے لگتا تھا۔ اس کے ساتھ لگا کر انھیں اپنی چوٹی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اُس کی چھتیاں چونک کر کافی ابھری ہوئی تھیں، اس لیے وہ جتنے وہ بے چھن اپنی چوٹی میں رکھتی، مخصوص پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو نے سے بٹھلے سے کراؤ اُسے اپنے کچھ روپے پٹنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے کڑھے میں چھپا کر پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کی کو رام لال لال نے بتایا تھا۔ اُس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو نے سے آکر سوگندھی پر دھواوا اُڑتا ہے تو کما تھا۔ اس سالے کو کڑے کب سے یاد بنایا ہے؟ — یہ بڑی انوکھی عاشقی معشرتی ہے! — سالہ ایک سو بیسہ اپنی بیب سے نکالتا نہیں اور ترے ساتھ مزے اُڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تھے سے کچھ لے بھی رہا ہے — سوگندھی! مجھے کچھ دال میں کا لاکا لانگڑا ہے۔ اس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھاگیا ہے — سات سال سے یہ دھندلا کر رہا ہوں۔ تم کچھ کریں کی ماری کمزوریاں جانتا ہوں۔

یہ کہہ کر رام لال لال نے بوہن کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھکریوں کا دھندلا کر اُٹھا۔ سوگندھی کو بتایا — تسالی اپنا دامن یوں نہ برباد کر — تیرے الگ پر سے یہ کپڑے ہی اُٹا کر سے جاتے گا۔ وہ تیری ماں کو برا — اس پٹنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گھونڈا کھود کر اس میں ساڑھے چھ روپے کا ادھب دیا۔ یا کہے تو اُس سے کہا کہ — تیری جان کی قسم! ادھو، آج مج سے ایک دھیلے کا منڈ نہیں دیکھا، باہر دالے سے کہہ کر ایک کوپہ چلے اور ایک اندھون بکٹ تو لگا، ٹھیک سے میرے پیٹ میں چ ہے دھڑک رہی ہیں — کھیں؟ بہت بڑک وقت آگیا ہے میری جان — اس سال کی انگریس نے شراب بند کر کے بازار باطل مندا کر دیا ہے پر تجھے تو کیسے نہ کیسے سے پیٹنے کو ہی ہی جاتی ہے۔ جگن انتم جب تیرے یہاں بھی دست کی خالی کی ہوئی تو کی دیکھتا ہوں دھندلا کر ہی اس سرگشتہ ہوں غریب چاہتا ہے تیری بوہن میں چلا جاؤں۔

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار بھلا نے اُس سے کہا تھا، نیچے سے ان بپ کے گراں کو ہاتھ کے رکھا کہ اُٹ گیا پنہا کر کے اُن کی حقان کی شکایت دے گی۔ سوگندھی پر غم کر نہیں دی۔ سبنا تو سب کچھ نے مر گیا گھنٹی ہے۔ دس روپے میں وگتیری روٹیاں تو لگا کر چلے جاتے ہیں۔ تو کچھ

جے کسب کے ساتھ ہی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ کوئی نواگائے تو ایسے ویسی جگہ ہاتھ —۔ اسے ان کی بات ٹھجے سنائوں
 رام لال دات کے دو بچے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے ملے خراب۔ جب سونے لگے تو میں نے جی بھادی —
 اسے وہ تو کوڑی لے لگا۔ — شقی ہو جینا ہنیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اُس کا سارا اٹھاٹھ کرکرا بریگیا! — وہ ڈر گیا امیں نے کہا،
 چلو پلور کیوں کرتے ہو امیں بچنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ آئے گا۔ — ہلا — — — روشنی کرو — — — روشنی کرو — — —
 میں نے کہا، یہ روشنی کیا بخرا۔ — ہلا لائٹ — — — لائٹ! — — — اس کی بھٹی ہوئی انداز میں کچھ سے سنسی نہ رکی، بھٹی میں تو لائٹ نہ
 کروں گی آ — — — ہورہ کہ کروں نے اس کی گوشت بھری دان کے ٹھکی — — — تیراب کر اٹھ چٹا اور لائٹ اون کو دی میں نے ٹھٹ
 سے پیادوڑھ لی، اور کہا، تجھے شرم نہیں آتی مر رہے آ — — — دم ہٹکے پڑا تو میں نے شقی اور ایک کر لائٹ بھجا دی! — — — وہ
 پھر گھبرانے لگا۔ — تیری قسم جسے مرے میں رات گئی، کبھی اندھیرا کبھی آجلا کبھی آجلا، کبھی اندھیرا — — — رام کی کھڑکڑ ہوئی
 تو کون نہ ظلم میں کرو وہ اندھیرا ک — — — سائے نے تیس روپے سے میں بیٹے ہوں کے جروں مفت دے گیا۔ — جنا، ٹو بھل اہرا
 ہے، ابرے جسے گڑیا دیں مجھے ان لوگوں کے ٹیکہ کرنے کے لیے؟

سو گندھی کو اتنی بہت سے گڑیا تھے جہاں نے اپنی ایک دو سیلوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گڑس کرتا کہ ان کو
 — — — انکا آدمی شریف ہو، زیادہ بائیں نہ کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرا تیں کرو، اسی گنت بائیں کرو، اسے چھڑا دتاؤ، اس کے
 لگادی کرو، اس سے کہیو۔ — اگر داری رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے لکھی کرتے کرتے دو چاند بال بھی لوی فریٹ لڑا ہوتا چھینلا
 — — — اس کو اتنی مصلحت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے۔ — وہ خوش خوش چلا جائے گا اور ہم بھی بچے ہوگی۔

ایسے مرد جو گنچ چپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں ہیں — ہڈی پہلی تو نہ دیتے ہیں اگر ان کا داڑھی چل جائے؟

سو گندھی اتنی پیاداک نہیں تھی، اپنی خود کو کھا رہی تھی۔ اس کے گانگ بہت کم تھے۔ غایت دھند جھلکیوں کی تھی وہی وجہ کہ
 وہ تمام گڑیوں سے زیادہ تھے اس کے دماغ سے پہل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں
 — — — ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے غداش زودہ گتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنادے ہیں۔ جب
 جب کوئی کھینا بڑی بچہ، غذائی سے اس کے ہاتھ گتے کے پاس سے گزرتا جاتی تھی تو وہ شرمندگی زور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی
 قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سو گندھی دماغ میں زیادہ دھنکی تھی۔ لیکن جو خبی کوئی نرم و نازک بات — — — کوئی کوئی بول — — — اس سے کتا تو جھٹ
 پھٹ کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی، گو دھند رورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ باطل فعلی بھتا تھا، گڑاس کے جسم
 کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بہتے مری طرح ناک تھے وہ تھکن چا رہے تھے۔ — — — جس تھکن جو انھیں ٹھیک ہو کر — — — انھیں
 مار کر سلائے پر بھجوا کر دے! ایسی خند جو تھک کر چڑچڑ ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے۔ — — — وہ بے وحشی جو مارکھا کر بند بند
 ڈھیلے جو جانے پر ملا رہی ہوتی ہے، کتنا آندو ہوتی ہے! — — — کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمارو کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں
 ہوا! اس جو نے اند نہ ہونے کو چاہی کبھی ایسا بھی معلوم ہوتا کہ تم ہوا میں بہت سلائے کی جگہ ملکی ہوئی ہو، تو پھر ہوا نیچے ہوا، داییں

ہوا، یا نہیں ہوا، میں ہوا ہی ہوا! اور پھر اس میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزاجیتا ہے۔

نہیں میں جب وہ آنکھ بھول گیا کرتی تھی اور نہ ہی اس کا بڑھاپا کسی کمر کی اس میں چھب جاتا تھا، تو کافی برسوں میں نہ ہونے کے ساتھ ساتھ کہنے جاتے کے خوف سے وہ تیز دھڑکی جیسا کہ دل میں پیدا ہو جاتا تھا، تھی کتا نہ ہو جاتی تھی!

سوگند جس بات میں تھی کہ اپنی ساری زندگی اسی ایسے ہی صندوق میں بچھپ کر گزار دے جس کے باہر کوئی شخص نہ دے نہ دیکھ سکے۔ کبھی کبھی انہیں کوڑھونڈ لگتا تھا کہ وہ بھی ان کوڑھونڈ نے کیا کشش کر کے یہ زندگی جودہ پانچ برس سے گزار دی تھی، انکھیں پانی ہی تو تھیں۔

لیکن وہ کسی کوڑھونڈ نہیں تھی اور کسی کوئی اسے ٹھونڈتا تھا۔ بس یونہی اس کا جیروں میں رہتا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر دفعہ مات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے پرچڑے سالگاری پہنکے پر جڑتا تھا اور سوگند بھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لیے بے شمار گڑیاؤں تھیں اس بات کا بار بار حسیہ کرتے پر بھی کدو ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانتے گی اور ان کے ساتھ بڑے ڈونگھے پر کے ساتھ پیش آئے گی۔ بیحد اپنے جذبات کے حوالے سے یہ بجا بیا کرتی تھی اور فقط ایک سو بیاسی عورت وہ بجا بیا کرتی تھی اور ہر روز اس کو اس کا پیرا لایا یا لانا تھا اس سے کہا کرتا تھا "سوگند جی میں تجھے سے پریم کرتا ہوں" اور سوگند بھی یہ جانی ہو چکا کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ بس یوم ہو جاتی تھی اور ایسا غصوں کوئی تھی جیسے کچھ اُس سے پریم کیا جا رہا ہے۔ پریم۔ کتنا سندر لگتا ہے۔ وہ جانتی تھی اس کو گھٹا کر اپنے سارے انگوں پر مل گئے، اُس کی مائش کو سے تاکہ یہ سارے کا سارا اُس کے صبر میں رہ جائے۔ یا پھر خود اُس کے اندر چل جائے۔ سمٹ سٹا کر اُس کے اندر داخل ہو جائے اور نوپر سے ڈھکن بند کر دے۔

لیکن کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اُس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیا تو کئی بار اُس کے کبھی میں آناکہ اپنے پاس پرچے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر قہقہہ لانا شروع کر دے اور لڑکیاں دے کر اُسے اپنی گود میں سلا دے!

ہریم کر سکنے کی اجازت اس کے اندر اس قدر راہ چنی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ جانتا کہ سکتی تھی اور پھر اس کو
نیام بھی سکتی تھی اب تک چاروں مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی۔ جس کی تصویر یہ اس کے سامنے دریا پر لٹک رہی تھیں۔ ہر
وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے لیکن یہ اچھا پس مردوں میں کیوں نہیں جو نایاب بات اس کی گھر
میں نہیں آتی تھی۔ ایک بار اندر دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ سوکھ جی — تجھ سے زمانے نے
اچھا سلوک نہیں کیا ؟

یہ مذاکرہ یخچال پر پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں اُن کے چہرہ کے ساتھ وابستہ تھا۔ اُس زمانے سے اُس کو فطری نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اُس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ جانتی تھی کہ یونانی اُس کے دن بیچتے چلے جائیں، اُسے کون سے عمل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا پالچ کرتی۔ دس روپے اُس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رات لال اور دن والی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے دُسے روز لایا جاکرتے تھے جو اُس کی اکیل جہاں کے لیے کافی تھے اور باقی صاحبِ خانہ سے بقول رات لال و دال لال، سوگند میں پروا جو اسے بوجھنے کے لیے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی، یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگند لای کر اس سے پکڑوہر برگ لائے۔ رات لال و دال لال ٹھیک کرتا تھا، اس میں دس بات ضروری تھی جو سوگند میں کو بہت بھانجی تھی، اب اُس کو

چھپا کر لیا ہے۔ اب یہی کیوں نہیں! ————— ہو گئی ہے جب ادا ہو کر پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا: تجھے لاج نہیں آتی چنا بھاؤ کرتے اجانتے ہے تو میرے ساتھ کسی چیز کا سودا کر دی ہے؟ ————— اور میں ترسے پاس کیوں نہ رہوں؟ ————— ہنگامہ لگ گئی ————— دس روپے اور سیساکہ تو کتنی ہے ڈھائی روپے دلال کے۔ باقی رہے ساڑھے سات، درجہ ساڑھے سات؟ ————— اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا دوسری دہائی ہے ہو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے کیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا ————— مجھے عزت چاہیے پر مجھے کیا اس دست، اس کھڑی مرو چاہیے؟ ————— مجھے تو عزت ہی بھابھانے کی پر کیا میں تجھے چمتا ہوں ————— تیرا میرا ناٹ ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں ————— بس یہ دس روپے بھی میں سے ڈھائی دلال میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر کھجورائیں گے، دیر سے ادھر سے بیچ میں کیا رہے ہیں ————— تو جی ہاں کا بھناٹا نہیں رہی ہے اور میں بھی تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ————— کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ مجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری ————— پونے میں حالدار ہوں۔ پیسے میں ایک بار آیا کہوں گا یہی چاہوں گے ہے ————— یہ دھندا اچھڑ ————— میں تجھے خرچ دیا کروں گا ————— کیا بھڑا ہے اس کھول کا —————؟

دادھو نے اور یہی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سونگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حالدار ہی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد دادھو نے اس کمرے کی کھری ہوئی چیزیں خریدنے سے رکھی تھیں اور مثالی تصویر پر جو سونگندھی نے اپنے سر لٹکانے کا کارنامہ کیا تھا، بنا پر تجھے گھمے چھاڑ دی تھیں اور کہا تھا: ————— سونگندھی! میں میں ایسی تصویر پر ہمارے نہیں رکھنے دوں گا ————— اور پانی کا ٹھکڑا ————— دیکھا، کتنا میلا ہے اور یہ ————— یہ پیسے ————— یہ چندیاں ————— ات کتنی تیری پاس آتی ہے۔ اٹھائے کے باہر صلیک اٹک ————— اور تو نے اپنے ہاتھوں کا کیا نتیجہ اس کر سکا ہے ————— اور ————— اور —————۔

تیس گھنٹے کی بات چیت کے بعد سونگندھی اور دادھو دونوں آپس میں غسل لی گئے تھے اور سونگندھی کو تو اب محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے کھالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے ہی کمرے میں بدبودار چھتیزاؤں، پیلے گھڑے اور مثالی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک ٹکڑے جس میں گھری ہوئی آسکتا ہے لوگ آتے تھے وہ بستر تک کی غلاظت کو محسوس کیے بغیر چلے جاتے تھے کہ ان سونگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا: دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے ————— شہر میں تیرے واسطے دوا لگاتا ہوں۔ دادھو کھٹکا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون قولہ اور پادرتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سونگندھی کو ————— اسے محسوس ہونے لگا کہ اُسے دادھو کی ضرورت ہے چنانچہ ان دونوں سے سمجھتا رہ گیا۔

میسے میں ایک بار دادھو پڑنے سے آتا تھا اور وہاں چلتے ہوئے ہمیشہ سونگندھی سے کہا کرتا تھا: دیکھ سونگندھی! اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو میں تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے میاں ٹھہرا تو بٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا ————— دیکھ اس میسے کا خرچ میں تجھے پڑنا پسند ہے ہی مٹی اڑا کر دوں گا ————— ہاں کیا بھڑا ہے اس کھول کا۔.....“

زادہ سونے بھی پونے سے خرچا بھیجا تھا اور زسوں گندھی نے اپنا دھندہ بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے، کیا بڑا ہے زسوں گندھی نے بھی مانتو سے کہا تھا، "تو بڑا ڈر کر آیا ہے، ایک چھوٹی کوڑی ہی دی ہے بھی تو لے" اور زادہ سونے بھی سوں گندھی سے پوچھا تھا، "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے۔ جب کریں تجھ کو دینا ہی نہیں" — دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک طبع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے — لیکن سوں گندھی خوش تھی جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ طبع کیے ہوئے گمنوں کی برادری ہو جایا کرتا ہے۔

تیسرے وقت سوں گندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا فطر جسے آہٹ کرنا وہ بھول گئی تھی۔ اس کے سر کے اوپر ٹھیک رہا تھا۔ اس کی تھوڑی سی آس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ مگر وہ گری بند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی — سات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوں گندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھینسا پٹ ہی کر گئی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چٹک کر اٹھ بیٹھی — دوڑی ملی ٹرائیں اور دستوں کی ریزوں میں پھنسے ہوئے بھگی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کیلہ اور صیدار تھا۔ دھونک کے توڑے اٹھ لے کر یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملے گی۔ پلنگ پر وہ اکیل تھی۔ ٹھیک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا گناٹا سونکھے ہوئے چپوں پر بند رکھے سو رہا تھا اور پینڈ میں کسی غریبی چیز کا سر پڑا رہا تھا اور عموماً پیٹو کے بالوں میں سر دیے سڑا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی سوں گندھی بستر پر سے اٹھی۔ سرور کے اوسے پٹا بٹا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے گل کی اور دوسرا ڈونگا نکال کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا، "دام لال؟"

دام لال جواب نہ دیتے دیتے ٹھیک گیا تھا۔ جتنا کہنے لگا، "جیسے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کاک (گھنٹہ) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا۔ کہاں رہی تھی؟ — پھر آواز دیا کہ اس نے مجھے سے کہا، "اند کوئی ہے تو نہیں؟"

جب سوں گندھی نے کہا، "نہیں" — تو دام لال کی آواز پھر اٹھی ہو گئی، "تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ — ابھی مدد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھو کوئی آکر لے میں دودھ گھٹنے سر پہا کر لے تو میں اپنا دھندہ کر چکا — اب تو میرا منہ کیا کھیتی ہے۔ جیسٹ پٹ یہ دھونک آنا کہ وہ پھروں والی سامی ہیں، پوٹو دوڑ رہا تھا اور پل میرے ساتھ — باہر بیٹھیں ایک سیڑھی چلتی رہا

انتظار کر رہے ہیں — چل چل ایک دم جلدی کر۔"

سوں گندھی آدم کر دی پر بیٹھ گئی اور دام لال آہینے کے سامنے اپنے بالوں میں کٹھنی کرنے لگا۔

سوں گندھی نے تپان کی لاف بات کر دیا اور دام کی ٹیشش اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھاتے ہوئے کہا، "دام لال کچھ میری اچھا نہیں۔"

دام لال نے کٹھنی دو دو کر گریہ کر دیا اور سر کر کہا، "تو جیسے ہی کہہ رہا ہوتا۔"

سوں گندھی نے ماتھے اور پیٹ پر ہر دم ہٹے ہوئے دام لال کی غلط فہمی دہر کر دی وہ بات نہیں دام لال! — ایسے ہی میرا اچھا نہیں — بہت ہی گئی۔"

دام لال کے منہ میں دانی بھرتا تھا۔ پڑی ہوئی رہا — خدا ہم ہی سے کلمہ اٹھیک کر لیں۔"

رام لال دلال کی آواز سنائی دیتی۔ پتہ نہیں کیا تجھے ہے۔ اچھا بھئی میں چند ہوں دو گھنٹے صفت ہی میں برابر کیے۔
یہ اُس کو سونگندھی کی ٹانگوں میں اُس کی ہانوں میں اُس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ کہاں ہے وہ
موٹر۔ کہاں ہے وہ سیٹر۔ تو آؤ نہ کامطلب یہ تھا کہ اُس نے مجھے پسند نہیں کیا۔ اس کی.....
گالی اُس کے پریش کے اندر سے اُٹھی اور زبان کی ٹوک پر آکر رک گئی۔ وہ آخر کمال کسے رہتی موٹر تو جا چکی تھی۔ اُس کی دم کی
سُرخ جتنی اُس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ٹھوب رہی تھی اور سونگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال دلال انگارہ آؤ نہ ہے
جو اُس کے سینے میں برسے کی طرح اُترا چلا جا رہا ہے۔ اُس کے جی میں آئی گند سے پکارتے۔ اوسیتھ۔ اوسیتھ۔ ذرا
موٹر دیکھنا اپنی۔ بس ایک منٹ کے لیے۔ پھر وہ سیٹر تھری ہے اُس کی ذات پر بہت دُور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی سائیں جو۔ خاص خاص بوتلوں پر پینا کر لی تھی۔ رات کے کچھ پہلے ہر کی ہلکی سی
ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑھی اور اُس کی شصیں سرسراہٹ سونگندھی کو کتنی بُری معلوم جو تھی وہ چا جتنی تھی کہ اس ساڑھی کے پتھر شے
اُٹا دے کیونکہ ساڑھی ہر وہی لہرا لہرا کر آؤ نہ، اوسیتھ گورہی تھی۔

گالوں پر اُس نے پڑا دیا تھا اور خرد پڑا دیا تھا۔ جب اُسے خیال آیا کہ یہ سنگا اُس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے
کیا تھا تو خرم کے مارے اُسے پسینہ آیا۔ یہ شرمندگی دُور کرنے کے لیے اُس نے کیا کچھ نہ سوچا۔ میں نے اس سونے کو دکھانے
کے لیے تھوڑی اپنے آپ کو بجا دیا تھا یہ تو میری عادت۔ میری کیا سب کی یہ عادت ہے۔ پڑ۔ پڑ۔
یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور۔۔۔ یہ بازار۔۔۔ اور وہ موٹر اور میٹری کی چٹک۔ یہ سوچتے
ہی روشنی کے دیجے اُس کی تھوڑا سا تک نضا میں ادھر ادھر ترانے لگے اور موٹر کے انجن کی پھر پھر ٹھٹھ اُسے ہوا کے ہر
جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اُس کے ہاتھ پر ہام کا لپ جو مستکار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا پسینہ آنے کے باعث اُس کے مسامروں
میں داخل ہونے لگا اور سونگندھی کو پتا تھا کہ اُس کا ہاتھ معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اُس کے حلق آؤ نہ تھے کے پاس
سے گزرا تو اُسے ایسا سنگا کہ سرد و شوین کا ٹھٹھاکاٹ کر اُس کے ہاتھ کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں حدود سے کاویسا پڑ
تھا مگر خیالات کی پھیر جھاڑ لہرائی کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا سونگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے
نیچے سے نکال کر اُتر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چا جتنی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُس کا انگ انگ ڈکھنے لگے۔ اُس کے سر میں درد ہو،
اُس کی ٹانگوں میں درد ہو، اُس کے پیٹ میں درد ہو، اُس کی ہانوں میں درد ہو، ایسا درد کہ وہ صرف وہی کا خیال
کرے اور سب کچھ بھول جاسے۔ یہ سوچتے سوچتے اُس کے دل میں کچھ ہوا۔ کیا یہ درد تھا؟ ایک لمحے کے لیے
اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا۔ کیا تھا؟..... صفت! یہ تو وہی آؤ نہ تھی جو اس کے دل کے اندر بھی سکڑاتی اور بھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سونگندھی کے قدم اُٹھے ہی تھے کہ رک گئے۔ وہ درد شکر کو سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اُسے سونگندھی
ہی پسند نہیں آئی۔ شکر کا تو اُس نے نہ مانا تھا۔ کیا اُس نے تو رکھا تھا سونگندھی تجھے پسند نہیں کیا؟ اُسے۔۔۔ صوف میری شکر ہی

سوگند می بد صورت تو نہیں تھی۔ بیخیال آتے ہی وہ تمام کس ایک ایک کے کس ایک کی جھگھول کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں ہوا، جیتنے میں دیکھ کر کچھ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا ناک ٹوٹا، اب وہ نہیں رہا تھا، آج سے پانچ سال پہلے تھا۔ ایک وہ تمام ٹکڑوں سے آگے اپنے ہاتھ پک کے ساتھ ڈاکر تھی۔ لیکن وہ بد صورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل و صورت ان عام چورتوں کی ہوتی تھی، جس میں اس طرح نہ گندے گندے ٹکڑوں کے دیکھ دیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام غریب مسکندہ جی کے خیال میں ہر مرد اس صورت میں ضروری جگہ ہے جس کے ساتھ اسے ایک لادو میں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کا کھانا انتہا سبب کبھی کبھی نہ لے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی دافوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گرلائی اور گندہ دھت کو پسینہ لگاتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے بعد ان میں شاید یہی کوئی آگاہی اس سے خوش ہو کر لیا ہو۔ بڑی طشتار تھی۔ بڑی دھم دھم تھی۔ پچھلے دنوں کو مسرور جب وہ گولی بیٹھی میں داکر تھی۔ ایک فرحان داکر اس کے پاس آیا تھا۔ سچا اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھڑکی سے دیکھا تو اسے ایک اور فرحان ثابت پایا۔ سوگند کا داکر یہ ٹوٹے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چٹھیاں گندائے کے لیے حیدر آباد سے تھی۔ آگاہ اب اس کے پاس داپس جانے کے لیے دھم دھم تھے۔ سوگند نے ترس کھا کر اسے اس کے دس دپے داپس سے دے دیے تھے۔ پھر میں کیا بکاتی ہے؟ سوگند نے یہ سوال اس پر اس پر سے بکایا جو اس کے سامنے تھی۔ گیس کے ڈبے سے پک، صوبے کے کچے ڈبے، ان کے داکر کو دیکھ کر وہ داکر کے داکر کی داکر کی برائی ہوئی ہوئی۔ ان سب چیزوں کی طرف اس نے بار بار بار بار دیکھا، پھر وہ اس کی طرف لگا دیں آگاہ اس جو اس کے آگاہ تھا، پھر وہ داکر سوگند کی کوئی چیز نہ لے۔

جواب اُس کے اندر موجود تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ بڑی نہیں رہی ہے، پر وہ جانتی تھی کہ کوئی اس کی ایسا کرے۔ کوئی — کوئی — اُس وقت کوئی اُس کے کانوں پر ہر اقدار کو موندنا، تکانا، دسے سوگندیں، اکوئی کہتا ہے، تو بڑی ہے، دو چھ بڑا کہے۔ وہ آپ بڑا ہے۔ — نہیں، یہ کہنے کی کوئی حد نہ ہے۔ نہ وہ نہیں تھی، کسی کا انا کہہ رہا تھا، انا تھا۔ سوگندیں تو بڑا، اچھی ہے! — وہ سوچنے لگی کہ وہ کبوں چاہتی ہے کوئی اس کی تعریف کرے، اس سے پہلے اُسے اس بات کا شہدہ سے ضرورت تھی۔ محسوس نہ ہوئی تھی کہ وہ کبوں وہ ہے، بلکہ وہ بڑی ہو کر لگی، یہی مفہور ہے۔ کہ نہیں، ہے جیسے کسی پر اپنے اچھے ہونے کا احساس، یہ بڑا چاہتی ہے اُس کے نام کا تہہ و تنہہ کیونٹ ملے، میں رہتا ہوں۔ وہ نہیں کہ کوئی اس کی تعریف کرے، یہ کہیں کیا ہو رہی تھی؟ — اس کا کیا کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے جس کد، خوش گلی کے ساتھ چٹ جاتے اور اُس کے سر پہ بے پراپے کمال لکھ دے۔ — اپنے گرم گرم گال اور اُس کی ساری موی ٹوٹے۔

تھوڑی دیر کے لیے اُسے اس مخصوص بڑا کمرے کے اندر سے پیمپ اوپے کے کھجے، فیلڈ ہاتھ کے چکر چکر اور ہر وہ طے جو رات کے ستارے میں اُس کے اُس پاس تھی بعد ہدی کی نظروں سے اُسے دیکھ رہی ہے اور اُس کے اوپر بڑھکا ہوا آسمان بھی جڑیلا سے دنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اُس کی پائیں سمجھتا تھا اور سو گندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کو ٹھٹھاتا کھینچتی ہے۔ — لیکن اُس کے اندر یہ کیا گڑبگڑ تھی؟ — وہ کیوں اپنے اندر اُس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بادش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے۔ — اُس کا بچا چاہتا تھا کہ اُس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے، اور جو کچھ اُس کے اندر ابل رہا

ہے ان کہہ دیتے بارنگل جاتے پھرے کیسے جو — کیسے جو ؟

سوگندھی کے کپڑے خط ڈالتے مارے لال چپکے کے پاس کھڑی تھی — ہوا کے تیز جھوکے سے اس بچہ کی آنکھیں زاری جو اُس کے کٹھے جوئے منہ میں لگی رہتی ہے ، اڑکھائی تو سوگندھی کی نگاہیں ایک ایک اُس غرت اٹھیں جدھر وہ لگتی تھی گنا سے کچھ نظر نہ آتا — اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موڑ پھر ایک بار آئے اور — اور —

”آئے — بلا سے — میں اپنی جان کیوں بیچارہ لگان کروں — گھر چلتے ہیں اور ادا نام سے لٹی لٹائی کر سوتے ہیں۔ ان جگہوں میں رکھا ہی کیا ہے بھت کی درد سہی ہی تو ہے — پل سوگندھی گھر پر —“ غدا سے پانی کا ایک ٹونڈ لگائی اور تھوڑا سا ام آکر سر ہا — فٹ کلاس میں آئے گی اور دب ٹھیک ہو جائے گا — سینٹ اور اُس بوڑھی کی سی تھی — یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا رجو دکھا ہوا جیسے وہ کسی شخص سے ناوب سے خدا ہو کر باہر تھی ہے جس طرح لپکا کھانے کے بعد اُس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا گھر کی طرف چلتے گئی تو خیالات کا بوجھ نہر مرنے کے باعث اُس کے قدم بھی بار اڑکھڑاتے ۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر مقام واقعہ اُس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اُس کے دہانہ دیکھ کر بھاگ گیا — قدم پھر واصل ہو گئے اور وہ اس بات کو خدمت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ کمرے کا کراہتا ہوا اور میں نہر پر دھنی کا ہڈا مار کر ایک آدمی نے اُس کی ابھی ابھی جنک کی ہے ۔ یہ خیال آیا تو اُس نے اپنی پیسوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کیے جیسے کوئی اُسے پھینک رہی کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال بڑیل میں — اُس سینٹ نے — ہر تھاکرے سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بد عادی سے مگر سوچا ، بد عادی سے کیا بنے گا ذرا تو سب تھا کہ وہ سامنے برا اور وہ اُس کے جود کے ہر قدم سے اپنی محنتیں مکھو دیتی — اُس کے نہر پر کچھ ایسے اتفاقا کتنی کوڑھی جبر ہے حسین رہتا — کپڑے پھاڑ کر اُس کے سامنے لگی ہو جاتی اور کہتی نہیں جینے آیا اتفاقاً تو — بے دلام دے پنا لے جا اسے — ہر کچھ میں ہوں ، ہر کچھ میرے اندر بچھا ہوا ہے وہ تو کیا تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا —“

انتقام کے خٹے خٹے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آرہے تھے ، مگر اُس سینٹ سے ایک بار — صرف ایک بار — اُس کی ٹڈ میٹر ہو جائے تو وہ یہ کرے ، نہیں ، یہ نہیں دے کرے — یوں اُس سے انتقام ہے ، نہیں یوں نہیں یوں — لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سینٹ سے اُس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اُسے ایک چھوٹی سی گالی دینے پر غور کرنا ہنسی لیتی — جس صرف ایک چھوٹی سی گالی ، جس اُس کی ناک پر چکر کھنکی کی طرح میٹر جاتے اور ہمیشہ وہیں بھی رہے ۔

اسی اوجھڑنے میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی پر لڑکیوں سے چابی نکال کر نکالا کھولنے کے لیے اعتراض کیا ۔ تو چابی پر ہی جس گھوم کر وہ گئی اٹھنے سے بین نکال نہیں تھا ؛ سوگندھی نے کورا اندر کی طرف دبا تے تو لگی سی چڑچڑاہٹ پیدا ہوئی ۔ اندر سے کسی نے کھڑی کھولی اور دھڑا دھڑا سے نے جانی لی ، سوگندھی اندر داخل ہو گئی ۔

آدھو لوٹنے میں رہتا اور وہ اندر دنگ کر کے سوگندھی سے کہنے لگا آج تو نے یہ کیا کیا — میری سیر

محدود حق کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر وہ ناس طرح جج آٹھ کر کھونٹے جایا کرے گی تو تیری ساری شہسختی خود جو جانے کی اور وہ تیری کر کا اور میں غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو نے وہی شکوت کیا کرتی ہے۔ — دکھ دیکھ کر ڈن دن تک تو میرا نہ مرگ تو؟ — یہوں؟

سو گندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ دھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب ملاحدوبات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سو گندھی خود اس میں حصہ لے اور سو گندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ دھو اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

ادھو بید کی کڑھکی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چڑھے ہوئے سر نے میل کا ایک بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا اور ڈانٹ پر ڈانٹ دیکھ کر انہی منہجیوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سو گندھی پہلک پر بیٹھ گئی اور ادھو سے کہنے لگی میں آج تیرا انتقام ہی کر رہی تھی۔

ادھو بڑا ہنسٹا ہوا۔ — انتقام؟ — تجھے کیسے معلوم ہو کہ میں آج آنے والا ہوں؟

سو گندھی کے بچے ہوئے ب کھلے۔ — ان پر ایک پہل مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ — میں نے رات تجھے پسینہ دیکھا تھا۔ — انہی تو کوئی جلی نہ تھا، سوئی نے کہا چلو نہیں باہر گھوم آئیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔

ادھو خوش ہو کر رہا۔ — ادھ میں آگیا۔ — مجھ بڑے دنگل کی باتیں بڑی ہی ہوتی ہیں، کسی نے جب تک کہ اسے دل کو دل سے دھو ہے۔ — تو نے رہنمائی دیکھا تھا؟

سو گندھی نے جواب دیا: چار بجے کے قریب۔

ادھو کسی پر سے آٹھ کر سو گندھی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اس نے تجھے دیکھنے پہنچے میں رکھا۔ — جیسے تو پتھروں کی

ساڑھی۔ — اسے بالکل ہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے، بڑے ہاتھوں میں۔ — کیا تھا تیرے ہاتھوں میں!

— ہاں تیرے ہاتھوں میں دوپٹوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری معمولی سا دھوئی اور کہا: — ادھو، تو پتھرا

کیوں کرتا ہے؟ — بے قبیل۔ — اسے تیرے سے بڑے دھپے کیا اور میں؟ — سو گندھی تیری جان کی قسم

نوراً آٹھ اور ٹکٹ کا کا دھ کر مارے گا۔ — کیا شادی بڑی پریشانی ہے! — بیٹھے بٹائے ایک کیس بر گیا ہے۔

اب میں تیس روپے ہوں تو۔ — انپاکٹر کی مٹی گرم کر کے چھٹکارا ہے۔ — تھک تو نہیں گئی تو؟ یہی تیرے سے بڑے

دباؤں۔ میری عادت نہ ہو تو تھکن ہو رہی جایا کرتی ہے۔ — ادھو میری طرف پیر کر کے بیٹھا جا۔

سو گندھی بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں کا کلیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔ اور اس لمحے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا۔

ادھو سے کہنے لگی۔ — ادھو، یہ کس ٹوٹے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟ — بیل دیں گا تو دھو تو مجھ سے کہو۔ — میں نہیں

کیا سوچا اس جی ایسے سوچوں پر پولیس کے ماتر میں تھا دیے جائیں تو نہ اندھ اپنا ہی ہے۔ — جانی گی لاکھوں پائے۔

بس بس اب جانے دے، تنگی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ — مٹی چاہی جھوڑا دھ گھے ساری بات سُنا۔ — کیس کا نام لے لے

زور کا ہتھ دگا کر اس نے "اوندہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دونوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کالج ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی شکل سے اس نے جش کر اٹھا کہا: "اچھا کیا؟" — مجھے بھی یہ فرق پسند نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ "مجھے یہ فرق پسند نہیں تھا۔" — یہ میں پر چھٹی ہوں تجربہ میں ہے ایسی کوئی چیز کسی کو پسند آ سکتی ہے — یہ جبری کوشاں سی ناگ، یہ تیرا بالوں بھرا تھا، یہ تیرے سروے جیسے ہونے لگے یہ تیرے شرسے ہونے لگے، یہ تیرے منہ کی اس، یہ تیرے بدن کا سیل ہے — تجھے اپنا فرق پسند نہیں تھا، اوندہ..... پسند کیوں جو تیرا تیرے محبوب پر چھپا رکھے تھے اُس نے..... آجکل زمانہ ہی ایسا ہے جو عجب پھپھائے ہوئے ہیں۔"

مادھو بچھے بٹھا گیا، آخر جب وہ دیوار کے ساتھ ٹک گیا تو اس نے اپنی آواز میں اندر پیدا کر کے کہا۔ دیکھ سوگندھی، مجھ ایسا لگائی رہتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندلا شروع کیا ہے — اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں....."

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لیے میں کتنا شروع کیا۔ اگر تو نے پھر سے اپنا دھندلا شروع کیا تو بس تیری بیری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو ٹھیک سے پڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا — اس مہینے کا خرچ میں تجھے پڑنا چھتے ہیں میں ہی اُٹھا رکھ دوں گا — ہاں کیا بھلا ہے اس کوئی کا؟
مادھو بکرا گیا۔

سوگندھی نے کتنا شروع کیا۔ میں بتاتی ہوں — پندہ وہ پر بھلا ہے اس کوئی کا — اور دس روپیہ بھلا ہے بے پرا — اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے ساڑھے سات، یہ ان ساڑھے سات دو چلوں میں نہیں لے کر ہی چیز دینے کا خرچ دیا تھا، خرچ میں دس ہی نہیں سکتی تھی اور تو کسی چیز لینے آیا تھا جو تیرے ہی نہیں سکتا تھا — تیرا سونا آج کیا تھا کچھ بھی نہیں، بس یہ دس روپے تیرے اور میرے خرچ میں بچ رہے تھے۔ سونم دفن نے لی کر اس بات کی کہ تجھے بیری ضرورت ہوئی اور تجھے تیری — پہلے تیرے اور میرے خرچ میں دس روپے بچتے تھے، آج بچاس بچ رہے ہیں تو بھی اُن کا بچنا نہیں رہا ہے اور میں بھی اُن کا بچنا نہیں رہی ہوں — یہ تو نے اپنے ہاں کا کیا ستیا اس کر رکھا ہے؟

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوٹی انگلی سے ایک سونٹ اُڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کی ست ناگ اور گودی اس نے بڑے بڑے جیسے میں کہا۔ "سوگندھی؟"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے سونم نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ "تیرے سونے، یہ چندیاں — اُن کتنی بُری ہاں آتی ہے، اُٹھ کے باہر پھینک اُن کو....."
مادھو ہلایا۔ "سوگندھی؟"

سوگندھی نے تیرے میں کہا۔ "سوگندھی کے بچے تو کیا کس لیے ہے یہاں؟" — تیری ماں رنجی ہے اس جاگہ تجھے روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا بوجھ ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں..... نہتے، کینے، بھر رہا ہے کا منتھا ہے؟ میں تیری

وہیل ہوں کیا ؟ ————— بجک متلے تو پہنے آپ کو سمجھو کیا بیٹھا ہے ؟ ————— میں پر بھگتی ہوں تو ہے کون ؟ ————— چہرا گھٹے گھڑے ؟
————— اس وقت تو سر سے مکان میں کونے کیا آیا ہے ؟ ————— بلاؤں پر میں کو ؟ ————— پلٹنے میں پلٹ کر نہیں ہرگز میں، یہاں تو مجھے
ہر ایک کیس کھڑے گھڑوں —————

ماہو ستم گیا۔ دیکھتے ہوئے مجھے میں دوصورت اس قدر کمر سکاڑ سونگندھی، تجھے کیا ہو گیا ہے؟
تیری ماں کا سر۔۔۔ تو ہرکانوں ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔۔۔ بھاگ یہاں سے۔۔۔ دن۔۔۔ " سونگندھی کی
ہفتہ آواز سن کر اس کا انداز دل زوہٹتا ہوا سنکے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ڈیر ڈاکڑ تھا اور لڑکھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکا شروع
کر دیا۔ کتے کے بھونکے کے ساتھ ہی سونگندھی دھڑنور سے چلتی گئی۔

مادھو ڈر گیا۔ گرمی بھری ٹوپا اُٹھانے کے لیے اُٹھ نکلا تو سگندھی کی کرج سنائی دینی خبردار — پڑی رہنے دے دیں —
 — تو جاتیر سے چلتے پہنچتے ہی نہیں اس کوئی آڈر کر دوں گی — یہ کہہ کر وہ اندر سے جھبیلاؤں جتنی خست بیہوشی پر بیٹھ گئی، اُس
 کے خدوش فزہ کتنے بھونک بھونک کہہ کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ میٹرھیان اُٹار کر جب ٹھٹا اپنی ٹیبلٹ منڈم لے کر سگندھی
 کے پاس واپس آیا تو اُس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھر پھر اُٹھانے لگا تو سگندھی چاگئی — اُس نے اپنے چادر میں غرت ایک
 بولٹاک نشان اُٹھایا — ایسا سنا گا تو اُس نے پیٹے بھی نہ دیکھا تھا اُسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے — جیسے مسافروں
 سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اشیائیں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے ٹیکڑوں میں بالکل اکیل کھڑی ہے۔۔۔۔۔ یہ غلط جہاں چاگ
 سگندھی کے اُٹھ بیٹھا ہو گیا تھا اُسے بہت تکلیف دے رہا تھا اُس نے کافی دیر تک اس غم کو دھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ
 ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونسنے لگی مگر بالکل بھینٹ کا سا حساب تھا۔ وہ سردی دماغ کو توڑ کر تھی۔ اُٹھو وہ
 خالی ہو جاتا تھا۔

بیت درنگ۔ دو بید کی کڑھی پر بیٹھی رہی۔ سرخ بیکار کے بعد بھی جب اُس کو اپنا دل پرچانے کا کوفی طریقہ نہ ملا تو اُس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گڈڑیں اُٹھایا اور سانگاری کے چوڑے پٹنگ پر اُسے پلو میں ڈاکر سو گئی !
(منٹو کے افسانے میں سے)

موزیل

ترتوجی نے پہلی مرتبہ — چار برسوں میں کئی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبراتی رہتی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کہہ دیر سوچنے کے لیے اٹھاتی پھر بڑے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تلو کی طرح ساری اپنی پرتنا ہوا تھا۔ جو نعرہ کہ جگر ونگہ بتیاں روشنی تھیں، ترتوجی نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑک رہے تھے۔ جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتے تھیں، انکے گئے ہیں اور بگبگوؤں کی طرح ٹٹا رہے ہیں۔

ترتوجی کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی — رات کو کھٹا آسمان کے نیچے ہونا، اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے غیبتوں میں تہہ و بالا قدرت کی ایک بہت بڑی قوت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد بھئی بھئی تھی۔ ترتوجی چھپنے کی یہ کھانگی ہوا کا عالمی تھا جو اس کے سارے دل کو بھیل کر رہی تھی۔ صبح آٹھ گھنٹہ پیشروں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو بلا بیٹا لگتا ہے۔ پر اب صبح کی قدرت ہی ہوا میں اس کے جسم کا عالمی دھان، ترد و تازگی جو اس کو خوش ہر دیا تھا جب وہ اُپر آیا تھا تو اس کا دل دوبارہ سخت مضطرب اور بے چارہ تھا۔ لیکن آج سے گھنٹے ہی میں وہ مضطرب اور بے چارہ جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا، کسی حد تک ٹھنڈ ہو گیا تھا اور اب صاف طور پر سرچ سکتا تھا۔

کراپال کو یاد اس کا سارا خاندان — محلے میں تھا۔ جو کہ مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگس رہی تھی۔ کئی جائیں صحت ہو چکی تھیں۔ ترتوجی ان سب کو بے آریا ہونا، مگر مصیبت یہ تھی کہ کرنی ناختم ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا — غالباً آٹھ یا بیس گھنٹوں کا — اور ترتوجی لازماً مغلوب تھا اس پاس سب مسلمان تھے۔ بڑے خوفناک مسلمان تھے۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ پھریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھار رہے ہیں۔ کوئی بھی اتنا — مسلمان اتنا بڑی آسانی سے نرم و نازک کراپال کو رکھ لاتی ہے کہ حکومت کے نمائندوں کی طرف سے جاسکتا تھا۔

کراپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ بے غلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیوانہ لال میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ بے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترتوجی کو کراپال کے بھائی نے زخمیں پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس لیے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، منادات کی تیزی و شدت کی متعلق جتنے بھر پہلے آگاہ کر دیتا تھا، اور منادات تقطعوں میں کس دیتا تھا۔ ترتوجی یہ ٹھیکے دیکھ لگتا رہتا۔ ہم ایک بہت ہی نازک لہ یہ مناد سب پہلے نقوش ہی میں چھپا تھا۔ مناد کے مناد کے اضافوں کی صورت میں اسے دوبارہ نقوش میں پیش کیا جاتا ہے۔

قد سے گندہ ہے ہیں۔ تھلا کرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہاں سے اُلٹ جا کر اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزار کر کیا کرتا ہے۔ گروہ خانا۔ اس کا تاثر بڑا نیکو پرش کو سونہ ہو گئی مگر کھوں میں شکوہ اور تیار، تم غمناک غمناک غمناک رہو۔ میں نے یہاں ایسے کئی غمناک دیکھے ہیں۔ یہاں تھلا کرچہ رہنا ہو نہیں۔ جیسے ہے۔ بچے تھیں یہاں آئے صورت چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔ بارہ برس سے۔

جانے فریضہ بھی کر کیا کھیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں ایسا ظہر ہے، اگر غمناک رہا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود ختم ہو جاتا ہے، جیسے اس کے پاس چھوٹا سفر ہے۔ یاد وہ کہاں کیوں کا کوئی ایسا ظہر ہے جس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔ مگر تو فرمیں کہ کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ۔ غمناک بالکل غمناک نہیں۔ وہ تو برج کے جنابوں میں سے ہیں چڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کراپال کو روک دے اس کے ان باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کراپال کوڑ کے مظلوم باپ اور اس کی اندھیاں ماں کی کوئی پیدا نہیں تھی۔ وہ رہا تھے اندھ کراپال کوڑ بچ جاتی تو تو فرمیں کے لیے اچھا تھا۔ وہاں دیوہا دیوہا اس کا بھائی نہ رہیں بھی، مادا جاتا تو اندھ بھی اچھا تھا کہ تو فرمیں کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر تو فرمیں اس کے راستوں میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگڑا تھا، چنانچہ جب کبھی کراپال کوڑ سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے تو فرمیں ٹھوکر کی بجائے کھنگڑا سے ٹکراتا۔

صبح کی ہوا دیر سے دیر سے سرد رہی تھی۔ تو فرمیں کایکسوں سے بے نیاز اور میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے تھے۔ کراپال کوڑ کی نئی ماں کی زندگی میں داخل ہوتی تھی۔ وہاں تو بچے کچھ کھنگڑا ٹھوکر کی بھی تھی۔ مگر بہت ہی نرم و نازک لگیلی تھی، اس نے دیہات میں وہ دوش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گویاں مرد ہون لگی تھیں مگر اس میں وہ سختی وہ کٹھنہ۔ وہ مردانہ نہیں تھی، جیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں جیہات سے نہیں کڑی سے کڑی مشقت کر لی پڑتی تھی۔ اس کے نقش پتلے پتلے تھے۔ جیسے ابھی نامکمل ہیں چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جیہات پلائیوں کی چپڑاؤں میں پڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گرا تھا مگر گروت ٹھٹھے کی طرح، اور بدن چمکا تھا جس طرح سرخ اور ٹو پٹر سے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد نرم و لطیف تھی۔

تو فرمیں اسی کے گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پانقری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو اس پھر وہیں کا جو کہ رہ گیا۔ اسکول سے خارج ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی، اس دور میں وہ کئی مرتبہ۔ وہ تھلا کرچہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کراپال کوڑ کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا۔ شاید اس لیے کہ وہ میرا دوسرا افغانی میں رہتا تھا کہ جلد از جلد وہاں سے شہر چلے۔ کالج کا زمانہ بہت تھک چکا تھا۔ اٹھواں، پچیسویں کے ٹیس اور کالج کی ملازمت میں غمناک دس برس کا فاصلہ تھا اور دس سالہ تو فرمیں کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پر تھا۔ بڑا، سنگلاخ، بانگ لاگ۔ پھر بڑی، جہاں وہ چار برس سے قیوم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مہمزدات کا سامان کی شکل دیکھی تھی، جروری نہیں تھی۔ خاکستری رنگ کے تنہ کی جھٹ میں ہزار ہا دینے روشن تھے اور ہر ٹھٹھی لہر ہلکی ہلکی تھی۔

میں اپنے کو بچھو بھرے ہونٹ پر دست کر دیے۔

موزیل نے ایک دم تپوں چوں کی اداس کی گزرت سے غلطہ ہو گئی۔ "میں جس اپنے مانتے پر ہر شکر کی ہوں — تم تعظیم نہ کرو۔"

ترجمہ چلا آیا۔ موزیل۔

موزیل دینٹ ایک سے نکلا سا رنگ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی ٹاٹھی اب اس کے ہونٹوں میں آگئی تھیں۔
تھا کی قسم — تم اپنی ڈاٹھی پر بونٹوں کا بیج استعمال نہیں کرتے۔ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نئی بونٹ سٹ بے
ابھی طرح صاف کر سکتے ہیں۔ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی۔

ترجمہ غصے کی اس آواز سے پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ داخل ہوا وہاں تھا۔ آرام سے سونے پر بیٹھ گیا۔ موزیل بھی آگئی اور اس
نے ترجمہ کی ڈاٹھی کھولنی شروع کر دی۔ اس میں جو پیش لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں سے دبا دیں۔
ترجمہ کی صورت تھا جب اس کے ڈاٹھی پر پتھر نہیں لگی تھی تو واقعی لوگ اس کے کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر حیرت کھا جاتے
تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے، مگر ہاں کے اس انبار نے اب اس کے تمام اندوخال بھاڑیوں کے اندر اندر چھپا لیے تھے۔ اب
کوس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعرا اور ذراں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا
کہ ان چیزوں کا اپنے وجود سے الگ کر دے جس سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب ڈاٹھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موزیل سے پوچھا: "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پیش دبانے وہ مسکرائی۔ "تھوڑے بال بہت مہتم ہیں۔" میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نئی بونٹ سٹ
صاف ہو سکے گا۔ — ترجمہ — تم یہ مجھ سے دو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فٹ کلاس ٹھرا بناؤں گی۔
اب ترجمہ کی ڈاٹھی میں پتھر لگائے گئیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موزیل سے غائب ہوا۔ میں نے آج تک تھوڑے
مذہب کا مذاق نہیں ڈرایا۔ — تم کیوں اٹھاتی ہو — دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں یہ بھی
بدداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لیے کہ تاراجوں کو مجھے تم سے بے پناہ محنت ہے۔ کیا انہیں اس کا پتہ نہیں؟
موزیل نے ترجمہ کی ڈاٹھی سے کھیلنا بند کر دیا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

"پھر؟" ترجمہ نے اپنی ڈاٹھی کے بال بڑی صفائی سے ترکیے اور موزیل کے دانتوں سے نہیں نکالی ہیں۔ تم ابھی طرح جانتی ہو
کہ میری محنت کبھی نہیں — میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

"مجھے معلوم ہے۔" ہاں کو ایک خفیف سا ہنسنے کے ساتھ اٹھی اور دیوار سے ٹکڑی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی
قریب قریب یہ فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔

ترجمہ اچھل پڑا۔ "سچ؟"

موزیل کے منہ میں ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لمبے کے لیے چمکے۔ "ہاں!"

تقریب نے اپنی نصیحت پر مٹی ہوئی قرار دے لی ہے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ تو..... ترکیب
موزیل ایک ہٹ گئی تبجب — تم اپنے یہ بال کٹا دو گے؟

تقریب اس وقت جو ہوسو ہو، بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا: میں کل ہی کٹوا دوں گا۔

موزیل قریش پر شیبہ قوائس کرنے لگی: تم بھوس کرتے ہو تقریب — تم میں اتنی بہت نہیں ہے۔

اس نے تقریب کے دل و داغ سے جذبہ کے دے سے خیال کو نکال باہر بیٹھا: تم دیکھ لو گی:

”دیکھ لو گی“ اور دو تیزی سے آگے بڑھی۔ تقریب کی آنکھوں کو آٹھ آٹھوں بھون کرنی باہر نکل گئی۔

تقریب نے سات بھر کیا سوچا — وہ کن کن آفرینوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے۔ اس بچے کو دوسرے روز اس

نے فورٹ میں اپنے کس کٹوا دیے اور داڑھی بھی مٹوا دی — یہ سب کچھ جوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ ختم

ہو گیا تو اس کی آنکھیں کھولیں اور دیکھ کر اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر مٹی کی صیسیں سے جس طرح کی کچھ دیر کے لیے غور کرنے

پر مجبور ہو جاتا۔

تقریب وہی عجیب و غریب تشنگان محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیس پینز پر قرین

شروع کر دیا۔ جہاں شیلکوں اور ٹوں کا ایک جرم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے داغ میں نہ آئے مگر

آئے ہی نہ رہا۔

بال کٹا کر وہ پچھلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موزیل کر مٹی کی صیسیں

نا ساز ہے، اٹھوڑی دیر کے لیے آتا ہے۔ موزیل آئی۔ تقریب کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پچھلے وہ ایک لحظے کے لیے کھٹکی بھڑائی اور رنگ

تقریب ”کہہ کر اس کے ساتھ ہٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ مٹا بی کر دیا۔

اس نے تقریب کے صاف اور عام کالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں

سے کھٹکی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا — موزیل نے جب

اُسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھا یا اور اُسے پانچنا شروع کر دیا — تقریب فرمایا اس نے سکرٹ پی کی اور سرزنش کے

طو پر اس نے کہا: نیچے کچھ پس تو لیا کرو۔

موزیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اٹھری ہوئی پب اسٹاک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صحت اٹھائی

کہا: ”مجھے بڑی گھبراہٹ ہوئی ہے — ایسے ہی چلتا ہے۔

تقریب کو وہ پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موزیل دونوں مٹا گئے تھے اور اب میں کچھ عجیب طرح گڑبڑ ہو گئے تھے۔

مسکرا کر اس نے موزیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگایا۔ ”خدا ہی کل ہو گی؟“

”خود۔“ موزیل نے تقریب کی کلام ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

سطح پر ہوا کہ شاید پچھلے میں جو چنگ سول میرج تھی اس لیے ان کو دس پندرہ دن کا ٹوٹ دینا تھا۔ طالع کا لڑائی

تھی۔ اس لیے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پورے ہفتے سے پاس چلا کر تروچن کے وہاں کوئی دوست نہ ہو۔ وہ سب سے بدظن اور بدگوار کے مطابق پورے روزانہ جوتا تھا۔

موزیل ٹورٹ کے ایک مشرقی سیوا گراں تھی۔ اس سے کچھ نا اچھے چٹکیس اسٹینڈ تھا۔ اس ہی موزیل نے اس کو اشتہار کرنے کے لیے کہا تھا۔ تروچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا پھر گھنٹہ اشتہار کرتا رہا مگر وہ خالی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ ساز کو نو فریدی ہے، دیوالی چلی گئی ہے اور ایک غیر میس جیسے کے لیے وہیں رہے گی۔ تروچن پر کیا گزری؟ — یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کو دیکھا اور اس کو قبول کیا۔

انہیں اس کی ملاقات کراچال کو دے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور قصور سے ہی محبت میں اس نے محسوس کیا کہ موزیل بہت لادبیات لڑائی تھی جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے ہیں اور ہر شے کے اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹھکنا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موزیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود بھی موزیل کی یاد ایک پیشگی کے مانند اس کے دل کو کچلا تھی اور پھر پھر ڈر کر کڑے ملاقاتی غائب ہو جاتی تھی وہ بے حیا تھی۔ بے مروت تھی۔ اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر اس نے وہ تروچن کو پسند تھی۔ اس کے لیے کبھی وہ اس کے متعلق سوچنا شروع نہ کرتا تھا کہ وہ دیوالی میں اتنے عرصے سے کہا کہ وہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی نئی کلا فریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے محنت کو فتنہ ہوئی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ ملائکس کو موزیل کے کردار کا بڑا غم تھا۔

وہ اس پر سیکڑاؤں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا۔ لیکن وہی مرضی سے وہ موزیل کی منگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی ہیزری پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ تروچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا اور اسے بہت پسند تھے، مگر اس دکان میں موزیل بھولے اور پتھر کیلے اور بہت سستے آئینوں پر مبنی اور سونے کے ٹوپس پھر پھر تروچن سے منگی کرنے لگی کہ وہ انہیں خرید دے۔

تروچن اب تک دیکھ سکا کہ موزیل کی تلاش کی دکان ہے۔ کس آج دکان سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھتی رہتی تھی اس کو جسنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ سارا کاسا اسباب کی مانند اس کے جسم پر پھیر رہا تھا، مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک لڑائی سے نہیں دیتی تھی۔ اس کو بڑانے کی خاطر آنا کہ دیتی تھی تم بکھو۔ مجھے تم سے نفرت ہے؟

تروچن ابھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موزیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا ادھ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دوسرے تک اس کی صحبت میں نہ لگتا۔ وہ ایک فیصلہ کر دیتی تھا کہ اس کو ناپسند تھے اس لیے کہ اسے اس کا اچھا نہیں ہوتی تھی۔ تروچن نے کئی بار اس کو ان کی خدمت سے آگاہ کیا۔ اس کو نرم دیا گیا کہ اس کو اس نے بہترین بھی نہ سنی۔ تروچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تو وہ چڑھ جاتی تھی۔ یہ حیا دیکھا کہ اس ہے۔ اگر تھیں اس کا کچھ خیال ہے تو انہیں بند کر لیا کرو۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کونسا لباس ہے جس میں وہی شک نہیں ہو سکتا۔ اس میں سے تمہاری نگاہیں ہر سکتی۔ مجھ سے وہی لباس نہ لیا کرو۔ تم بکھو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک بلی سا اندر دیکھ رہے ہو جو نیکو سے دینا چاہتا

ہے۔ یہ بھی تصدیق دلاؤ اسی اور سر کے بالوں کی فروغ تھلاؤ سے ذہن میں شامل ہے۔ شرم آتی چاہیے نہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور اب بھی ہلکے سی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب اللہ اور شر میں چھٹا ہے؟

ترہم جن کا شروع شروع میں ایسی آہیں تھیں کہ غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غصہ مٹ کر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑا کھاتا تھا اور جتا تھا اور موزیل کی باتیں شاید نا دوست نہیں اور جب اُس نے اپنے کپڑوں اور داڑھی کا صفایا کر دیا تھا تو اُس سے قطعی طور پر ایسا عرصہ میں جدا کر وہ دیکھ کر اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھر اس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

باتی کی نیکی کے پاس پہنچ کر ترہم بھی رگ گیا۔ موزیل کو ایک بڑی مرنی لکھائی دے کر اُس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔
— کہاں کو۔ ایک پاکیزہ دلا کی۔ جس سے اس کو محبت ہوئی تھی۔ غصے میں تھی وہ ایسے نئے میں تھی جس میں ترہم کے کون ہوتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہر پہل نہیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کو اس نئے میں اتنا لیس لکھنے کا کوفہ تھا، مگر کوفہ کی کون پر داکڑا ہے۔ اس چال کے مسلح اگر چاہتے تو اندھ ہی اندھ کہاں کو، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر کھتے تھے۔

ترہم میں سوچتا سوچتا پانی کے مرنے کی بد چلیو گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کی بغیر لڑا کی ایک ہیں۔
کے اندھ اندھ پر دے کیوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ ورثہ میں ایک بار برہنہ وہ اس صفائی سے اسے شرمناک تھا کہ ترہم مرنے دیکھا تو نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور عظیم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سر وہاں بھری۔ اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے گھڑاؤں کی کرشت اور مٹائی دی، اس نے سوچا کہ وہ ہو سکتا ہے؟۔ بلڈنگ میں کئی سودی عورتیں تھیں جو سب کی سب غریب عورتوں کی بیوی تھیں۔ آزاد قریب آتی تھیں۔ یک لخت اس نے دوسری نیکی کے پاس موزیل کو دیکھا، جو بیویوں کی خانہ میں کا زبیدہ ڈھالا کرتے پچھنے بڑے نور کی انگڑائی سے رہی تھی۔ اس نور کی آنکھوں میں کو محسوس ہوا تھا اس کے آس پاس کی ہوا چلنے لگی۔

ترہم پانی کے تل پر سے اُٹھا۔ اس نے سوچا کہ یہ ایک کی کہاں سے نور اور مرنے۔ اور اس وقت ٹیر میں پر کیا کرنے آئی ہے؟

موزیل نے ایک اور انگڑائی کی۔ اب ترہم کی ہڈیاں چٹنے لگیں۔
ڈھیلے ڈھالے کرتے ہیں اس کی مقبول چھاتیوں و حرمیں۔ ترہم کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور بچے بچے نیل اُبھرائے۔ وہ نور سے کھانا۔ موزیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا تھل یا نکل خفیف تھا۔ گھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی تختی میں داڑھی دیکھنے لگی۔ تم پھر سکو میں گئے ترہم؟

داڑھی کے بال ترہم کو چھینے گئے۔
موزیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھونڈی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت دگڑی اور سکا کر کہا۔ اب یہ برش اس کو مل ہے کہیری
نیو جو سکرٹ صاف کر سکے۔ مگر وہ تو وہیں دیر لالی میں رہ گئی ہے۔

تروچی خاموش رہا۔

موزیل نے اس کے بازو کی پگھلی لی۔ "بوتے کیوں نہیں سردار صاحب؟"

تروچی اپنی پگھلی بے وقوفیوں کا اعانہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ٹھیکے اندھیرے میں موزیل کے چہرے کو فورے دیکھا۔ کوئی نامس تبدیل واقع نہیں ہوئی تھی، ایک طرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ تروچی نے اس سے پوچھا، "یاد رہی ہو؟"

"نہیں۔" موزیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟"

"میں ڈانٹا گیا کہ وہی ہوں۔" موزیل نے پانی کے موٹے تل پر بڑبڑاتی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔ "تم گویا کہ۔۔۔ اب

پھر۔۔۔ نئے سرے سے بکھری رہے ہو۔"

تروچی نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا: "ہاں! "

"مبارک ہو۔" موزیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لیا اور پانی کے تل پر بجانے لگی۔ "کس اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کر دی؟"

تروچی نے بہت سے کہا: "ہاں! "

"مبارک ہو۔۔۔ اسی بڑا ٹنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں۔"

"یہ بہت بڑی بات ہے۔" موزیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔ "ہیشہ! وہی کو اپنے مہمانوں کا خیال رکھنا چاہیے۔"

تروچی خاموش رہا۔ موزیل نے اٹھ کر اس کی دائرہ کی کوئی پانچ ان انگلیوں سے پھیر کر کہا: "اسی لڑکی نے تجھے یہ بال بڑھانے کا

مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں۔"

تروچی بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی دائرہ کی بالیں میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں"

کہا تو اس کے لیے میں دیکھا ہی تھا۔

موزیل کے منظر پر آپ اسٹاک ہائی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکراتی تو تروچی نے یہ محسوس کیا کہ اس کے گانڈی

میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے پھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔

مسکراتے کے بعد وہ ہنسی۔ "تم اب یہ دائرہ میٹھا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کروں گی۔"

تروچی کے جی میں آئی کہ اس سے کہہ کر وہ ایک بڑی شریف، باہمت اور پاک طینت کناری لڑکی سے متعلقہ کر رہا ہے اور

اسی سے شادی کرے گا۔۔۔ موزیل اس کے مقابلے میں خاموش رہا، جو صورت ہے، بے وقوف ہے، بے عزت ہے مگر وہ اسی

قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موزیل سے صرف اتنا کہا: "موزیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گانڈی کی ایک عیدھی

سادہ لڑکی ہے۔۔۔ جو مذہب کی پابند ہے، اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

موزیل سرچ سچا رکھادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر توڑیں سے کہا: ”وہ مذہب کی پابند ہے تو نفیس کیسے قبول کرے گی؟“ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دھماکے والے کٹھنچکے ہو؟“ اس کو ابھی تک معلوم نہیں — دائرے میں لے کھارے دیوالی جانے کے بعد ہی بڑھائی شروع کر دی تھی — محض اشتعال طویل — اس کے بعد میری کہان کو اسے ملاقات ہوئی، مگر میں گڑھی اس طریقے سے بانڈ تھا ہوں کہ سوسوں سے لاکھ ہی آٹھ شکل سے جان سکنا ہے کہ میرے کیسے کٹے ہوئے ہیں — مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“ توڑیں نے اپنے لیے ملائم بالوں میں انگلیوں سے نگہیں کرنا شروع کی۔

موزیل نے لبا کڑتے اٹھا کر اپنی گوری دیوڑیاں کھلائی شروع کی۔ ”یہ بہت اچھا ہے۔۔۔۔۔۔ مگر یہ کم بہت تھوڑی ہی ہو چکی ہے۔“ دیکھا کس نور سے کاٹا ہے؟“

توڑیں نے دوسری طوط دیکھنا شروع کر دیا۔ موزیل نے اس پر جگہاں پتھر لے کاٹا تھا، انگلی سے لب نکالی اور کڑے پھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی، ”تکب ہو رہی ہے تمھاری شادی؟“

”ابھی کچھ پتہ نہیں۔“ یہ کہہ کر توڑیں سخت مشکل ہو گئی۔

چند ثانیات تک خاموش رہی۔ اس کے بعد موزیل نے اس کے ٹھکانے کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔

توڑیں — تم کیا سوچ رہے ہو؟“

توڑیں کو اس وقت کسی جھڑپ کی ضرورت تھی خواہ وہ موزیل ہی کیوں نہ ہو چنانچہ اس نے اس کو سارا مابراں سنا دیا۔ موزیل ہنسی۔ ”تم اول درجے کے ایڈریٹ ہو — کیا تو اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟“

”مشکل! — موزیل! تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں — کسی بھی معاملے کی نزاکت — تم ایک

ڈاڈا کی قسم کی لڑکی ہو — یہی وجہ ہے کہ تمھارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے جس کا مجھے ساری عمر فرسوس ہے گا۔“

موزیل نے نور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے ٹی کے ساتھ ماری۔ ”فرسوس بی ڈیڈ — بلی ایڈریٹ — تم بے سوجہ کہ

تمھاری اُس..... کیا نام ہے اس کا..... اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے..... تم جیل گئے ہو تعلقات کا دونا

روئے..... تمھارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے — تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو — اور بہت

ڈیڈ لوک، مجھے نڈر مر رہا ہے..... لیکن چھوٹے لوگ ان باتوں کو..... چلو آؤ، تمھاری اس گور کو لے آؤ۔“

اس نے توڑیں کا بازو پکڑ لیا — توڑیں نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا: کہاں سے؟

”وہیں سے، جہاں وہ ہے۔“ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں — چلو آؤ میرے ساتھ۔“

”گور کس کو؟“ — کرنے ہے۔“

”موزیل کے لیے نہیں — چلو آؤ۔“

وہ توڑیں کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دھڑانے تک لے گئی تھی جو نیچے پڑیوں کی طوط کھلتا تھا۔ دو ڈاڈا گھول کر وہ اتارنے

والی قلی کوڑک گئی اور تراجی کی وارسی کی حوت دیکھنے لگی۔

تراجی نے پوچھا کیا بات ہے؟

موزیل نے کہا: یہ تھاری وارسی ————— لیکن خیر شیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے۔ ————— نکلے سر چلے تو کوئی نہیں کہے گا تم سکھو۔

”نکلے سر تراجی نے کسی قدر دکھا کر کہا۔ میں نکلے سر نہیں جادوں گا۔“

موزیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا: کیوں؟

تراجی نے اپنے ہاؤں کی ایک لٹ شیک کی تم بھتی نہیں ہو۔ میرا ہاؤں چڑھنے کے بغیر خانا شیک نہیں۔
میں شیک نہیں۔

”تم بھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک نکلے سر نہیں دیکھا۔ ————— وہ بھی بھتی ہے کہ میرے کیس ہیں میں اس پر راز افشاں نہیں کرنا چاہتا۔“

موزیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دو دھڑے کی دہلیز پر ماری۔ ”تم واقعی اولیٰ درجے کے ایڈیٹ ہو۔ ————— گدھے کہیں کے..... اس کی جان کا سوال ہے۔ کیا نام ہے، تھاری اس کہہ گا جس سے تم محبت کرتے ہو۔
تراجی نے اسے کھلنے کی کوشش کی۔ موزیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔ ————— بلکہ اس نے مجھے نکلے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔

موزیل چڑھ گئی۔ ”اوہ، تھاری محبت، بی ڈیٹ ————— میں پوچھتی ہوں، کیا سارا ہے کچھ تھاری حوت کے بیوقوف جوتے ہیں۔ ————— اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ بگڑی ضرور پہنوں گے۔ ————— اور شاید وہ اپنا انڈر وئیر بھی جو نیک سے بٹا جاتا ہے۔“
تراجی نے کہا: ”وہ تو میں ہر وقت پہنتے جوتا ہوں۔“

”محبت اچھا کرتے ہو۔ ————— مگر اب تم یہ سوچ کر معاملہ اس نکلے کسے جہاں میاں بھائی بی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے خدا ادرتے ہوئے ممال۔ ————— تم بگڑی پس کر گئے تو وہ ہیں ذرا گدھے۔“

تراجی نے مختصر سا جواب دیا: ”جیے اس کی پڑا نہیں۔ ————— اگر میں تھارے خدا ڈاں جادوں تو بگڑی پس کر جادوں گا۔ ————— میں اپنی محبت خطے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“

موزیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے بیچ دھاب کھلنے کو اس کی چھاتیوں آپس میں جڑ جڑ کر لیں۔ ”گدھے ————— تھاری محبت ہی کہاں ہے گی۔ جب تم نہ ہو گے۔ تھاری وہ۔ ————— کیا نام ہے اسی بگڑی کا۔ ————— جب وہ بھی نہ رہے گی اس کا خاندان تک نہ رہے گا۔ ————— تم سکھو ہو۔ ————— خدا کی قسم تم سکھو ہو اور بڑے ایڈیٹ ہو۔“
تراجی جھنجھلا گیا۔ ”کیوں نہ کرو؟“

موزیل زور سے ہنسی۔ ”میں میں بالوں کے بغیر ہے اٹی ہوئی یا نہیں اس نے تراجی کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر

کما ڈارنگ، پلو، جیسے تھاری مرضی — جاؤ گوی ہیں آؤ۔ میں نیچے بازو میں کھڑی ہوں۔
یہ کہہ کر وہ پیچھے جانے لگی تروچی نے اسے روکا۔ تم کھڑے نہیں پہنو گی؟
موزیل نے اپنے سر کو جھٹک دیا۔ نہیں — پہنے گا اس طرح۔

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے آ گئی۔ تروچی بھی منزل کی پیر میں پڑ ہی اس کی کھڑکیوں کی چابی آواز سنارہا۔ پھر اس نے اپنے
لبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف پیٹھے اور نیچے آکر اپنے ٹیٹ میں چلا گیا۔ مددی جوری اس نے پشت سے تھپکی کیے۔ بگڑی ہندی ہندی
دکھی تھی۔ اسے بھی طرح سر پر جھپٹا اور ٹیٹ کا دواؤہ منتقل کر کے نیچے آ گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موزیل اپنی کھڑی ہائیکس چڑھی کیے سرکریٹ پی رہی تھی۔ بالکل موزوں انداز میں جب تروچی اس کے نزدیک
پہنچا تو اس نے شہرت کے طور پر ہنر کے دھواں اس کے سر سے پڑے پڑے دار۔ تروچی نے غصے میں کہا۔ تم بہت ذلیل ہو۔
موزیل مسکرائی۔ تم نے تم نے کوئی تھی بات نہیں کہی — اس سے پہلے اور کہی مجھے ذلیل کہ چکے ہیں۔ پھر اس نے تروچی کی کھڑکی
کی طرف دیکھا۔ یہ کھڑکی تم نے تھی بہت بھی طرح باندھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تھوڑے گیس ہیں۔

بنا رہا بال سنسان تھا۔ ایک طرف جہاں پل رہی تھی اور دوسری بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کہ غصے سے خوفزدہ ہے۔
بتیاں روٹھیں تھیں گھران کی روشنی تیار کی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت تروچییں مٹی شروں عوجاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت
بھی جاری ہو جاتی تھی۔ ابھی خامی گنا گئی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شرک پر کوئی انسان گزرا ہے۔ ناکورے نکلا۔

موزیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑکی کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز اس خاموش فضا میں ایک بہت
خراشور تھی۔ تروچی دل ہی دل میں موزیل کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی دہلیات کھڑکیوں ہی آکر کوئی دوسری
چیز نہ کر سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موزیل سے کہے کھڑکیوں آکر دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں ملے گی۔ اس نے غصے میں کہا۔
تروچی سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی چٹا کھڑکی اس کا دل دھک سے رو جاتا تھا۔ مگر موزیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی سگرٹ
کا دھواں اُڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکر ہے۔ پہل تقدی کر رہی ہے۔

چو کہ میں پہنچے تو پچیس میں ہی آؤ اور گری۔ آئے — کوہ چارہ ہے۔
تروچی سمجھ گیا۔ موزیل آگے بڑھی اور پچیس میں کے پاس پہنچ گئی اور بائیں کو ایک خفیہ سا جھٹکا دے کر کہا۔ آؤ، تم
— ہم کو پہنچانا نہیں تم نے — موزیل..... پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ آؤ پھر اس باج — ہمارا رہیں
رہتا ہے، اس کی طبیعت خراب ہے۔ فٹ کھڑے کر جا رہا ہے.....

سپاہی مسیحیچا نے کوشش کر رہا تھا کہ اس نے غصہ معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیہ نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر
اس کو دیا۔ اور پھر —

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موزیل نے اپنے منہ سے شٹکا ہٹا کر اس سے کہا۔ تم میرا ڈاکٹر؟
سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موزیل نے داہنی آنکھ اس کو اوڑھ لیا۔ آکھڑ تروچی کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی، اس کی طرف

پہل دی — جس میں سے گذر کر انہیں — ملے جاتا تھا۔

ترجمہ ناموش تھا، مگر محسوس کر رہا تھا کہ موزیل کر فری غلط دزدی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مشرت محسوس کر رہی ہے — غلطوں سے کیلن اسے پسند تھا۔ وہ جب جو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لیے ایک ایسی جگہ جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تھیں ہوں سے ٹکراتی، بھڑکی دھڑک نکلی جاتی تھی اور اس کو بیشمار بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ کس سے وہ ڈوب نہ جائے جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوا تھا گلو سے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موزیل آگے آگے تھی۔ ترجمہ اس کے پیچھے چلے ڈوڈ کے ابوہر اوہر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی نعل میں سے کوئی پھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موزیل رگ لگتی جب ترجمہ پاس آیا تو اس نے سمجھا کہ اسے انداز میں اس سے کہا تو پہلے ڈیز — اس طرح ڈیٹا اچھا نہیں — تم ڈوڈ کے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہ جاؤ — یہ سچ کتنی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔

ترجمہ خاموش رہا۔

جب وہ لگی طے کر کے دوسری لگی میں پہنچے، جس اس کی طرف نکلتی تھی، جس میں کربال کو رہتی تھی تو موزیل چلتے چلتے ایک دم ٹوک لگی — کچھ غافلے پر پڑے اطمینان سے ایک باغیچہ کی دکان کوٹی جا رہی تھی، ایک لٹکے کے لیے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترجمہ سے کہا، کوئی بات نہیں — چلو آؤ۔

دونوں چلتے گئے — ایک آدمی جو سر پر ستھری پرات، اٹھلے پلاٹا تھا، ترجمہ سے ٹکر لیا پرات لگتی، اس آدمی نے غور سے ترجمہ کی طرف دیکھا، عادت معلوم ہوتا تھا کہ وہ بکھرے، اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیچے میں ہاتھ ڈالا — کہ موزیل لگتی، لڑکھاتی ہوئی پیسے نشے میں چڑ ہے، اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور غور سے اس کے لیے کیا کر رہا ہے — اپنے بھائی کو مارتا ہے — ہم اس سے شادی نہ لے کو مانگتا ہے، پھر وہ ترجمہ سے مخاطب ہوئی، کریم — اٹھائو، پرات اور رکھ دو اس کے سر پر۔

اس آدمی نے نیچے میں سے ہاتھ نکال لیا اور غصہ مانی آنکھوں سے موزیل کی طرف دیکھا، پھر لگے بڑھ کر اپنی گھنٹی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹکڑا دیا، پیش کر سالی — پیش کر، پھر اس نے پرات اٹھائی اور بجا، وہ بجا۔

ترجمہ بڑبڑایا، کیسی ذلیل حرکت کی ہے حملہ مزہ سے آ

موزیل نے خودی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا، کوئی ذلیل حرکت نہیں — سب چلتا ہے آؤ۔

اور وہ تیز تیز چلتے گئے — ترجمہ نے بھی قدم تیز کر دیے۔

یہ لگی طے کر کے دونوں اس محلہ میں پہنچ گئے۔ یہاں کربال کو رہتی تھی، موزیل نے پوچھا، کس لگی میں جانا ہے؟

ترجمہ نے آہستہ سے کہا، تیسری لگی میں — کھڑائی بلڈنگ آ

موزیل نے اس طرف چلتا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا، اس پاس اتنی گجائی آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس لگی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی — ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کا دے والی ہڈی لٹکے سے نکلنا اور دوسرے کنارے والی ہڈی لٹکے میں گھس گیا۔ اس ہڈی لٹکے سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ قسط پاتھر پر انھوں نے اوندھرا دھندلکا اور بڑی پگھلتی سے دوسری ہڈی لٹکے میں چلے گئے۔ موزیل خشک گئی۔ اس نے تروچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا: "تروچن ڈیر — یہ بگڑی آثار ہو آ"

تروچن نے جواب دیا: "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں آنا سکتا۔"
موزیل جھنجھلا گئی۔ "تمہاری مرضی — لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے؟"

سامنے جہانگہر ہوتا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا — سات گڑبڑ جو بڑی تھی اور بڑی ہی سراسر قسم کی۔ وہاں ہاتھک ہڈی لٹکے سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر ہڈیاں اٹھائے نکلے تو موزیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے ایک کا ڈھکی کا ڈھکی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موزیل اپنے جوتے کاٹنے لگی۔ غائبانہ سر ہر تھی۔ جب یہ دونوں آدمی لگی کے دوسرے سر پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے تروچن سے کہا: "دیکھو، ایسا کرو — میں بھاگ کر نکلا والی ہڈی لٹکے میں جاتی ہوں — تم میرے پیچھے آنا — بڑی تیزی سے، جیسے تم میل چھو کر رہے ہو۔" — کبھی — مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔

موزیل نے تروچن کے جواب کا انتظار کیا اور نکلا والی ہڈی لٹکے کی طرف کھڑا ہوا۔ کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگ کر تروچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ ہڈی لٹکے کے اندر تھے — سیڑھیوں کے پاس۔ تروچن کانپ رہا تھا۔ مگر موزیل بالکل خشک خشک تھی۔ اس نے تروچن سے پوچھا: "کون سا مالا؟"

تروچن نے اپنے خشک ہنرٹوں پر زبان پھیری: "دوسرا۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ تروچن اس کے پیچھے ہوا۔ ان دونوں پر تھوڑے کے تھوڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کا غصہ خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے سالے پر پہنچے تو کوئی ڈھیر میں کچھ ڈھیر جا کر تروچن نے ہولے سے ایک دردناک دردناک دی۔ موزیل فوراً سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

تروچن نے ایک بار پھر دردناک دی اور دردناک کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی: "ہنگا سنگھ جی — ہنگا سنگھ جی!"

اندر سے میں آواز آئی: "کون؟"

"تروچن!"

دردناک دھبے سے کھٹا — تروچن نے موزیل کو اشارہ کیا۔ وہ پیک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہوئے — موزیل نے اپنی بٹل میں ایک دہلی تکی لٹکی کر رکھا۔ جو بے حد سی ہوئی تھی۔ موزیل نے اس کو ایک لمبے کے بے خود سے دیکھا۔ یہ نقش تھے۔ لٹک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موزیل نے اس کو اپنے چڑے پھلے سینے کے ساتھ لگا

لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کڑے کا دس اشکائیں اس کی ناک پر لپی۔
تو راجن سرخ ہو گیا۔

موزل نے کربال کو دے کر بے پرواہی کے ساتھ کہا: ”خود نہیں، تو راجن تمہیں لینے آیا ہے۔“

کربال کو دے کر راجن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موزل سے الگ ہو گئی۔

تو راجن نے اس سے کہا: ”مردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں۔“ اور آجی سے بھی — یکن جلدی کوڑا۔

انتہی میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور حید کا شقی جود ہی ہے۔

کربال کو دے ملک سے دلی دلی چیخ بلند ہوئی۔ اسے پکڑ لیا انھوں نے آ

تو راجن نے پوچھا: ”کسے؟“

کربال کو جواب دینے ہی والی تھی کہ موزل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی ”پکڑ لیا تو لپچھا

جرا تم یہ پکڑے آؤ۔“

کربال کو رہی کچھ سوچتے بھی نہ پائی تھی کہ موزل نے اٹا کاٹا اس کی قمیص اُٹا کر ایک طرف رکھ دی۔ کربال کو دے اپنی ہانوں

میں اپنے ننگے جسم کو چھپایا اور وحشت زدہ ہو گئی۔ تو راجن نے سردی طرف موڑ لیا۔ موزل نے اپنا ٹھیلہ ڈھالا کر ”اُٹا کر آؤ“

اس کو پناہ دیا۔ خود وہ ننگ۔ دھڑلنگ تھی جلدی جلدی اس نے کربال کو کھا ڈالا رینڈ ڈھیلہ کیا اور اس کی شلوار اُٹا کر، تو راجن سے

کہنے لگی ”نہاؤ، اسے لے جاؤ۔“ لیکن ٹھہرو۔“

یہ کہہ کر اس نے کربال کو دے بال کھول دیے اور اس سے ”جاؤ۔“ جلدی اُٹل جاؤ۔“

تو راجن نے اس سے کہا: ”آؤ۔“ مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موزل کی طرف دیکھا جو دھوئے ویدے کی طرح

ننگی کھڑی تھی اس کی ہانوں پر میس میس بال سردی کے پامٹ جا گئے ہوئے تھے۔

”تم جانتے کیوں نہیں ہو؟“ موزل کے بچھر میں پڑ چلا ہی تھا۔

تو راجن نے اہستہ سے کہا: ”اس کے بال باپ بھی تو ہیں۔“

”جھنم میں جائیں وہ۔“ تم اسے لے جاؤ۔“

اور تم؟“

”میں آ جاؤں گی۔“

ایک دم اوپر کی منزل سے کچی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اُترنے لگے۔ دھڑا دھڑ کے پاس اگر انھوں نے کوٹھا شروع کر دیا،

جیسے وہ اُسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کربال کو دے کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موزل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیعت جبشکا دے کر اس نے تو راجن سے کہا: ”سنو، اب مہفت ایک ہی ترکب میری

٥

ہامس کا سفر ٹیلا جیکسن تھا کہ وہ سب اُسے ہی کہتے تھے۔ وہ یہاں نے فکری اور فطرتی عمر کی موت تھی۔ اس کا نام ڈی جیکسن بھی ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں، ہارپن تھا اس کی پیشین گوئی کہ قریب قریب دس برس سے پہلے ہی تھی۔

دو چہ نہیں کیسے آئی تک سے وہاں تھی اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اور اصل میں نے اس کے کچھ واقعات کے متعلق نہیں جانتے
کا کہ ششہری نہیں کی تھی۔ وہ اپنی کچھ عورت تھی کہ اس سے لی کہ سوائے اس کی ذات سے ہے اور کسی چیز سے نہیں تھی۔ اس سے کوئی
دوست ہے، اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی اس لیے کہ وہ پورے روزے سے وابستہ تھی۔ ہو سکتا ہے یہ
ایک حاکم پہلو جو مگر میرے لیے وہی چیز ہے، اور اس کے وہی فرقے، اس کے تمام فرقے میں ہیں کے ساتھ شری چندیا میں مسلسل نہیں
ہوتی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری پہلی ملاقات پر نے ہی میں جوتی میں نہایت شستہ اور جوانساں ہوں۔ یوں تو میرا وسیاحت کی بڑی بڑی انگلیوں سے دل میں موجود ہیں۔ آپ میری باتیں نہیں تو آپ کیجیے گا کہ میں تقریباً کچھ چنگا گیا ہاں کہ اسی قسم کے نام کی کسی اور چرائی کو مرکز کرنے کے لیے نقل جانے والا ہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر زیادہ افسوس ہے کہ میں جوتی مرکز کے وہیں کا موجود ہوں۔

خدا معلوم کتنے برس سے پہلے میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب پہلے گیا تو میری ریب سے ساتھ تھی۔ ایک رات کا ہو کر اُس کو مرنے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دور میں میں..... نظر بچے میں حساب لگاوں..... آپ یہ کہہ گئے کہ آٹھ برس سے پہلے میں تھا۔ مگر اس دور میں مجھے وہاں کا کوئی راز اور میری زندگی کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو عرض افاق تھا کہ میں ایک دم پوچھ جائے کہ یہ تیار ہو گیا جس نظم کہ میں میں لازم تھا اس کے انگوٹوں سے ایک نکتی سی بات پر دل میں غلامی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ شکوہ دُور کرنے کے لیے پُروردہ آؤں۔ وہ مجھے اس لیے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے یہ بات ٹکر جانا تھا، جہاں یہ فلموں کا ایک پرانا ماسٹری رتبا تھا۔ اسٹیشن کے باہر معلوم ہوا کہ جنگ کافروں ہے۔ گرامن قوت
ہم ناگہم رہ چکے تھے۔ نشست کو چھڑیوں سے میری طبیعت سخت الجھا رہی ہے۔ گرامن اس دخول سے کھدات ڈور کرنے کے لیے آیا تھا اس
لیے مجھے یہ بات ٹکر پہنچنے میں کوئی گھٹت نہیں تھی۔ ناگہم بہت حایات قسم کا قاتل گڑھ کے کونے میں جلی زیادہ دایات۔ ہر وقت گرنے کا
خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا ناگ چلتا ہے اور سواریاں پیچھے۔ ایک دو گڑھ کے اٹے جوئے بازار اقساں خیزاں ملے جوئے تو میری طبیعت الجھا رہی۔
میں نے ان غیروں سے مشورہ کیا اور یہ سمجھا کر اس صورت میں کیا کہ اگر ناچا یہیے۔ اس نے کہا کہ دھوپ تیز ہے۔ میں نے جواب دیا کہ دیکھ میں وہ بھی
اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دو یا تو یہ بدل ملتا ہے بلکہ کھٹا ہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ کھٹا وہ ہے۔ میں نے اس سے سخت تنقید کا سب

نہ سمجھا۔ دھوپ واقعی تیز تھی۔

گھوڑا ایک نورانگہ لنگے بڑھا ہوا گا کہ پاس سے اسی جوانی ٹاپ کلاک ٹانگہ گزرا میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک ٹم کوئی چھپاتوئے غصے کے گھوڑے آ

میں دم نکب پڑا۔ چلے تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ بڑے کیٹھے تھے۔ میرا پسلاؤ مکمل انسانی انفسر کا تھا کہ میٹھے کی بجائیا قی جس کہاں گئی جو ایسی دل لگائی کے ساتھ بچیلے کے ساتھ ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا کہ اس عورت کی ٹھہریاں پاؤں ڈالوؤ وچ کی تھوں میں سے بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کو سخت ہوئی تھی۔

چلے گئے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ دوسرا بے تعلقت دوست تھا۔ دوسرے غصے کے گھوڑے کے جواب میں یقیناً میں نے بھی کچھ اسی قسم کا غور و جند کیا جو تا، مگر اس عورت کو اس کے ساتھ ساتھ کمری سادی بے تعلقی جھریاں جھریاں ہو گئی۔

میں نے اپنا ٹانگہ لگا دیا۔ پھٹے لے بھی اپنے کو جان سے کہا کہ ٹھہر جائیے۔ پھر اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر انگلی میں کتا قی جھٹ لے نہٹ "تاگے سے کو کو وہ میری طوط اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے سمجھا۔ تم بے تم یہاں کیسے آئے۔ پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑی بے تعلقی سے میری بے تعلقت میری سے ملاتے ہوئے کہا تھا جی جان — آپ نے کمال کر دیا — اس گل ٹھکرا کر آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ تم جا کہاں رہے ہو؟

چلے گئے نے اُونچے سروں میں کہا۔ ایک کام سے جا رہا ہوں — تم ایسا کرو امید ہے۔۔۔۔۔ وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے دالے سے مخاطب ہوا۔ دیکھو صاحب کو ہمارے گھرے جاؤ — گراہ دہانہ مت لینا ان سے۔ دھوپ سے نورانی تارخ ہو کر اس نے "بٹھنے کے انداز میں مجھ سے کہا۔ تم جاؤ۔ نوکرواں ہوگا — باقی تم دیکھ لینا۔"

اور وہ ٹھٹھک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا جس کا میں نے فی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گور تھیں

ہوئی تھی۔ جگر یوں کیسے کروہ بوجھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آ پڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔ اس کا تاگر چل پڑا میں نے اپنے تانگے دالے سے کچھ نہ کہا۔ میں بچاؤ فرنگ ہل کر وہ ایک ڈاکہ ٹھکرا ناظم کی عمارت کے پاس رکا اور مجھے آنگنا "چلیے صاحب۔۔۔۔۔"

میں نے پوچھا۔ کہاں؟

اس نے جواب دیا۔ چڈھ صاحب کا مکان میں ہے۔

"آدو میں نے سوائے نظروں سے اپنی جیوی کی طوط دیکھا۔ اس کے توروں نے مجھے بتایا کہ وہ چلے کے مکان کے مکان کے قریب میں نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو وہ وہ پُر نہی کے قریب میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں پہنچے پلانے دالے دوست مل جائیں گے۔ مگر نوکروں نے کا ہانہ پہنچے ہی سے موجود ہے، اس لیے وہاں ات ڈالے گی۔ میں تانگے سے اتار

گیا۔ چھڑا سا بھی نہیں تھا وہ میں نے اٹھایا اور اپنی جیڑی سے کہا: چلو!

نونا چمروں سے پہچانی گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میری خدمت کرنی کرنا ہو گا۔ چنانچہ اس نے جیل رحمت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ چلی پڑی۔

بہت معمولی کم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملازمی اٹوں نے عارضی طور پر ایک چھڑا سا جگہ بنایا تھا۔ تھوڑی دیر کے استعمال کیا اور پھر بڑکے بچے بن گئے۔ چرنے اور کھانام ڈال دیا تھا۔ جگہ جگہ سے پتھر اکٹرا ہوا تھا۔ اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا گھوڑے کا ہو سکتا ہے۔ جو غلوں کا بیروں اور ملازمی کینڈے میں لازم ہو جاں دانا نہ تھا وہ ہر قسم کے سہنے ملتی ہے اور وہ بھی کئی قسموں میں۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ محنت جو میری جو ایسے عجیبے ماحول میں یقیناً پریشانی اور کشمکش محسوس کرے گی، مگر میں نے یہ سوچا تھا کہ پتہ آجائے تو اس کے ساتھ میری پرچہات غمر ملیں گے۔ وہاں جو یہ غلوں کا پرانا ساتھی رہتا تھا، اس کی بیوی اور بال بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی تو دوش بڑھان دویش دویش دویش دن گزار سکتی تھی۔

تو کبھی عجیب و غریب آواز آتی تھی جب ہم گھر میں داخل ہوتے تو سب اندازے کھلے تھے، مگر وہ کچھ نہیں تھا، جب آواز آتا تو نہ ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا جیسے ہم سالہا سال سے وہیں بیٹھے تھے، اور اسی طرح بیٹھ رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہو کر ہم دیکھے بغیر یا اس سے گفتگو کرتے تو میں سمجھا کہ شاید کوئی معمولی ایکڑ ہے جو پتہ کے ساتھ رہتا ہے۔ پر جب میں نے اس کے نوک کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذات شریف چڑھ صاحب کے چھپتے ملازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی دونوں کو یہ احساس تھا کہ وہی تھی، اس نے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا، بڑی دیر کے بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا گلاس لایا۔ نیچے سے نکالا اور بڑبڑاتا ذات، ایک اور جی گلاس صاحب نے منگوائے تھے معلوم نہیں کہ سر لگے۔

میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نکستے گلاس کی طرف اشارہ کیا کیا آپ اس میں تھل بیٹھ جا رہے ہیں؟
تھل لینے جانا، اپنی لاکھ ایک خاص محاذ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی، مگر میں پڑی۔ تو کبھی قدر و کھلا گیا انہیں صاحب..... میں..... تلاش کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں۔

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا گلاس دھو کر دیا، میں الماری کے نیچے اس انداز سے کھنکھائی دہی اس کی جگہ تھی۔ اگر اسے کہیں اندر رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا انتظام ہم پر ہم ہوتا۔ اس کے بعد وہ جوں کر سے سب باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے حانت ہیں۔

میں چنگ پر بیٹھا تھا جو باپا چلے گا تھا اس سے کچھ دور بیٹھ کر دوا دام کر سیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بیل رہی تھی کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ ہاتھ میں پتہ آگیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم اس کے سماں ہیں اور اس کا تعلق ہماری خاطر داری اس پر لازم تھی مگر اس کے اندر داخل ہوتے ہی سے اس نے مجھ سے کہا بیٹا از دیش تو تم آگئے لاڈلو آئے۔ چلو ذرا اسٹڈیو تک جہاں ہیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈٹس ملنے میں آسانی ہو جائے گی۔

..... آج شام کو..... میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھٹکھٹا کر بٹسنے لگا بھائی جان کہیں آپ نے اسے مولوی نہیں بنا دیا، پھر ہندو سے ہنسنا تمہاریوں کی ریت کی سی، اٹھو منٹو، بھائی جان یہاں بیٹھتی ہیں، ہم ابھی آجائیں گے۔

میری بیوی مل کر چلے کر تھی تو اب باہر دیکھ ہو گئی تھی، میں اٹھا اور چٹکے کے ساتھ ہولیا، مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہاں کھاروہ سر جلتے گی چٹا پتھر کی جڑ، اسٹیل پر اس کی تھا، لڑائی میں جسٹی کے سر پر ٹھکے چٹے کے بلیغ وہ دوسرے پہلے وصل کیے اور پلٹ گئے تھے، جب دیکھا کہ آدمی پر بڑے آدم سے سو رہی تھی، ہم نے اسے بے وقوف کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کپڑا خدے سے لٹا تھا، اس میں جو چیز تھی حیرت انگیز اور پتھر پر ٹوٹی ہوئی تھی کو سب مل کر ایک سال کی ہفتیاں کر گئی تھیں۔

ہوٹے گئے تو تھی، اس کی آواز گئی، ایک ضروری ہی تھا، جیسے اس کی ہونٹوں کی ایک کڑی ہونٹوں کی نہیں کے بٹاری تھی، چٹے نے فوراً ہی اپنے نوکر کو حوٹہ نکالا اور اسے سونہ پہلے کا نوٹ دے کر کہا، تمہیں گے سزا دے..... وہ تو بلیں تو کلاس آدم کی ہے آؤ۔۔۔ میرا مطلب ہے تھری ایکس آدم کی اور نصرت دہن کلاس۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صوف چینی کی کانٹیں، ڈولیکے ہر ٹیٹے ملک کا شہزادہ تھا، چٹے کی زبان پر جس ملک کا نام آ جاتا، وہاں کا شہزادہ ہی جاتا تھا۔ اس وقت انھیں کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑانا چلا گیا۔

چٹے نے ٹوٹے ہوئے پتھر گولوں والے پتھر پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس آدم کے استقبال میں چٹھارتے ہوئے کہا ویٹ از نوٹ۔۔۔ لٹا نظر آتا، ابھی ہی نکلے۔۔۔ لیکن ایک دم حوٹہ ہو گیا، یہاں بھائی کا کام۔۔۔ وہ تو گھبرا جائے گی۔

چٹہ بیٹھ کر بیٹھ گیا تھا، مگر اس کو دیکھ کر اس کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا، وہ ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوئل رہنا چاہتا تھا، وہ کیا کرتا تھا، یہ احساس کبھی نہ چھوٹا، مجھے ابھی تک اس نصرت سے محروم رہا ہے، جب شادی کا سوال آئے

تو فوراً تیار ہو جاتا ہوں، لیکن بعد میں یہ سچ کہ میں میری کے قابل نہیں ہوں ساری تیاری کو لڑ سٹورج میں ڈال دیتا ہوں۔۔۔ آدم فوراً ہی آگئی، مگر اس کی چٹے نے چھٹکے کا تھے اور چین کا شہزادہ تین لڑا تھا، لڑا تین مائے میں نوٹ گئے تھے، چٹے نے ان کی کوئی پروا نہ کی اور خدا کا شکر کیا کہ تو بلیں سلامت رہیں، ایک بوتلی جلدی جلدی کھول کر اس کے کنوئل کلاسوں میں آدم ڈالی اور کہا، تمہارے پوتے آئے کی خوشی میں۔

ہم دونوں نے بے بے گھونٹ بھرے اور کلاس خالی کر دیے۔

دوسرا دور شروع کر کے چٹہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ کر آ کر میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے، اس کو بہت دوس آیا اور کہنے لگا، میں شوکر تاجروں کی خند کھل جائے گی۔۔۔ پھر ایکس آدم کے..... شہزادہ۔۔۔ پہلے میں چائے شکر آتا ہوں۔۔۔ یہ کہہ کر اس نے دم کا ایک پتھر ڈال دیا اور نوکر کو مارتی جیٹا کے شہزادے۔

جیٹا کا شہزادہ فوراً ہی آگیا، چٹے نے اس سے کہا، دیکھو، آتی ہے کو ایک دم نصرت کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے۔

لوکر چلا گیا۔ چٹے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ چمک ڈال کر کہا: "میں فی الحال زیادہ نہیں پیراں گا۔ پہلے چار چمک لےجے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھائی کو چھوڑنے سے اس کے ساتھ پر جات ٹکر جانا ہے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد چٹے آنکھی بہت صحت برتن تھے، اور چٹے سیٹھے سے ٹرے میں چٹنے ہوئے تھے۔ چٹے نے غصے سے کہا: "اٹھا کر چلے گی تو ظہور سو گئی اور سرت کا اٹھا کر کیا تھی؟ ذرا سے جیول....." پھر اس نے اسٹیم ریل کے شہزادے پر برتاؤ شروع کر دیا۔ "اٹھا شہزادہ چار پیرے کان بلبلاتا تھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرے اٹھا لی اور مجھ سے کہا: "اؤ۔"

میری بری جاگ رہی تھی۔ چٹے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور دوبارہ کہا: "تعاثر ہے، بیگ صاحب! یہ سڑک میری کو مذاق پسند آیا۔ لیکن چٹے کا سامان چکر صحت ختم تھا اس لیے اس نے اٹھا کر لیا اور پٹیا لیاں پی لیں۔ ان سے اس کا کچھ فزیت نہ تھی۔ اٹھا اس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر ضمنی خیر بھیجی کہ آپ اپنی چٹے کو پیٹھ پر پی چکے ہیں۔"

میں نے جواب دیا کہ چٹے سے تنگ کر ڈھے اور اٹھا اور خود پر کہا: "جی ہاں، یہ غلطی ہم سے سڑک ہو چکی ہے۔ لیکن میں یقین تھا کہ آپ ضرور صاف کر دیں گی۔"

میری بری مسکرائی تو کھلکھلے سے جیسا ہم دونوں بہت اونی نسل کے تھیں۔..... جیو پر ہر جرم طے محال ہے!

پہلے، اب ہم آپ کو سب تک چھوڑ آئیں!

میری بری کو کچھ چٹے کا یہ مذاق پسند آیا۔ واصل اس کو چٹے ہی سے نفرت تھی، بلکہ اس کیسے کیسے ہر دوت سے نفرت تھی اور چٹے انھیں اسے بہت کھلتا تھا، اس لیے کہ وہ بعض اوقات بے تعلقی کی حدود میں چاند جاتا تھا، مگر چٹے کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرا خیال ہے اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ اس فضول باتوں میں دماغ غرق کرنا ایک ان دندگم سمجھتا تھا جو دوسرے کہیں گناہ لگتی ہے۔ اس نے میری بری کے چلے چٹنے تھیں کہ ٹرے میں ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی: "کیا بستان کے شہزادے — ایک عدد ٹانگہ لاؤ۔ دو دروازے اس قسم کا۔"

کیا بستان کا شہزادہ چٹا گیا اور ساتھ ہی پٹہ۔ وہ غائب دوسرے کمرے میں گیا تھا۔ خلیہ ملا تو میں نے بری چری کر بھلیا کہ کباب ہوئے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آجی جایا کرتے ہیں جو دم و گمان میں نہیں ہوتے۔ ان کو میر کرنے کے لیے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گزر جانے دیا جائے۔ لیکن حسب معمول اس نے میری اس کیفوشسٹا دعیت کو پتے زیادہ حال اور بڑا ترقی رہی۔ اس نے میں کیا بستان کا شہزادہ دو دروازے اس قسم کا لانا لگے کہ آگیا ہم پر جات ٹکر دانا ہو گئے۔

بہت ہی اچھا بڑا کمرہ انھوں نے لایا تھا۔ اس میں موجود تھیں تھا۔ اس کی بری تھی، چٹے نے میری بری اس کے سپرد کی اور کہا: "خود وہ خیر ہے کہ دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ میری بری کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے، یہ ہم ابھی حاضر ہو کہ دیکھیں گے پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ پلوں شہزادہ اسٹیم ریل میں تھا۔ اسے دوست کو پکڑا۔"

چٹہ کچھ لمبی آنرا تقریر کیا دیا کہ اٹھا کر مخالفت تو ان کو کچھنے سوچے کہ بستان کم موقع ملا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور بارے گیا اور میری بری سوچتی ہی رہ گئی۔ تاں لکھی میں سوار ہو کر چٹے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا: "یہ تو ہو گیا"

— اب کیا پروگرام ہے۔ پھر کھلکھلا کر ہنسا۔ مٹی — گریت مٹی؟

یہاں سے بڑے چھنے سی والا تھا۔ یہ مٹی کس تو سلیج آموں کی اولاد ہے کہ پٹے نے باتوں کا پکڑ لیا۔ سلسلہ شروع کر دیا کہ ہوا استفسار پر مٹی موت مریگا۔

— مانگ رہیں اُس ڈاک بنگلہ نا کو مٹی پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹیج تھا۔ گر پٹہ ماس کو کبیدہ کاٹیج کا تھا۔ اس لیے اس میں رہنے والے سب کے سب کبیدہ و خاطر رہتے ہیں۔ تھا لانکر یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

اس کاٹیج میں کافی آدمی رہتے تھے۔ حالانکہ مادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اُسی فلم کمپنی میں ملازم تھے جو سینے کی تنخواہ ہر سہ ماہی کے بعد دیتی تھی اور وہ بھی کئی قسطوں میں ایک ایک کر کے جب اس کے ساتھیوں سے پورا تھا تو پورا تو پتہ چلا کہ سب اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ کوئی چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر کوئی اس کا نائب کوئی نائب در نائب ہر درمزا کسی پہلے کا اسسٹنٹ تھا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے سر پر فراہم کر رہا تھا۔ پالشنگ اور وضع قطع کے اعتبار سے ہر ایک سرور معلوم ہوتا تھا۔ کنٹرول کا راز تھا۔ مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہیں تھا۔ وہ چیز ایک ہی تھی۔ مٹی طبیعت کے بعد آسانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یہ لوگ ایک سداکٹ سے خریدتے تھے۔ بیکر ضرور دیکھتے ا تھے۔ دس کاموسم ہر تو دس کھیلنے تھے۔ درز مسٹ جیتنے شاندار ہوتے تھے، مگر اتنے ہر ہوتے تھے۔

سعیدہ کاٹیج کی آبادی بہت گنجان تھی چونکہ جگہ کم تھی اس لیے موٹر گراج عمارتوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک بڑی ٹرکی تھی۔ خیریں نام کی ایک عورت تھی جس کا غاوند شاید محض یکسانیت کو ڈھونڈنے کے لیے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نہیں تھا وہ اُسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا، معلوم نہیں، وہ کب آتا تھا۔ اور کب جاتا تھا، کیونکہ میں نے اس ٹریفک آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ خیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا راکٹ تھا جس کو سعیدہ کاٹیج کے تمام ساتھیوں نے فرسٹ اوقات میں پیرا کرتے۔ خیریں جو قبول صورت تھی اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔

کاٹیج کا معزز حقیقہ چلتے اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا۔ یہ دونوں بھی ایکٹر تھے، مگر ہر وہ نہیں تھے۔ ایک سعیدہ تھا جس کا فلمی نام رنجیت کا تھا۔ چٹہ کہہ کر آتا تھا۔ سعیدہ کاٹیج اسی خرافات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے۔ ورنہ اس کا نام کبیدہ کاٹیج ہی تھا۔ خوش شکل تھا اور بہت کم گو چٹہ کبھی کبھی اسے کچھوا کہا کرتا تھا، اس لیے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اُسے غریب نواز کہتے تھے۔ حیدر آباد کے ایک متول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک رنگ کے شوق میں میاں چلا آتا تھا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ابوروں پر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا لازم ہوئے مگر اس دوران میں اُس نے صورت ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لے لیے تھے، وہ بھی پٹے کے لیے کہ اُس پر ایک ٹرسٹ غورخوار چٹان کے قرض کی ادائیگی لازم ہو گئی تھی۔ اوپ طبیعت قسم کی عبادت میں غلی کنا یاں کھنسا اُس کا شغل تھا کبھی کبھی شہر میں موزوں کر مینا تھا۔ کاٹیج کا ہر شخص اُس کا مقروض تھا۔

رہے تھے۔ لکھنؤ کی ایک عجمی باک کے بھائے اس کے چہرے بڑے حیرت ناک طریقے پر مڑی ہوئی چٹنی ناک جو اس کے منہ کی گھاٹی سروں کے لیے بہت نازک تھی، جس کا تعلق براہ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو چلا یا منٹو — منٹو سیٹھ؟ چٹے نے اُس سے زیادہ اہم کی آواز میں کہا۔ "سیٹھ کی ایسی میس..... چلی اندر!"

وہ فوراً اندر آگیا۔ پرشیپ سے اُس نے ہنسنے ہوئے دم کی ایک بوقی نکالی اور بتائی کہ رکھ دی میں سالہا ادھر کی کچھ من گیا، دو دو۔ تو اور فریڈ آئے گا..... میں بڑا سالایہ فریڈ کون ہونے کو سکتا ہے..... سالہا لام نہ تھا سالہا منٹو ہے۔ چٹے نے دن کترے کے کدو ایسے سر پر ایک وصول جانی۔ اب چپک کر سلسے کے..... تو دم لے آیا..... پس ٹیپک ہے۔ دن کترے نے اپنا سر سلاہا دیا میرا حال گلاس اٹھا کر اپنے لیے پیگ تیار کیا۔ منٹو..... یہ سالہا آج شے ہی کہنے لگا۔ آج چینے کو بھی چاہتا ہے..... میں ایک دم کو..... سوچا کیا کروں.....؟

چٹے نے ایک اور دھچکا اُس کے سر پر جمایا۔ پیٹھے ہے، جیسے تو نے کچھ سوچا ہی ہو گا۔

"سوچا نہیں تو سالہا یہ اتنی بڑی بائی کہاں سے آیا — تیرے باپ نے دیا ہو کہ توں کترے نے ایک ہی جڑے میں دم ختم کر دی۔ چٹے نے اُس کی بات سنی، اُن سنی کر دی اور اُس سے کرسچا۔ تو یہ تو بتا کر می کیا ہو! — پولی تھی؟ — سو ذیل کب آئے گی؟..... اسے ہاں..... وہ ٹوشٹم بلونڈ آ"

دن کترے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر چٹے نے میرے بازو پر ہاتھ کرنا شروع کر دیا۔ منٹو — خدا کی قسم کیا چیز ہے — نہا کرتے تھے ایک شے ٹوشٹم بلونڈ بھی ہوتی ہے۔ مگر دیکھئے کائنات کی جڑا — ہاں ہی، جیسے چاندی کے میں میں تار..... گریٹ — خدا کی قسم منٹو بہت گریٹ..... لی ذندہ بارہا چٹوں نے تو اوزنگا ہوں سے دن کترے کا طوف دیکھا اور کواں کر کہا کی کترے کے بچے — نرہ کیوں نہیں دلا تا — لی ذندہ بارہا

چٹے اور دن کترے دونوں نے لی کو می ذندہ بازو کے کئی نعرے لگائے اس کے بعد دن کترے نے چٹے کے سرواں کا پھر جواب دینا چاہا مگر اُس نے اُسے خاموش کر دیا۔ چھوٹو بارہا..... جس جذباتی ہو گیا ہوں..... اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام طور پر مشنوں کے مال سپاہ ہوتے ہیں جنہیں کالی گشا سے کشیدہ دی جاتی رہی ہے..... مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے۔ چھوٹو مجھ سے مخاطب ہوا۔ منٹو — بڑی گورڈ ہو گئی ہے اُس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں..... چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جا سکتا — معلوم نہیں ٹیشٹم ہارنگ کیسا جڑا ہے، کیونکہ میں نے ابھی تک یہ دھات نہیں دیکھی..... کچھ ٹیپ ہی سا رنگ ہے..... فولاد اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے.....؟

دن کترے نے دوسرا پیگ ختم کیا۔ اور اُس میں تھوڑی سی تھری ایکس دم کس کر دی جائے؟

چٹے نے جھٹکا اس کو ایک قریب اندام کالی دی — بکواس ذکر۔ پھر اس نے بڑی دم اگلیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "بارہا..... میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں..... ہاں..... دو رنگ..... خدا کی قسم لا جواب رنگ ہے..... وہ تم نے دیکھا ہے..... وہ ہر گھپلیوں کے پیٹ پر جڑتا ہے..... نہیں نہیں ہر جڑا ہوتا ہے..... پوسٹرٹ بھلی..... اُس کے وہ

آج کی راست ساز دود نہ چھینٹا

وہ نکلے پیلہ، اُس کی نواوتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب لہاز اور نجیت کا رانگتے۔ دونوں کے پاس اسکا ج کی دود و تریس تیس۔ یہ انھوں نے بیڑ پر رکھیں۔ نجیت کا سر سے میرے اچھے خاصے ماسم تھے۔ مگر بے نجیت نہیں۔ اُس لیے ہم دونوں نے تھوڑی سی، آپ کب آئے، آج ہی آیا، اسی دمی گنگو کی اور گلاس مکر کر پینے میں مشغول ہو گئے۔

چند دھاتی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اُس پلٹنم بلونڈ کا ذکر لے آ تھا۔ نجیت کا دوسری بونل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ غریب لہاز نے اسکا ج کے تین چاک پتے تھے۔ نئے کے معاملے میں اُن سب کی سلیج اب تک۔ اسی تھی میں چمکے کر لہوہ چمچے کا طاری ہوں اس لیے میرے جذبات مستدل تھے میں نے اُن کی گنگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاندی اس نئی لوہی پر بہت بُری طرح لافیتہ تھے جہی نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس خلاب والے کا نام فی اس تھا۔ پرنے میں کوئی بیڑ ڈریسنگ سیلون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اُس کے ساتھ عام طور پر ایک بچہ لڑکا لڑکا رہتا تھا۔ وہی کی طرح وہ پندہ برس کے قریب تھی۔ غریب لہاز کو یہاں تک اُس پر گرم تھا کہ وہ جیلز آباد میں اپنے جیسے کوئی لڑکا پر کڑی اس داؤں پر لگانے کے لیے تیار تھا۔ پتہ سے کے پاس ترب کا سوت رکب پتا تھا، وہاں بونل سوت ہوتا اُن کتے کا بزم خور خیال تھا کہ اُس کی میٹھی سن کو وہی ضرور ٹیٹھے میں اُترائے گی۔ اور نجیت کا راجا جانا اقدام ہی کر لگا کر کھتا تھا..... لیکن سب انھیں ہی سوچتے تھے کہ دیکھو کی کس پر مہربانی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس پلٹنم بلونڈ فی اس کو وہ دولت جیسے میں نے پتہ سے کے ساتھ مانگے میں رکھا تھا، کسی کے بھی حوالے کر سکتی تھی۔

فی اس کی باتیں کرتے کرتے پتہ سے نے اچانک اپنی گھڑی دنگی، اور مجھ سے کہا۔ جنم میں جائے یہ لوٹنا۔ چلو۔.... بھائی وہاں کیا اب سو رہی ہوگی۔ لیکن عجیب یہ ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سنوٹی۔ سنوٹی۔ سنوٹی۔.... خیر۔ تم مجھے خیال لینا۔ آجئے گا اس کے چند آخری قطرے حق میں ٹپکا کر اُس نے نوکر کو آواز دی۔ میوں کے ملک کے شہزادے۔ میوں کے ملک کے شہزادہ آنکھیں ملتا نمودار ہوا، جیسے کسی نے اس کو صدیوں کے بعد کو دکھانے کے باہر نکالا ہے۔ پتہ سے نے اُس کے چہرے پر دم کے چھینٹے مارے اور کہا۔ دود عدد مانگے لاؤ۔.... جو میری رتھ معلوم ہوں۔

ٹانگے آ گئے۔ ہم سب اس پر لڑکر پر جات گنگو نہ جوئے۔ میرا پانا غلوں کا ساتھی۔ برٹش گھر پر موجود تھا۔ اس نور و راز جگر پر بھی اُس غیری بیوی کی خاطر درانت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا تھا۔ پتے نے اُنکے کے اشارے سے، اس کو سدا سدا بھاریا تھا، چنانچہ یہ بہت کار آمد ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غرض و غضب کا اظہار کیا۔ اُس کا روت وہاں گھر اچھا ہی کتا تھا۔ برٹش نے جو لوگوں کے نفسیات کا تھا۔ بڑی پُر غفلت باتیں کہیں، اُس انھیں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اُس کی شوٹنگ دیکھنے چلے۔ اُس روز مرنے والی تھی۔ میری بیوی نے ہر چہا کر لی کا اظہار ہے ہیں آپ؟

برٹش نے جواب دیا۔ جی نہیں۔ وہ لی کا پود گرام ہے۔.... میرا خیال ہے آپ کل چلے گا۔
برٹش کی بیوی شوٹنگ دیکھ کر دیکھ کر اوروں کا دکھا کر عاجز آئی۔ برٹش تھی۔ اُس نے فرما ہی میری بیوی سے کہا۔ انا کا ٹھیک رہے گا۔ تو انھیں سفر کی تسکین ملی ہے۔

ہم سب نے ایلڈن کاسانس لیا۔ ہرنل نے پھر کچھ دیر تک پُر گفت باتیں کیں۔ آخر میں بھروسے کہہ چلا۔ تم چلو۔ ساتھ آؤ میرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اُن کو بھڑو..... سیٹھ صاحب تمہاری کمائی سننا چاہتے ہیں۔ میں نے پوری کی طرف دیکھا اور ہرنل سے کہا اُن سے اجازت لے لو۔

پیری ساوہ لوح پوری جا میں پھنس چکا تھی اس نے ہرنل سے کہا۔ میں نے بجے سے چلتے وقت اس سے کہا ابھی تھا کہ اپنا ڈو کیونٹے کیس ساتھ لے چلیے۔ پراغوں نے کہا کوئی ضرورت نہیں — اب یہ کمائی کیا ستائیں گے۔ ہرنل نے کہا۔ اُن بانی سنا دے گا۔ پھر اُس نے پیری طرف یوں دیکھا جیسے کہ رہا ہے کہ ہاں کو جلدی۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ ہاں ایسا ہو سکتا ہے؟

پٹے نے اس ڈرا سے نکل کر دیا۔ تو مئی ہم چلتے ہیں۔ اور وہ تینوں ناخاکہ کو سلام کرنے کے چلے گئے تھوڑی دیر کے بعد میں اور ہرنل نکلے۔ پر بھات ٹگر کے باہر ٹانگے کھڑے تھے۔ پٹے نے میں دیکھا تو زور کا نعرو بلند کیا۔ بابو ہرنل چند زندہ بار.....“

ہرنل کے سوا ہم سب نے اُس کو گھرانہ نہ ہو گئے۔ اُس کو اپنی ایک سسلی سے ملنے جانا تھا۔ یہ بھی ایک کالج تھی شکل و صورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کالج جیسی، مگر بہت صاف ستھری جس سے مئی کے سلیٹے اور ذرخینے کا پتہ چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر چیزیں جہاں تھی جہاں تھی۔ پر بھات ٹگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی قبرخانہ ہوگا، مگر اُس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی ٹریفنا تھا جیسا کہ ایک اور سلاو پر کامیابی ہوتا ہے۔ لیکن مئی کی عمر کے مقابلے میں وہ جوانی تھی اُن دکھائی دیتا تھا۔ اُس پر وہ میک اپ نہیں تھا۔ میں نے مئی کے گھروں والے چہرے کو دیکھا تھا جب مئی ڈرائنگ روم میں آئی، تو میں نے سوچا کہ اگر وہ پیش کی تھیں چیزیں ہیں۔ وہ آج کی نہیں، بہت برسوں کی ہیں۔ حسرت مئی آگے نکل کر اوڑھی ہو گئی ہے اور وہ ویسی کی ویسی پڑی رہی ہیں — اُن کی بڑھتی ہوئی، وہ وہیں کی وہیں رہی ہے..... لیکن جب میں نے اُس کے گھر سے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کہوں یہ غمازش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنے گرد و پیش کے ماحول کی طرح بنیادہ دیکھیں طور پر چہان بن جائے۔

پٹے نے اُس سے جبراً اتفاق کر لیا، جو بہت مختصر تھا، اور اختصار ہی کے ساتھ اُس نے مئی کے تعلق بھروسے یہ کہنا۔ مئی ہے..... وہی گریٹ مئی.....؟

مئی اپنی تعریف مئی کو سکھادی، اور میری طرف دیکھ کر اُس نے پٹے سے انگریزی میں کہا۔ تم نے چائے منگوائی تھی حسب معمول خیریت؟ آخر تقریریں..... معلوم نہیں اخص پسند بھی آئی ہوگی یا نہیں۔ پھر وہ مجھ سے غائب ہوئی۔ ٹھٹھٹھٹھ میں بہت شرمندہ ہوں..... اس میں سارا قصور تھا۔ دوست پٹے کا ہے جو میرا ذہنی اصلاح لوٹا ہے۔

میں نے مناسب دہریوں الفاظ میں چائے کی تعریف کی اور اُس کا شکریہ ادا کیا۔ مئی نے مجھے غصوں کی تعریف سے منع کیا اور پٹے سے کہا۔ بات کا کھانا آیا ہے..... یہ میں نے اس لیے کیا کہ تم عین وقت کے وقت میرے سر پر سوار ہو جاؤ گے.....؟

چٹے نے ٹی کو لگے سے لگا دیا۔ ”یو آؤ بے جیول می..... یہ کھا نا اب ہم کھائیں گے۔“

ٹی نے چونک کر پوچھا کیا؟..... نہیں، ہرگز نہیں۔“

چٹے نے اُسے بتایا، مسٹر مشکو کو ہم پر بھارتی گر جھپٹے آئے ہیں۔“

ٹی چلائی۔ خدا تعالیٰ غارت کرے۔۔۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔“

چٹہ کھکھکا کر ہنسنا۔ آؤ پارٹی ہو مرنے والی تھی۔“

”وہ تو جس نے مسٹر مشکو کو بچتے ہی اپنے دل میں کیسل کر دی تھی۔“ ٹی نے اپنا سرٹ سلگا لیا۔

چٹے کا دل ڈوب گیا، خدا اب تعالیٰ غارت کرے..... اور یہ سب جلیں ہم نے صحت اس پارٹی کے بچے بنا دی تھیں۔“

وہ کہہ کر اس زور ہو کر بیٹھ گیا اور کہنے کے ہنسنے سے غلاب ہو کر کہنے لگا، تو سارے خواب دیار سے ہو گئے..... چٹھی تم بونڈ

..... اور اسے سانپ کے تختے نیچے کچھروں جیسے رنگ والے بال..... ایک دم اُس نے اٹھ کر ٹی کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔

”کیسل کی تھی۔۔۔۔۔ اپنے دل میں کیسل کی تھی نا.....“ اس پر صدا بنا دیتا ہوں۔ اور اس نے ٹی کے دل کے مقام پر انگلی سے بہت

بڑا صدمہ بنا دیا اور بازو بند پکڑا۔ ہرے۔۔۔۔۔ آ

ٹی منسلک لوگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چٹے کو دیکھ کر نا انصافی

تھی چنانچہ اُس نے بڑی شفقت سے اُس کے گال قبضہ کیا اور کہا۔ تم گنہگار کرو..... میں ابھی انتقام کرتی ہوں۔“

وہ انتقام کرنے باہر چلی گئی۔ چٹے نے غشی کا ایک اور نعرہ بلند کیا اور دن کترے سے کہا، ”جنرل کن کترے۔۔۔۔۔ جاؤ

ہیڈ کوارٹرز سے ساری توڑ بیٹے آؤ۔“

نوں کترے نے سیلوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ سیدیہ لالچ بالکل ہاس تھی، اس منٹ کے خدا غور و غور تھیں

یے کہ وہ اپنی اٹلی، ساتھ اُس کے چٹے کا لور تھا۔ چٹے نے اُس کو دیکھا تو اُس کا استقبال کیا۔ آؤ، آؤ۔۔۔۔۔ میرے کہہ کاف

کے خزانے..... وہ۔۔۔۔۔ وہ سانپ کے کچھروں جیسے رنگ کے بالوں والی توڈیا آ رہی ہے..... تو ابھی قسمت

آزمائی کر لیتا۔“

رجحیت کا اور غریب اور زور و فوں کو چٹے کی یہ صلائے عام ہے یا راجن نکندوں کے لیے، مالی بات بہت ناگوار معلوم

ہوتی۔ دونوں نے بچے سے کہا کہ یہ چٹے کی بہت بے پروگی ہے۔ اس بی پروگی کو انھوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ چٹہ حسبِ حالت

اپنی ہاتھ دلا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھ اہستہ آہستہ دم کی کر ایک دوسرے سے اپنے دھکے کا اظہار کرتے رہے۔

میں ٹی کے متعلق سوچتا رہا۔ ڈورنگ روم میں غریب توڑ، رجحیت کا اور چٹہ بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ چھوٹے

چھوٹے بچے ہیں، ان کی ماں باہر کھلونے بیٹھے گئی ہے۔ یہ سب منتظر ہیں۔ چٹہ مطمئن ہے کہ سب بڑھیا اور چھا کھلنا اُسے ملے گا،

اس لیے کہ وہ اپنی ماں کا چیتا ہے۔ باقی دو کاظم چکر ایک جیسا تھا اس لیے وہ ایک دوسرے کے محسوس ہی گئے تھے..... غراب

اس ناول میں دو دو معلوم ہوتی تھی اور وہ بیٹھ کر..... اُس کا قصہ ایک پھوٹی سی گڑا کسا خدا داغ میں آتا تھا۔

ہر خدا ہر اعمال کی اپنی مستقلی ہوتی ہے..... اُس وقت جو مستقل میرے دل کے قانون تک پہنچ رہی تھی۔ اُس میں کوئی مشہد اشتغال انگیز نہیں تھا۔ ہر شے اس انداز کے بچے اور اُن کے بھی رشتے کا لوحِ قلوبِ اہم اور تعین تھی۔
 میں نے جب اُس کو سنا لگے میں پٹکے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری جانیاتی میں کو صد پر پہنچا تھا مجھے افسوس ہوا کہ میرے لی میں ان دونوں کے متعلق وہ بات خیال پیدا ہوتے لیکن یہ چیز مجھے بار بار سنا رہی تھی کہ وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اُس کی تجزیوں کی قریب ہے اُس مٹائی کشمیک ہے جو اُس کے دل میں پٹکے خراب تو انہوں نے کترے کے لیے موجود ہے..... اور خدا معلوم اور کس کس کے لیے.....؟

باقی باتوں میں پٹکے سے سحر میں نے پہنچا۔ یہ تو سناؤ تھا ہی لمبی اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے؟
 اس لیے کوئی یا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے..... تمہارے اور میرے جیسے اُن کو اس دنیا میں بہت کم بتتے ہیں جو دم علم سوار مدغم رنگ پسند کرتے ہیں۔ جو جوانی کو بچپن کے یو پ میں نہیں دیکھنا چاہتے اور..... اور جو بڑھاپے پر جوانی کا لوحِ پسند نہیں کرتے..... ہم جو خود کو آرٹسٹ سمجھتے ہیں، اُن کے کچھ پٹے ہیں..... میں نہیں ایک دلچسپ واقعہ سنا تھا ہوں..... ریسٹا کھیلا میل تھا..... تمہارے سر پر..... دام باغ کے اُس بار میں جہاں کھینچا گیا رہتی ہیں..... جاٹ گذر رہے تھے..... ایک صحت مند جوان نے..... خاص دور دور کھس پر پٹے ہوئے جوان نے جس کی نئی برقی اُس کی کاشی پر بادی گری کر رہی تھی اُن پر ایک کوٹھے کی طرف دیکھا، جس کی تل میں چڑی ہوتی ہوں، اُس کے اچھے بڑے بدنا طریقے پر لگی ہوتی تھیں اور اپنے ساتھی کی پیسوں میں ٹھوکرے کر کیا..... ہوئے لہنا سیاں..... جو اسے اور پرورخ..... اسی تے پشدرپ تھا ان..... ہنری شہزادہ خدا معلوم کیوں گول کر گیا۔ سالانہ وہ شائستگی کا بالکل ناکل نہیں تھا کھلے کر ہنسنے لگا اور میرے کلاس میں دم ڈال کر لڑا اُس جاٹ کے لیے وہ چڑلی ہی اُس وقت کوہِ تلافی کی پری تھی..... اور اُس کے لڑائی کی سیریل جیل تیار میں ہے ڈول بھی نہیں..... ہم سب چھڑیں..... دریا نے درجے کے..... اس لیے کہ اس دنیا میں کوئی چیز قول درجے کی نہیں..... تیسرے درجے کی ہے یاد دیرانے درجے کی..... لیکن..... لیکن فی س.....
 خاص اُن اس درجے کی چیز ہے..... وہ سانپ کے کپڑوں.....؟

دن کترے نے اپنا کلاس اُن کا کڑکے کے سر پر انڈیل دیا کچھ..... کچھ..... تمہارا دستک چر گیا ہے۔
 پٹکے نے اچھے پر سے دم کے ٹپکتے ہوئے قطارے زبان سے چائے شروع کر دیے اور دن کترے سے کہا اے اب سنا..... تجرا اب سالانہ سے گفتی ثابت کرتا تھا..... میرا داغ اب کافی خندنا ہو گیا ہے؟

دن کترے بہت سنجیدہ ہو کر کچھ سے مخاطب ہوا۔ "بائی گاؤ..... وہ مجھ سے بہت ثابت کرتا تھا..... میں غفیل اور کا تھا کہ اُس نے میری شادی بنا دی؟"

پٹکے خود سے ہنسا۔ "تھیں کاروں بنا دیا اُس سارے نے..... بھگوان اُسے شوگر میں کسیریل کی میٹھی دے کر وہاں بھی اسے بجایا کہ کھادی شادی کے لیے کوئی خوبصورت ٹور دھوڑا ہے۔"

”تمہاری غمگینی کی دلی تپشیں..... فی اس کی بات کرو..... اس سے زیادہ اور کوئی خوبصورت نہیں ہو سکتا۔“ پڑھے نے غریب لہذا اور رنجیت کمار کی طرف دیکھا جو کہنے میں بیٹھے فی اس کے جس کے متعلق رنجی رائے کا اظہار ایک دوسرے سے کہنے والے تھے۔ لگی پاؤں ڈھلے کے بانیہ..... سن لو تمہاری کوئی سازش کامیاب نہیں ہوگی۔ میدان پڑھے کے ہاتھ رہے گا..... کیوں ویز کے شہزادے پتا

ویر کا شہزادہ دم کی خالی ہوئی ہوئی بزل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پڑھے نے غصہ لگایا اور اس کو آدھا نکالے بھر کے دے دیا۔

غریب نور اور رنجیت کمار ایک دوسرے سے فی اس کے بارے میں مکمل مل کے باتیں تو کر رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اسے حاصل کرنے کی مختلف اسٹریٹجیاں مفید و ملود پر بناتا رہے تھے۔ یہاں کے طرز گفتگو سے صاف عیاں تھا۔

ڈرائنگ روم میں اس کی بے بسی دکھائی دیتی تھی، کیونکہ شام گہری ہو چکی تھی۔ چٹہ چھ سے بچے کی فلم ڈسٹری کے ناز و حالات سن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں مٹی کی تیر تیر آواز سنائی دی۔ پڑھے نے غصہ لگایا اور باہر چلا گیا۔ غریب نور نے رنجیت کمار کی طرف اور رنجیت کمار نے غریب نور کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، چھوٹوں اور بزرگوں کے درمیان کی طرح دیکھنے لگے۔

مٹی چٹکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ چار پانچ رنگو آئین لوگیاں تھیں۔ مختلف تعقیبات اور خطوط و احوال کی پرانی ڈھلی کپڑی، ایلٹا اور چیلٹا..... اور وہ ویر کا اٹا لٹکا..... اس کو پڑھا سہی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی اس سبب آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی پڑھے کے ساتھ۔ اس کا ایک بازو اس لیٹرن پر لٹکی ہوئی کمری میں خالی تھا۔ فی نے غریب نور اور رنجیت کمار کا رد عمل نوٹ کیا۔ ان کو پڑھے کی یہ ناشی غصہ انداز حرکت پسند نہ آئی تھی۔

طوبیوں کے نازل ہوتے ہی ایک شور برپا ہو گیا۔ ایک دم اتنی انگریزی ہر کسی کو ذی کسرے و بھری کوشش امتحان میں لگنی پڑی۔ مگر اس نے کوئی پروا نہ کی اور برابر بولتا رہا جب اس سے کسی نے انتقادات نہ کرتا تو وہ اٹھا کی بڑی ہنسی لگاتا کہ ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پچھلے لگا کر اس نے ہندوستانی ڈانس کے اور کتنے نئے کوڑے سیکھے ہیں۔ وہ اصرار دہانی ناکت اور تاشی تھی کی لون، مو، تھری جتا جتا اس کو توڑے بنا رہا تھا، اور چٹہ باقی لوگوں کے ٹھہرٹ میں انگریزی کے ٹنگے ٹنگے لوگ ٹسار رہا تھا جس کو بڑوں کی تعداد میں بے نیازی دھتے۔ مٹی سوڑے کی بوتلیں اور گرگ ک ساہن منگوا دی تھی۔ رنجیت کمار سگریٹ کے کش لگا کر کھلی ہانڈ سے فی اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور غریب نور ڈھلی سے بار بار کہتا تھا کہ وہ بچے کی ہون تو وہ اس سے لے لے۔

اسکاچ کھلی اور پہلا قدر شروع ہوا۔ فی اس کو جب شامل ہونے کے لیے کہا گیا تو اس نے اپنے بیٹھنی ہاتھوں کو ایک خفیہ سا جھٹکا دے کر نکال کر دیا کہ وہ دسکی نہیں پیا کرتی۔ سب نے اصرار کیا مگر وہ فی نے پڑھے نے بدلی کا اظہار کیا تو فی نے فی اس کے لیے ہلکا سا مشروب تیار کیا اور لگا اس کے ہنر مند کے ساتھ لگا کر بٹے پر اسے کہا ”بہادر لڑکی خواہی ہو یا جادو“

فی اس کا اظہار کر سکی۔ پڑھا خوش ہو گیا اور اس نے اسی خوشی میں کچھیں اور لڑکھائی مانتے۔ سب مزے پیتے رہے۔

میں نے سوچا، اعرانی سے کتاب اگر انسان نے ستر پریشی اختیار کی ہوگی یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پریشی سے اٹکا کر کبھی کبھی اعرانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے، بلا تسلی کا روئے عمل یقیناً شائستگی ہے۔ اس فراہم قطعی طور پر ایک دلکش پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے وابستہ سبب ایک بڑی کلفت سے چند لمحوں کے لیے نجات مل جاتی ہے۔.....“

میں نے بی کی طرف دیکھا جو بہت جفاکش بڑا آدمی تھا۔ اس کے پاس میں گھنٹی ٹی پٹے کے ننگے ننگے لڑکے تھے جن کو میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی وہی باتیں تھیں۔ ایک آپ تھا۔ اس کے نیچے پاس کی جھڑیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ بھی سرور تھیں..... میں نے سوچا، آخر لوگ کیوں فخر کو کہا سمجھتے ہیں..... وہ فخر جو میری آنکھوں کے سامنے تھے، اُن کا کھانا گوبدنا تھا، لیکن ہاں اُس کا بے حد خوبصورت تھا..... اُس پر کوئی بناؤ سنگھار، غارہ، کوئی اجڑا نہیں تھا۔

یہاں تھی وہ ایک کونہ میں ریختہ کار کے ساتھ کھڑی، اپنے نئے ڈاک کے باسے میں بات چیت کر رہی تھی، وہاں سے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیار رہی سے اس نے بڑے سستے داموں پر بڑی عمدہ چیز تیار کرائی ہے، وہ کٹے تھے جو بظاہر باطل بیگانہ معلوم ہوتے تھے، غراب وہ ایک خوبصورت پرشاک میں بندرل ہو گئے تھے۔ اور ریختہ کار ٹھٹھے ٹھٹھے کے ساتھ اس کو روئے ڈیس بنوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا، حالانکہ اسے علم کہیں سے اسنے روپہ کلفت طے کی ہوگا، ہرگز امید نہیں تھی، ڈول تھی وہ غریبوں سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اُس کو یقین دلایا کہ قرض کو فوری طور سے تنخواہ منے پر وہ یہ قرض ضرور ادا کرے گی، غریب نواز کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ دو پیر حسبِ محول بھی واپس نہیں دے گی کہ اگر وہ اس کے وعدے پر اعتبار کیے جا رہا تھا تو کیا ان کے ترسے تاخیر و ناہی کے بڑے مشکل ٹوڑے کیکنے کی کوشش کر رہی تھی، وہ کہتے کہ معلوم تھا کہ ساری عمر اُس کے پیر بھی اُن کے بول واپس کر سکیں گے، مگر وہ اس کو بتاتے جا رہا تھا اور قیلاً ہی وہی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ان کے ترسے کا وقت ضائع کر رہی ہے مگر بڑے حقوق اور انعام کے سبق یاد کر رہی تھی، اچھا اور کئی دونوں نے جاری تھیں وہاں اُس میں کسی آدمی کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلے برس میں اُن دونوں سے خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹیپ دی تھی، اور چڑھ فی اس کے سانپ کے کچرے ایسے رنگ کے بالوں کے پچھلے ہوئے سونے کی رنگ کی اسکلچ میں ملاحظہ کرتی رہا تھا، اُس کا بیڑہ غار و ست بار بار جب سے لگتی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا، کئی کئی اس سے بات کرتی تھی، کبھی اُس سے، کبھی سڑا کھلاوتی تھی، کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی..... اُس کی نگاہ سب پر تھی اُس کی طرح، جو بظاہر تکیوں بند کی سستاتی ہے، مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے پاؤں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا ضرورت کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ، کون سا خط غلط تھا؟..... بی کا وہ بھڑکلا اور طوٹ گیا ایک آپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔

غائب کتاب ہے۔

قید حیات و بندِ عیشم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

تقدیر حیات اور ہنر و فنم جب اس قدر ایک ہی تھی تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس نجات کے لیے کوئی ملک، امرت، کھانا، تھلا کرے..... کیوں آدمی چند لمحات کے لیے خود فری کے کھسک کھیل میں مبتلا نہ ہو۔

میں سب کی تعریف میں مطلب انسان تھی، اُس کے پہلو میں ایسا دل تھا جس میں ان سب کے لیے قربانی تھی۔ میں نے سوچا شاید اس لیے اُس نے اپنے چہرے پر رنگ ملایا ہے کہ لوگوں کو اُس کی اصلیت معلوم نہ ہو..... اُس میں شاید اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی امان بن سکتی..... اس نے اپنی شفقت اور محبت کے لیے چند آدمیوں کی بیعتیں اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر اُس کو معلوم نہیں تھا چھوڑ دینا ایک بڑا کام ہے، مگر اُس وقت اندر باری خدائے مہربان کی شہر میں تل رہی تھی..... اُس کی نظر میں تھی، اچکے چکے سرور میں، جس طرح اُس کے ہاتھ کیے ہوئے نواز کے رنگ کے بال اُستہا ہستہ ہلاتے تھے، اسی طرح وہ خود بھی لڑاتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے، دن کترے تھے، قیام کو ٹوڑے سکھا سکھا کلاب اُسے تار ہا تھا کہ اُس کا باب سا اُس سے بہت رعب کرتا تھا۔ چائے پڑھ رہی میں، اُس نے اُس کی شادی بنا دی تھی، اُس کی مانت بہت پریشانی میں ہے..... اور غریب نواز، دہلی کو فرض دے کر پھول میں چکا تھا۔ نچیت کمار، پولی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا تھا۔ ایتنا اور کچھ دلوں میں جہاں ہم کی باتیں کر کے اب خفا گئی تھیں۔ تپائی کے اور گرد، فی اس، اُس کا بھڑانا سا تھی اور کئی بیٹھے تھے۔ چنڈا اب ہندوستانی نہیں تھا، فی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی، جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرو پکھا تھا۔ اُس کو حاصل کرنے کا عزم اُس کی آنکھوں میں صاف صاف موج د تھا، اُس سے غافل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد فی اس کا بیڑو غنا دوست ٹھکانہ کو صوفیہ پر دھانڑا گیا اور اپنے بالوں میں لکھی کوٹے کرتے سو گیا۔ غریب نواز اور ایتنا ٹھکانہ کو کہیں چلے گئے۔ ایتنا اور کچھ نے اُس میں کسی ناگزرت کے متعلق باتیں کرتے ہوئے مئی سے رخصت مل اور لڑکی لیں..... لوں کتر نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی، اسی فی اس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا، پھر خفا کی غارت میں اُس کے ہاتھ کی تار اُس کو بازو سے پکڑ کر چاند دکھانے کے لیے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم جانے کیا ہوا کہ چٹے اور کرم میں گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چٹے کی زبان لڑکھڑاہی تھی وہ ایک اختلاف پہنچے کی طرح مئی سے جذباتی کرنے لگا۔ فی اس نے دلوں میں صاف صحت کی مین میں کوشش کی، مگر چٹے دھوا کے گھوٹے پر سوار تھا وہ فی اس کو اپنے ساتھ سمیٹ کر لکچ میں لے جانا ہوتا تھا، اُس کے خدات تھی وہ اُس کو بہت دیر تک گھما کر رہی کہ وہ اس ارادے سے ہانڈائے مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا، وہ بار بار اسی سے کہہ رہا تھا تم رونا کی جگہ جو..... بڑھتی جا رہی..... فی اس میری ہے۔ پوچھ لو اس سے۔

میں نے بہت دیر تک اُس کی گالیاں سنیں، آخر میں بڑے کھیلنے والے انداز میں اُس سے کہہ ڈیا، مائی سن..... ہم کیوں نہیں سمجھتے..... شمی از رنگ۔ شمی از بیری رنگ۔

اُس کی آواز میں کچکا پچا ہٹ تھی۔ ایک اجتماعی، ایک سرخوش تھی۔ ایک بڑی بھانجک نصیر بونٹی، اگرچہ بالکل نہ سمجھا اُس وقت اس کے پیش نظر صورت فی س اور اُس کا حصول تھا۔ میں نے فی س کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی دفعہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی شرکائی تھی۔ پیشانی پندرہ برس کی..... اُس کا سفید چہرہ، لعنتی بدوں میں گھلایا ہوا دیش کے پسٹل نظر سے کی طرح ٹوڑا ہوا۔ چڑے نے اُس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور انگوٹھ کے سرور کے اندر میں اُسے اپنے سینے کے ساتھ چسپن کر لیا۔ جی نے احتجاج کی جگہ بند کی۔ چٹو..... چھوڑ دو..... فوراً ڈرامیک..... چھوڑ دو.....

جب چڑے نے فی س کو اپنے چڑے سینے سے جدا کر لیا تو فی س نے اُس کے منہ پر ایک چاشما ترا گٹ آؤٹ..... گٹ آؤٹ! چٹا بھونچکا رہ گیا۔ فی س کو جدا کر کے اُس نے وہ ہٹا دیا اور جی کی طرف تھراؤ تو نگاہوں سے دیکھتا باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر رخصت لی اور پٹے سے کتے بچھے چلا گیا۔

سعید کا کٹیج پرچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون قمیص اور بوٹ سمیت پتنگ پرانہ صحنہ منظر لیتا تھا۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر برٹس میز پر سو گیا۔

صبح رُسے اٹھا، گھڑی میں دس بج رہے تھے۔ چٹا صبح ہی صبح اٹھ کر باہر چلا گیا تھا کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اُس کی آواز سنی جو گالاج سے باہر آ رہی تھی میں ٹک گیا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا کہ لاہور عورت ہے۔۔۔۔۔ خدا کی قسم وہ لاہور عورت ہے..... تو جا کر دیکھ اُس کی عمر کو پچھ کر تم بھی رُسے ہی کر بیٹھ کر مارتو۔

اُس کے بچے میں ایک عجیب و غریب کٹی تھی۔۔۔۔۔ معلوم نہیں اُس کا رخ اُس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اُس شخص کی طرف جس سے وہ مخاطب تھا۔۔۔۔۔ میں نے زیادہ دیر وہاں ٹکے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا نصف گھنٹے کے قریب میں نے اُس کا منتظر کیا۔ جب وہ نہ آیا تو میں پریشان ہو کر نہ رہا۔

بہری بیوی کا راج معتدل تھا۔۔۔۔۔ ہر شے گھر میں نہیں تھا۔ اُس کی بیوی نے اُس کے متعلق متغیر کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ ہاتھ میں کافی قہر سوج ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے ہر شے کی بیوی سے کہہ کر کہیں اجازت دے دی جاتے۔ دسوا اُس نے میں روکا جا یا، مگر میں سعید کا کٹیج ہی سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لیے ذہنی جنگ کی کدو اسے بہت کافی ہے۔ ہم چل دیے..... راستے میں ہی کی باتیں ہوئیں جو کچھ نہ تھا میں نے اُس کا من میں منساویا۔ اُس کا رد عمل یہ تھا کہ فی اس اُس کی کوئی رشتہ دار ہوگا۔ یادہ اُسے کسی بھی اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی مجھی اُس نے چڑے سے لڑائی کی..... میں غامض رہا۔ اُس کی تردید کی نہ تائید۔

کئی دن گزرے پر پٹے کا خط آیا جس میں اُس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا اور اُس نے اپنے متعلق یہ کہنا تھا میں اُس نوڈ صحنہ میں ہی گیا تھا۔۔۔۔۔ محنت ہو چھوڑا۔

میں نے اپنے کے بعد مجھے ایک صندوق کا مہرے پڑے جانا پڑا۔ سیدھا سعید کا کٹیج پہنچا۔ چٹا صحنہ میں تھا غریب نواز سے اُس وقت ملاقات ہوئی۔ جب وہ گالاج سے باہر نکل کر شہر کی کئی دو سال بچے کو بلایا کہہ رہا تھا وہ بڑے تپاک سے ملا۔ ٹھوڑی دیر

پولنگ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا مگر اس کی غواہی پسند طبیعت اسی طرح نوروں پر تھی اپنی بیماری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا کہ جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا شکار کرتا ہے۔ اب کہ وہ جانبر ہو گیا تھا اپنی خطرناک حالات کے متعلق تفصیلی گفتگو سے بیکار معلوم ہوتی تھی۔

سعیدہ کاٹیج میں جلسے کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی تبدیلیاں ہوتی تھیں۔ اہل بارودان یعنی حقیقی اور فیکٹل کہیں اور اٹھ گئے۔ نئے کپورنگہ انھیں اپنی ذاتی فکر کمپنی قائم کرنے کے لیے سعیدہ کاٹیج کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان کی جگہ ایک جنگالی سرورگ ٹرانزکٹر آگیا تھا۔ اس کا نام سین تھا۔ اس کے ساتھ لاہور سے جھاگا ہوا ایک لاٹا مارم منگھر دھنبا تھا۔ سعیدہ کاٹیج والے سب اس کے کام لیتے تھے۔ طبیعت کا بہت شریف اور خدمت گزار تھا۔ چٹے کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ ٹی کے گھنے پر لوٹا اور جبار ہوا تھا۔ اس نے غریب نواز اور نجیت کا ر سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کاٹیج میں رکھ دیا جائے۔ سین کے کمرے میں چکر بگڑ خالی تھی۔ اس لیے اس نے دیں اپنا ٹریہ بھلادیا تھا۔

نجیت کا ر کو کمپنی کے نئے نظم میں سرورغتب کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر نظم کا ہیاب ہوا تو اس کو دوسرا نظم ٹائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چٹہ اپنی دوسری کی جنج شدہ تنخواہ میں سے فوراً ہزار روپے یکیشٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے نجیت کا ر سے کہا تھا میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو یہ کسی میں مبتلا ہو جاؤ۔ دوسراؤ ڈاکٹر کٹر بننے سے میرا خیال ہے وہی بہتر ہے۔

غریب نواز نے آواز نہ جید سے دوسرا دیا تھا، اس لیے سعیدہ کاٹیج کسی قدر رفع احوال تھی۔ میں نے یہ سمجھا کہ کراچی کے باہر اگلی سے ایسی فیسیں اور ضلواویں لٹکسری تھیں جی کا کپڑا اچھا اور قیمتی تھا۔ شہر میں کے خورد و سال بچے کے پاس نئے کپڑے تھے۔ مجھے پونے میں پندرہ ہفتہ بنا پڑا میرا ناٹوں کا ساتھی اب نئے نظم کی ہر دہائی کی محنت میں گرفتار دوسرے کی کوشش میں مصروف تھا۔ گورڈونا تھا۔ کیونکہ یہ ہر دہائی قیمتی اور اس کا خاوند بڑی بڑی مریخوں والا جٹا کٹا مشتہد تھا۔ چٹے نے اس کو حوصلہ دیا تھا۔ کچھ پروا نہ کرو اس سانس کے..... جس خیالی ایکٹرس کا خاوند بڑی بڑی مریخوں والا بھٹوان ہر وہ عشق کے میدان میں ہنر و جادوں شانے چیت لگا کرتا ہے۔ بس اتنا کہ وہ دوسرے پے پی گالی کے حساب سے مجھ سے خیالی کی دس میں بڑی بڑی ویت قسم کی لایاں سیکھو۔ یہ تمہاری خاص شہلوں میں بہت کام آیا کریں گی۔

برش ایک بڑی بڑی گالی کے حساب سے ہر گالیاں بھاب کے مخصوص لمبے میں یاد رکھا تھا۔ مگر ابھی تک سے اپنے عشق کے راستے میں کوئی دوسرا خاص شکل پیش نہیں آتی تھی۔ عہدہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔

ٹی کے گھر سب معمولی مغلیں جتنی تھیں۔ چولی، ٹوپی، کٹی، ایٹھا، بیلا وغیرہ سب آتی تھیں۔ دن کترے بدستور تھیں کہ کھانے کا لڑا۔ تاثر کو تاج کی تاقی، اور دھانی ناکت کی دن، تو تعری بنا بنا کر تانا تھا۔ اسے دیکھنے کی پڑتوں کوشش کرتی تھی۔ غریب نواز سب تو بڑی قرض دے دیا تھا اور نجیت کا جس کی سب کمپنی کے نئے نظم میں ہر وہ کچا نسیں دیا تھا، ان میں سے کسی ایک کو باہر کھلی برا میں لے جاتا تھا۔ چٹے کے ننگے ننگے لہرک شہن کو اسی طرح تھتھے برپا ہوتے تھے..... ایک صورت وہ نہیں تھی..... وہ جس کے بالوں

کے رنگ کے بچے صحیح تشبیہ ڈھونڈنے میں پٹے نے کافی وقت صرف کیا تھا۔ گھوٹا غلطوں میں پڑے کی نگاہیں اسے ٹھوس ٹھکانے میں نہیں تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھی جب پٹے کی نظریں مٹی کی غلطوں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو اس صحن میں کتنا تھا کہ اس کو اپنی اس رات کی دوا لگی کلاخوس ہے۔ ایسا انھوں جس کی یاد سے اس کو تخلیق ہوئی ہے چنانچہ چرچہ پیک کے بعد کسی وقت اس قسم کا جملہ اس کی زبان سے بہ اختیار نکل جاتا۔ پٹہ — یوں اسے ٹوینٹر ہوٹا؟

یہ سن کر مٹی نے زبردست سکوا دیتی تھی، جسے وہ اس سکوا سٹکی کی شریعت میں بیٹھ بیٹھ کر کہہ رہی ہے۔ ٹوینٹر لوگ روٹ۔
وہ کترے سے بدستور اس کی بیٹھ چاتی تھی۔ مگر میں اگر تب بھی وہ اپنے باپ کی تعریف میں باڑی چری کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ اس کی بات بہت بڑے گٹھڑے کاٹ ڈالتا وہ غریب چپ بوجھتا، اور اپنا سیرنگ بچہ پیش کر دیتا کہ اس کے جیس میں ڈال لیتا۔

مٹی، رہی مٹی تھی — بدل کی مٹی، اٹولی کی مٹی، پٹے کی مٹی، رنجیت کمار کی مٹی۔ سڑے کی بوتلوں، گولک کی پیرریوں اور محفل جمانے کے دوسرے ساندو ساندی کے انتظام میں وہ اس پر شفقت و امانت سے حاضر مٹی تھی اس کے چہرے کا میک اپ ویسا ہی عجایب ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اس طرح کے شروع و شگ تھے۔ خانہ سے اور مٹی کی تنوں سے اس کی تفریحیں اس طرح چھا جاتی تھیں۔ گلاب پھیرے مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کرپلیگ کے کپڑے ان ناک نہیں پہنچ سکے تھے۔ ڈرک مسٹک، وہ دوڑ گئے تھے۔ پٹے کے جسم سے بھی نکل جاتے تھے کہ اس پر ان جہریوں کا ساہ تھا۔۔۔۔۔ ان مقدس جہریوں کا وہ وقت نہایت ویریا ت رنگوں میں نظری رہتی تھیں۔

وہ کترے کی خوبصورت پوری کے جب اس مقام پر آتا تو مٹی کی بد وقت، اعلیٰ سے اس کی جان کی تھی جیسا جب ہندوستانی دس کیچنے کے شوق میں، مادہ اڑ کے ایک کھٹک کے بجتے چڑھتی تھی اور اس صودے میں ایک روز جب اس کو ایک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو مٹی نے اس کو بہت ڈانٹا تھا اور اس کو تنہا چھوڑ کے بیٹھ بیٹھ کر اسے اس سے تعلق قلعی کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل سوج گیا تھا۔ اس نے اسی روز شام کو اپنے بیٹوں کو ساری بات سنائی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ جیسا کہ ملاحظہ کریں، کبھی کو ایک قتل عام کرنے کے سلسلے میں باغی صودے کا انعام ملا تھا، تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے دوپے غریب نواز کو دے دے کہ کوئی گندم اس کا قتل عام ہے۔ اس نے کئی سے کہا تھا، تم اس وقت اسے دے دو — بعد میں مٹی نے جتنا اندھ بھڑکاسا اس نے چند روز کے قیام کے دوران میں کئی مرتبہ سری منتر کے بارے میں پوچھا تھا، اور فقرہ اش کاظمہ کرنا تھا کہ پہلے بچے کی موت کو اتنے برس ہو گئے ہیں، وہ سراج بچہ کیوں نہیں جڑا، رنجیت کمار سے زیادہ رنجیت کے ساتھ بات نہیں کرتی تھی۔ ویسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تھوڑی سی پسندیدگی اس کو بھی نہیں ملتی میرے سامنے اس کا اٹھا، وہ ایک دوسرے غلطوں میں لگی کر رہی تھی۔ روزگ ڈاکٹر تھیں سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چلہ اس کو اپنے ساتھ لانا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی، ایسے نرل آدمی کو اس سے دیا کرو۔ پٹہ اس سے وہ چھٹا تو وہ ٹہری سبیدگی سے یہ جواب دیتی تھی کہ مجھے یہ آدمی اور پادرا پر سامع معلوم ہوتا ہے — فٹ نہیں دیکھا میری غلطوں میں، یہ سن کر پٹہ ہنس دیتا تھا۔

میں کے گھر کی محفلوں کی بڑے خلوص گہری پیہر میں دایس بیچے چلا گیا۔ ان محفلوں میں ہندی غنی، بڈا نوشی غنی، ہنسیاتی رنگ تھا، مگر کوئی آہٹاؤ نہیں تھا۔ ہر چیز حاملہ محبت کے پیٹ کی طرح توالی غم تھی۔ اسی طرح ابھری ہوئی۔ بدلتا ہوا سر ملن کٹھن صوب، جینڈی اور دیکھتے دیکھتے گڑگڑاؤ کی حالت میں ڈالنے والی۔ گڑا سلی میں بڑی ریح، اسلیقہ اور اپنی بلنگہ پر قائم۔

دوسرے روز صبح کے خیالوں میں ہی پڑھا کر سعیدہ کو لڑکی میں بھگتلی بیوی لگا کر اکثر میں لہا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی مام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً پورے فلسفیان کیا مگر کوئی زلزلہ نہ سنا۔

ایک چھتے کے بعد پڑے کا خفا کا جس میں عمارت قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ پتے کے کھنگ پر بیٹا بگ کوئی لگا۔ وہ بڑا ناکار تھا۔ روشنی کی توری بکا کر میں ہے۔ خون میں لت پت۔ پتہ لگی طرح اپنے ہوش دھڑا کر منبہ نہ بھی پایا تھا کہ دو دن اس میں مام سنگھ خود رہا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور نہایت کما رہی آگئے۔ ساری سعیدہ کا لٹک میڈا ہو گئی۔ نہایت کما اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ پتے نے سین کو اپنے پٹنگ پر لٹایا اور اس سے زخموں کے منتقل کچھ پر چھینری دلا تھا کہ اس نے آخری چٹکی لی اور شعلہ اہو گیا۔

رام سنگھ، غریب نواز اور نہایت کما کی گزشتہ میں تھا۔ مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ سین مر گیا تو رام سنگھ نے پتے سے پوچھا۔ بجا بادی — مر گیا؟

پتے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے نہایت کما اور غریب نواز سے کہا "مجھے مجبور دیکھو یہ میں بھاگ لگا نہیں"۔ پتے کی بھڑ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً توڑ کر چھری کو لٹا دیا۔ مگر کوئی تو سب ملن ہو گئے کہ سالہ سلہ جانے لگا۔ اس نے رام سنگھ کو آڑو کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گئی جہاں ان کو بیان درج کروا دیا گیا۔ اس کے بعد پتہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ دینا تا، پھر عدالت میں مقدمہ کی پوری تھی اس دوران میں بہت دھڑ دھوپ کرتی رہی تھی۔ پتے کے قاتلین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انھیں عدالت ہی نے اس صحت بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے قاتلے میں دیا تھا۔ مگر اس سے کما تھا۔ شیا لکھو اور نہیں جکھے ہوتا ہے پھر چرچا بتاؤ — اور اس نے تمام واقعات میں وہی بیان کر دے تھے کہ سین نے اس کو پٹے بگ سنگھ نواز نے کالہ لچ دیا تھا۔ اس کو خبر بھی ہو سکتی ہے بڑا کٹاؤ تھا اور میں بڑا اچھا گانے والا تھا۔ وہ اس پکڑ میں آکر اس کی شہوانی خواہشات کو پوری کرتا رہا، مگر اس کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اس کا دل دبا دبا رہا اسے لعنت ملا کہ اس نے قاتل کر دیا تھا۔ آخر میں وہ اس قدر رنگ آگیا تھا کہ اس نے سین سے کہہ لی "یا تھا کہ اگر اس نے مجھ سے مجبور کیا تو وہ اسے جان سے مار دے گا۔ چنانچہ دارالت کی رات کو ہی ہوا۔"

عدالت میں اس نے یہی بیان دیا۔ مگر وہ قاتلین ہی آنکھوں میں آنکھوں وہ رام سنگھ کو دلا اور قاتل ہی کی گھبراہٹ میں جو سب سے کسو۔ ہر جگہ ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے ہاتھوں نے خون کیا ہے۔ مگر ایک کس جسیر کا۔ ایک خباثت کا۔ ایک غیر فطری سودے کا۔

رام سنگھ نے بڑی سادگی، بڑے جھوٹے اور بڑے مصدومانہ انداز میں سلسلے واقعات بیان کیے، جیسے یہ اس قدر تازہ ہوا کہ

اس نے دام سنگھ کو بری کر دیا۔ چٹے نے کہا اُس جھوٹے زلف نہیں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے — اور اس کا سر چیری بڈھی لگی کے سر ہے آ

پڈے نے مجھے اس جلسے میں بلایا تھا جو دام سنگھ کی رہائی کی غرض میں سعیدہ کا بیچ والوں نے کیا تھا۔ مگر میں مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ اہل بلوچہ ٹھیکیل اور عقیل دونوں ملاہیں سعیدہ کو کھینچ آ گئے تھے۔ باہر کی فضا بھی اس کی ذاتی نظم کینٹی کی تباہیوں سے اس ذاتی فضا اب وہ پھر اپنی پرانی نظم کینٹی میں کسی اسٹنٹ کے اسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس اس سرایہ میں سے چند سواقی بچے ہوئے تھے جو انھوں نے اپنی نظم کینٹی کی فضاؤں کے لیے فراہم کیا تھا۔ پڈے کے مشورے پر انھوں نے یہ سب دو پیڑ چلے کو کامیاب بنانے کے لیے دے دیا۔ پڈے نے ان سے کہا تھا، اب میں چار بیگ بٹی کر دو عاکروں کا گروہ تھا دی ذاتی نظم کینٹی فوراً کھڑی کر دے۔

پڈے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں دن کترے نے خراب پی کر نکلات معمول اپنے سالے باپ کی تعریف دیکر اور نہ اپنی خود صورت جی کا ذکر کیا۔ غریب کو اڑنے کی بجائے کی فوری ضروریات کے پیش نظر اس کو دو سو روپے قرض دیے اور نجیت کا دوسرے اس نے کہا تھا، تم ان بچاری لڑکیوں کو یونہی جھالے نہ دیا کرو۔..... ہو سکتا ہے کہ تمھاری نیت صاف ہو، مگر بچنے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی۔..... کچھ نہ کچھ مے دیا کرو؟

میں نے اس جلسے میں دام سنگھ کو بہت پیار کیا اور سب کو یہ مشورہ دیا کہ اُسے گھرواپس جانے کے لیے کہا جائے چنانچہ میں فیصلہ بنا اور دوسرے روز غریب فوراً نے اس کے شکست کا بندوبست کر دیا — خیر میں نے سفر کے لیے اس کو کھانا پکا کر دیا۔ بیٹھن پر سب اس کو چھوڑ لے گئے۔ میری چلی تورو دیر تک ہاتھ بلاتے رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں جب مجھے ایک ضروری کام سے نکلنے جا رہا تھا۔ سعیدہ کا بیچ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم تھا کہ وہ ایسا چڑاؤ ہے جس کی شکل و صورت بڑو یا قانلوں کے ٹھہرنے سے بھی تعبیر نہیں ہوتی۔ وہ کچھ دوسری جگہ تھی جو اپنا خفا خود ہی پرکھ دیتی تھی۔ میں جن روز وہاں پہنچا، خیر نی بٹ دی تھی۔ خیر میں کے گھر ایک اور لوکا ہوا تھا۔ دن کترے کے ہاتھ میں ٹیکس کا ڈبہ تھا۔ ان دنوں یہ بڑی شکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کے لیے کیس سے دو پیدیا کیے تھے۔ ان میں سے ایک وہ خیر میں کے گروا تینڈہ لاکے کیلئے لے آیا تھا۔ پڈے نے آخری دو لڈو اس کے غرض میں ٹھونسے اور کہا کہ ٹیکس کا ڈبہ لے آیا ہے۔ بڑا کمال کیا ہے تو نے..... اپنے سالے باپ اور اپنی سالی بیوی کی دیکھنا، ہرگز کوئی بات نہ کرنا۔

دن کترے نے بڑے سوجھ بوجھ کے ساتھ کہا سالے، میں اب کوئی پتہ نہیں..... وہ تو واسطہ لاکرتی ہے..... ویسے باقی گاؤ..... میری بیوی بڑی جیڑھم ہے.....

چٹے نے اس قدر بے تحاشا تعجب لگایا کہ ذی کترے کے کچھ کچھ کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد چٹوہ غریب بلوچہ اور نجیت کا دوسرے جھوٹے جھوٹے اور اس کمانی کی باتیں شروع ہو گئیں جس میں اپنے بڑو نے انھوں کے ذریعے سے وہاں کے ایک پڈو اور سر کے لیے

گھر ہاتھ۔ پھر کچھ دیر شیریں کے فرائید و لذت کے کام مقور ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے گریڈ سے کو پسند نہ آئے۔ آخر میں نے کہا کہ جاکر یہ پیش یعنی سیدہ کا بیچ کی رعایت سے کڑا مولود مسود ہے۔ اس بچے مسود نام بہتر ہے گا۔ ہڈ سے کو پسند نہیں تھا لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔

اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ چٹھہ، غریب فزان اور نجیت کمار تینوں کی طبیعت کسی قدر عجیب تھی سی تھی میں نے سوچا شاید یہ خراس کے موسم کی وجہ سے ہے۔ جب کوئی خواہ مخواہ تھا کڑاٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا نیا بچہ جس میں نجیت کمار کا باعث ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ سین کو تھل کی ٹریچڈی..... معلوم نہیں کیا وجہ تھی..... لیکن میں نے یہ قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب مسودہ تھے۔ بظاہر ملتے تھے، بدلتے تھے، مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔

میں پر حیات نگر میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے گھر میں کمانی کھتا رہا۔ یہ مصروفیت پورے سات دن جاری رہی، مجھے بہادر خیال آتا تھا کہ اس دوران میں ہڈ سے نے ضل اندازی کیوں نہیں کی۔ لیکن کڑے بھی کیوں غائب تھا۔ رنجیت کمار بھی کڑے کوئی اتنے مرام نہیں تھے کہ وہ میرے پاس آتی نہ آتا۔ غریب فزان کے متعلق میں نے سوچا تھا کہ شاید جیو دیا ہو چلا گیا ہو۔ اور میرا بڑا فلموں کا ساتھی اپنے نئے فلم کی بیرونی سے اس کے گھروں اس کے بڑی بڑی مچھلیوں والے غلوں کی موجودگی میں عشق و راز کے مستم ہادہ کر رہا تھا۔

میں اپنی کمانی کے ایک بٹے دلچسپ باب کا منتظر نہ رہتا کہ وہ ہاتھ کا چٹھہ بلائے گا۔ کمانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا "اس کو اس کا تم نے کچھ وصول کیا ہے؟"

اس کا اشارہ میری کمانی کی طرف تھا جس کے ساتھ میں نے دوسری قسط میں نے دوسرے وصول کی تھی۔ "ہاں....."

"سہ ہزار روپیہ لیا ہے؟"

"کمال ہے یہ ہزار ۹۹ کتا ہوا چٹھہ میرے کوٹ کی طرف بڑھا۔"

"میری جیب میں؟"

ہڈ سے نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سوسو کے چار نوٹ نکالے اور ایک سے کہا "آج شام کوٹھی کے ہاں بیٹھ جانا۔"

ایک پارٹی ہے؟

میں اس پارٹی کے متعلق اس سے کچھ دریافت کرنے ہی والا تھا کہ وہ چلا گیا وہاں فساد کی وجہ سے چند روز پہلے اس میں محسوس کی تھی بدستور ہرجو مچی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا۔ میں نے اس کے متعلق سوچنا چاہا کہ وہ راز خانہ کا دل نہ بڑا۔ کمانی کے دلچسپ باب کے نظر آئے اس میں بڑی طرح پینسا تھا۔

اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کی بیوی سے رخصتی میری کی باتیں کر کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سداۓ ہو کر سات بجے سعیدہ کو گلی پہنچا۔ گاج کے باہر انگلی پر لگیے گیلے پر تڑے ٹکڑے رہے تھے ہڈ کے پاس ایل برادران شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گاج کے ٹاٹ کا پودہ جٹا ہوا تھا اور شیریں ادا سے غالباً ٹی کی باتیں کر رہی تھی مجھے دیکھ کر وہ ٹپ

ہو گئے۔ میں نے ہڈے کے متعلق پوچھا تو قیقل نے کہا کہ وہ ملی کے گھر مل جائے گا۔

میں وہاں پہنچا تو ایک غور پر ہاتھ سب تلخ رہے تھے۔ غریب لوگوں کی کے ساتھ رنجیت کا، کرتی اور ایلما کے ساتھ اور وہ کترے جھینکا کے ساتھ۔ وہ اس کو کھٹا کلی کے مدرے بنا رہا تھا۔ چٹوہلی کو گود میں اٹھائے بھڑک دھڑک رہا تھا۔ سب ننھے تھے۔ ایک طرف ان کا بچا ہوا تھا جس میں اندر داخل تھا تو سب سے پہلے ہڈے کے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد دوسری اندر میں بدیشی آوازوں کا ایک گور سا پیشاب جس کی گونج روتھک کانوں میں سرسرا رہی تھی بڑے تپاک سے ملی۔ ایسے تپاک سے جو بے لکھنی کی زندگ جڑھا ہوا تھا۔ بیرا ہاتھ پہنے ہاتھ میں سے کاس نے کہا، کس کی ٹوٹ رہا؟

لیکن اس نے خود ہی میرا ایک گال چوم لیا اور گھسیٹ کرنا چنے والوں کے جھرمٹ میں لے گئی۔ چٹوہ ایک دم پکڑا بند کر کے اب شراب کا اندر چلے گا۔ پھر اس نے نوکر کو آواز دی، اس کاٹ لیش کے خنزروے — دس کی کئی بول لاؤ، اس کاٹ لیش کا خنزروہ نئی بول لے آیا۔ ننھے میں دھت تھا۔ بول کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور پکھلا چڑھ گئی۔ مٹی نے اس کو ناخوشا چاہا تو پٹکے نے ٹوک دیا اور کہا ایک بول لٹو ہے مٹی — جانے دو، یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔

اصل ایک دم سوئی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی ہڈے سے اس لہائی افسوس کو اپنے ہتھکوں سے درجیم پریم کر دیا۔ نئی بول آئی۔ ہر ایک بول میں لائبریل پیگ ڈالا گیا۔ ہڈے نے بے ربطی تقریر شروع کی ٹیڈر زائینڈر ٹنٹلیں۔..... آپ سب ختم میں جائیں۔..... منٹو ہمارے درمیان موجود ہے۔ برنٹم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی قصبات کی — وہ کیا کہتے ہیں یعنی تربی گراؤ میں اجڑتا ہے۔..... گرہیں کتابوں کو کہ کس ہے۔..... کنزٹن میں اترنے والے۔..... کنزٹن میں اترنے والے۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا، افسوس کر یہاں کوئی ہندستوڑ نہیں۔ ایک جیداً باہی ہے جو قات کو خات کرتا ہے اور جس سے دس برس چیکے ملاقات ہوتی ہو کہ گاہر سوں آپ سے ملا تھا — لعنت ہمارا اس کے نظام جیداً باہر جس کے پاس کئی لاکھ شین سونا ہے، کوڑا باہر ہمارا ہے، لیکن ایک کی نہیں۔..... ہاں۔..... وہ کنزٹن میں اترنے والے۔..... میں نے کیا کہا تھا کہ سب کو اس ہے۔..... پنجابی میں جنہیں ٹوہے کہتے ہیں۔..... وہ غولہ لگنے والے وہ اس کے مقابلے میں انسانی نفسیات کو بڑھاتا ہتر گھتے ہیں۔..... اس لیے میں کتابوں۔.....

سچے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ چٹوہ چھپا۔ سب سازش ہے — اس منٹو کی سازش ہے۔ ورنہ میں نے ہر ٹھکر لٹن تم لوگوں کو مردہ باد کے خبرے کا اشارہ کیا تھا۔..... تم سب مردہ باد۔..... لیکن پہلے میں۔..... میں۔..... وہ جذباتی ہو گیا۔ میں۔..... جس نے اس رات اس۔..... سانپ کے پیٹ کے کچھروں ایسے رنگ والے ہاوں کی ایک ڈکی کے لیے اپنی لی کو ناراغ کر دیا۔..... میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جوان سمجھتا تھا۔..... لیکن نہیں۔..... اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی کی قسم۔ ایک ہی بوسے میں پلیٹنم جوتس کے کنارے کا حق میں اپنے ان سولے سولے ہونٹوں سے چوس سکتا تھا۔..... لیکن یہ ایک۔..... یہ ایک نامنا سب حرکت تھی۔..... وہ کم عمر تھی۔..... آئی کم عمر، آئی کم عمر۔ آئی گیر کھڑ میں۔..... اتنی۔..... اس نے میری طرف سوا میری نظروں سے دیکھا، بتاؤ یاد رہے اور وہ اندر سے باہر میں کیا کہیں

گئے..... بیکریٹر میں..... بیلز زائندہ نہیں..... وہ اتنی چھوٹی، اتنی کمزور اور اتنی لاچار تھی کہ اس بات کو گلوہ میں نہ لے سکتی ہو کہ یہ تو وہ ساری عمر چھپاتی رہتی، یا اسے قطعاً بھول جاتی..... اسی چند گھنٹوں کی لذت کی یاد کے سوا کچھ نہیں کاسلیقہ اس کو قطعی طور پر دے آ..... مجھے اس کا ذکر ہوتا — اچھا ہوا اگر مئی نے اُس وقت میں وہ حق باتیں نہ کہہ دیا..... میں اب اپنی جگہ اس بند کرتا ہوں۔ میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چٹری تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر تجھ سے کچھ بولا نہیں ہوا..... میں ایک پیگ ادھیٹا ہوں۔“

اس نے ایک پیگ ادھیٹا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد میں خاموش رہے۔ مئی نے معلوم کیا سوجھ بوجھ، غماز اور شرم کی شہوں کے نیچے اس کی جھڑپیں بھی دکھائی دیتا تھا کہ خود فکر میں مبتلا ہوئی ہیں۔ بوسے کے بعد پتہ جیسے نکالی سا ہو گیا تھا۔ دھرا دھرا دھرا گھوم رہا تھا، جیسے کوئی چیز کھونے کے لیے ایسا کوڑھوٹا دھوٹا رہا ہے جو اس کے ذہن میں ابھی طرح محفوظ ہے۔ میں نے اس سے ایک بار پوچھا کیا بات ہے چٹے؟

اس نے تھکے لگا کر جواب دیا کچھ نہیں..... بات یہ ہے کہ آج وہ کسی میرے دماغ کے چتر ٹول پر جہاں کہتے نہیں ادھیٹا۔ اس کا تھکے لگا رہا تھا۔

وہ کثرت نے قبیلہ کو اٹھا کر مجھے اپنے پاس بٹھایا اور دھرا دھرا دھرا کر کے باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا لائق آدمی تھا۔ ایسا بارہو نم بھانا تھا کہ لوگ دم بخود ہو جاتے تھے۔ پھر اس نے بھگت دیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ کبھی سی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی لیں کہ اس سے بیاہ دی تھی، بنگالی بوزک ڈانڈا کڑیسیں کی بات نکلی تو اُس نے کہا ”فطر منڈ — وہ ایک دم جھٹک آئی تھا.....“ کہ تھا میں خاص صاحب جیڈا کریم خاں کا شاگرد ہوں..... بھوٹے بالکل بھوٹے..... وہ تو بنگالی کے کسی جھڑکے کا شاگرد تھا.....“

گھڑی نے وہ بوجھائے۔ چٹے نے جھڑپا بند کیا۔ کئی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور بڑھ کر دن کترے کے کھڑے ایسے سر پر دھپتا مار کر کھاس بند کر کے..... اٹھ..... اور کچھ گار..... لیکن خبردار اگر تو نے کوئی پکا رنگ لایا۔“

وہ کترے نے فوراً کاٹا شروع کر دیا۔ آواز بھی نہیں تھی۔ مگر کبوں کی ٹوک چاک۔ واضح طور پر اس کے گلے سے نینر نکلتی تھی۔ لیکن جب کچھ کاٹا تھا، پورے غلغلے سے کاٹا تھا۔ بالکل اس نے اُس نے اوپر نئے دوتیں گانے منائے جن سے فضا بہت اُٹاس ہو گئی۔ مئی اور پتہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظریں کسی اور سمت بٹھا بیٹھے تھے..... غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ چٹے نے زور کا تھکے بند کیا اور کٹا چھوڑا۔ باوا والوں کی آنکھ کا شاد بہت کمزور ہوتا ہے..... موقع بے موقع چمکنے لگتا ہے۔“

غریب نواز نے اپنے آنسو روپے اور ایلہ کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ وڈن کترے نے گاروزن کے تھوسے پر دھکا دے کر کھسوٹی لگا دی۔ گھیس ہوئی ٹیوں بجنے لگی۔ چٹے نے مئی کو پھر گد میں اُٹھایا اور کوڑو کو دھکا دے کر شاد بٹھانے لگا۔ اس کا ٹھیکہ لگ گیا تھا۔ ان میڈیٹوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقعوں پر اُدھے سروں میں گا گا رہی آواز کا ناس مار رہی ہیں۔

اس پھیل گواہ پرچم و جواہر میں چار نک گئے تھے ایک دم خاموش ہو گئی، پھر اُس نے چڑے سے غلطی ہو کر کہا "میں اب ختم؟" چڑے نے تو اس سے نہ ٹکایا، اسے خالی کر کے ایک طرف پیونک دیا اور کچھ سے کہا "چلو منو چلیں آ" میں نے اُس کو کمری سے اجازت یعنی چابی کر چڑے نے مجھے اپنی طرف گھبراتے دیکھا۔ آج کوئی اور رات نہیں کے گا؟ ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے وہی کُترے کے دو فکی آواز سنی میں نے چڑے سے کہا "بھروسہ رکھیں کیا بات ہے؟" گھروہ مجھے دیکھ کر اُٹھے۔ اُس سارے کی آنکھوں کا شامہ زمینی خراب ہے؟

مٹی کے گھر سے سعیدہ کا شیج بالکل نزدیک تھی۔ راستے میں چڑے نے کوئی بات نہ کی۔ سونے سے پہلے میں نے اُسے اس عجیب و غریب پادشہ کے متعلق استفسار کرنا چاہا تو اُس نے کہا مجھے سخت یاد آ رہی ہے اور بستر لیٹ گیا۔ صبح اُس طرح غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا غریب فوڈنگ کچ کے کٹاٹ کے ساتھ ٹنگ کو کھڑا ہے، اور مور ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھا تو وہاں سے بٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس سے روئے کی وجہ دریافت کی تو اُس نے کہا "مٹی چلی گئی" "کہاں؟"

"معلوم نہیں؟" یہ کہہ کر غریب فوڈنگ نے سرنگ کاٹ کر دیا۔ چڑہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لکے کے لیے بھی نہیں سہا تھا، میں نے اس سے مٹی کے بارے میں پوچھا تو اُس نے مسکرا کر کہا "مٹی گئی۔" صبح کی لکڑی سے اُسے پائے چھوڑنا تھا۔ میں نے پوچھا "مگر کیوں؟"

چڑے کے لیے میں مٹی ان گنتی حکومت کو اس کی اور میں پسند نہیں تھیں۔ اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی اس کے لکڑی خفلیں اس کی نظریں قابل اعتراض تھیں۔ اس لیے کہ پولیس اس کی شخصیت اور محنت بطور مثال کے مینا پاتا تھی۔ وہ اسے مان کہہ کر ایک دلا کا کام لینا چاہتے تھے۔ ایک طرح سے اس کا ایک کیس زیر تفتیش تھا۔ آخر حکومت پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہو گئی اور اس کو توبہ کر دیا۔..... خیر بد کر دیا۔..... وہ اگر توبہ کر دیا۔..... اس کا بد سوسائٹی کے لیے منسلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے تھا۔ پوئے کی مظلومت سے یہ کہوں گا کیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور جہاں چاہو وہاں رہو۔ چڑے نے اُسے نذر کا ہتھکڑی لگاوا اور تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اُس نے بڑے جذبات جھڑپے میں کہا "مجھے افسوس ہے مگر وہ اس مظلومت کے ساتھ ایک مٹی کا کینہ کی طرح گئی ہے جس نے اس بات میری ایک ٹپری غلطی جسے رنگ کو میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا۔" "لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہیے۔" وہ پوئے سے چلی گئی۔..... مجھ ایسے ہوں میں مٹی کی نیچا اور غلط تر لگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی۔..... میں اپنی مٹی ان کے سپرد کرتا ہوں۔" فوڈہ بادھی۔..... زندہ باد! — چلو غریب فوڈنگ کو سناؤں۔ وہ دیکھ کر اس نے اپنی جہاں بھگان کر لی ہر گز۔ ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا شامہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ وقت بے وقت گھٹنے لگتا ہے؟

میں نے دیکھا، چڑے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مشقوں کی لاشیں۔ (زیریں میں سے)

بابو گوپی ناتھ

بادگونی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں یحییٰ کا ایک بھتیجا ولید چھوٹا سا بچہ تھا۔ ولید نے اپنے دوستوں کے ساتھ داخل ہو کر اس وقت ٹیڈ کھڑا تھا۔ سیٹھ نے اپنے مخصوص انداز میں تجویز دے دی تھی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت سے میری ملاقاتوں کا ایک بھتیجا ولید چھوٹا سا بچہ تھا۔ ولید نے اپنے دوستوں کے ساتھ داخل ہو کر اس وقت ٹیڈ کھڑا تھا۔ سیٹھ نے اپنے مخصوص انداز میں تجویز دے دی تھی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت سے میری ملاقاتوں کا ایک بھتیجا ولید چھوٹا سا بچہ تھا۔

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینٹون نے حسبِ عادت میری قمریوں کے ہل مادے سے شروع کر دیے۔ بالوگرنی تاتھ۔ تم ہندوستان کے کفریوں کا نمونہ ہے۔ ہاتھ ملانے سے تو مرثیہ تختہ پر رہتا ہے، لوگوں کا ایسی اس کٹنی نہیں ملتا ہے کہ کیفیت ملان ہو رہا ہے۔ بچے دونوں دو کیا چٹکلا کھا تھا اپنے منٹو صاحب ہنس غور شید نے کہا غریبی، اللہ ڈاکار سا ہے کیوں بالوگرنی تاتھ۔ ہے نہ غریبی بھٹی لڑی

خبردارم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل برا لاشعاً کھنٹی نیوٹلی۔ حضرت تھنہ اور انڈی سیٹی پراہے افغانڈاؤس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ باؤگرنی نام کی طرف منسوب تھا جو بہت محبوب تھا۔ آہا۔ آپ ہیں باؤگرنی نام۔ بڑے خانہ خواب۔ لاہور سے جھک۔ اترتے اترتے بھی قشر لین لائے ہیں۔ ساتھ ٹھیکیر کی ایک کھیت تھی۔ باؤگرنی نام تھا مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعلیم کو کافی سمجھ کر کہا: "بیویوں بے وقت ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے شکا شکایہ جوتے ہیں۔ میں موت باتیں کر کے ان سے ہر روز پوسن بڑے کے دوپکیٹ وصول کرتا ہوں بس منٹو صاحب۔ یہ سمجھ لیجئے کہ بڑے انٹی ٹرینسٹیں قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے ٹیٹ پر ضرور تشریف لائیے۔"

باور کوئی ناتھ نے جزد معلوم کیا سوچ رہا تھا چونکہ کر کہا: "اے ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب۔" پھر سینڈو سے روجھا۔ کیون سینڈو کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں۔"

عبدالرحیم سینڈھو نے زور سے تنہد لگایا۔ اسی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آجنگا میں بھیجی جی
 ٹھہرا کر دی ہے۔ اس لیے کہ ٹھٹھٹھ ہے!

سینڈو نے مجھے غلیٹ کا پتہ دکھا دیا۔ جہاں میں حسبِ وعدہ شام کو کچھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا غلیٹ تھا جس میں بالکل نیا فرنیچر سجایا ہوا تھا۔ سینڈو اور گپل انعام کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں، جن سے سینڈو نے مجھے معارف کرایا۔

ایک تھا خفاہ سائیں، خمد پوش، چوب کا ٹیٹ سائیں لگے میں موٹے موٹے دافوں کی ۱۱ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا۔ آپ باورگرنی ناقد کے لیکل ایڈوکرز ہیں، میرا طلب کچھ ہوتا ہے۔ آپ ہزاروں میں کی ناک بھی ہر ایس کے منہ سے لعاب نکلتا ہو۔ بنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا دوش بن جاتا ہے۔ یہ بھی اس پہلے سوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے باورگرنی ناقد کے ساتھ آئے ہیں۔ کیونکہ انھیں وہاں کوئی اور جوتوف ملنے کی سہولتیں تھیں۔ یہاں آپ باجو صاحب کے کریوں نے کے سرگٹ اور سکارج دسکی کے پاک پی کر دھا کرتے رہتے ہیں کہ انھام نیک ہو۔

خفاہ سائیں یہ سخن کر سکتا تھا۔

”سرے مرکا نام خفاہم علی، لیا تہ نگا جمان، کمر قی بدن، منہ پر چھپک کے داغ، اس کے متعلق سینڈو نے کہا یہ میرا شاعر ہے، اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک ناکی طرافت کی کنواہی لڑکی، سر برعاشق ہو گئی، بڑی بڑی کنواہی زیر لیلیاں ملائی لیکیں، اس کو بھانسنے کے لیے، مگر اس نے کہا ٹو لوٹو دانی، جس ٹکٹ کا پکار سوں گا، ایک کے لیے میں بات چیت دیتے ہوئے باورگرنی ناقد سے ملاقات ہو گئی، میں اس دن سے ان کے ساتھ رہتا ہوں۔ ہر روز کریوں نے ہاؤس اور کھا اپنا مقدر ہے۔ یہ بھی کونام علی بھی سکھاتا رہا۔

گولی ہرے والی ایک شہرہ و سجدہ صحت تھی، کمرے میں داخل ہونے میں ہر گز گھبراہٹ نہ تھی، جس کے متعلق سینڈو نے فرمائیں، ذکر کیا تھا، بہت صاف، صحت خیر، صحت تھی، بال بچھوٹے تھے، یہ لگتا تھا، کچھ برے ہیں، مگر وہ حقیقت ایسا نہیں تھا، آنکھیں خشک اور چکلی تھیں، چہرے کے خطوط سے صاف ناہر ہوتا تھا کہ بے مدد نظر ہوتا، تجربہ کار ہے، سینڈو نے اس سے تعاف کراتے ہوئے کہا، نرسٹ رنگ۔ باجو صاحب پیار سے زیر کرتے ہیں۔ ایک بڑی ٹرانٹ، ناگہان ٹیمپو سے یہ سب ٹوڑ کر لاہور لے آئی۔ باورگرنی ناقد کو اپنی سی آئی ٹی سے پتہ چلا اور ایک رات لے آئے۔ مقدمے پڑی ہوئی، تقریباً دو مہینے تک پوسٹ میں کئی ہی آخر باجو صاحب نے مقدمہ ترجیت دیا، اور اسے یہاں لے آئے۔ وطن تھنہ آ

اب گھر سے سافو نے رنگ کی صحت بانی، مگر تھی جو ناموش بھی سرگٹ پی رہی تھی، آنکھیں سرخ تھیں، جسے کافی بیچائی مرشح تھی۔ باورگرنی ناقد نے اس کی طوف اظہار کیا اور سینڈو سے کہا، اس کے متعلق بھی کچھ سوچا ہے۔

سینڈو نے اس صحت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا، بنجاب یہ ہے، نیمہ بڑی، غل غل قویٰ، مسرعدہ الرحیم سینڈو صحت مزار رنگ۔ آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں، سن چھتیس میں مجھ سے ملتی رہا۔ دو برسوں ہی میں میرا وطن تھنہ کر کے بکھریا، لاہور چھوڑ کر چلا گیا۔ باورگرنی ناقد نے اسے یہاں بلوایا ہے تاکہ میرا دل ٹکڑے۔ اس کو بھی ایک ڈوبہ کریوں نے کالاش میں ملتا ہے ہر روز شام کو حافی روپے کا مورچا کا انگلیشی لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ گرویسے بڑی ٹٹ فورٹیت مٹم کی صحت ہے۔

سردار نے ایک ادا سے صحت انا کہا، جو اس ذکر اس میں پیشہ و صحت کی بناوٹ تھی۔

سب سے تعاف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پُل باز سے شروع کر دیے ہیں نے کہا

چھوڑو، بار آؤ کچھ باتیں کریں۔

سینڈرو چلا یا۔ جو آئے۔ وہ سکی اینڈ مسٹوان۔ بابو گرنی ناتھ لگا تو جوا ایک منبر سے کہہ۔
بابو گرنی ناتھ نے حبیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندا نکالا اور ایک نوٹ سینڈرو کے حوالے کر دیا۔ سینڈرو
نے نوٹ لے کر اس کی طرف رخ سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا۔ او کوڑو۔ اور سر سے رب احاطہ لیں۔ وہ دلی کب آئے
گا جب میں بھی اب لگا کروں نوٹ نکال کروں گا۔ جاو جی غلام علی، دو پونیس جالی واکر شل گزٹنگ سٹرنگ کی لے آؤ۔
توئیں انیس تو سب نے پتیا شروع کیں۔ یہ شعل و تمیں گھنٹے تک جا رہا۔ اس دوران میں سب نے زیادہ باتیں حبیب
معمول عبدالرحیم نے کہیں پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ پتیا با۔ و سٹرن ٹخنہ منٹو صاحب وہ سکی ہو توئیں جلتے سٹار کر
پریش میں انقلاب زندہ باد گھنٹی بج گئی ہے۔ جیر بابو گرنی ناتھ چوہ۔

بالوگرنی نامتھ بے چارہ غلاموں دبا کجی کھی البتہ وہ سیٹھ دی ہاں میں ہاں ملاوتیا تھا میں نے سوچا اس شخص کی انہی باتے کوئی نہیں ہے۔ وہ سراجو کھی گئے ان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقاد ہی کا ثبوت غلام سائیں موجود تھا جسے وہ قبول سیٹھ اپنا بھل ایتھ اندر بنا کر لایا تھا۔ سیٹھ دی کا اس سے دراصل یہ طلب تھا کہ بالوگرنی نامتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ لوں میں مجھے وہ ران گھنگو میں معلوم ہوا کہ اب میری اس کا اکثر وقت فقیروں اور مددیشوں کی صحبت میں گذرتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھورا کھوڑا سا تھا۔ جیسے وہ کچھ سوج رہا ہے۔ میں نے چاہا پھر اس سے ایک بار کہا۔ بالوگرنی نامتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی ہیں۔ میں — کچھ نہیں۔ یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔

ان حسینوں کے شعلیں سوج رہا ہوں — اور میں کیا سوچ رہی ہوں۔

سینٹھو نے کہا: "بڑے شہزادے خراب ہیں یہ منٹو صاحب۔ بڑے شہزادے خراب ہیں۔" لاہور کی کوئی ایسی طاقت نہیں، جس کے ساتھ باوجود صاحب کی کھٹی نینٹول نہ رو جی ہو۔

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے جھوٹے افسار کے ساتھ کہا: "اب کریں وہ دم نہیں مٹو صاحب۔"
اس کے بعد وہابیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طرف افسوس کے سب گھرنے لگے۔ کون ڈیرہ واریسی ہو گئی تھی؟
کون کس کی فوج کی تھی؟ نہتھی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا راتھا ڈیرہ واریسی؟ یہ انگٹو سرکار و سینڈو، مختار سائیں اور غلام علی کے لڑے ہوئے
ہوئی رہی۔ تحیث لاہور کے کوٹھوں کی زبان ہیں۔ مطلب تو یہی بھٹارہا۔ مگر بعض اسطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر ہنس کر اڑتی۔ مگر عجیبے ایسا محسوس ہوا کہ اسے اس محفل سے کوئی بھی نہیں تھی۔ ہلکی دھڑکی کا ایک گلاس بھی پیرا بغیر کسی دھڑکی کے۔ سکرٹ بھی بیٹھی تھی تو معلوم ہوتا تھا، اُسے قبا کو اس کے دھڑکی سے کوئی وجہ نہیں، لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سکرٹ اسی نے پیسے۔ بابو گولی ناتھ سے اُسے جھگڑا تھی، اس کا بڑا چھچھو کسی بات سے شلا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گولی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لیے ہر سامان مہیا تھا لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا گھنچا تھا یہ اس مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ دُشے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب مولانا کا مسجد کے پاس چلی گئی کیونکہ اسے مولانا کا انجکشن لینا تھا بغیر اس میں نہیں چکے پینے کے بعد اپنی تیس آٹھ گز غلامیں پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوش سے کھانا لینے کے لیے بھیج دیا گیا سینڈیٹھ نے انہی دو چپ بکواس جب کچھ حصے کے لیے بند کی تو باؤگرنی ناخدا سے جواب فٹے میں تھا زینت کی طرت وہی عاشقہ زنگاہ ڈال کر کہا۔ منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

میں نے سوچا کیا کموں زینت کی طرت دیکھا تو وہ جھینپ گئی میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ جڑانیک خیال ہے۔
باؤگرنی ناخدا خوش ہو گیا۔ منٹو صاحب جے بھی ٹری نیک لوگ خدا کی قسم ذلیل کا شوق ہے کسی اور چیز کا نہیں نے کئی بار کہا۔ جان میں مکان بنواؤں ؟ جواب کیا دیا۔ معلوم ہے آپ کو ؟ — کیا کڑوں کی مکان سے کہ میرا کون ہے —
منٹو صاحب موٹر کتنے میں آجائے گی ؟
میں نے کہا۔ مجھے معلوم نہیں ؟

باؤگرنی ناخدا نے فوج سے کہا۔ کیا بات کرتے ہیں منٹو صاحب — آپ کو انکا دلوں کی قیمت معلوم نہ ہو کل چلے میرے ساتھ زینر کے لیے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بیسے میں موٹر جونی ہی چاہیے ۔
زینت کا چہرہ وہ محل سے خالی رہا ۔

باؤگرنی ناخدا کانشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ برقی بنڈیا ت ہو کر اس نے مجھ سے کہا۔ منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں — لیکن آپ مجھے بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈیٹھ نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا۔ مجھے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کئی گفتگویی ہو تو سعادت کر دیجو گا — بہت گوارا دے دی ہوں — دیکھی منگوائی گا آپ کے لیے اور ؟
میں نے کہا۔ نہیں نہیں — بہت پر پیچھے ہیں۔

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا اور مجھ کو منٹو صاحب یہ کہہ کر صوب سے سوسو کے ٹوٹوں کا پلندہ اٹھالا اور ایک نوٹ بٹھا کر نے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لیے اور وہ اس کی جیب میں ٹھونس دیے ۔ سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا ؟

مجھے دراصل کچھ سمجھ نہ تھی کہ باؤگرنی ناخدا سے۔ کتنے آدمی اس قریب کے ساتھ جو تک کی طرح چپے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا باؤگرنی ناخدا بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب سے گر پڑے گا یا —

باؤگرنی ناخدا نے فوراً جھک کر اس میں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے ڈک کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ جوتی میں کسی حرام زادے نے اس کی جیب میں سے سارے روپے نکال لیے۔ باؤگرنی ناخدا میری طرت دیکھ کر مسکرایا پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب نکالا اور غلام علی کو دے کر کہا۔ جلدی کھانا لے آؤ۔

پلہنا چھٹے تاقوں کے بعد مجھے باور گئی تاتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ چوری طرح توخیر فساد کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پچھلے لوگ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال کو وہ پرے درجے کا فخر ہے غلط ثابت ہوا۔ اُس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈرو، غلام علی اور سردار و فرخہ جو اس کے مصداق بنے ہوئے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جڑ گیاں گایاں سب سنا تھا لیکن غصے کا انداز نہیں کرتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا: منٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا منظرہ نہ دیکھا ہے۔ جب بھی مجھے کوئی رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انھیں عقلمند سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو ملتی جو مجھ میں ایسی ہے تو ان کو شناخت کریں جس سے ان کا اثر سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے معتبروں اور کجیوں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھ ان سے کچھ محنت ہی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی ٹیکس میں پناہ لیوں گا۔ زندگی کا کوٹھا اور چر کا مراد۔ میں یہ دو ٹیکس میں جاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ زندگی کا کوٹھا تو چھوٹ جاتے گا اس لیے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں ہیں جن میں کسی ایک کے حذر پر چلا جاؤں گا۔

میں نے اس سے پوچھا: زندگی کے کوٹھے اور ٹیکے آپ کو کون پسند ہیں؟

کچھ دیر سوچ کر اُس نے جواب دیا: اس لیے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اُس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے؟

میں نے ایک اور سوال کیا: آپ کو ملوثوں کا لگانا غصے کا شوق ہے کیا آپ مرستی کی سمجھ رکھتے ہیں؟

اس نے جواب دیا: بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کسی سُری سے کسی سُری طوائف کے ہاں جا کر بھی رہتا رہتا رہتا ہوں۔ منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مراد آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اُس کو دکھایا۔ وہ اُسے بیٹھنے کے لیے ایک اور اسے اٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جواب میں اُڑا لیا۔ اس نے تھک کر اُسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضاں فضاں میں ہی باقی ہیں جو ہم ایسے تقاضاں جنوں کو پسند ہیں وہ کوئی نہیں جانتا کہ زندگی کے کوٹھے پر ہاں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کرتے ہیں اور مقبول اور نیکوں میں انسان اپنے خدا سے۔

باور گئی تاتھ کا شجرہ نسب تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے جنوس بیٹے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اُسے دس لاکھ روپے کی جائیداد ملی جس نے اپنی خواہش کے مطابق اثرا شروع کر دی۔ بیٹے آتے وقت وہ اپنے ساتھ بچا پاس ہزار روپے لایا تھا۔ اُس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن بھر بھی ہر روز تقریباً سو سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ فریو کے لیے اُس نے فلیٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ٹیار نو روپے کا لیکن وہ بھی نکلنے ٹاپ کا۔ باور گئی تاتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا، باوا کو اپنی ناتق سے مجھے تو سرت لہری تھی، لیکن اسے ہر کچھ عقیدت ہوگئی تھی یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی باہمت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں ٹیبلٹ بریگ آؤ مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی، مگر شفیق طوسی کو تو شاید آپ کچھ نہیں کہہ سکتے، اس کی آواز سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے کچھ اپنی جدت طراز ٹانگی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ نسخ طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثر بیت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ میں ملکہ بنوں کو بچے بعد وٹرسے تین تین چار بار سال کے وقفے کے بعد واسطہ دنانے سے پہلے اس کا شفیق اس کی ماں سے بھی تھا، یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بھوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی اس لیے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور شوشے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خبر ہر آدمی۔ جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا، چھ سے اچھا کچھ اچھا ہوتا۔ خود سے عذر دیکھا تاکھا یا بغیر اس سے نفیس موٹر رکھی، گلاس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف ہر ایک ایک وٹری بھی خرچ نہ کی۔

حقوق کے لیے، خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں، اس کی بذلہ نسخ طبیعت میں جس میں میرا اثر ان کے مزاج کی جھلک تھی بہت ہی جاذب نظر تھی، وہ کوشش کیے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ جاتا تھا۔

میں نے جب اسے نہیں نہیں کر زینت سے باہر نکلتے دیکھا تو مجھے اس لیے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دلچسپ رہا یا پہنچا کیسے، ایک سینڈو اسے جانتا تھا۔ گوان کی بولی چال تو ایک عرصے سے جند تھی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اسے لایا تھا، ان دونوں میں صلہ صفائی ہوگئی تھی۔

باوا کو اپنی ناتق ایک طرف بیٹھا تھوڑی رہا تھا میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا، وہ سگڑت بالکل نہیں جانتا تھا، غرض شفیق کو میرا اثر ان کے لطیفہ نصاب تھا جس میں زینت کسی قدر کم اور متراست زیادہ دیکھیں گے، یہی تھی شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا، ابوہم اللہ، ہم اللہ کیا آپ کا گھر بھی اس دوا میں ہوتا ہے؟

سینڈو نے کہا، انشرفون نے اپنے عذر ورائیل صاحب یہاں دھڑن تھوڑے؟

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوئی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور مگر شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں جھک کر کچھ اور ہیں کہ یہی ہیں۔ زینت اس غمزے بالکل کوئی تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی غامیوں کو چھپاتی رہی، سوادہ دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے ٹھیکے لکھا اسے کہ باہر چھوڑ کر اپنے چٹھوں کے داد و تحسین کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا، ابھی منسلک طبیعت کی عورت تھی کم گو، سادہ لوح، صاف تھوڑی۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اتنا تو اس میں جھوٹا پن تھا، اس کے علاوہ — پھر لوں گئے کہ

اس بات کا بھی اُس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کوستی تھی۔ شفیق اور سلیقہ آواز کر رہے تھے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے ننگا ہاڑی کے شعلے استعمال کیے کیونکہ لوہا اُس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آسوا گئے اور دوقی دوقی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ باوجود گونی ناخن جو ایک کمرے میں بیٹھا احتیاطی رہا تھا آواز کر تیری سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں میں آنسو سے کہا کہ میں یہ مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد باوجود گونی ناخن کمرے سے باہر نکلا اور اپنے منٹو صاحب کو کمرے لے گیا۔ فریڈ نے ہنگامہ بزمی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو دونوں ہاتھوں سے منڈ صاحبہ کی بیٹ گئی۔ میں اور باوجود گونی ناخن دونوں ہنگامہ کمرے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ باوجود گونی ناخن نے بڑی جلدی کے ساتھ کنا شروع کیا۔ منٹو صاحب مجھے اس حالت سے بہت جنت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بیٹی میں صاحبہ ہے اس بیٹی کی دوسری عمر تین۔ دونوں ہاتھوں سے مجھے قوت کرکھاتی رہیں مگر اس نے بھی ایک زائد میرے لیے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عمرت کے ہاں ہفتوں گزارا تو اس غریب نے اپنا گونی زور دے کر گزارا دیا میں سمجھا کہ آپ سے ایک وفد کرچکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کٹا رہ کٹل ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی گمان ہے میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو میں نے باوجود میں اس کو بہت سمجھا یا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھوں میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے جھکادی ہو نا ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صورت ایک دولت مند کا نہیں میرے بعد تم کسی اور کو نہیں چھوڑ سکتی۔ تو کام نہیں چلے گا۔ یہی منٹو صاحب اس نے میری دشمنی۔ سارا دن غریب زاریوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی ہیں نے غدار سلاش سے مشورہ کیا۔ اُس نے کہا بیٹی بے باور اسے معلوم تھا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا بیٹی میں اس کی دو جانتے والی طوائفیں ایکڑ میں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بیٹی ٹھیک ہے۔ دوسرے بھگتے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو ہر سے بلایا ہے کہ اس کو سب کو سکھائے غدار سلاش سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ باوجود گونی بے عرق ہو گی میں نے کہا تم چھوڑو اس کو بیٹی بہت بڑا شرم ہے۔ لاکھوں روپے میں اس نے انھیں موڑے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی کاش کرو — منٹو صاحب میں تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری دل خواہش ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، اچھی طرح ہوشیار ہو جائے میں اس کے نام آج ہی ہنگامہ میں دس ہزار روپیہ پیش کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باوجود گونی سردار اس کی ایک ایک بات اپنی جیب میں ڈال لے گی — آپ بھی اسے سمجھا دیے کہ چاکل بننے کی کوشش کرے جب سے موڑ خریدی ہے سردار اسے ہر روز شام کو کھانے کو بندے جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سب سے آج بڑی مشکلوں سے غمزدگی کو بردہا لیا ہے۔ آپ کا خیال ہے، اُس کے منتقل ہے

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا لیکن باوجود گونی ناخن نے خود ہی کہہ دیا اچھا کھا آیتا آدمی معلوم ہوتا ہے نہ فریڈ نے بھی ہے — کہیں نہ فرجانی — پسند ہے نہیں؟

فریڈ خاموش رہی۔

باوجود گونی ناخن سے جب مجھے عزت کوشش لائے کی غرض رعایت معلوم ہوئی تو سردار کاغذ پر لکھا۔ مجھے یہیں خدایا کہ بسا بھی ہو

کتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حریت نمود کر دی۔ باہو گولی ناتھ کی دلی آزمودنی کو زینت پہنی جس کی اچھے والدہ آدمی کی داشتہ بن جانے یا ایسے طریقے سیکر جانے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے رو بہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔ زینت سے اگر موت چھٹکار دی حاصل کرنا تو بہت آری تھی مگر اس میں نہیں تھی۔ باہو گولی ناتھ کو کسی بی دل میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی زینت نیک تھی اس لیے اس نے زینت کے مستقبل کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایک ٹرس بنانے کے لیے اس نے کئی جملہ دار کڑیوں کی دونوں میں گھر میں ٹیلیفون لگوا دیا۔ لیکن اوٹ کسی کو نہ بیٹھا۔ محمد شفیع طوسی قلابا ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سامرا ہی سکے۔ باہو گولی ناتھ نے ایک وفد افسوس اور دعا کے ساتھ کنا۔ شفیع صاحب تو خالی خالی منٹیلیں ہی نکالے جھستے دیکھے لیکن بے چارہ کی زینت سے چار چار دیں، چھ تکیے کے خلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے کہ اس کا ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان ٹیپا نے دلال کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی، اس سے پہلے میں نہیں شفیع کی داشتہ ہو چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لیے تھے مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ جو بھگوا کر الماس نے لڑکھا لیا تھا۔

محمد شفیع نے جب آنا مانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا اُسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے میں نے اُسے تلاش کیا لیکن کسی کو اس کا پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک دفعہ اتفاقاً ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی سنت پریشانی کے عالم میں تھا جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت باقی ہے تو اس نے جہاں اب دیا۔ مجھے یہ پیغام اور دونوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کا کل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے۔ — ایسی عورتوں سے جو ہر لون جیسی ٹیکس مجھے کوئی دیکھی نہیں۔

شفیع سے جب ایسی سوتی تو زینت نے مردار کے ساتھ پھرا ڈولو بند رہنا شروع کیا۔ چندہ دنوں میں بڑی خشکوں سے کئی ٹیکس چڑھ چکے تھے بعد سردار نے دوا دی بھانے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ باہو گولی ناتھ نے سمجھا کہ حالات اُمید افزا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے جویریہ کی کپڑوں کی کٹی کا مالک تھا زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جاتے کس کام سے بارہی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے غصے پاتھ کے پاس زینت کی مڑ مڑ کھڑی نظر آئی۔ کچھ نشست پر ٹیکس مچھا تھا۔ ٹیکس بول کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟
 ٹیکس مسکرایا۔ تم جانتے ہو موٹر والی کہ؟
 میں نے کہا جانتا ہوں۔

”تو میں کچھ لو میرے پاس کیسے آئی۔“ اچھی لڑکی ہے یا؟“ ٹیکس نے مجھے انگھڑائی۔ میں کسکا دیا۔

اس کے چوتھے روز باوگرانی ناتھ ٹھیکس پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے طیس کی ملاقات کیے ہوئی۔ ایک شام باوگرانی ناتھ سے ایک آدمی کے سرسوار اور زینت ٹھیکہ بٹلی گئیں۔ وہ آدمی کسی بات پر جھگڑا کر چلا گیا۔ لیکن بول کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

باوگرانی ناتھ مطمئن تھا کہ کوئی دس چندہ روز کی دوستی کے دوران میں نہیں نے زینت کو کچھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی سازبیاں لے دی تھیں۔ باوگرانی ناتھ صاحب یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دن اور گندہ جا نہیں زینت اور طیس کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

ٹھیکہ بٹلی میں ایک کرپھیں عورت نے کمرہ کر لے لیا۔ اس کی جوان لڑکی سوریل سے طیس کی آنکھ لڑ گئی چنانچہ زینت بے جا رہی ہوئی میں بھی دوستی اور طیس اس کی موٹریں سب شام اس لڑکی کو لکھا اور بتا۔ باوگرانی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر بہت ڈکھ ہوا۔ اس نے کچھ سے کہا۔ منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں، بھئی دل چاہا ہو گیا ہے تو صحت کر دو لیکن زینت بھی عجیب ہے اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر اس سے اتنا بھی نہیں کہتی یہاں اگر تم نے اس کو سٹان چھو کر کسی سے عشق لڑا نہ ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو۔ میں کیا کروں منٹو صاحب۔ بڑی شرمیلہ اور تنگ بخت عورت ہے۔ کچھ بھرمیں نہیں آتا۔ نقد و نثر کی سی چالاک کو نہ بنا پایا ہے۔

طیس سے نصیحت کھج جو نے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا باوگرانی ناتھ۔ غلام علی اور غفار ساریں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے۔ دوپہ کا بندوبست کرنے کیونکہ پاس ہزار انچ ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہ گیا تھا کہ اے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اُسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو سردیا کے ٹکڑوں کی ضرورت تھی۔ سینڈ کو پوسٹ کھن کی، چنانچہ دونوں نے تھوڑے کوشش کی اور دو روز میں آدمی پھانس کر لے آئے۔ زینت سے کہا گیا کہ باوگرانی ناتھ واپس نہیں آتے گا اس لیے اُسے اپنی فکر کرنی چاہیے۔ سوسا اور دوپہ روز کے ہو جاتے ہیں جس سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈ دار سردار دیا جیتے۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا تم کیا کر رہی ہو۔

اُس نے بڑے اظہارِ محبت سے کہا مجھے کچھ معلوم نہیں ہے جانی جان رہے لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔

جی یا ہاتھ کر بڑے پاس بیٹھ کر کھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک نہیں۔ سینڈ دار سردار اپنا آئینہ دکھانے کے لیے ٹھیکس پر بھی ڈال لیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا زینت آکھانے والے حد تک بے کچھ، بے انگ اور بے جان عورت تھی اس کم بخت کو اپنی زندگی کی کچھ تدوینیت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں پیسے نہاں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ داندھے کے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر مگڑھ سے، شراب سے، کھانے سے، مگر سے، ٹیلی فون سے، جتنی کہ اُس صوفے سے جی جی پر وہ اکثر بیٹھتی رہتی تھی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابو گرنی ناتھ پورے ایک جیسے کے بعد لوٹا۔ تاہم گیا تو وہاں غلیطہ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باڈن میں ایک جنگلے کا بالائی حصہ کرایہ پر لے لیا تھا۔ بابو گرنی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے پورا پرتیا دیا۔ اُس نے مجھ سے زینت کے حلقوں کو پوچھا جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا لیکن یہ دیکھا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کر رہے ہیں۔

بابو گرنی ناتھ اب کی دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے فنی مشینوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار صاحب کو وہ لاہوری چھوڑ آیا تھا ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گرنی ناتھ نے امرار کیا کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں ہم باغیچہ پہنچ گئے پانی پل پر ٹیکسی پر چڑھی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گرنی ناتھ نے زور سے ہکاوارا سینڈو۔

سینڈو نے جب بابو گرنی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صحت اس قدر نکلا۔ ”دھڑن تختہ“

بابو گرنی ناتھ نے اُس سے کہا ”آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو لیکن سینڈو نے کہا ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجیو، مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔“

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گرنی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اس کے قدموں پر گیا۔ دو رنگ ان میں باتیں ہوتی رہیں جب تک وہیں تو بابو گرنی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا ”واپس لے چلو۔“

بابو گرنی ناتھ نے جواب دیا ”جید آباوندہ کا ایک دولت مند زیندار ہے۔ خدا کو تہنوں خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں ہیں وقت ہر آن پہنچا جو روپے میرے پاس ہیں ان سے ترخہ کا جیڑی جاتے گا۔“ کیوں کیا خیال آپ کا۔“

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا میں سوچ رہا تھا کہ جید آباوندہ کا دولت مند زیندار کون ہے؟ سینڈو اور سردار کی کوئی اصل سازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً جید آباوندہ کا متولی زیندار ہے جو جید آباوندہ ہی کے ایک میوزک شپ کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک شپ زینت کو گانا سنانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا ایک روز یہ پتہ چل گیا کہ غلام حسین دے اس جید آباوندہ کے رئیس کا نام تھا، کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر وارات کی غلام حسین کی پُند و فراکش پر اس نے غالب کی غزل سے

نکتہ نہیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

لکھنؤ سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اُس پر زینت ہو گیا۔ اُس کا ذکر میوزک شپ نے زینت سے کیا بتو اور سینڈو نے لکھنؤ کا معاملہ پکٹا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گرنی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی اس سے مل کر بابو گرنی ناتھ کی خوشی دوئی ہو گئی مجھ سے اُس نے کہا ”منٹو صاحب خراب صورت ہیں ان اور شادی آ رہی ہے۔“ میں نے کہا ”یہ جو بڑے دامانگی بخش کے حضور جا کر دامانگی میں برقعوں ہوتی۔“ بھلائی کسے دونوں خوش رہیں۔

بابو گرنی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زلیو اور دو ہزار کے کپڑے بنوائے اور پانچ ہزار نقد دیے۔

عمر حقیقت طوسی، محمد حسین، پرویز اشرف، گلبدن بٹل، سیٹھ دیو دھرم سنگھ، اور بابو گرنی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دوسرے کی طرف سے سیٹھ وکیل تھا۔

ایک باب و قبول ہوا تو سیٹھ نے آہستہ سے کہا: ”دعوت مختہ!“
غلام حسین سرج کا بیٹا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارکباد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی کافی دیر بعد آدمی تھا۔ بابو گرنی ناتھ اس کے مقابلے میں چھوٹی سی ٹیبلر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خود دو فوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گرنی ناتھ نے مینا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ ندرغ ہوئے تو بابو گرنی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھووائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لیے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے اعزاز میں کہا: ”مسلط صاحب ذرا اند جائیے اور دیکھیے زینو دھو لیں کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔“

میں بدودہ جاکر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زرد لیت کا شلوار کرتہ پہنے تھی۔ — دوڑے بھی اسی رنگ کا تھا جس پر کوٹ لگی تھی چہرے پر ہلکا ہلکا سبک۔ اب تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر پب اسٹیک کی شرمی بہت بڑی معلوم ہوتی ہے۔ مگر زینت کے ہونٹ بچے ہوئے تھے۔ اس نے شرمکے مجھے آداب کیا تو بہت سی باری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسری دیکھی جس پر بچوں ہی قبول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا: ”کیا مسخروں ہی ہے۔“

زینت نے میری طرف بالکل معلوم کبوتری کی طرح دیکھا۔ آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان۔“ اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈھبڑا آئے۔

مجھے اس غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گرنی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے دو بال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا: ”مسلط صاحب میں سمجھتا تھا آپ بڑے بچہ دار اور لائق آدمی ہیں۔“ زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا۔“

بابو گرنی ناتھ کے بصر میں وہ حقیقت ہوا سے مجھ سے تھی زخمی نظروں سے لیکن شیشے کے کریں اس سے صفائی مانگوں اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا: ”خدا تمہیں خوش رکھے۔“

یہ کہہ کر بابو گرنی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی۔ — بہت ہی دکھ بھری ملامت اور چلا گیا۔

(”چند“ میں سے)

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہاں ہار چھاؤنی میں تھی، جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس چندرہ پہنے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گھنٹوں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کلہو بارہ چلا تو ایک دن اُس نے اپنی پڑوس میں رہنے والوں سے کہا: ”دس سیف — ویری بیڈ۔ یعنی یہ زندگی بہت بُری ہے جبکہ کھانسی کو نہیں ملتا۔“

انبار چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے ٹولہ سہی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہیں چاکلٹنٹوں میں سے آٹھ دس گوروں کو نہا کر بیس بیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی بھروسہ نہیں آتا تھا۔ لہذا ان کی زبان سے یہ لاطینی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے پکار دلات چاہتے، تو وہ سر ہلا کر رو پار کرتی تھی۔ صاحب ہلاری بھی اس بھروسہ ہی بات نہیں آتا، اور وہ اس سے خدمت سے زیادہ چھڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ دوسرے میں اس کے منہ کی طوط دیکھتے تو وہ ان سے کہتی: ”صاحب تم ایک دم اٹو کا پٹھا ہے۔ حرازوہ — مجھا تیرہ کہتے دنت وہ اپنے بھروسہ میں سختی پیدا کر کرتی۔ بلکہ بڑے ہیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی — گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل اٹو کے پہنے دکھائی دیتے۔“

گروہاں دہلی میں وہ جبکہ آئی تھی۔ ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین چھٹاس کو چند دستان کے اس شعر میں رہتے ہوئے تھے جہاں اس نے منہ تھا کر ٹپسے صاحب رہتے ہیں۔ جو گروہوں میں شعلے جاتے ہیں صرف چھ آدھی اس کے پاس تھے۔ صرف چھ، یعنی چھٹے میں دو۔ اور ان چھ کا جو کہ اس سے اس نے مذاکرے تو سارے اٹھارہ روپے دس روپے کے تھے۔ تین روپے سے زیادہ ہر کوئی آتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدھوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے سوئس کہا۔ یعنی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے۔ چلنے کہا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھڑ آیا تو اس نے خود اس سے کہا: ”دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے ہوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کو تو نہ ہو گا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو ہو جو دہن جاؤ۔ چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر گلاڑا کی اور اس کے ہاں شعر گیا۔ جب تو دوسرے گروہ میں دھندا سے بند کر کے وہ اپنا کوٹ آتے تو سلطانہ نے کہا: ”ٹایسے ایک روپیہ دودھ کا۔“ اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چٹکن ہوئی تھی جب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ

نے بھی چپکے سے لے لی کہ جو تیار ہے غنیمت ہے۔

ساتھ سے اٹھارہ روپے تین سینور میں — میں روپے باہر اور اس کوٹھے کا کر یہ تھا جس کو ملک مکان انگریزی زبان میں ٹیکٹ کہتا تھا۔ اس ٹیکٹ میں ایسا پاغا تھا جس میں زمین پر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے نذر سے ایک — بچے ان میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا غور ہوتا تھا شروع شروع میں تو اس شخص نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ چلے وہ جب وہ دفع حاجت کے لیے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا وہ دور ہوا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے ٹھکی ہوئی زمین پر کا سہارا لے لیا۔ اس زمین پر کھڑکھڑا کر اس نے خیال کیا کہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ زمین پر کسی لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جائے کہ اس نے زمین پر کچھ کرنا چاہا اور کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈسکے باسے اس کے منہ سے خارج ہو گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرائی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈروکونن ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا کیا ہوا؟ — یہ چیخ تھاری تھی۔

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا یہ میرا بیٹا ہے۔ کیا کیا ہے؟ میں یہ دیکھ کر ڈر رہی ہوں کہ یہ زمین پر کھڑکھڑا کر اس نے خیال کیا کہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ زمین پر کسی لیے لگائی گئی ہے کہ اس نے زمین پر کچھ کرنا چاہا اور کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈسکے باسے اس کے منہ سے خارج ہو گئی۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کبھی سمجھ نہ ہوا یہ ایک ہی کہانی ہے خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹر میں پاس کرنے کے بعد اس نے فوری چلنا نہ سکی چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور مظفر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد مظفر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو کھٹک کر وہ ساتھ لے آیا مگر عورت چھ نکد اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لیے اس نے عورت کو بیٹھے بٹھا دیا جو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبار میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں آیا۔ جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کا سمجھ بوجھ ہو گیا۔ خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار یک اٹھا۔ عورت پر نگرانی میں لگا۔ اس لیے اس نے بھگا کر خدا بخش کو بھاگوانا شروع کیا۔ اس سے اتنی تڑپ ہو گئی ہے چنانچہ اس خوش اعتقاد نے خدا بخش کی دقت اس کی نظر میں نہ آئی۔

خدا بخش آدمی غفیف تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریوس اسٹیشن کے باہر منڈیکر سے فوٹو کھینچتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا پھر سلطانہ سے ساتھ روپے کے کمرہ میں خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دھڑکیاں خریدیں اور فوٹو حوضے کا سب سامان لے کر اس نے حوضہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اثا بناے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گودوں کے فوارے گھنٹیا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گودوں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطان گودوں سے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعے سے کئی گورے سلطان کے مستقل لاکس بن گئے۔

سلطان نے کانوں کے پے بستے خریدے۔ ساڑھے پانچ تونے کی آٹھ گھنٹیاں بھی بنوائیں۔ دس ہندہ بھی بھیجی۔ سارے مایاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آگیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں ڈاکو کی خوش حال مٹی لگا دیکار کی پانے خدا بخش کے محل میں کیا سانی کر اس نے دہلی جانے کی شاہانہ سلطنت انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کا کہنے بے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوش خوش دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے غریب جس کا وٹ صاحب دہلی میں دس کا دھند اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سیڑھیوں سے وہ دہلی کی تعریف میں لکھی تھی۔ چھوڑاں حضرت نظام الدین اویسی کی خاندانہ مٹی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بجاری سامان بھی باج کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آگئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے میں روپے ماہر پر یہ غریب لیا جس میں دونوں رہتے تھے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار شکر کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میر ہسل کپڑے نے شکر کا یہ حق تعالیٰ کے لیے منظور کیا تھا تاکہ وہ شہر میں بلکہ ملک اپنے آگے نہ بٹائیں۔ نیچے دوکانیں، غنیمتیں اور دیر و منزلہ ہا کٹی نیٹ۔ جو کہ سب عمارتیں ایک ہی ٹورڈن کی ہیں۔ اس لیے شروع شروع میں سلطان کو پناہ نیٹ تیار کر لیں۔ بہت وقت محسوس ہوئی تھی۔ پر جب پہلا ٹورڈن واسے نہ پورا ہوا تو گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک سو کی نشانی مل گئی۔ "یہاں پہلے پہلوں کی وصلاتی کی بات ہے" یہ بود پڑھتے ہیں وہ اپنا نیٹ تلاش کر رہا کرتی تھی۔ اس طرح اور بہت سی نشانیاں کا نام کر لیں۔ مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں کو نکلوں کی دکان لکھا تھا وہاں اس کی سیلی میرا بائی رہتی تھی جو کہی بھی ریڈ ریڈ میں گانے پایا کرتی تھی جہاں لڑکا کے لیے کھانے کا مٹی انتظام ہے۔ لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سیلی مٹی راجہ جی تھی۔ مٹی کے کارخانے کے اوپر انوری رہتی تھی جو اس کا رخانے کے سینٹر کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ شیخ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی لاکس تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطان دیکھا رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کھٹے پر نہ آیا تو اسے بہت غصہ ہوا۔ اس نے خدا بخش سے کہا۔ کیا بات ہے خدا بخش۔ پورے دو مہینے ہو گئے ہیں۔ میں یہاں آئے ہوئے کسی نے ابھی کوئی بھی نہیں کیا۔ نامی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے۔ پر انتظام نہ اچھی تو نہیں کو مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھتے ہیں نہ آئے۔ خدا بخش کو بھی یہ بات بہت مرے سے کشک۔ یہی تھی مگر وہ خاموش تھا۔ چہ جب سلطان نے خود بات چلی تو اس نے کہا۔ میں کچھ دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات بھر میں آتی ہے اور وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ بھاگ کر دوسرے دھندوں میں ڈر کر ابھر کا رستہ بھول گئے ہیں۔ — باہر پر ہو سکتا ہے کہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ٹیڑھیوں پر کسی کے چرے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطان دونوں اس کی آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ غصہ ٹپا دینے کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے ایک کر دو ارادہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا لاکس

جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انہیں نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اُسے
 جس کسی نے زندگی کی پٹریوں پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کاٹھن بادل سے ہیں اور وہ پل جا رہی
 ہے۔ نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس ننگے کا اندھا بہتہ بہتہ ختم ہو گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ کسی ایسے
 مقام پر اس کا دیکھا بجلا نہ ہو گا۔

یوں تو وہ اپنے طلب گھنٹوں ریل کی ایڈریس پر باگی پٹریوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے آنکھوں کی طوط دیکھتی رہی۔ ہر طرح طرح
 کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبار چھاؤنی میں جب وہ اپنی حق تواریف کشی کے پاس ہی اس کا مکان غلہ گر وہاں اس نے
 کبھی ان چیزوں کو کسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کسی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹریوں کا جال سا
 بچھا ہے اور ہر جگہ سے بھاپ اور دھواں اُٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلا ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن
 اور دھواں دھونکتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انہیں سیٹھ معلوم ہوتے۔ پھر کبھی کسی انبارے میں اس کے ہاں آتا کہ تھے
 پھر کبھی کسی جب وہ کسی دہلی کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چلنے کے کسی
 بازار میں سے آدمی کو کشوں کی طوط دیکھتا چار رہا ہے۔

سلطانہ دیکھتی تھی کہ کسی باتیں سوچنا، دماغ کی خوابی کا باعث ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آتے تھے تو اس
 نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خود بخش نے اس نے بار بار کہتا دیکھو میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو میں سدا میں یہاں رہا کرو
 کی طرح پڑی رہتی ہوں۔ مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کوئی تباہی میں! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ
 نے چاہا تو چند دنوں میں ہی پٹریاں بار ہو جائے گا۔

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک سلطانہ کا پٹریاں بار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

عزم کا مزید سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے پکڑے خوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ غنا نے لیڈی میٹش کی ایک نئی
 وضع کی قمیص جو آتی تھی جس کی آستینیں کالی جاڑھت کی تھیں۔ اس کے ساتھ پیراج کرنے کے لیے اس کے پاس کال ساٹن کی شلو اور
 جو کاجیل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے روشنی جاڑھت کی ایک بڑی انیس ساڑھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی
 کے نیچے سفید بوسلی کا چٹنی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہنے کا لڑی کا لال لالیک جو آٹا لال تھی جو بڑا
 تازہ تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت ڈکڑا کہ وہ عزم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے
 کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت اُداس تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا تھا کہ ایک پٹریاں
 سلاں کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ مگر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش صبر، جلال باہر تھا۔ وہ کہتا کہ وہ وہی رنگاؤ کلیہ سر کے نیچے دیکھ کر کٹتی رہی۔
 پھر جب اُس کی گدن اور پٹائی کے باعث اگلا سی گئی تو باہر بالکنی میں چلی گئی تاکہ ظلم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔
 سامنے پٹریوں اور گاڑیوں کے ڈبے کٹھے تھے۔ رات بھی کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لیے

گرو غبار و ب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی پہلے شروع ہو گئے تھے جو تاک بھاگ کرنے کے بعد چب چاب گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اوپر کی کر کے سلطان کی طرف دیکھا۔ سلطان نے شکر ادا کیا اور اس کو قبول لگی۔ کیونکہ اب سلسلے میں ایک انجی نمودار ہو گیا تھا۔ سلطان نے خود سے اس کی طرف دیکھا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں اڑا کہ انہوں نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں نکالنے کی خاطر جب اس نے ترک کی جا چکی تھی تو اسے وہی آدمی جل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف لمبائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطان نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا اس آدمی نے اوجھڑا دھر دیکھ کر ایک بیٹھ اشارے سے پرہیز کیا۔ کوہر سے آدمی سلطان نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا ہوا مگر پھر ٹہری پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطان نے اسے دیکھ کر بھلا جب وہ چلا گیا تو اس نے سلطان کو شروع کرنے کے لیے کہا۔ آپ اور آپ کے لڑکیوں رہے تھے۔ وہ آدمی اس کو مسکرایا۔ نہیں کیسے معلوم تھا — ٹوٹنے کا باعث ہی کیا تھی؟ اس پر سلطان نے کہا میں نے اس لیے کہا کہ آپ ورنہ نہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کا دھڑا تھے۔ وہ یہ سن کر پھر مسکرایا۔ تجھیں غلط فہمی ہوئی میں تمہارے اوپر دالے غیث کی طرف دیکھ رہا تھا وہاں کوئی عورت کھڑی ایک موکو ٹینڈا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ نظر پڑا کہ یہاں پھر بالکن میں سبز بلب دو ٹی ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطان نے پوچھا آپ جا رہے ہیں؟ اس آدمی نے جواب دیا میں نہیں میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں — چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔

سلطان نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا جائزہ لیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا میرا کام شکر ہے۔

سلطان نے پہلی بار غور سے شکر کی طرف سے دیکھا۔ وہ متوسط قد کا موٹی شکل جسمت کا آدمی تھا گروس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور خفایت تھیں کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی گھٹیلاد اور کھڑی بدن تھا۔ پنڈیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ نمائندگی رنگ کی گرم تیلوں پہنے تھا۔ سفید تیس تھی جس کا کارگر گروس پر سے اوپر کوٹھا ہوا تھا۔

شکر کچھ اس طرح دیر پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شکر کے بھانے سلطان کا ہک ہے۔ اس احساس نے سلطان کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شکر سے کہا: "....."

شکر بیٹھا تھا یہ سن کر بیٹ گیا۔ "تیس کیا فرماؤں کچھ تم ہی فرماؤ۔" بلایا تھیں نے ہے مجھے۔ "جب سلطان کچھ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ میں سمجھا، اب اس جگہ سے سونو کچھ کہے تھے سمجھا، غلط ہے یہ سن ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں، ٹانگوں کی حرکت میری بھی نہیں ہے، مجھے جب بلایا جائے تو میں دینا ہی پڑتی ہے۔"

سلطان یہ سن کر چلا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "آپ کام کیا کرتے ہیں؟ شکر نے جواب دیا۔ یہی جو تم لوگ کرتے ہو؟"

”کیا؟“

”تم کیا کرتی ہو؟“

”میں..... میں..... میں کچھ بھی نہیں کرتی۔“

”میں کچھ بھی نہیں کرتا۔“

سلطان نے بھٹاکر کہا: ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی آپ کچھ نہ کہہ تو ضرور کہتے ہوں گے۔“

شکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: ”تم بھی کچھ نہ کہہ ضرور کرتی ہوگی۔“

”جھک مارتی ہوں۔“

”میں بھی جھک مارتا ہوں۔“

”تو آؤ دونوں جھک ماریں۔“

”حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے کام میں بھی نہیں دیا کرتا۔“

”ہوش کی دوا کرو۔۔۔ یہ ٹکڑا نہیں۔“

”اور میں بھی واقفیر نہیں۔“

سلطان یہاں تک گئی اس نے پوچھا: ”یہ واقفیر کون ہوتے ہیں؟“

شکر نے جواب دیا: ”آؤ کے چٹھے۔“

”میں آؤ کی کچھ بھی نہیں۔“

”مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ضرور آؤ کا پٹھا ہے۔“

”کیوں؟“

اس بچے کو دو کئی دنوں۔۔۔ ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی بچی قسمت
تنگ لگے تانے کی طرح بند ہے۔ یہ کدو شکر ہنسا۔

اس پر سلطان نے کہا: ”تم ہندو ہو۔ اسی بچے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔“

شکر سکایا۔ ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں بنی کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریعت
آدی بن جائیں۔

”جیائے کیا اوٹ پٹا تنگ پاتیں کرتے ہو۔۔۔ پلہ رہو گے؟“

”اسی شرط پر جو پہلے بنا چکا ہوں۔“

سلطان اٹھ کھڑی ہوئی: ”تو جاؤ رستہ کھڑو۔“

شکر آرام سے اٹھا، تہوں کی سیوٹی میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھرنے اور جاتے ہوئے کہا: ”میں کبھی کبھی اس ہاتھ سے گزرا

کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا — بہت کام کا آدمی ہوں؟

شکر چلا گیا اور سلطانہ نے اس کو بھولی کر درخشاں اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دل کو کوہستہ چلا کر دیا تھا۔ اگر وہ اپنے سے تیرا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی دنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دیکھے دے کہ باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت آدمی دیکھتی تھی اس لیے شکر کی باتیں اسے پسند ہیں۔
ظلام کو جب اندھا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا کہ تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟

اندھا بخش تعجب کر چڑچڑا ہوا رہا تھا۔ کہنے لگا: بڑے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دلوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جانتے ہوں کہ ہمارے دن چہرہ کیسے —

”کچھ احوال نے تم سے کیا؟“

”نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے — برہم سلطانہ، میں جہاں کی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ اکلوتہ کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل سال رہا تو ضرور دوسرے تیار سے ہو جائیں گے۔“

سلطانہ کے دل میں غم و غصہ تھا۔ وہاں سلطانہ نے کبھی اندھا بخش سے کوئی بات نہیں کہنے لگی۔ سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو — میں یہاں ہنجرے میں قیدمندی ہوں، کیسے جاسکتی ہوں نہ سکتی ہوں۔ حرم سر پر آگیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی نگر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں چٹوٹی کوڑی تنگ نہیں۔ گنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے پک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہرگز؟ یوں فقیروں کے کپڑے کب تک مارے پھرا کر دو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں وہاں میں اندھا لے جی ہم سے سزا ہو گیا ہے۔ میری سزا تو اپنا کام شروع کر دوں کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا؟

اندھا بخش دبی پریشان گیا اور کہنے لگا: یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تنقوڑا بہت سہارا چاہیے — خدا کے لیے اب ایسی دیکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتی۔ میں نے پہلے پانچ بار تجھ کو اپنے سخت غلطی کی پر جو کرتا ہے، اللہ ہی کرتا ہے اور جاری رہتی ہی کے لیے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ دیر مارو گنگنیاں برداشت کرنے کے بعد ہم سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا: تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا فدا کر ڈالو، پر مجھے ایک شہر رکھا پڑا ضرور ہے۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیض پڑی ہے۔ اس کیس میں دنگوں کی۔ سفید قمیضوں کا ایک دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لاکر دیا تھا۔ یہ بھی قمیض کے ساتھ دنگوا دیا جائے گا۔ ایک صرت شہر لاکر کمرے۔ سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو دیکھو قمیض میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو — میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔“

اندھا بخش اٹھ بیٹھا۔ اب تم خواہ مخواہ ضرور پہنچ جا رہی ہو — میں کہاں سے لاؤں گا — ریم کھانے کے لیے تو میرے پاس ایک پیسہ نہیں؟

”کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔“

”دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔“

یہیں تم کچھ کہیں کر لو گے۔۔۔ تم اگر جاہل و سوادہ سنو اسے یہ کہہ کر کہتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ سائنس باوجود آئے کرمل جاتی تھی۔ اب سوادہ روپے گڑ کے حساب سے ملتی ہے۔ سائنس سے چار گز دور کھینچ کر رکھتے ہو یہ بڑے جرم و برائی میں گئے ہیں۔
آپ تم کہتی ہو تو میں کوئی جیل کر دوں گا۔ یہ کہہ کر خدا کا کھٹن اٹھاؤ۔ اب اس قانون کو قبول کیا تو میں جیل میں سے کہاں لے دوں؟

ہوئی سے کہا تاؤ دووں نے لی کر زہر مار کیا اور سونگے۔ صبح ہوئی، خدا بخیر برائے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ کی اسکل رہ گئی۔ کچھ روز بیٹھی رہی کچھ دوسری رہی۔ اور صبر و صبر کو وہیں پہنچی رہی۔ وہ پرہیزگار کاٹھکانے کے بعد اس نے اپنا سفید غنوی کا روپیڑ اور سفید اسکی کی قمیض نکالی اور نیچے لاٹھری دوائے کو دنگے کے پیچ سے آئی کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں دنگے کا کام بھی کرتا تھا۔ کام کرنے کے بعد اس نے وہاں انگریزوں کی کتابیں پڑھیں۔ جہاں اس کے دیکھے ہوئے غلوں کی کوئی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سونگئی جب اٹھی تو چار بج چکے تھے۔ کیونکہ وہ صوبہ آنگلوں سے عہدی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ خدا صبر کو ناراض ہوئی تو گرم چادر اور دوکر باگنی میں آکھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ باگنی میں کھڑی رہی، اب شام ہو گئی تھی۔ بیٹیاں دوشی ہو رہی تھیں۔ نیچے عسکر میں دوشی کے استاد نظر آئے گئے۔ سڑی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی، وہ عسکر پر کھاتے جاتے تھانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ وہ غصہ اسے شکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گروں کو اپنی کئی۔ اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ سلطانہ نے غصہ اداوی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے آگے بلا لیا۔

جب شکر گڑب گڑا گیا تو سلطان بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اُس سلطان جیسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا۔ شکر گڑب مدغلی تھا۔ جیسے ان کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ ٹوٹی بنے نعلانی سے پہلے وہ اُن طرح وہ گاؤں تک پہنچ کر کھڑے ہو گیا۔ جب سلطان نے سوچا کہ اب اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا۔ تم مجھے سو فوہ بلا سکتی ہو اور سو روئے کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔

سعادۂ شش پر پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی: نہیں مٹیو، قیص جانے کو کون کہتا ہے؟
شکرا اس پر مسکوا دیا۔ قیصری شرطیں قیصیں منظور ہیں۔

”کیسی شریں سلطان نے سب سے کہا۔ کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟“

”نکاح اور شادی کبھی؟ — دائم عزیز کسی سے نکاح کرو گی نہیں۔ یہ ہمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں — چھوڑ دو ان فضیلت کو۔ کوئی کام کی بات کرو“

یہ لو کیا بات کہوں؟

”تم صدمت ہو۔ کوئی ایسی بات کرو جس سے دو گھنٹہ ہی دل بہل جائے۔ میں کوئی ایسی صرف دکھانداری ہی دکھانداری نہیں کچھ اور بھی ہے۔“

سلسلہ ذہنی طور پر اب شکر کو قبول کر چکی تھی کہنے لگی: صاف صاف کہہ دوں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟
سجود دوسرے چاہتے ہیں: شکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”تم میں اور دوسروں میں فرق ہی کیا رہا؟“
 ”تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔“
 سلطان نے تھوڑی دیر تک شکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہتا: میں سمجھ گئی۔“
 ”تو کہو کیا مادہ ہے؟“
 ”تم جیسے، میں داری۔ پر میں کتنی ہوں، آج تک کسی نے اس بات قبول نہ کی ہوگی۔“
 ”تم غلط کہتی ہو۔۔۔ اسی محلہ میں تمہیں ایسی مادہ لوح و حریف بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذات قبول سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو، لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔“
 ”تھا اور نام سلطان ہے نا؟“
 ”سلطان ہی ہے۔“
 شکر نے ٹھٹھکا کر اجازت مانگ لی اور ہنسنے لگا ”میرا نام شکر ہے۔۔۔ یہ نام بھی عجیب اور عجیب ٹھانک ہوتے ہیں پہلو کا اندر چلیں۔“

شکر اور سلطان زور دے کر دالے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر جب شکر نے دالے کا
 ”سلطان نے کہا، شکر میری بات مانو گے؟“
 شکر نے جواباً کہا: ”پہلے بات بناؤ۔“
 سلطان نے کچھ عجیب سی گئی۔ تم کو گئے کریں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر.....“
 ”کو کو۔۔۔ دیکھو گئی ہو؟“
 سلطان نے حرات سے کام لے کر کہا: ”بات یہ ہے کہ غم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کریں گا کہ شکر اور سلطان
 — یہاں کے سارے ڈاکٹرے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو، یقیناً اور دو چار میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج دنگو لانے کے لیے
 دے دیے ہیں۔“

شکر نے یہ سن کر کہا: تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شکر اور سلطان
 سلطان نے فوراً ہی کہا: نہیں یہ مطلب ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھ پر ایک کالی شکر اور سلطان
 شکر مسکرایا: میری عجیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کبھار ہوتا ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ مجرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں
 یہ شکر ادا کر جائے گی۔ بس اس بات پر خوش ہو لیں۔“ سلطان نے بندوں کی طرف دیکھ کر پھر اس نے پوچھا کیا یہ بندے تم مجھ سے سکتے ہو؟“
 سلطان نے ہنس کر کہا: تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے سولہ بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔“
 اس پر شکر نے کہا: ”میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بلکہ دینی ہو۔“

”لے لو۔“ یہ کہہ کر سلطان نے بندے کو آواز دے کر کہہ دیا۔ اس کے بعد اسے افسوس ہوئی مگر شکر جاسکا تھا۔

سلطان نے کچھ عرصے تک شکر اٹھایا اور وعدہ پورا کیا کہ گاؤں کے لوگوں کے بعد قریب قریب تمام لوگوں کو بھیج دیا۔ سلطان نے سلطانہ کو بلا کر شکر کھڑا کیا۔ انجیا میں بیٹھی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا: ”سائیں کی کالی مشلوار ہے۔“ دیکھ لیتا شاید یہی ہو۔ اب میں چلتا ہوں۔“

شکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سوکڑا تھا ہے اور سیدھا اور صبر ہی چلا آیا ہے۔“

سلطانہ نے کانڈ کھولا۔ سائیں کی کالی شلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت غرض ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا ہوا افسوس اُسے ہوا تھا۔ اس شلوار نے اور شکر کی وعدہ ایٹھا کی نے دور کر دیا۔

دو پر کو وہ نیچے لاندھی والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹے آئی۔ قمیص کاٹے کپڑے جب اس نے پہنے لیے تو سلطانہ نے سلطانہ کو بلا کر شکر اٹھایا اور دوا مل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا: ”میں اسے دے دوں گا تو رنگا ہو کر معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نہی ہے۔“ کب جوائی پڑا۔

سلطانہ نے جواب دیا: ”آج ہی دہری لایا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں۔ یہ بندے تم نے کہا سے لے پڑا۔“

مختار نے جواب دیا: ”آج ہی منگوائے ہیں۔“

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

(دو حوالے میں سے)

ٹوہ ٹیک سنگھ

شورائے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا ہنگامہ نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جہ ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات مقبول تھی یا غیر مقبول، ہر حال دو شخصوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر انجی سٹیج کی کانفرنس ہوئی اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے منظور کیا۔ ایسی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے درمیان ہندوستان ہی میں تھے وہیں رہنے دیے گئے تھے جو باقی تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اس لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہیں رہا تھا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب ہاٹیس کی مخالفت میں سرحد پہنچا دیے گئے۔

اُدھر کا معلوم نہیں لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو ٹری ڈیپ چریگیٹیاں مرنے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقا علی کے ساتھ ٹرمینڈا چمکتا تھا اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا تو بڑی سادہ، یہ پاکستان کیا ہوتا ہے۔ تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔ ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں اترے جتے ہیں۔

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا سواہری میں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے۔

میں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔

دوسرا سکھ آیا۔ مجھے تو ہندوستان کی بولی آتی ہے۔ ہندوستانی بڑے شیطانی آگوا آگوا پھرتے ہیں۔

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ اس دور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گر ااور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے تھانوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے انہوں کو بسے داکر پاگل خانے میں جوایا تھا کہ چھانسی کے چھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور پاکستان کہا ہے۔ لیکن رنج و رقتات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ ان پر وہ دارسیاہی ان پڑھ اور بانی تھے۔

ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آئین محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک عظیمہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے — یہ کہاں ہے۔ اس کا نئی اور قریعہ کیا ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بالکل غلطی سے وہ سب پاگل جن کا داماد پوری طرح ناواقف نہیں ہوا تھا، اس گھٹے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں ہیں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان اور ہندوستان اور پاکستان کے پکڑ میں کچھ ایسا گرفتار تھا کہ اندازاً وہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن دھشت پر چڑھ گیا اور ٹھٹھے پر بیٹھ کر وہ گھٹنے مسلسل تکرار کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے تارک مستطیل پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اتارنے کو کہا تو وہ اور لوہے پر چڑھ گیا۔ ڈیرا یا دھماکا یا کیا تو اس نے کہا — میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں — میں اس دھشت ہی پر رہوں گا؟

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرحدی اقوہ نیچے آقا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گھسے مل کر کرنے لگا اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائے گا۔

ایک نیم۔ اس۔ سی۔ پاس لیٹر لیا، انجینئر میں جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر مسادا دن خاص روش شفا رہتا تھا۔ یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر وہ دھار کے محلے کر دیے اور ننگ و طرنگ سداے باغ میں چلتا پھرتا شروع کر دیا۔

پشاور کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم رکن رہ چکا تھا اور وہیں پندرہ سولہ مرتبہ نمایا کرنا تھا ایک نیت یہ عادت ترک کر دی، اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلی میں اعلان کر دیا کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل باشرآرا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلی میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل افراد کو کر عظیمہ عظیمہ بند کر دیا گیا۔

۱۱۔ ہر ایک ایک نوجوان ہندو مکمل تھا جو بہت سے ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرت سر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شرم کی ایک ہندو لڑکی سے اسے بہت بھتی تھی۔ گو اس نے اس دیکھ کر ٹھکرا دیا تھا مگر وہ لڑکی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لڑکوں کو گالیاں دیتا تھا۔ جنہوں نے لی لڑاکا ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے — اس کی محبوبہ ہندوستانی بھی گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تباہی کی بات شروع ہوئی تو مکمل کو کئی پاگلوں نے بھلیا کہ وہ دل بڑا دکھ سے اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے مگر وہ ہر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امرت میں اس کی پرورش نہیں چلے گی۔

۱۲۔ ہر ایک وارث میں دو لڑکھو آئین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو تارک کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو

بہت صدمہ ہوا۔ وہ چپ چاپ کہنے لگا کہ میں اس کام سے پریشان ہو کر رہتی ہوں۔ اب ان کی حیثیت کسی قسم کی ہوگی۔ اور میں وارڈ رہے گا یا آؤں یا جانے لگا۔ ہر ایک خاصٹ مارے گا یا نہیں کیا انہیں ڈبل روٹی کے بجائے بڑی ڈھونڈی چائے تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سگہ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے چند برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سُنے جاتے تھے۔ اوڑھنی گڑ گڑوی اینکس دی بے دھیا ناوی منگ دی وال آف دی لائیں دی کو سترہ تھا زراعت کو۔ پھر وادوں کا یہ کہتا تھا کہ چندہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک نعلے کے لیے بھی نہیں سوراہ لیتا بھی نہیں تھا۔ ابتر کہی کبھی کسی دروازے کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں شروع کئے تھے۔ ہڈیاں بھی پھول گئی تھیں مگر اس جسمانی تعلیق کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تباہی کے تعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سننا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سیدھی سی جواب دیتا۔ اوڑھنی گڑ گڑوی اینکس دی بے دھیا ناوی منگ دی وال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔

لیکن بعد میں، آف دی پاکستان گورنمنٹ، کی جگہ آف دی ٹوربینک سگہ گورنمنٹ، نے لے لیا اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوربینک سگہ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے، لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو کہنے کے کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ کیا ٹوربینک سگہ پہلے ہندوستان میں ہوا تھا، پر اب منشا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور، جہاں پاکستان اب میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے یا اسدا ہندوستان ہی پاکستان ہی جاتے اور یہی کون سیٹھے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سگہ پاگل کے کیس چھوڑے ہو کر بہت مشغورہ کئے تھے۔ چونکہ بہت کم زمانہ تھا اس لیے وارڈس اور سر کے بال آپس میں جھگڑ گئے تھے جس کے باعث اس کی شکل بڑی ہسیانک ہو گئی تھی۔ مگر وہی ہے ضرورت تھا۔ چند برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا نہ کیا تھا۔ پاگل خانے کے جوڑنے کے ملازم تھے وہ اس کے تعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوربینک سگہ میں اس کی کئی زمینی تھیں، اچھا کہا تو دنیا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ آٹ گیا اس کے رشتے دار کو بے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کر گئے۔

میں نے ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آئے تھے اور اس کی غیر ضرورت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ چوبیس پاکستان، ہندوستان کی گڑ بڑ شروع ہوئی ان کا آکا بند ہو گیا۔

اس کا نام بھی سگہ تھا کہ سب سے ٹوربینک سگہ کہتے تھے۔ اس کو یہ یقین معلوم نہیں تھا کہ وہ کونسا ہے، عینہ کونسا ہے، یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مصلحت سے اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتا

پہل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ وہ فیصلہ کرے کہ اس کی ملاقات آج ہی ہے۔ اس دن وہ زچہ طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر پر تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا انکھوا کے پٹیاں اور یوں سج کر لٹنے والوں کے لباس بناتا۔ وہ اس سے کچھ بڑھ جیتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار وہی کڑبڑ وہی ایکس وہی بے دھیان یا وہی سنگبہ وہی دال آت وہی لٹاٹیں نہ کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر پچھلے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ ہنسنے لگے اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا وہ آج بھی وہی اپنے باپ کو دیکھ کر دلاتی تھی جو ان ہوئی تھیں وہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا نقشہ شروع ہوا تو اس نے دو حصے پا گئیں سے پچھنا شروع کیا کہ ٹوپیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان پڑا تو اس کی کرپوں بدلی ٹرستی گئی۔ اب ملاقاتیں نہیں آتی تھیں۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتلا چل جاتا تھا کہ غصے والے آکر ہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جاسے ال کے آگے خبر اسے دیا کرتی تھی۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے جھڑپ کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے چل بسا تیاں اور کپڑے لاتے تھے وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوپیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوپیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاکل نے اس میں ایک پاگل ایسا ہی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بیش سنگو نے (چچا کو ٹوڑیک سنگو پاکستان میں ہے یا جندوستان میں تو اس نے حسبِ عادت تقہر لگایا اور کہا: "وہ پاکستان میں ہے نہ جندوستان میں اس لیے کہ ہم نے بھی تم کو حکم نہیں دیا۔"

بش سترگہ اس خدا سے کہن مرتبہ بڑی منت حاجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ مجھ کو ختم ہو کر وہ بہت معصوم تھا اس لیے کہ اس سے اور بے شمار حکم دیتے تھے۔ ایک دن وہ تنگ آگیا اس پر برس پڑا۔ اوپر ڈیڑھ گز گڑی ایکس دی ہے وحی نامہ دی تنگ دی وال آفت وا ہے گرد و بی واخلعہ وینڈوا ہے گرد و بی کی فتح — جو بے سو نہال، ست سری اکال۔“ اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو — سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری ٹھنکتے۔

تباوے سے بکھڑی پہلے ٹریک سٹوڈنٹ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے لیے آیا پہلے دو گھنٹے نہیں آیا تھا۔ جب بش سٹوڈنٹ سے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور اسی پہلے لگا مگر سچا بہوں نے اسے روکا یہ قسم خورے آ رہا ہے۔
تھرا دوست فہل دیں ہے۔

بشن منگنے فضل دین کو ایک نظرو کیس اور کچے بڑا لالہ لگا فضل دینی نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا نہیں بہت
دلوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے طوں لیکن فرستہ میں نہ ملی — تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے —
میں نے جتنی حد ہو سکی، میں نے کہ — تمہاری بیٹی روپ کو رہا کر.....

وہ کہہ کئے کہ آگ لیا۔ بس مگر کچھ لوگ اسے شکر بھی روپ کورہ

فصل دین نے رک رک کر کہا: ہاں..... وہ..... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے سامنے جی ملی گئی تھی۔

بش سنگھ خاموش رہا، فضل دین نے کہنا شروع کیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری غیر ضرورت پر بچنا ہوں۔ اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو۔ بھائی بلیر سنگھ اور بھائی دودھا سنگھ سے میرا سلام کہنا۔ اور میں امرت کو سے بھی..... بھائی بلیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے۔ دو بھوویا بھینسیں مردہ چھوڑ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کتا دیا ہے۔ دوسری کے کتے برائی تھی، یہ وہ چھوٹوں کی جھمکے گئی..... اور..... میرے لائق جو خدمت ہو، کتا میں ہر وقت تیار ہوں..... اور یہ تمہارے لیے تھوڑے سے مردہ لے لایا ہوں۔

بش سنگھ نے مردہ لڑکوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا تو بیک سنگھ کہاں ہے؟ فضل دین نے قدر سے حیرت سے کہا۔ کہاں ہے۔ وہیں ہے جہاں تھا۔

بش سنگھ نے پھر پوچھا۔ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟ ہندوستان میں۔ نہیں نہیں پاکستان میں۔ فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بش سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اوپر دی گڑگڑادی ایکس دی ہے دھیا تا دی سنگ دی وال آت دی پاکستان ایسٹ ہندوستان آت دی ڈرنے منہ؟

تباہی کی تیریاں مکمل کر چکی تھیں، بدھرت آدھرا اور آدھرتے آدھرا نے داسے پاگوں کی فرسٹس پیچ لگی تھیں اور تباہی کا بھی دن مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردی ان تھیں جب لاہور کے باہر گانے سے ہندو سکھ پاگوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے کمانڈر کے ساتھ روانہ ہوئیں، متعلقہ افسری ہمراہ تھے۔ واہگہ کے پورے طریقے کے سپرٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تباہی شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگوں کو لاریوں سے نکلانا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا مشکل کام تھا، بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلتے پر دھماکا مارتے تھے ان کو سمجھانا مشکل ہو جاتا تھا، کیونکہ آدھرا اور بھیاگ اٹھتے تھے، جھنگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاٹکے اپنے حق سے جھکا کر دیتے۔ کوئی کالیاں بک رہا ہے، کوئی گارہا ہے۔ آپس میں ڈانٹتے رہے ہیں۔ دودھ ہے میں، بلیک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور مردی اتنی کڑم کے کی تھی کہ دانت سے دانت بچ رہے تھے۔

پاگوں کی اکثریت اس تباہی کے حق میں نہیں تھی، اس لیے کہ ان کی بھوس نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جگہ کی سوج بھجھ سکتے تھے پاکستان زندہ باد اور پاکستان مردہ باؤ کے نعرے لگا رہے تھے۔ دوسری طرف ہوتے ہوئے بچا، کچھ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو بے نعرے کی کریش لگائی تھی۔

جب بش سنگھ کی بارش آئی اور واہگہ کے اُس پار متعلقہ افسر اُس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اُس نے پوچھا۔ ٹو بیک سنگھ کہاں ہے۔ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟

متعلقہ افسر رہا۔ پاکستان میں۔“

یہ سن کر رضی منگو بھل کر ایک طرف ہٹا اور دھڑکراہٹے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جہلے گئے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ ٹوہر ٹیک سنگھ یہاں ہے — اوندو دند سے چلائے لگا۔ اوپر دی گڑا دی ایٹکس دی ہے دھیا نا دی سنگ دی وال آنٹ ٹوہر ٹیک سنگھ ایٹ پاکستان۔“

اسے بہت بھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوہر ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے — اگر نہیں گیا تو اسے لودا وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جہلے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی شہرکی جوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدی چ نکدے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی، اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تباہی کا بانی کام ہوتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت ہٹن سنگھ کے محل سے ایک نلک شگاف راج نکلی — ابھر اودھر کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اب اندر سے مڑ بیٹھا ہے۔ ابھر ہمارا تباہی کے چھپے ہندوستان تھا — اودھر ویسے ہی تاروں کے نیچے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ ٹوہر ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

”آپہندتے میں سے“

اس منجھسار میں

کردار

بیگم ماں
 امجد بیگم کے بیٹے
 مجید بیگم کے بیٹے
 سعیدہ امجد کی نوری سہیلی بیوی
 اصغر می خادمہ
 کریم اور غلام محمد نوکر

پہلا منظر

(نگار و قلم کا ایک کمرہ — اس کی خوبصورت نشیمنہ لگی کھڑکیاں پہاڑی کی ٹوٹلو آغوش کی طرف کھلتی ہیں، بخیر نظر تک پہنچ رہی پہاڑ منظر آتے ہیں جو آسمان کی خاکستری مائل نیلا شہروں میں گھل مل گئے ہیں۔ کھڑکیوں کے بیچ پر دیکھ کر کئی چمکی ہوا سے ہولے ہولے سرسرا رہے ہیں۔ یہ کمرہ عیساکہ ساز و سامان سے معلوم ہوتا ہے جگہ پر توڑی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کو کھڑکیوں کے پاس ساگوان کی سہری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کونوٹیں شیشے کی تپائی جس پر بطور کی صراحی اور گلاس کے علاوہ ایک ٹائم پیس رکھی ہے۔ نیچے بیٹھ کر پہاڑی ٹینیس میں بھوس موٹو سیٹ ہے۔ اس پر دو ملازم گھڑیاں سج رہے ہیں — اس سے ٹور ہٹ کما ایک نوجوان خادمہ جو صحرانی شکل و صورت کی ہے آکٹھمان پر سہائی ہوئی مختصر چڑیوں کو اوڑھنا دے سجانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کمرے کی فضا میں ایسی دو خیزگی ہے جو ذرا سی جنبش سے منکوحیت میں تبدیل ہو سکتی ہے — باہر سے ٹانگوں پر کھڑکی کی تختی تختی ضرروں کی آواز آتی ہے۔ تینوں خادمہ جگہ سے دھکیل کے بعد اپنے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں — دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی وچیر عورت عیساکھیوں کی مدد سے اندر آتی ہے اور کمرے کا جائزہ لے کر اپنے اطمینان کا اظہار کرتی ہے۔)

بیگم صاحب۔ (ایسا کہیں کی حد سے کہے میں اور حرا دھر چکر تمام چیزوں کو صحیح مقام پر دیکھ کر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے، ٹھیک ہے! ایک ایسا کھی کو اپنی بھل سے انگ کے صوفے کے ساتھ رکھ کر بیٹھنا چاہتی ہے، مگر فوراً ہی پشاور اور ترک کر دیتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ سہارے کے بے صوفے کے بازو کی چمکیلی سطح کے ساتھ چھوٹا تھا اور اس پر نشان پڑ گیا تھا۔ اپنے دوپٹے کا ایک کونہ پکڑ کر وہ یہ خود بخود مٹ جانے والا نشان بچھا دیتی ہے اور پھر یہ کھی اپنی بھل میں جا کر کوجہان خادمہ سے مخاطب ہوتی ہے) اصفری!

اصفری۔ (فوراً متوجہ ہو کر) جی!

بیگم صاحب۔ (ایک دم یہ محسوس کر کے کہ وہ بھول گئی ہے کہ اس نے اصفری سے مخاطب کیوں کیا تھا اور میں کیا کھنڈالی تھی؟ اصفری۔ (مسکراتی ہے) آپ یہ کھنڈالی تھیں کہ آپ کا اطمینان نہیں ہوا..... میں مجھ کی سمجھتی ہوں بیگم صاحب۔ دولہن بہت خوبصورت ہے۔ اس کو سہ کی تمام سجاوٹیں اس کے سامنے ماہر بڑھائیں گی۔ (وہ آتشخان کے عین درمیان میں برقی ٹاوروں سے آوازوں، دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے)۔

بیگم صاحب۔ (مسکراتی ہوئی) آتشخان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اور اپنی ہموکی تصویر کو خود سے دیکھتی ہے۔ غرض ہوتی ہے۔ لیکن ایک دم گھبرا سی جاتی ہے، اصفری!

اصفری۔ جی!

بیگم صاحب۔ سچ سے میری طبیعت۔ کچھ گھبرا سی رہی ہے۔

اصفری۔ اہمдіاں جو آ رہے ہیں اپنی دولہن کے ساتھ۔

بیگم صاحب۔ (اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی) ہاں..... میں آنے والا ہے..... کمال موڑ لے گیا ہے ایٹیشن پر۔

اصفری۔ اگلے سال عید میاں کی شادی کیسی ہے۔ گھر میں رونق ہی رونق ہو جائے گی۔

بیگم صاحب۔ انشاء اللہ۔ وہ بھی انشاء اللہ اسی طرح بخیر و خوبی انجام پائے گی..... (ذریعہ لب، انشاء اللہ۔

اصفری۔ دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے اور اس کے حسن سے بہت متاثر ہوتی ہے، اللہ نظر بے پکارتے۔

بیگم صاحب۔ (خیر وادی طویر پر قریب قریب پہنچ کر) اصفری!

اصفری۔ (سہم کر دیتی)!

بیگم صاحب۔ کچھ نہیں..... لاٹری کب آتی ہے کراچی سے!

اصفری۔ معلوم نہیں بیگم صاحب۔

بیگم صاحب۔ (ایک خادمہ سے) دیکھو کریم، تم ٹیلیفون کرو اور پوچھو..... لیکن لاٹری تو کل ہی کی مارو پٹنسی پہنچ چکی ہے

— عید کا کارہ جزا تھا۔

کریم۔ جی ہاں!

بیگم صاحب۔ اور میں نے کمال کو کس اسٹیشن پر بھیجا ہے..... (گھبر کر) خدا معلوم میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے.....
 اجمد میاں کو رات کو اوپنٹی ٹھیکرنا تھا..... اپنے دوست سعید کے پاس..... اور وہ تو میرا خیال بچا ہے
 وہاں سے چل بھی چکے ہوں گے (دوسرے خادم سے) غلام محمد؟

غلام محمد۔ جی؟

بیگم صاحب۔ تم دیکھو کمال کہاں ہے..... موٹر کہاں لے گیا ہے؟
 غلام محمد۔ بہت اچھا! (پلا جاتا ہے)

بیگم صاحب۔ (اصغری کے کانڈے کا سارا لے کر آج صبح سے میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ چلتے پھرتے سے سنڈ
 ڈھرتی۔ اس کم بخت خدا کٹر جاہلیت اٹھانے مجھے منع نہ کیا جو تانوں میں کوسا تھلائی (دوسرے ٹیلیفون کی
 گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے، میرا خیال ہے شاید اجمد میاں کے دوست کا ٹیلیفون ہے کہ وہ چل پڑے ہیں) جانا
 اصغری..... بھاگ کے جاؤ۔ (اصغری دوڑی باہر جاتی ہے)

بیگم صاحب۔ (دکری سے) — اپنی خسرولی ڈور کرنے کی خاطر! بس اب آتے ہی جوں گے، اجمد میاں۔
 کریم۔ الٹریٹ سے لائے۔

بیگم صاحب۔ (قریب قریب چچ کی کیا مطلب تھا رار
 کریم۔ (ڈور کر) جی یہی کر..... جی یہی.....

(اصغری کی چھین سنائی دیتی ہیں) بیگم صاحب، بیگم صاحب؟
 بیگم صاحب۔ (سر اسیروں کو) کیوں کیا ہوا؟

(اصغری سخت اضطراب کی حالت میں اندر داخل ہوتی ہے،
 اصغری۔ بیگم صاحب — بیگم صاحب۔

بیگم صاحب۔ (بیٹا اکیسوں کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر) کیا ہے؟
 اصغری۔ جی..... جمید میاں کا ٹیلیفون کیا ہے کہ گاڑی..... گاڑی ٹھکرا گئی ہے۔

بیگم صاحب۔ (بیٹا اکیسوں پر ہاتھوں کی گرفت اور زور اور مضبوط ہو جاتی ہے، پھر؟
 اصغری۔ اجمد میاں اور ان کے دو من دونوں زخمی ہوئے ہیں اور ہسپتال میں پڑے ہیں۔

بیگم صاحب۔ (ہاتھوں کی گرفت ٹوٹ چلی پڑ جاتی ہے۔) جیسا کہ کیاں بغل سے گر پڑتی ہیں۔ ایک لحظے کے بعد وہ
 روں کٹری رہتی ہے، جیسے پتھر کا ثبت — (پھر اس میں تھوڑی سی جنبش ہوتی ہے۔ اور وہ دوبارے کی
 جانب بڑھتی ہے، کمال سے کمر نوٹ نکالے — ہم اوپنٹی جا رہے ہیں۔

بیگم دوبارے کی جانب بڑھ رہی ہے — غلام محمد اور اصغری دونوں حیرت زدہ ہیں۔)

اصغری تو دیکھ سکتی تھی ہے۔ بیگم پلٹ کر اس کی طرف دیکھتی ہے،

بیگم صاحب کیا ہے؟

اصغری۔ آپ۔ آپ بل رہی ہیں۔ چل سکتی ہیں۔

بیگم صاحب۔ میں؟ اپنی جگہوں میں بیٹھا کیوں کی عدم موجودگی کا احساس کرتے ہوئے، میں؟..... میں کیسے چل سکتی ہوں؟

(ایک دم پکڑاتی ہے اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے)

اصغری۔ (بیگم کے پاس جاتے ہوئے، غلام محمد سے) غلام محمد جاؤ ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کرو۔

(غلام محمد چلا جاتا ہے۔ اصغری بیگم کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی ہے،

بدرد

دوسرا منظر

(دوبی کروچ پہلے منظر میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جو ساز و سامان پہنچا ہوا تھا، اب وہ ناپائیدار ہو چکا۔ اب ہر چیز دیر کی استعمال شدہ معلوم ہوتی ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ کھڑکیوں کے پریشی پر دوسے صبح کی ٹپکی ٹپکی ہوا سے سراپا ہے۔ درمیں ہاتھ کی سانگوان کی سرری پر وہ بہن سیدہ کبیل اوڑھ لیٹی ہے۔ شیشے کی تپائی پر بڑی ہوتی تختی ٹائم میں جس میں نو بجے ہیں، لہرنا شروع کر دیتی ہے۔ علی کی گھنٹی کی آواز

پیدا ہوتی ہے۔ کبیلوں میں جنبش پیدا ہوتی ہے۔ سیدہ کوٹ بدلتی ہے اور آنکھیں کھولتی ہے جبکہ

گزشتہ ٹائم میں کی طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ ایسا کہتے ہوئے اس کے خوبصورت چہرے پر چھاتی ہوئی گھنٹی

پلکیں پڑھتی ہیں۔ کوٹ بدل کر وہ بستر میں ٹیکوں کا سہارا لے کر ڈال ہو پر اٹھاتی ہے اور باہر تو نظر تک

پہنچی ہوئی پٹریوں کا دکھائی نظر دیکھ کر کچن کی سی سترت محسوس کرتی ہے۔ پھر ایک دم ناگھیں چلا کر کبیل اوپر

سے جاتی ہے اور ایک کمرے سے آرتی ہے اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ کس

غرض المان پرندے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ سیدہ اپنے خیالوں میں محو ہے۔ وہ جہاں ہے، شب غازی

کا ڈھیل ڈھلا ہوا پریشی لباس بھی جاس کے بدن سے ڈور ڈور اپنی حریر دنیا الگ بے لگ ہے، اس کے خوبصورت

خطوط سے غافل نہیں..... اور خود سیدہ کا اور ایک ہیں..... اس کا سراپا حسین و جمیل ہے اور اپنے

حسن و جمال سے آگاہ..... اصغری کی کراخت آواز، پرنسے کی غرض المانی کا تقابل پیش کرتی ہے۔ سیدہ

چوکتی ہے۔)

سیدہ۔ (نگاہوں ہی نگاہوں میں کیا ہے؟ پوچھتی ہے،

اصغری۔ بیدیاں ابھی ابھی ہسپتال سے آئے ہیں۔ کتے تھے، جا کے دیکھو، اب جنگ گئیں یا نہیں؟

سعیدہ - کیا خبر لائے ہیں ؟

اصغری - میں انہیں بھیجتی ہوں۔

اصغری چل جاتی ہے۔ سعیدہ کھڑکی کے پاس سے بیٹھ کر ٹکھا دینے کے پاس آتی ہے۔ آئینے میں ایک لمبے کے لیے اپنے آپ کا جائزہ لیتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے کپڑے ہلے ہال سرسری طور پر ٹھیک کر کے سری کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ سری کے سرانے اس کا جارجٹ کا سفید و پڑ فلک رہا ہے۔ اسے اتار دیتی ہے اور ٹری بے ٹری سے اپنے کاندھوں پر ڈال لیتی ہے۔ باہر سے بوٹوں کی چری آواز آتی ہے، نجیعت سے درو عمل کے ساتھ سعیدہ دروازے کی جانب دیکھتی ہے۔ مجید۔ سافرے رنگ کا متوسط قد لڑکا، جو مضبوط ہاتھ پاؤں رکھتا ہے اور جس کے چہرے کے خطوط ترکے منہ بٹے میں ذرا وہ پختہ اور نمبے ہوئے ہیں، اندر داخل ہوتا ہے۔

مجید۔ سلام بھائی جان!

سعیدہ۔ سلام۔

مجید۔ (صوفے کے پاس آکر کھڑے ہوئے) طبیعت کیسی ہے آپ کی ؟

سعیدہ۔ (بے دلی سے) ٹھیک ہے (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) سنا ہے کیا خبر لائے راو اپنڈی سے ؟

مجید۔ (سعیدہ کے سامنے آکر) کوئی خاص بات نہیں (ادھی سی آواز جھری) میں اب انہیں لے آئیں گے یہاں۔

سعیدہ۔ کیوں ؟

مجید۔ وہ تنگ آگئے ہیں (ایک منٹ کا گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے) ان کی جگہ میں ہوتا تو..... بہت ممکن ہے میں نے

خود کشی کر لی ہوتی۔

سعیدہ۔ (اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) کیا معلوم تھا کہ میری قسمت میں یہ لکھا ہے..... اتنے آدمی مرے..... میں

میں ساتھ ہی مر گئی ہوتی۔

مجید۔ مگر یہ اللہ کو منظور نہیں تھا۔

سعیدہ۔ (کھڑکی سے باہر ہاتھوں کا منظر دیکھتی ہے) ہاں، یہ اللہ کو منظور نہیں تھا۔ اللہ کو یہ منظور تھا کہ میری ٹانگ

پر ہلکی سی خراش آئے پر میری ساری زندگی رقموں سے بھر پور ہو جائے (آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں) سفید و پٹے

سے وہ انہیں پُر نزاکت طریقے سے ہرے ہوئے خشک کرتی ہے (اللہ کو یہ منظور تھا کہ میرے سہاگ کی کرلوٹ جائے

اور میں ساری عمر ہمیشہ کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ڈوختی رہوں۔

(سسکیاں لیتی ہے)

مجید۔ (اُٹھتا ہے) بھائی جان حوصلے سے کام لینا چاہیے..... کیا تپا ہے وہ خشک ہو جائیں۔

سعیدہ۔ (سرخش کے طور پر) مجید، کم از کم تم تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ چھوٹے ہو گئے ہیں انہیں ہسپتال

کی چار پائی کے ساتھ لگے ہوئے ڈاکٹروں کا جو فیصلہ ہے میں اُسے اپنی طرح جانتی ہوں وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے ان کی دونوں ٹانگیں ریکارڈ ہو چکی ہیں لیکن لیکن میں ایک بات جانتی ہوں کہ ان میں بہت حوصلہ ہے میں جب بھی ان کو کہا اس گنتی انھوں نے مجھے پاس بٹھا کر کہا، سعیدہ! کچھ نہ کرو، میں بہت جلد تندرست ہو جاؤں گا اور پھر میں تمہیں ان پھاڑیوں کی سیر کراؤں گا جی کا ذکر تم کراچی میں اتنی بابر سے تر سے سن چکی ہو مجھے ان پھاڑیوں سے پیار ہے اتنا پیار ہے کہ تم ان کے متعلق اور سو فی صد شک کرو گی اور وہ مجھے حوصلہ دینے لگے کہ سعیدہ دنیا حادثوں کا دو سوا نام ہے میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری جان نہیں گئی ورنہ پھر وہی بات کہنے کو میرے درگتھے کھڑے ہو جاتے۔

مجید کیا ؟
سعیدہ - (فناک آنکھوں سے غلامیں دیکھتے ہوئے) کو تم کو تم میرے بعد کسی اور کی ہو جاؤ گی — (کانپ جاتی ہے وہ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں مجید ؟
مجید - معلوم نہیں۔

سعیدہ - تجھیں معلوم ہونا چاہیے (اُستہ اُستہ قدم اُٹھاتی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے — دوپٹہ ڈھلک آتا ہے — سوری لباس میں اس کا سلاطین سینہ ڈیڑھی اُٹا چڑھاؤ پیدا کرتا ہے، تم مرد ہو تم اس کے بھائی ہو اگر اس ملاوٹے کقم شکار ہوتے تو ؟

مجید - میں کبھی ایسی باتیں نہ سوچتا ہر مجید بھائی سوچتے ہیں ؟
سعیدہ - کیوں ؟

مجید - ہم دونوں مرد ہیں — دونوں بھائی ہیں — مگر دل اور دماغ کے اعتبار سے ہم دونوں بہت مختلف ہیں۔
سعیدہ - (بڑبڑاتی ہے) دل اور دماغ۔

(صغریٰ داخل ہوتی ہے)

صغریٰ - مجید میاں، آپ کو بیگم صاحب بلائی ہیں۔

مجید - جی، میں آتا ہوں۔

صغریٰ - انھوں نے کہا ہے جلدی آئیے۔

مجید - اچھا (سعیدہ کی طرف دیکھ کر) میں ابھی آتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

صغریٰ - (فرش پر کچے ہوئے لڑکے پر سعیدہ کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے اور اُس کے پاؤں کی انگلیاں چٹکانا پاتی ہے)
سعیدہ - (پاؤں ایک طرف کھینچ کر) جانے دو صغریٰ۔

اصغری۔ (پاؤں سے قریب قریب پیٹ کر نہیں دو اس ٹیگ۔) (انکھیاں چٹکانا شروع کر دیتی ہے)۔..... کیا خبر لائے ہیں مجید میاں۔

سعیدہ۔ کہتے تھے، وہ یہاں آنا چاہیے ہیں۔

اصغری۔ یہ تو بڑی خوش خبری کی بات ہے۔

سعیدہ۔ (دو کھ کے ساتھ) ہاں!

اصغری۔ بیگم صاحب تو بہت ناراض ہو رہی تھیں کہ اتنی دیر کیوں لگا دی مجید میاں نے۔

سعیدہ۔ کہاں؟

اصغری۔ یہاں۔ آپ کے پاس۔

سعیدہ۔ میرے پاس؟ کیا کہتی تھیں بیگم صاحب۔

اصغری۔ کچھ نہیں۔ ان کا مزاج آج کل بہت چڑھا سارہتا ہے۔ انہیں کوئی بات اچھی نہیں لگتی۔ انہیں.....

..... اچھ میاں کا اتنا لڑکھ نہیں جتنا آپ کا ہے..... ہر وقت آپ ہی کے حلق سوہتی رہتی ہیں تو.....

..... اچھ میاں ٹھیک ہو گئے ہیں نا؟

سعیدہ۔ (چڑکر اپنا پاؤں شاکر اٹھتے ہوئے) ہاں ٹھیک ہو گئے ہیں۔

(بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اصغری اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

سعیدہ۔ سلام خادہ جان!

بیگم صاحب۔ سلام بیٹا۔ چنتی رہو پاس اگر سعیدہ کے سر پر پیار کا ہاتھ بھرتی ہے، انہیں معلوم ہو گیا مجید کے.....

سعیدہ۔ ہاں ہاں!

بیگم صاحب۔ غریب تنگ آ گیا ہے وہاں ہسپتال میں..... (اصغری کی طرف دیکھ کر) اصغری تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے)

بیگم صاحب۔ اس کی..... اس کی خواہش ہے کہ وہ تمہارے پاس رہے..... اس نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے مزاجی ہے تو میری سعیدہ میری نظروں کے سامنے ہونی چاہیے.....

سعیدہ۔ (آنکھوں میں سے آنسو پھٹک پڑتے ہیں۔ بیگم کے گلے سے لگ باقی ہے)

بیگم صاحب۔ (آنکھوں میں آنسو رواں ہیں) وہ..... وہ تم سے بے انداز محبت کرتا ہے..... لیکن..... لیکن

اس نے کہا تھا، تم سے پوچھ لیا جائے کہ تمہیں اس کے یہاں آکر رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔

سعیدہ۔ اعتراض.....

بیگم صاحب۔ ہاں بیٹا۔ ہو سکتا ہے، یوں تمہارے ڈاکٹر میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

سعیدہ - وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں — خالہ جان وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔

بیگم صاحب - بیٹا، وہ کچھ ایسے ہی دل و دماغ نکال رہی ہے — اس کو دوسروں کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔

سعیدہ - آریں..... کیوں نہ آئیں (میں نے سوچا) سہی پیدا ہو جاتی ہے، وہ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔

بیگم صاحب - ٹاکٹروں نے کہا ہے، اگر وہ خوش ہے تو انشاء اللہ ایک دو مہینے میں بیسیا کیوں کی مدد سے چل پھر سکے گا..... (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) بیسیا کھیاں..... جو اس کے گاڑی کے حادثے

کی خبر سن کر میری زندگی سے الگ ہو گئی تھیں..... مجھے معلوم ہوا کہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والی ہیں تو

میں ان کو مضبوطی سے پکڑ کر رکھتی..... مگر بیسیا اس بندھن میں جسے زندگی کہتے ہیں مضبوط سے مضبوط کھینچتی

لے ڈالتی ہے اور ایک عمومی تنکا ہی کنارے لگا دیتا ہے..... (توقف کے بعد) سعیدہ بیٹا، امجد نے عہد سے

ایک اور بات تم سے پوچھنے کو کہا تھا؟

سعیدہ - کیا خالہ جان؟

بیگم صاحب - کیا تم اس سے جنت کرو گی؟

سعیدہ - (ہلکھلا کر) جنت.....

بیگم صاحب - (سعیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) میں تجھیں زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتی.....

(چل جاتی ہے)

سعیدہ - (دوپٹے سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) جنت — جنت؟ — دل و دماغ آہستہ

آہستہ قدم اٹھاتی، آتش دان کے مین و سٹیم میں لٹکی ہوئی اپنی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی

ہے، بتا — کیا تو اس سے جنت کرے گی؟

(ٹمکے میں رکھی ہوئی پیالیوں کی آواز آتی ہے) — اسفری ناشتہ یہ اندر داخل ہوتی ہے اور پیوں والی

تپائی صوفے کے آگے لے جاتی ہے اور اس پر ناشتہ چھن دیتی ہے)

اصفری - دو من بیگ، امجد میاں سے جنت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی؟

سعیدہ - (ایک دم چڑھتی ہے) کیا کیا؟

اصفری - جی کچھ نہیں..... ایسے ہی آپ سے باتیں کر رہی تھی — ناشتہ کر لیجیے۔

سعیدہ - تم جاؤ۔

اصفری - جی رخصا۔

(اصفری ایک نظر سعیدہ کو اور ایک نظر اس کی تصویر کو دیکھتی باہر چلی جاتی ہے۔ سعیدہ آہستہ آہستہ

سوچ میں متفرق صوفے کی طرف بڑھتی ہے اور سہری پر لیٹ جاتی ہے۔)

سعیدہ۔ (چٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) دو مہینے، امجد میاں سے جنت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی۔
(اور کئی آوازیں) اور کون کرے گی؟ — اور کون کر سکتی ہے؟

(پہرہ)

تیسرا منظر

لنگاہ دلا سے ملحقہ باغیچہ — وسط میں پست قد ترشی بھرتی بھاریوں کے درمیان قمار ہے جس میں سے پانی کی چھوڑ و شرک و شرک کر باہر نکل رہی ہے۔ دھوپ کھل چکی ہے آسمان نکھل رہا ہے۔ نضایاں عجیب سا کنوارا ہیں — بے حجاب۔ ہر فردہ نطارے کی دولت ہے گویا قبولیت کا منظر ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے ہوا چلتے چلتے ٹھہر گئی ہے کہ بارش کی باتیں پھر سے اپنی زلفیں سنواریں، پھول اپنے گالوں کی شرمیلی درست کر لیں اور جھوڑوں کو جن کلیوں کا شہر چڑھنا ہے بے خوف و خطر چوم لیں — اس نضایاں گھاس کے ہوا قیامین پر کرسیاں بچھیں ہیں۔ ایک میں سعیدہ لنگاہی لباس میں بلوریں خود اپنا ہی عکس بن چکی ہے۔ دھوپ کی حدت سے اس کے غانے کے پلے سے غبار سے اس کی اپنی ملا بیاں، امرنیاں بن رہی کہ باہر نکل رہی ہیں۔ دوسری کرسی میں سعیدہ ہے جو ہلے ہوئے سگرٹ کے کٹل لنگاہ دھوپ کے نیلے نیلے پھلتے من سے نکال رہا ہے، اس کا چہرہ مٹھن ہے۔ سامنے امجد ہے — لپا بچوں کی کرسی میں اس کے چہرے پر لپا بچوں کی کرسی والی کیفیت ہے جو کس اور کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی — اس کا رنگ بہت زرد ہے مگر اس کی آنکھوں میں چمک ہے جو سعیدہ کے سن و جمال کی بازگشت ہے۔

امجد۔ (اپنے دائیں بائیں دیکھ کر) آج موسم کتنا دھیر ہے۔

سعیدہ۔ (فرا متوجہ ہو کر) جی ہاں۔

امجد۔ سعیدہ، جاؤ، سعیدہ کو گھماؤ — ان پہاڑیوں کی سیر کر لاؤ — (پچھے ٹکر دیکھنا چاہتا ہے) انہوں نے مجھ سے ٹکر نہیں جاتا۔ سعیدہ اٹھو — میری کرسی گھما کر ادھر کر دو — یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہونا چاہیے۔

سعیدہ اٹھتا ہے لیکن سعیدہ اس سے پہلے اٹھ کر امجد کی کرسی کا رخ پھیر رہی ہے۔ اب تینوں کا منظر پہاڑیوں کی طرف ہے جو دھوپ میں تیز لنگاہ تک اپنے منہ دھوپ رہی ہیں)

امجد۔ پہاڑیوں کے منظر کو اپنی لنگاہوں سے چیتے ہوئے، سعیدہ، یہی ہیں وہ پہاڑیاں جن سے مجھ کو یاد ہے — اتنا یاد رکھیں بیان نہیں کر سکتا — (سعیدہ سے) جاؤ، سعیدہ کو ساتھ لے جاؤ اور ان کی سیر کر لاؤ سعیدہ سے، سعیدہ، جب تم ان پر چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگو گی اور تمہاری سانس رکنے لگے گی تو تمہیں ایسا محسوس

ہو گا کہ اس سے بڑھ کر کوئی نہیں اور کوئی لذت نہیں.... میں مجید کو زبردستی ساتھ لے جانا تھا مگر یہ ایک پڑھائی کے بعد ہی ہمت ہار دیتا تھا۔ مجھ سے کہتا تھا، جہاں جان مجھے آپ کا یہ شغل پسند نہیں۔ یہ کیا کر آدمی بیکار میں اپنے اپنے کمرے ہوٹل پر جاتے رہتا ہے، ہڈیوں اور ان کو مرکز لے لائن اس کی کھڑکی کھلی نہیں آئے گا۔ بکریں سعیدہ ۹

سعیدہ۔ (سکڑا کر کہا، جی ہاں۔)

امجد۔ (مجید سے، جاؤ بار۔ سعیدہ کو لے جاؤ۔ کبھی کام چلی کیا کرو۔)

مجید۔ (سعیدہ سے، چلیے جہاں جان۔ مگر میں شرم لگاتا ہوں، آج تو یہ چلی جائیں گی۔ لیکن پھر کبھی ابو صر کا رخ نہیں کریں گی۔ سعیدہ۔ نہیں نہیں۔ یہ آپ کی بات ہے؟)

امجد۔ اس لیے کہ ہر دل و دماغ کا اتنی ہے۔

سعیدہ۔ دل و دماغ؟ یہ کیا بلا ہے دل و دماغ؟

مجید۔ آپ کو ایک ہی پٹری پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا۔

امجد۔ (ہنستا ہے) تم بچتے ہو مجید۔ سعیدہ کی زندگی کے سامنے تو ایک پہاڑ ہے۔ اگر یہ ایک معمولی سی پٹری کی پڑھائی سے آگاہی تو.....

سعیدہ۔ چلیے مجید بیان۔

مجید۔ چلیے۔

ادولوں چلے جاتے ہیں۔ اہل سکڑا ہے۔ اصغری داخل ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ ہے جس میں چھلے اور کٹے ہوئے سیب ہیں۔ وہ معنی خیز نظروں سے مجید اور سعیدہ کو دیکھتی ابھری جانب آتی ہے اور اس سے مخاطب ہوتی ہے،

اصغری۔ توڑے سیب کھا لیے۔

امجد۔ اچھا سعیدہ اور مجید کو ڈسٹھانوں میں اتارتے دیکھ رہا ہے، کھاؤں گا۔

اصغری۔ راضی کی طرت دیکھ کر، آج دو میں یکم کتنی خوبصورت دکھائی دے رہی ہیں۔

امجد۔ (ایک دم پلٹ کر اصغری کو دیکھتے ہوئے) دکھائی دے رہی ہیں؟

اصغری۔ (خشیت سی دکھا ہٹ کے ساتھ) جی ہاں۔

امجد۔ (پھر سعیدہ اور مجید کو دیکھتے ہوئے) خوبصورت ہے خوبصورت دکھائی نہیں دیتی۔ ہونے اور دکھائی دینے میں زمین

آسمان کا فرق ہے اصغری۔

اصغری۔ جی ہاں۔ یہ تو ہے۔

امجد۔ لاؤ سیب۔

اصغری۔ (پلیٹ بڑھاتے ہوئے) حاضر ہیں — ہر چھلے ہوئے ہیں۔

امجد۔ تمہارا مطلب ؟

اصغری۔ چھلی ہوئی چیز سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا ہے (ہنس کر)..... اس کے ٹرنے ٹرنے کا تو تجربہ ہے اُن کے پاس۔

امجد۔ (ہلستا ہے) اصغری! — تم اب بہت شیطان ہو گئی ہو۔

اصغری۔ (سجیدگی سے) شیطان ؟ — امجد میاں — آپ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ شیطان خدا کا ہے بڑا فرشتہ

تھا جس نے آدم — یعنی مٹی کے پتلے کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

امجد۔ ہاں ہاں.....

اصغری۔ اور فرشتوں کے اس ہیڈ ماسٹر کو اس کی منزاوی گئی تھی.....

امجد۔ درست ہے.....

اصغری۔ تو یہ بھی درست ہے۔

امجد۔ کیا ؟

اصغری۔ کچھ بھی نہیں — درست آخر ہوتا کیا ہے ؟ — وہی، جسے آپ درست سمجھیں، یا درست کہنے کی کوشش

کریں، یا وہ غلطی جو آپ ایک دفعہ اس لیے کر لیں کہ آئندہ درست ہوتی رہے گی۔ یا وہ درست ہے جسے آپ غلطی میں تبدیل

کر کے دیکھتے ہیں کہ آپ پھر درست کر سکتے ہیں — بلکہ، سب کو اس ہے — میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں

امجد میاں۔

امجد۔ تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو ؟

اصغری۔ میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں — لیکن ایک عورت۔ ہوں امجد میاں۔

امجد۔ میں پُرس نہیں سمجھا

اصغری۔ (سیب کی ایک تاش اٹھاتی ہے اور امجد میاں کے منہ کو؛ اس سے جاتی ہے) آپ سیب کھائیے۔

امجد۔ (سیب کی تاش دانتوں میں لیتے ہوئے) تم پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کیا کرتی تھیں۔

اصغری۔ آج موسم ہی کچھ ایسا دغریب ہے۔

امجد۔ کیا نہیں ہے ؟

اصغری۔ (سیب کی دوسری تاش اٹھا کر) کیوں نہیں..... یہ لیجیو یا ایک اور تاش.....

(دوسری تاش امجد کے کھلے ہوئے منہ میں ڈالتی ہے)

امجد۔ (سیب کھاتے ہوئے کچھ وقف کے بعد) اصغری !

اصغری۔ (جو پہاڑوں کا منظر دیکھنے میں غوطی چمک کر، جی؟

امجد۔ شادی شادی کر دی؟

اصغری۔ شادی؟

امجد۔ ہاں — اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔

اصغری۔ کیوں امجد میاں؟

امجد۔ شادی بڑی اچھی چیز ہے — دنیا میں ہر شے کی شادی ہو جانی چاہیے — زندگی میں شادی سے بڑھ کر اور کوئی

خوشی نہیں — میں اتنی باتوں سے کہوں گا کہ اصغری کی جلد ہی شادی کر دیجیے۔

اصغری۔ شاہجہاد میاں!

امجد۔ کیوں؟

اصغری۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔

امجد۔ کس سے؟

اصغری۔ (بہتر سے پریشانی سے)۔ بہتر فکر نہ کرتا ہے، شادی سے۔

امجد۔ (ہنستا ہے، ہلکا)

اصغری۔ سچ کہتی ہوں امجد میاں — مجھے واقعی ڈر لگتا ہے — اول تو ایک لڑکائی کی شادی ہی کیا ہے۔ ہوئی ہوئی،

نہ ہوئی — کیا فرق پڑتا ہے..... لیکن ہو گئی تو کہیں ایسا نہ ہو گاڑی پٹری سے اُتر جائے اور.....

امجد۔ (دکھ کے ساتھ)۔ اصغری!

اصغری۔ (لکھ جاتی ہے، گاڑی پٹری سے اُتر جائے اور اصغری تیر تیر ہونے سے بچ جائے — ایک ٹانگ سے لنگڑی

ایک بانڈ سے ٹوٹی اور ایک آنکھ سے اندھی ہو جائے — آدمی اصغری غائب ہو جائے — آدمی بچ جائے

— نا امجد میاں — میری شادی کا نام نہ دیجیے — شادی تو ایک سالم چیز ہے — آدمی یا

چوتھائی چیز کو شادی نہیں کہتے۔

امجد۔ (سوچتے ہوئے)۔ اصغری!

اصغری۔ گھنٹی گھنٹی آواز میں، جی!

امجد۔ تم ٹھیک کہتی ہو آواز میں آتا رہے گا اور پیدا ہو جاتا ہے، لیکن دیکھو مجھے، خیمہ نہ کرو..... میں خوش رہنا چاہتا ہوں

— اپنی ان دو شکستہ ٹانگوں پر بھی خوش رہنا چاہتا ہوں — مجھے رنجش نہ — میرے دل میں درد نہ ہے —

اصغری۔ (ابھرا ہواؤں پر ہنستی ہے)۔ مجھے معاف کر دیجیے امجد میاں (آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں)۔ جانے میں کیا بات گئی۔

آپ خوش رہیں — خدا آپ کو خوش رکھے۔

امجد۔ (دہاوی کے ساتھ) خدا کا نام نہ لو — اگر اس کو مجھے غوش رکھتا ہوتا تو مجھے اس سادھے لاشکار ہی کیوں کرتا — کیا خدا تو ارکا رہنے شکاری قیصلے میں کیوں نہ ڈال لیتا — اس کا نام نہ لو — میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے — مجھے اگر غوش دینا ہے تو اپنے رہے سے جو دہوی کے سارے غوش رہنا ہے — انھی ٹوٹی ہوئی ٹینوں پر چڑھنے کی بجائے اپنی غوشی کے کشتیالے بنائے ہیں۔

اصغری۔ صوف اپنی غوشی کے؟

امجد۔ (بہت زیادہ دھکے کے ساتھ) اصغری خدا کے لیے — تم اتنی غلام کیوں ہو گئی ہو۔ — تمہارے منہ میں گزبان پیدا ہوئی ہے تو کیا اس لیے کہ تم میرے نوکر میں اضافہ کرو۔ میں تم سے دھڑست کرتا ہوں کہ میری مدد کرو — ایک ایسا نیک کی مدد کرو کہ وہ اپنی ٹوٹی ہوئی زندگی جوڑ جاؤ کے چند دن — صوف چند دن گزارے۔

اصغری۔ آپ دھڑاست نہ کیجیے اجدیاں — میرا کچھ بھلتا ہے — آپ انکس ہیں، حکم دے سکتے ہیں — میری زندگی حاضر ہے۔

(اس کے موٹے موٹے اعضاء اجد کے سیلوں پر لگتے ہیں — اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ایک طرف منہ پھل جاتی ہے، امجد۔ اگر دن بھٹکا کر اپنے سیلوں کی طرف دیکھتا ہے جی پر سے اصغری کے کاسٹرو لٹک جاتے ہیں — گردن اٹھا کر اصغری کو دیکھتا ہے جو کہ جا رہی ہے)

(کوٹھی کی جانب سے نیگم نمودار ہوتی ہے۔ شمال اڈ سے ہاتھ میں زیورات کے ڈبے لیے وہ اجد کے پاس آتی ہے، بیگم صاحب۔ امجد بڑھا۔

(امجد۔ (جلدی سے اپنے پاؤں اکھل میں چھپا کر) جی!

بیگم صاحب۔ سعیدہ کے یہ جو زیورات تم نے پسند کیے ہیں تیار ہو کر لگائے ہیں۔ لو۔

(ڈبے امجد کی گود میں رکھ دیتی ہے)

امجد۔ (بچوں کے سہاشتیاق سے ہر ڈک بکھول کر سارے زیورات دیکھتا ہے اور اُبلتی ہوئی غوشی کا اظہار کرتا ہے) بہت اچھے ہیں — بہت عمدہ ہیں — بہت حسین ہیں — لیکن اتنے ننیدہ تھی سعیدہ ہے۔ اصغری:

— اصغری! — ادھر آؤ۔

(اصغری جو ایک سو کے ساتھ ٹگ کر کھڑی تھی۔ اجد کے پاس آتی ہے۔ اجد سے تمام زیورات دکھاتا ہے،

امجد۔ کس، کیسے ہیں؟

اصغری۔ آپ خود دیکھ لیں — حسین ہیں لیکن اتنے ننیدہ تھی وہ من بیگم۔

امجد۔ (دال سے) اتنی جان بچھڑے کب آئیں گے۔

اصغری۔ کل تک آجائیں گے۔

امجد۔ اوروہ بایسکوپ نشین — کہوں نہیں آئی ابھی تک ۔
 بیگم صاحب ۔ بیٹا — مجید اوروہ سے آیا تھا۔ ایک دوست میں آجائے گی۔
 امجد۔ اچھا (رنگ کر) آئی جان !
 بیگم صاحب ۔ جی بیٹا ۔
 امجد۔ کچھ اور بھی ملگوانا چاہیے سیدہ کے لیے — میں اسے ایک ٹکٹے کے لیے بھی اداس نہیں دیکھنا چاہتا — ہر روز اس کے لیے کوئی نئی چیز ضرور ہوتی چاہیے ۔
 بیگم صاحب ۔ سب کچھ تیار ہے اختیار میں ہے جو چاہو کرو۔
 امجد۔ اختیار بہ (رنگ کر) ہاں تو..... امی جان ۔
 بیگم صاحب ۔ جی !
 امجد۔ کمال کر دیجیے — اسپورٹس کی دکان میں جائے — جتنے کھیل اسے مل سکیں لے آئے۔..... سیدہ اور مجید کھیلنا کریں گے اور میں دیکھا کروں گا..... اوروہ کیجیے..... اس سے کہیے کچھ ایسے کھیل بھی لے آئے جس میں..... میں بھی سیدہ کے ساتھ کھیل سکوں۔

بیگم صاحب ۔ (بے حد متاثر ہو کر) امجد کا سامنے ہاتھوں میں لے کر میرے بچے !
 (امجد ہلکے ہلکے کودنا شروع کر دیتا ہے — اسفریضہ نہیں کر سکتی اور)
 جیننی ہوتی ایک طرف (دور جاتی ہے) بیگم کی آنکھوں سے غامضی آنسو ادا ہیں،

برودہ

چوتھا منظر

(دوبی کو جو پہلے اور دوسرے منظر میں ہے۔ رات کا وقت، نضا باطل خاموش ہے۔ بڑے بڑے ٹکٹے طریق پر بصری پر سیدہ تین چار گڑ گڑتے ٹکیوں میں اپنا نیم منہ بہاؤ والا سر دبائے کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول ہے..... نظری کتاب کے حروف کے بجائے اس کے اپنے دل کی جانب منسوب ہوتی ہیں۔ سینے کے مقام پر کھیل کی سٹمیں چلیاں کھڑی ہیں اور نضے سے تلاب میں جڑ کا نقشہ پیدا ہو رہا ہے — بایک طرف لہجے کی پستالوں جیسی چار بائی بھی ہے — اس کے ساتھ ایک لڑکائی گڑی میں امجد بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کتاب ہے اور اسے یوں پکڑے ہے جیسے کوئی شیشے کی بنیڑ ہے۔ اس کی نظری پریشان ہیں۔ کتاب کے حروف سے اٹھ کر کہیں وہ سیدہ کے ہاتھوں پر جا بیٹھتی ہیں۔ کہیں اس کے سر سے بالوں والے سر پر جو ٹکیوں میں دھنسا ہے۔ آخر اس سے نہیں رہا جاتا — کتاب ہنگامہ کے اپنی گود میں رکھتا ہے اور بڑی

امجد۔ معلوم نہیں کیوں — پس ایسا لگتا ہے کہ نیند کبھی آتی تھی نہ آئے گی..... میں تو وہ راتیں بھی یاد کرنا بھول گیا ہوں جب سو یا کرتا تھا۔

سعیدہ۔ کاش، میں آپ کو اپنی نیند دے سکتی۔

امجد۔ نہیں سعیدہ — میں اپنی عزیز چیز تم سے نہیں بھینٹنا چاہتا — یہ تمہاری آنکھوں ہی کے لیے سلامت رہے جو نیند میں ادبھی زیادہ خوبصورت ہر جاتی ہیں — جاؤ، اب سو جاؤ۔

سعیدہ۔ میں کم بخت تو سو ہی جاؤں گی۔

امجد۔ ایسا نہ کرو — خدا تمہارے بخت بلند کرے..... جاؤ سو جاؤ۔

سعیدہ۔ (چراغ) آپ کیوں میرے ساتھ اتنی نرمی سے پیش آتے ہیں..... امجد صاحب، مجھے اس سے بڑی وحشت ہوتی ہے — خدا کی قسم آپ کی یہ نرمی، یہ حلیم، یہ انکسار ایک دن مجھے پاگل بنا دے گا۔

(مجھ بھلا کر تیزی سے مسمری کی طرف بڑھتی ہے اور خود کو بستر میں گرا دیتی ہے)

امجد۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے منہ سے جو باتیں نکلتی ہیں، وہ سب ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہیں۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے۔ کروٹ بدل کر وہ اپنا منہ دوسری طرف کر لیتی ہے — امجد اپنی گود میں سے

کتاب اٹھاتا ہے اور اس کی دوتی گردانی شروع کر دیتا ہے — سکوت کا عالم ہے۔ ہلکی ہلکی ہنر روشنی میں

یہ سکوت ادبھی زیادہ خیف ہو گیا ہے — کافی لمبا عرصہ خاموشی میں گزرتا ہے، بڑی بڑی خاموشی میں

— امجد کے چہرے پر روشنی قبروں کے ہنر ظلمات کی طرح پڑھی ہے — اس کی نگاہیں کتاب سے

ہٹ کر بار بار سعیدہ کی جانب اٹھتی ہیں، اور شرمسار ہر کر دے پاؤں ٹوٹ آتی ہیں — قہقہوں کی دیر کے بعد

امجد بہت زیادہ مضطرب ہو جاتا ہے)۔

امجد۔ سعیدہ!

سعیدہ۔ جگا

امجد۔ میں — میں تم سے ایک درخواست کرنی چاہتا ہوں۔

سعیدہ۔ (کروٹ نہ بدلتے ہوئے) کیا؟

امجد۔ کیا..... کیا آج ہماری پہلی رات ہو سکتی ہے.....

سعیدہ۔ (بستر میں لڑھکی جاتی ہے)

امجد۔ وہ رات — جو ابھی تک نہیں آئی۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے)

وقفہ

امجد۔ سعیدہ۔

سعیدہ۔ جی!

امجد۔ کیا تم میری یہ درخواست قبول کر سکتی ہو؟

سعیدہ۔ وکروٹ بدل کر ادھر کو گھسیٹتے ہو، اس کی آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش تیر رہی ہے، کیسے امجد صاحب! امجد جھوٹ ٹوٹ..... محض میرے بھلاؤ کے لیے..... تم یہ فرض کر لو کہ میں تمہارے پیڑ میں ایسا ہوں..... میں یہاں فرض کروں گا کہ تم میرے پیڑ میں بیٹھی ہو..... میں تم سے وہی باتیں شروع کروں گا جو پہلی رات کو مجھے تم سے کہنا تھیں..... تم اسی طرح جواب دینا جس طرح کہ تمہیں دینا تھا..... میرے لیے..... کیا میرے لیے تم یہ جھوٹ بولنا کا کھیل کھیل سکتی ہو سعیدہ۔

سعیدہ۔ (آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش کی بجائے رحم کے آنسو تیر رہے ہیں، میں حاضر ہوں امجد صاحب۔ امجد۔ شکریہ۔

(طویل وقفہ)

امجد۔ آج بارہوی پہلی رات ہے سعیدہ۔ وہ رات جس میں جوانیاں راتِ جنّت کی طرف پہلے قدم اٹھاتی ہیں۔ وہ رات جس کی تمام پستانیوں میں وہابی فوط لگاتے ہیں اور ایک ہر جاتے ہیں..... شرماؤ نہیں..... یہ رات قزوہ ہے جب تمام پوشیدہ جینٹھوں کے گھونگھٹ اٹھنے کے لیے سینا بند ہوتے ہیں۔ جلی کی سرگوشی، نرم سی آہ، ایک چھوٹا سا پس، پریدہ سانس کا خفا سا جگر، اچھی ان گھونگھٹوں کے پٹ کھول دیتا ہے۔ اس تمدناً ہستہ کو بے معلوی سرسراہٹ تک بھی نہیں ہوتی اور آدمی اور عدار۔ پردے و دروازے تمام مراحل طے کر جاتا ہے۔ یہ وہ رات ہے جب نگاہیں نکرا کر کوئی تاریک جھڑکی میں اور یہ آفتاب دونوں زندگیوں کے ایک ماتھے پر پڑتی جاتی ہے..... یہ وہ رات ہے۔ پہلی رات، جب سے پہلی جب آدم کی پسلیاں چیر کر خراگتائی گئی تھیں۔ یہ وہ رات ہے جس کے حصول کے لیے جہاں کی جائے ناز و بچا کر زندگی اکثر مجبوراً رہی ہے..... یہ وہ رات ہے جس میں حجاب کی تمام گرہیں فطرت کے نامی نوکھوتے ہیں۔ یہ وہ رات ہے جب قدرت کے تمام کارخانے صحت ایک ہی پُرزہ ڈھال رہے ہوتے ہیں۔ وہ پُرزہ جس نے کائنات کے ان تمام کارخانوں کو حرکت بخشتی تھی۔ یہ وہ رات ہے جب تمام اندازیں واپس اپنے غزروں میں پہلی جاتی ہیں کہ اس آواز کا جس نے انسانی آرام و سکون سے گھڑ جائے جس میں گئی کی گونج ہے..... یہ وہ رات ہے جس کا ہر پردہ اچھا ہے بے نلکے۔ یہ وہ رات ہے۔ ہر آنے والی رات جس کے حضور جھوٹی بھیلانے بھیک کی منتظر کھڑی ہے۔ یہ وہ رات ہے جب بدن کا دھڑاں دھڑاں منہ کھول کے پوتا ہے اور کان کھول کے سُفتا ہے..... بڑے بڑے اُن کھے دانے۔ بڑے بڑے اُن کھائے دانے..... (ایک دم چرخ گئی ڈھانچ ہو۔ ڈھانچ ہو..... سعیدہ اپنا ہاتھ ڈھانچا)

..... یہ کچھ دُور ہے — اس کا ایک ایک خط گوار کی وحار کے مانند میری قلمی خواہشوں پر بھر رہا ہے.....

ڈھانپ لو — خدا کے لیے اپنا جیم ڈھانپ لو۔

سعیدہ - (اگلی ٹکی بندھتی میں گھاس کی نرم نرم شیوں سے بنی ہوئی لاش کے مانند لٹی ہے، اس کا بدن نوزد رہا ہے — ایک ایک انگ کانپ رہا ہے، جی؟)

(مجید -) ہلک ہلک کر رونے لگتا ہے، اپنا بدن ڈھانپ لو۔

(سعیدہ اپنا نوزدنا بدن کبیل سے ڈھانپ لیتی ہے -) مجید انکھوں کے سامنے ہاتھ رکھے روتا رہتا ہے)

پروردہ

پانچواں منظر

ننگہ بالے سے ملحقہ باغیچہ — شام کا وقت - قوارے کا پانی کھل کھل رہا ہے۔ سایہ گمرے ہر پکے ہیں، شکر

میں ناشتہ پھاڑاں شام کے صندلوں میں سیٹھنی اختیار کر گئی ہیں۔ آسمان نے اسیسا لگتا ہے اپنے بدن پر

جبوت مل رہی ہے۔ تختوں کے سیٹھ پر سبزہ ناموش لپٹا ہے۔ کوسیاں خالی ہیں — ساری نضا خالی ہے اس

نرم کی طرح جرم میں تصویر بڑی ہلنے والی ہے — مجید اور سعیدہ کی ہنسی کی آواز آتی ہے — چند لمحات

کے بعد دونوں ہنسے، بڑی شکل سے اپنی تھکاوٹ کا بوجھ اُٹاتے داخل ہوتے ہیں — سعیدہ نڈھال ہو کر

خود کو کسی میں گر لیتی ہے مجید اس کے پاس کھڑا رہتا ہے)

سعیدہ - (دونوں پر نگیاں مارتے ہوئے، اُٹ — اُٹ — تہ!

مجید - (ہنستا ہے) آپ تھک گئیں — وہاں آپ کو؟

سعیدہ - (گھبرا کر) نہیں نہیں — اصغری کو بھیج دیجیے — مجھ سے تو اب دو قدم بھی پینا دشوار ہے۔

مجید - (مسکراتا ہے) بہتر —... (اگے بڑھ کر سعیدہ کے چہرے پر خم کرنے سے باز رہ کر آواز دے لٹ انگلیوں سے اُٹا کر ایک طرف کر

دیتا ہے۔

سعیدہ - (بہت زیادہ گھبراہٹ سے) میں جاتی ہوں اندر — اُٹھنے لگتی ہے)

مجید - (ایک طرف دیکھ کر) او، وہ اصغری خود ہی آگئی — آؤ، اصغری — جہاں جان کے پاؤں وہاں دو۔

(اصغری داخل ہوتی ہے — اس کے ہنسنے کے اشتعالی کرنے کیلپا رہے ہیں جیسے کچھ کہنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔

پاس آ جاتی ہے،

اصغری - (سعیدہ سے) دو من یکم تھک گئیں آج؟

سعیدہ - (دونوں پر نگیاں مارتے ہوئے) ہاں!

اصغری۔ (گھاس پر بیٹھ کر، سعیدہ کی ایک پٹلی دبا کر خراج کرتی ہے۔ خطاب مجھ سے ہے، اے سب مجیدیاں! قصور ہے..... (پتی بڑی سیر اور دانتی جلدی.....) (مجھے نہ کھیا ہی ہے) ہر چیز جو ہے، میرے ہونی چاہیے (ہوئے ہوئے دباتی ہے، اس طرح — ہرے ہوئے، سعیدہ سے، کیوں دولہن بیگم — کچھا آرام محسوس ہوا آپ کو؟ سعیدہ۔ (دوسری ٹانگہ جو اصغری کی گرفت سے آزاد ہے، اضطراب کا شدید مظاہرہ کرتی ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!) اصغری۔ (مجید سے،) مجیدیاں! آپ جانتیں — منہ ہاتھ دھو آئیں — گرد و خراب سے آپ کا چہرہ بالکل اُن صوبیا آلودہ نہ بن جائے۔ مجید۔ (تیزی سے، تم بہت گستاخ ہو گئی ہو — یہ سب..... اصغری۔ (مجید کی بات کاٹ کر،) دولہن بیگم! قصور مجھوں نے — منہ لگایا ہے (سعیدہ کے چہرے کی حرکت دیکھ کر، ایسا خوبصورت منہ!)

(مجید نگاہوں میں نگاہوں میں عقدہ برساتا چلا جاتا ہے)

اصغری۔ (ہنستی ہے،) مجید میاں کی شکل و صورت یوں تو ماشاء اللہ بڑی اچھی ہے — گونٹھے میں ہمیشہ بگڑ جاتا ہے — آپ کا کیا خیال ہے۔

سعیدہ۔ (تم مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو ناٹھنا جانتی ہے، گرا صغری کی بیسورہ گرفت کے باعث نہیں اٹھ سکتی، چھوڑ دو مجھے۔ اصغری۔ (دباتے ہوئے،) میں اس خدمت سے خود کو چھڑا رہا نہیں چاہتی (سعیدہ کے پاؤں سے سیٹھلاؤ آدھرتی ہے،) مجید! اب کدو ہے تھے، میں گستاخ ہو گئی ہوں — کیا یہ درست ہے۔ دولہن بیگم۔ سعیدہ۔ بالکل درست ہے۔

اصغری۔ (بڑے اطمینان سے سعیدہ کے پاؤں کی انگلیاں ٹھاتے ہوئے،) تو یہ بہت بُری بات ہے — نوکرانی کو گستاخ کہیں نہیں ہونا چاہیے — آپ میرے کان پہنچیے۔

سعیدہ۔ خاموش رہو!

اصغری۔ یہ ظلم ہے — زبان بندی بہت بڑا ظلم ہے دولہن بیگم — میں نے یہی کونسی بات کی جو آپ کو ناگوار لگ رہی۔ سعیدہ۔ (اضطراب کے ساتھ،) قصاری سب باتیں — مجھے ناگوار لگ رہی ہیں۔

اصغری۔ اصغری بے چاری اب کیا کرے..... (وقت کے بعد،) میں تو یہ سمجھتی تھی کہ آپ عیسٰی مکتبی بیگم کی نوکرانی ہیں، اس ایک برس کے اندر اندر ہی مجھے سب کچھ آگیا ہے..... یہ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں غلط سمجھتی تھی — میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں سیکھا؟ — لیکن یہ کس کا قصور ہے؟ — سیکھنے والے کا یا سکھانے والے کا؟

سعیدہ۔ (اپنی دونوں ٹانگیں ایک طرف پھیلے ہوئے فیصلہ کن انداز میں،) تم کتنا کیا جانتی ہو؟

اصغری۔ (صوفی حیرت سے،) میں؟

سعیدہ۔ ہاں تم — کیا کتنا جانتی ہو تم؟

اصغری۔ (سوچتے ہوئے) کہنے کو تو میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

سعیدہ۔ (اُدھ کر ننگے پاؤں گھاس پر چلتے ہوئے) تو کہہ ڈالو آج۔ مجھے تمہاری ہر روز کی میںیں میںیں چٹکیاں پسند نہیں۔ جو تم کہنا چاہتی ہو، میں سننے کے لیے تیار ہوں۔

اصغری۔ آپ بڑی بہت والی ہیں۔ دولہن بیگم۔

سعیدہ۔ میں بہت والی ہوں، یا بزدل ہوں، تم اسے چھوڑو۔ جو کہنا چاہتی ہو آج اُگلی ڈالو۔

اصغری۔ یہ تھے آپ کو اور مجھے دونوں کو تکلیف دے گی۔

سعیدہ۔ میری تکلیف کا تم کچھ خیال نہ کرو۔ میں برداشت کروں گی۔

اصغری۔ (سوچتے ہوئے) میں بھی تھی میرے واقفوں سے دل ہونے لگا، ای دیکھو کہ آپ ڈر جائیں گی۔ یہ اب ایسا لگتا ہے کہ آپ چلتی چلتی ایسی جگہ پہنچ گئی ہیں جہاں دشمنوں کی کوئی پروا نہیں رہتی۔ اب تم مجھے خوف آنے لگے آپ سے۔

سعیدہ۔ (اضطراب میں ادھر ادھر دھرتے ہوئے) اصغری!

اصغری۔ (چونک کر) جی ہاں

سعیدہ۔ تم مجھے یہ بتاؤ۔ اگر اجداد میں گاڑی کے حادثے میں مر جاتے تو میں کیا کرتی؟

اصغری۔ آپ ہاں۔ مجھے معلوم نہیں آپ کیا کرتیں۔

سعیدہ۔ میں جہاں ہوں، خوبصورت ہوں۔ میرے بیٹے میں ایسے خدایوں اور ان میں جہاں ستر برس تک اپنے خیالوں

کا شہد بلا بلا کر پالتی پڑھتی رہی ہوں..... میں ان کا گلہ نہیں کھوٹ سکتی۔ میں نے بہت کوشش کی ہے اصغری

میرا خدا جانتا ہے، میں نے بہت کوشش کی ہے، لیکن میں اپنے باحقوں کو اس قتل پر آمادہ نہیں کر سکی

تم مجھے کہہ دو کہہ دو۔ نند کہہ دو۔ اخلاق باختہ کہہ دو..... تم ایک نوکرانی ہو۔ میں تمہارے

سلطنت حضرت کرتی ہوں کہ میں اپنی جوانی کا باغ جس کے چتے چتے، بوٹے بوٹے میں میرے کنوارے ارمانوں کا گرم

گرم غری و ڈر رہا ہے، اپنے باحقوں سے نہیں اجازت لے سکتی..... ویسے میں کسی کو بھی اجازت دے سکتی ہوں

کہ وہ میری آنکھیں بند کر کے۔ نہیں۔ میرے تمام حس میں تارے لگا کر بڑھاپا اور دند پے لگاتی ترین

گہرائیوں میں اُتار دے۔ یا ایک ہی بار دھکا دے کہ مجھے اپنے ارمانوں کی لذت ہوئی چٹانوں کی چوٹیوں پر سے

نیچے گرا دے جی پر میں اس وقت تک دامن سمیٹے شہد ہواؤں کا مقابلہ کرتی رہی ہوں۔ میں تم کو بھی اس کی اجازت دیتی ہوں۔

اصغری۔ (شکست خوردہ اُٹھتی ہے) ایس دولہن بیگم۔

سعیدہ۔ میں ایک ایسے دوراں پر کھڑی ہوں اصغری، جہاں زمین میرے قدموں کے نیچے گھوم رہی ہے۔ میں جس راستے کی طرف منہ کرتی ہوں وہی مجھے منہ منہ ملتا ہے۔ میں جہاں راہ کرتی ہوں، مجھ سے اپنا دامن چھڑانے کے بھاگ جاتا

ہے میں اس کے نیچے جاگتی ہوں — اندھا دھند دوڑتی ہوں اور جب اسے پکڑ لیتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریت کا ہٹا تھا میرے پکڑتے پکڑتے ہی ڈسیر ہو جاتا ہے — اصغری تم نہیں جانتی ہوں میں کتنی دیر سے انگاروں کے بستر پر لوٹ رہی ہوں۔ بچھلنے کے لیے میں ان پر پانی ڈالتی ہوں تو جواب کے ایسے بکواسے ٹھٹھے ہیں جو مجھے اپنے ساتھ ادھیچا توں میں لے جاتے ہیں اور مجھ پر بھجھوڑ کر بھجھوڑ بھجھوڑ کر ایک دم نیچے دسے چمکتے ہیں — میری ہڈی ہڈی، پسلی پسلی پور ہو چکی ہے۔ اصغری..... کیا ہی اچھا ہوتا اگر مجدد صاحب کے ہلے میں ایا بھی جوتی جوتی —

طلوعل وقت — اصغری خاموش کھڑی رہتی ہے — سعیدہ اضطراب میں اور سر کو مڑھلتی رہتی ہے، سعیدہ — بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے۔
اصغری — تختہ کے عالم سے بیدار جوتی ہے، کیا کرنا چاہیے — آپ کو — آپ کو اجڑمیاں کی موت کا انتظار کرنا چاہیے۔
سعیدہ — دیکھ دیر سہا کر، تم مجھے استادورے کی سنگدل کمری — لیکن میں پوچھتی ہوں — انھیں کب موت آئے گی۔
اصغری — جب اشد میاں کو نکلور ہو گا رڑھاتی ہے، لیکن اجڑمیاں کی دوستی تو ان سے ختم ہو چکی ہے۔
سعیدہ — کیا کہا؟
اصغری — جی، دیکھ نہیں۔

اکھڑے اکھڑے قدم اُٹھاتی اصغری چلی جاتی ہے — سعیدہ نگلے پاؤں گھاس کے ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر اضطراب کی حالت میں شلقتی رہتی ہے،

باردہ

چھٹا منظر

(نگار دلا — ڈورا ٹینگ روم — وسیع و عریض کمرہ جو برائی وضع کے ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ ہر چیز وزنی اور پاکدار ہے — دیواروں پر آگلی پینٹنگز آویزاں ہیں۔ جو خاندان کے مختلف افراد کی ہیں۔ ایک سو پینٹنگ ٹیکم کی ہے۔ جب کہ وہ جہان تھی۔ اس پینٹنگ کے نیچے ٹیکم ایک صوفے پر بیٹھی تعالٰیٰ پیش کر رہی ہے۔ تصویر میں وہ بے فکر ہے مگر صوفے میں سخت نگر مند۔ اس کا چہرہ ٹم و اندوہ کا مجموعہ ہے۔ کوئی آٹو پیڑ ٹی رہی ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خیالات و افکار کے اُچھے ہوئے دھاگے کبھی پھینتی ہے کبھی کھینتی ہے — اصغری داخل جوتی ہے،

ٹیکم صاحب — جید میاں لے؟
اصغری — جی ہاں۔

بیگم صاحب - کہاں تھے ؟

اصغری - باغچے میں

بیگم صاحب - کیا کر رہے تھے ؟

اصغری - جی ہاں — درگ کر، جی اکیلے بیٹھے تھے۔

بیگم صاحب (اصغری کی طرف دیکھ کر نکلا ہیں نیچی کر کے) آ رہے ہیں۔

اصغری - جی ہاں !

بیگم صاحب - تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے — جمیداس کی طرف دیکھتا اندر داخل ہوتا ہے ،

مجید - کیا بات ہے امی جان ؟

بیگم صاحب - کچھ نہیں — بیٹھ جاؤ۔

مجید - (پاس ہی صوفے کی دوسری کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) یہاں سردی ہے ۔

بیگم صاحب - ہاں — یہاں سردی ہے

(وقفہ)

مجید - (بے چینی محسوس کرتے ہوئے) میرا خیال ہے — آپ نے مجھے یہاں کچھ کہنے کے لیے بلایا ہے ۔

بیگم صاحب - ہاں !

مجید - فرمائیے ؟

بیگم صاحب - میں تمہیں یہاں سے بھیجا چاہتی ہوں۔

مجید - مجھے ؟ (دُکھ کر) کہاں ؟

بیگم صاحب - بیٹھ جاؤ

مجید - (بیٹھ جاتا ہے) یہ مجھے ۔

بیگم صاحب - میں نے ابھی امجد سے بات نہیں کی۔

مجید - (پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) کون سی

بیگم صاحب - یہی تمہیں یہاں سے بھیجنے کی۔

مجید - لیکن آپ مجھے یہاں سے کون دیکھا کر رہی ہیں..... میرا مطلب ہے کوئی خاص کام ہے یا.....

بیگم صاحب - بیٹھ جاؤ۔

مجید - (بیٹھ جاتا ہے) کوئی خاص کام ہے ؟

بیگم صاحبہ نہیں۔

مجید۔ تو پھر مجھے یہاں سے کہیں باہر بھیجنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے۔

بیگم صاحبہ۔ کریں، اس میں بہتری کی گنجائش ہے۔

مجید۔ بہتری؟ — کس کی بہتری؟

بیگم صاحبہ۔ ہم سب کی — اس گھر کی۔

مجید۔ (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) آپہر سیلیوں میں بات کر رہی ہیں اتنی جان۔

بیگم صاحبہ۔ مجید تم میرے ملاکے ہو میں تمہاری ماں ہوں — میرے تمہارے درمیان کوئی ایسی گنگنائیں ہونی چاہیے جو

اس مقدس دوستہ پر فزاسی بھی نہ لگے، نکائے — میں چاہتی ہوں کہ تم آج ہی کڑی چلے جاؤ اور جب کسی کی گولی لگے گی

مجید۔ لیکن اتنی جان —

بیگم۔ (بات کاٹ کر) تمہارے وہاں بے شمار درست مروجہ ہیں۔ مجھے یقین ہے، تم ان کی مدد سے، یا خود اپنی رحمت سے اس

منہدم حصار میں سے جسے زندگی کہتے ہیں اپنی کشتی صحیح وسامت کنارے لے جاؤ گے۔

مجید۔ (پکڑ کر چاہتا ہے مگر کہ نہیں سہنا اور میٹھ جاتا ہے) بہت بہتر — میں چلا جاؤں گا۔

بیگم صاحبہ۔ تمہارا فیصلہ..... (ایک دم خاموش ہو جاتی ہے)۔

(گھر سے بیٹا اچھا پانچوں والی کمرہ میں داخل ہوتا ہے جسے کیم پلار ہا ہے)

احمد (مجید سے) یا مجید، تم بھی عیب آؤں ہو — میں وہاں کمرے میں بیٹھنا تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ تم آؤ گے تو ہم دونوں سعید

کی ساگرہ کے گھنے کے متعلق سوچیں گے — لیکن تم یہاں بیٹھے ہو (بیگم صاحبہ) اتنی جان — آپ نے کیا

سوچا — کیا تحفہ ہونا چاہیے — میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا ہوں۔

بیگم صاحبہ۔ تم سعید سے کون نہیں پوچھتے۔

احمد۔ لو اور سنو (ہنستا ہے) حد کر دی آپ نے اتنی جان — اس سے مشورہ لیتا تو تحفے کا ہزار کیا خاک آئے گا۔ (مجید سے)

کیوں مجید؟

(مجید خاموش رہتا ہے)

احمد۔ بولو یا۔

مجید۔ (اٹھ کر) آپ اتنی جان سے پوچھیے — میں تو جا رہا ہوں۔

احمد۔ (حیرت سے) جا رہے ہو؟ — کہاں جا رہے ہو؟

مجید۔ کراچی!

احمد۔ یقیناً تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے — کیا کرنے جا رہے ہو کراچی؟

مجید۔ کیا گنے جا رہا ہوں دیکھیں اس مسکراہٹ کے ساتھ منہ صاف میں سے (کی گشتی نکلتی ہے۔
 امجد۔ (دیکھ سے) کیا ہو گیا ہے اسے (مجید سے) بیٹھو یاد۔ پرسوں اس کی سالگرہ ہے۔ (اسی بجلی فیصلہ ہو جاتا ہے۔
 مجید۔ فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

مجید۔ کیا؟
 مجید۔ کہیں کو آتی جا رہا ہوں اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔
 امجد۔ کیا کہتے ہو (دیکھ سے) اتنی جان دینے کا قصہ کیا ہے؟
 بیگم صاحب۔ کچھ نہیں۔ ماں بیٹے کی لڑائی ہو گئی کسی بات پر۔

مجید۔ کس بات پر؟
 بیگم صاحب۔ تم نہیں پوچھ سکتے۔
 امجد۔ عدول علی تو ہوئی ہے۔ لیکن مجید میرا بھائی ہے۔ آپ کے اداس کے درمیان اگر کوئی دلچسپی یا غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے تو اسے دور کرنا میرا فرض ہے۔ مجید کو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس سے کسی کوئی غلط مرزد نہیں ہو سکتی ہوا آزار کا موجب ہو۔ (مجید سے) ادھر تو مجید۔
 مجید۔ بھائی جان، مجھے اپنا اسباب بند سوندا ہے۔

مجید۔ لا حول و لا۔ یہ سب کیا ہے۔ (دیکھ سے) اتنی جان۔ خدا کے لیے اسے روکیے۔ میرے لیے نہیں تو سعیدہ کے لیے روکیے۔ اس گھر میں ایک حد تک یہ ہے جس نے ابھی تک اسے اداس نہیں ہونے دیا۔ میری خاطر اتنی زحمت برداشت کرتا ہے۔ اگر آپ نے اسے جانے دیا تو اتنی جان میں نہیں جاتا، میرا کیا حال ہوگا۔ سعیدہ کو میرے لیے جانے دیا ہے تو میں تصور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے بدلے میں اس کے ہمراہ ہوں اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلنا ہے تو وہ خلاہ بہت حد تک پورا ہو رہا ہے جو قدرت کے لیے رحم ہاتھوں نے میری زندگی میں پیدا کر رکھا ہے۔ میں تو کئی بار سوچتا ہوں امجد، اگر تیرا بھائی مجید نہ ہوتا تو کیا تیری شکستہ زندگی کا مطلب تو اس قابل نہیں تھا کہ خود سے پریشان ہوتا۔ اتنی جان اسے روکیے۔ یہ تو میرا انداز ہے..... لیکن آپ اس کو مجھ سے جدا کر رہی ہیں۔ اللہ میاں کی جگہ نہ لیجیے اتنی جان (رونے لگتا ہے)

مجید۔ میں جا رہا ہوں اتنی جان۔

بیگم صاحب۔ ٹھیک۔

مجید۔ (رک جاتا ہے)

بیگم صاحب۔ (دُشمنی ہے اور امجد کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) امجد بیٹا۔ روو نہیں جان مادر۔ مجید نہیں جائے گا۔ جو چیز یہاں ہے وہیں رہے گی..... اس لیے کہ اسے یہی منظور ہے..... (مجید سے) مجید

— بھائی کے پاس میٹھو اور سعیدہ کی سالگرہ کے متعلق سرچر رہی جاتی ہے،
(مجید کے در سے چلتا ہے پھر امجد کی کرسی کی طرف بڑھتا ہے،
مجید۔ اہستہ، بھائی جان، آپ مجھے جانے دیں۔

امجد۔ (ٹھٹھکا ہوا سر اٹھا کر) ہلے دوں؟ — کہاں جانے دوں؟ — پاگل مت بنو۔
مجید۔ آپ نہیں سمجھتے بھائی جان۔

امجد۔ میں سب سمجھتا ہوں — اپنا وہ مال نکالو اور ذرا میرے یہ آنسو پونچھ دو۔

مجید۔ (تھوڑے وقت کے بعد اپنا وہ مال نکالتا ہے اور امجد کے آنسو پونچھتا ہے — جلدی جلدی،

امجد۔ کیا کرتے ہو یاد — تمہیں تو آنسو پونچھنا بھی نہیں آتا — (مسکراتا ہے) اتنا معمولی سا کام ہے
مجید۔ یہ معمولی کام نہیں بھائی جان۔

امجد۔ (مسکراتا) اچھا بھائی بڑا جان جو کہوں گا کام ہے — آؤ اور میٹھو — سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق
سوچیں۔ میٹھو۔

مجید۔ (امجد کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) سوچیے۔

امجد۔ آہ بھر کر سوچتے ہیں بھائی سوچتے ہیں — سوچنے کے علاوہ اب اور کام ہی کیا ہے لیکن ذرا تم بھی سوچو۔

(مجید اور امجد دونوں سوچ میں مستغرق ہو جاتے ہیں)

پردہ

ساتواں منظر

(نگارو دلا سے طوطا باغیچہ — شام کا وقت۔ فوارے کا پانی بند ہے، جیسے وہ ابلی اہلی کر جا رہا ہے)
ہے۔ پس منظر میں خاکستری پائیاں وحند مکوں میں اپنی سنگینیاں جیسے چھپا رہی ہیں۔ فرش پر سبز لوندا
برسا سا معلوم ہوتا ہے۔ درختوں کی طرف فوارے سے فوارے ٹپک رہی ہیں جہاں جہاں جہاں کے عقب میں لٹکا ہوا ہے
والی کرسی میں بیٹھا ہے۔ پشت پر اصغری کسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہے — وہ اسے چلانے
لگتی ہے۔)

امجد۔ نہیں اصغری — کچھ دیر ٹھہرو۔

اصغری۔ (ٹھہر جاتی ہے) لیکن امجد بیاں

امجد۔ میں آج اپنی زندگی کا آخری زخم کھاتا چاہتا ہوں۔

اصغری۔ یہ زخم کھانا اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو اپنے تصور ہی میں کھا سکتے ہیں — لیکن یہ زخم تو آپ کے لگ

سجیدہ - آج تو میں بہت تنگ لگتی ہوں۔
مجیدہ - حالانکہ ہم زیادہ دُور نہیں گئے۔
سجیدہ - ہاں!

(وقف)

مجیدہ - کیا ہی اچھا ہوتا، اگر میں کراچی چلا گیا ہوتا۔
سجیدہ - اچھا ہی ہوتا۔

مجیدہ - میری جان مجھ پر مشکل میں پھنس گئی ہے — میں کراچی چلا جاتا..... لیکن سوال یہ ہے کہ میں اس بندھن میں سے
(نئی کشتی کئے کر کنارے لے جاتا؟ — نہیں — میں ضرور نا کام رہتا۔
سجیدہ - مجھے معلوم ہے۔

مجیدہ - تھیں معلوم ہے — مجھے معلوم ہے — سونے بجائی جان کسا وہ سب کو معلوم ہے اور یہی اس کہانی کا
سب سے المناک حصہ ہے۔

سجیدہ - میں نے کئی بار سوچا ہے کہ ان سے کہ دوں، لیکن (ڈاکٹر کفری ہوتی ہے) مجھے ڈر ہے، وہ اس حد سے کی
تاب نہ لاسکیں گے۔

مجیدہ - مجھے خود اسی بات کا ڈر ہے — ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک برس (اور زندہ رہیں گے۔
..... غریب سے زندگی کا اتنا مختصر عرصہ جیننا ظلم ہے۔

(بھارتیوں کے عقب میں اچھا اپنے دانت بچھ کر لیتا ہے۔) اصغری غصوبلی سے اس کا کندھا پرکھتی ہے،
سجیدہ - ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے کہ جب تک وہ زندہ رہیں خوش رہیں۔ ان کے احساسات کے تازگ آئینوں کو
ہلکی سی ٹھیس بھی نہ ملے.....

مجیدہ - اور اگر ہمارا کوئی اچھا لارگولہ کھد کے پھوٹ پڑا تو.....

سجیدہ - قریب قریب صحیح کن تو قیامت آجائے گی۔

مجیدہ - اسی لیے میں سوچتا ہوں کہ میں چلا جاؤں..... جب تک بھائی جان.....

سجیدہ (ایک دم بات کاٹ کر) ایسا نہ کہو مجیدہ — اتنے ظالم مت بنو۔

(اچھا، اپا بھائی کی کسی میں لڑ جاتا ہے، اصغری اس کا دوسرا کندھا بھی غصوبلی سے پرکھتی ہے)

مجیدہ - محنت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے سجیدہ — کم محنت دوسروں کی موت پر نہ اپنے کی خواہش کرتے ہوئے بھی نہیں
خبر پاتی۔

سجیدہ - ہمیں ایسے خیال اپنے دماغ میں نہیں لانے چاہئیں۔

مجید۔ ٹھیک ہے — لیکن آجائیں تو کیا کریں۔

اصغر۔ کیا کر سکتے ہیں — چلو۔

اصغر۔ کوٹلی کی جانب چلتی ہے — مجید اس کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے — جھانپوں کے عقب

میں اپنا بھروسہ رکھ کر کسی میں امجد کا سر جھکا رہا ہے اس کے پیچھے اصغر بیٹنی کھڑی ہے،

اصغر — پلیس؟

امجد۔ اسی طرح سر جھکائے، نہیں — ابھی نہیں — میں سوچ رہا ہوں۔

اصغر — کیا؟

امجد۔ معلوم نہیں — شاید یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا سوچنا چاہیے۔

اصغر — اسی سوچ بچار بالکل فضول ہوتی ہے۔

امجد۔ (سر اٹھا کر فضول تو ہوتی ہے — مگر پھر کیا کروں —) (وقفے کے بعد) اتنے ظالم نہیں ہیں جتنی تم ہو — تم تو

مجھے سوچنے سے بھی منع کرتی ہو — تم بڑی ظالم ہو، اصغر!

اصغر — (مسکرا کر) جنت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے امجد بیاں — کہنت اپنی موت اپنی ناپنے سے باز نہیں آتی۔

امجد۔ میرے سامنے آؤ۔

اصغر — امجد کے سامنے آتی ہے۔ امجد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے — کچھ سوچتا ہے اور ٹھٹھاتا ہے

امجد۔ یہ کتاب اب تک کہاں پڑی تھی۔

اصغر — کیسے رڈی کی ٹوکری میں..... اپنی میچ جگہ!

امجد۔ چلو — مجھے لے چلو۔

(اصغر کو کسی کھینچی ہے اور کوٹلی کی جانب چلتی ہے)

پہرہ

آٹھواں منظر

(وہی گروہ جو پہلے اور دوسرے اور چوتھے منظر میں ہے، رات کا وقت — چھت سے بہتر روشنی کی جھلک دکھائی

ہے — برتنے کا اعلیٰ رنگ بدلا ہوا ہے، جیسے احصاء زدہ مریضوں کا — مسری غالی ہے کچھ اس

طور پر غالی جیسے وہ کبھی آبادی نہیں تھی — اصغر، امجد کو اپنا بھروسہ رکھ کر کسی میں اندر لاتی ہے)

اصغر — دو لکھن، بیگم صاحب کے کمرے میں کیوں مل گئیں؟

امجد۔ کدنی تھی۔

اصغری۔ آپ سے ؟

امجد۔ (مسکرا کر) مجھ سے کوئی کیا ڈرے گا — وہ اپنے آپ سے ڈرتی تھی۔

اصغری۔ وہ اتنی کمزور نہیں ہیں امجد میاں۔

امجد۔ وقت بڑے بڑے پناؤں کو کھیلے کر دیتا ہے — وہ تو ایک جہان لڑکی ہے۔

اصغری۔ (توقف کے بعد) آپ سونا چاہیں گے اب ؟

امجد۔ سونا ؟..... (ہنستا ہے) میرا مذاق مت اڑاؤ اصغری — میرے بچتے ہوئے زخموں کی توہین ہوتی ہے۔

اصغری۔ (توقف کے بعد) کیا آپ کو سعیدہ سے محبت ہے ؟

امجد۔ نہیں۔

اصغری۔ تو پھر یہ بچتے ہوئے زخم کیسے ؟

امجد۔ مجھے سوچنے دو..... بولو اجازت دیتی ہو سوچنے کی ؟

اصغری۔ آپ سوچیے۔

(طویل وقفہ میں امجد سوچ میں غرق رہتا ہے)

امجد۔ مجھے سعیدہ سے محبت نہیں ہے — جس طرح مارکٹ سے آئی اچھی چیز بچنے کے لگتا ہے — اسی طرح میں نے

سینکڑوں لڑکیوں میں سے اسے انتخاب کر کے اپنی بیوی بنایا تھا۔ مجھے اپنے اس انتخاب پر ناز تھا اور بجا ناز تھا —

سعیدہ میرے لئے کی مراد ایک خوبصورت ہے — اس پر میرا صوف آفاقی ہے کہ میں نے اسے چنا اور اپنی رفیقہ حیات

بنایا — اس حیات کا جواب کبھی ہوتی اس کڑی میں ڈھیر ہے۔ — جو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر بلی نہیں سکتی

..... ڈاکٹروں نے مجھے زیادہ سے زیادہ ایک سال اور زندہ رہنے کے لیے دیا ہے..... سمجھ میں نہیں آتا

کیونکہ اس طرح تک اس کو ایسی زنجیروں میں پاندھ کے رکھنا چاہتا ہوں جن کا ہر حلقہ میری اپنی زندگی کی طرح غیر

یقینی ہے..... کچھ سمجھ میں آتا..... (سوچتے ہوئے) اس کی جہاں خوبصورتی ہی ایک وجہ ہو سکتی ہے (ایک دم

چونک کر) بی۔ بی۔ یہی وجہ ہے اور کوئی نہیں..... (تفلیٹ محسوس کرتا ہے) اور۔ اور..... وہ نظارہ۔ وہ

نظارہ..... مجھے محسوس ہو سکتا ہے کبھی وہ نظارہ..... اس مسہری میں جہاں خوبصورتی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ

یہی دنیا کی حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر دیتی تھی..... یہ نظارہ میرے ساتھ چٹ گیا ہے — نہیں میں اس

اس کے ساتھ چٹ گیا ہوں..... (وقفے کے بعد) اصغری !

اصغری۔ (چونک کر) بی !

امجد۔ کوئی ایسی صحت ہو سکتی ہے جو یہ چل کر رہا کرے میرے وجود سے ملحدہ ہو جائے۔

اصغری۔ ہر شکل کی چرلی میں اس کو آسان کرنے کی ترکیب بھی ہوتی ہے۔

امجد۔ تو ڈھونڈنی پہاڑی ہے..... لیکن..... لیکن مجھے حجاب کیوں محسوس ہوتا ہے۔

اصغری۔ مسلم نہیں کیوں۔۔۔۔۔ یہ شکل آپ ہی کی شکل ہے۔ اس کے لیے آپ کا ہاتھ کسی انٹرم کا ہاتھ نہیں ہوگا۔

امجد۔ جانا ہوں..... میں اپنے دل کی اس تمام ناخلف تسوہ سے واقف ہوں جو اس غلط جذبے کی دھڑکنیں پیدا کرتی ہیں۔

— لیکن آج اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اصغری۔ کس کا؟

امجد۔ میرے سامنے آؤ۔

(اصغری، امجد کے سامنے آ جاتی ہے)

امجد۔ جاؤ، مسہری میں لیٹ جاؤ۔

اصغری۔ (جھپکا کر) امجد میاں — مجھ میں وہ جوان تو بصورتی نہیں ہے جس کی رہائشیاں دنیا کے حسین ترین طہر سات

کوڑھسار کیسیں — میری جوانی تو کمزورے ٹاٹ کی شرمندہ احسان ہونا چاہتی ہے۔

امجد۔ مسہری میں لیٹ جاؤ اصغری۔

اصغری۔ (آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں) نہیں امجد میاں — مسہری کو تکلیف ہوگی — یہ دلوں میں بیگم کے نرم

اور ناگہ بدن کی عاری ہے۔

امجد۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔

اصغری۔ (مر جھپکا کر) آپ مالک ہیں (مسہری میں لیٹ جاتی ہے) — آنکھیں چھت میں گڑ جاتی ہیں)

امجد۔ جانتی ہو آج کون سی رات ہے؟..... وہ رات ہے جب ایک طوی شری حوائی اور زیادہ طوڑ کر سالمیت اختیار

کر لے والی ہے — یہ قیامت کی رات ہے، فنا کی رات — اس کے اندھیاروں میں وجود، عدم کی پھلتیوں میں پھیل

کر ایک غیر فانی قاب اختیار کرنے کا..... یہ وہ رات ہے جس کے بعد اور کوئی رات نہیں آئے گی۔ اس کی اندھی

آنکھوں میں ایسے کابل سے تحریریں ہوں گی جو انہیں ہمیشہ کے لیے روشن کریں گی — یہ وہ رات ہے جب موت کے

پنجرے ہوئے تھنوں سے زندگی کے آخری قطرے ڈکڑ خود بخود ہی باہر آجائیں گے — یہ وہ رات ہے جب شکستگی اپنی

کوکھ سے سر بلند ایوانوں کو جہم کھنگی — ایسے سر بلند ایوان جن کے کنگڑوں کو طوڑش کی بلند ترین اونچائیوں سے ہم کلام

ہونے کا شرف حاصل ہوگا۔ یہ وہ رات ہے جب زخم کا سارا پانی رنگ اور رنگ کر زمین کی تھنوں میں چھپ جائے گا

اس کے بدلے خاک اڑے گی جس سے پائیزہ رو میں تم کریں گی — یہ وہ رات ہے جب کاتب تقدیر اپنا علم دان

اوندھائی کے عرش کے کسی کونے میں مڑ کر کے روئے گا..... یہ وہ رات ہے جس میں امجد اس دنیا کی تمام غریبوں کو

یقین دہر طلاق دیتا ہے اور ایک بد صورتی کو اپنے رشتہ مناکحت میں لاتا ہے..... (ایک دم چپقلہ ہے) اصغری

— اصغری!

اس دوران میں اصغریٰ مسمری پر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچ کر اسے کھول پہلی ہے اور اس کی سل پر کھڑی ہو کر نیچے گمراہیوں میں دیکھ رہی ہے)

امجد۔ (وجہ کر) یہ کیا کر رہی ہو اصغریٰ؟

اصغریٰ۔ (کھڑکی کی سل پر مڑ کر امجد کو دیکھتی ہے) اکیلا بد و قبول ضروری ہے میرے مالک! (نیچے کوڑ جاتی ہے)

امجد۔ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر اصغریٰ!..... (ہاتھ ہٹاتا ہے اور چند لمحات کھلی کھڑکی کے اندھیرے کو دیکھتا رہتا ہے جو ہنر دلور میں تاریک رقم کے ماخذ منہ کھولے ہے) اکیلا بد و قبول!..... (بڑبڑاتا ہے) اکیلا بد و قبول واقعی ضروری ہے (نور دکا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی کرسی اگے کو کھینچتا ہے۔ بڑی شکل سے کھڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے)..... مجھے شکل کو آسان کرنے کا یہ راستہ معلوم تھا..... مگر شاید کسی انگلی پکڑنے والے کی ضرورت تھی.....

(کھڑکی کی سل دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑتا ہے اور اپنا اپنا بج جسم بڑی دقتوں سے اوپر اٹھاتا ہے اور دوسری طرف ٹھکانا شروع کر دیتا ہے)

امجد۔ میری بہاڑیاں — میری پیاری بہاڑیاں — میری پیاری اصغریٰ!

(اکلا دھڑکیچے پھسلتا ہے اور ایک دم اس کا سارا وجود اندھیرا کھا جاتا ہے)

(پہچہ)

(پہچند تھپیں سے)

نیا قانون

منگو کو چوان اپنے اوتے میں بہت مطمئن آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے نیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڑے کے وہ تمام کو چوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اُسٹا و منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُسٹا و منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گمانا چودھری نے ہڑے کا منہ سر پر چسکی دے کر بھرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی۔ تو کہہ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔

اور جب گمانا چودھری نے اُس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُسٹا و منگو نے بڑی تسانت سے جواب دیا تھا۔ "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو ایشیائے اٹلس کے اُٹسوں جتنے کو چوان حلقہ بنائے حفر بنائے ہوئے تھے۔ دل ہی میں اُسٹا و منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور اُسٹا و منگو اس وقت مال دوڑ کی ٹھیکیلی سطح پر تانٹ چلائے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تباہ و تباہ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اُٹسوں میں آیا تو اُس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تکتا ہوا تھا۔ تھے کا دھڑکتے چلتے چلتے ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو اُسٹا و منگو نے سر پر سے خاک کی چھڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے منکمانہ لہجے میں کہا:

"یہ کسی بڑی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو بھینچ پھٹتے رہتے تھے اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل ٹوک لیا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ دُعا دی تھی، بھارتیہ ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے۔ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے۔ ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے خنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات ختم کر دی۔ یہ کانگریس ہندوستان کو زلزلہ کرانا چاہتے تھے۔ میں کتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پھٹے رہیں تو کچھ نہ ہو گا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہو گی کہ اگر یہ بھلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یاد رہے والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت منکر آدمی ہے لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ اس میں یہ کتنا عجوبہ ہی گیا کہ میرے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔"

استاد ونگو کو انگریز سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلا کر تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھالتے ہیں مگر اُس کے نفرت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھانڈی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اُسے اُن کا رنگ سبھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و پید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی سی آہانی نہ معلوم کیوں۔ وہ کہتا تھا کہ اُن کے لال بھریوں بھر چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم پر سے آدمی کی جھلی لٹل لٹل کر چھڑ رہی ہو۔ جب کسی غمناک گورے سے اُس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت کھنکھرتی اور وہ شام کو اڑے میں آکر بل مار کر سگریٹ پیتا یا حقے کے کش دگاتے ہوئے اُس گورے کو جی بھر کر ستایا کرتا۔

..... ”یہ سنی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیل پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا: آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندوں کی اولاد نے، یوں اُنھیں گانٹتے ہیں۔ گویا ہم اُن کے بلحاظ کے نوکر ہیں.....“

اس پر بھی اُس کا منہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا جب تک اُس کا کوئی ساتھی اُس کے پاس بٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔

”شکل دیکھتے ہو نا تم اُس کی..... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے۔ بالکل مُرادہ ایک دھچک مارا اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے ماہی ڈبے کا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملا علی کی کھوپڑی کے پُرزے اُڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مرد کو مارنا اپنی ہشک ہے.....“ یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو غما کی تھپس کی آئینیں سے مسات کرنے کے بعد پھر پُڑا لے لگ جاتا۔

”قسم ہے جھگڑان کی، ان لاٹ مساجروں کے ناز اُٹھاتے اُٹھاتے تنگ آ گیا ہوں جب کبھی ان کا منہ چہرہ دیکھتا ہوں۔ دوگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون دانوں بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے تیری قسم جان میں جان آجائے۔“

اور جب ایک روز استاد ونگو نے کپڑی سے اپنے تانگے پر دو ساریاں لادیں اور اُن کی گنگلوٹ اُسے چڑھا کر ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے۔ تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دور واداری جو کپڑی میں اپنے دیوانی عقیدے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے ہمیدہ آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

”سننا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟“
 ”ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔“
 ”کیا بیاج کے متعلق میں کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟“

تیرے پوچھنے کی بات ہے۔ کئی کسی درمحل سے دریافت کریں گے۔“

ان مادہ اڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہنستا لگایا اور تھلا اور چابک سے بہت جری طرح پٹیا کرتا تھا۔ مگر اس دوزخ بار بار اچھے حرکت کار مادہ اڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑی برائی مریچکوں کے بال ایک انگل سے بڑی صفائی کے ساتھ اڑھنے کے گھوڑے کی بٹھیر پر یا گیس ڈبیل کی کتے ہوئے ٹپے پیار سے کہتا۔ چل بیٹا، چل بیٹا۔ دوا ہوا سے باتیں کر کے دکھاوے۔“

مادہ اڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اُس نے انارکلی میں ریزہ سلوائی کی دکان پر آدھ سو روپی کی مٹی کی کرایک بڑی ٹوکاری اور نو پتھوں کو مٹھڑ میں دبا کر ان کو کچے سے ہوئے ایسے ہی بلند دواڑ میں کھانا بہت تری ایسی کی تھی۔“

شام کو جب وہ اڑے کو ٹھکانا تو خطرات محول اُسے وہاں اپنی جان بچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب وغریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنائے والا تھا۔ بہت بڑی خبر اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ کھٹے ٹپک روہ چابک بغل میں دبائے آئین کے اڑے کی ابھی بھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں تھلا رہا۔ اُس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات گڑھے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اُس کو ایک دنیا میں لاکر کھڑا دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی بار دلی کو سندھوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے تمام تیار کی تمام تیار کی روش کے فوری طور پر دیا تھا۔ اُس کے کانوں میں مادہ اڑی کا یہ اندیشہ کیا بیجا کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا یا بار بار گونج رہا تھا اور اُس کے جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھٹی مریچکوں کے اندر ہنس کر اُس نے ان مادہ اڑیوں کو گالی دی۔..... غریبوں کی کھٹیا میں گھٹے ہوئے کھل۔ نیا قانون ان کے لیے کھوٹا ہوا پانی ہو گا۔“

وہ بے مدد رہ رہا تھا۔ خاص کر اُس وقت اُس کے دل کو بہت ٹھنڈا کبھی جب وہ خیال کرتا کہ گورنر سفید چہروں کو اُس نام سے یاد کیا کرتا تھا، کی تھوٹھیاں نئے قانون کے آتے ہی جلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔

جب تھوٹھیاں، پگڑی بغل میں دبائے، اڑے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند دواڑ سے کہنے لگا۔ لاہتھر ادھر..... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ جیڑی اس کی کھوپڑی پر بال آگ آئیں۔“

ادھر کہ کہ منگو لے ٹپے..... مزے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دواڑ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ تھوٹھیاں کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مارا کہنا۔ تو دیکھتا رہا، کیا بنتا ہے۔ یہ کس والا بادشاہ کی طرح کچھ ضرورہ کر کے رہے گا۔“

استاد منگو موجودہ سو ریٹ نظام کی اشرا کی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ مٹی چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون

اور دوسری ٹیکہ جزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اُس نے دوس والے بادشاہ کو اڑیا ایکٹ یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو کچراٹے نظام میں جو کئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ تو انہیں دوس والے بادشاہ کے اثر کا نتیجہ سمجھا۔ بہر حال دوس سے پیشاد اور دیگر مشروں میں شرح پرشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں دوس والے بادشاہ اور پھر نئے قانون کے ساتھ غلط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے شستا گفلاں مشروں اتنے ہم ساز پکڑے گئے ہیں یا غلاں جگہ اتنے اُسیوں پر بغاوت کے الزام میں مقصور چلا یا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش یہ سمجھنا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہونا تھا۔

ایک روز اُس کے تانگے میں دو پیرسٹر بیٹھے تھے نئے آئین پر بڑے نوبت سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اُن میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:-
 جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ بالیس فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ مانی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے اس فیڈریشن باطل غلط ہے بلکہ لوں کا کٹا ہوا ہے کہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں؟
 اُن پیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ چونکہ اس میں جینر الفافا انگریزی کے تھے اس لیے استاد منگو صوبہ اُپر کے چمکے ہی کو کسی قدر کجھا اور اُس نے خیال کیا۔ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اُس نے کئی مرتبہ ان دو پیرسٹروں کو حضرات کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا:
 ”ٹوڈی بچے!“

جب کبھی وہ کسی کو نہی رہا میں ٹوڈی بچے کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے برا خوش ہوتا تھا کہ اُس نے اس نام کو میرے جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریعت دہی اور ٹوڈی بچے میں تیر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔
 اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے نین طلبہ کو اپنے تانگے میں جھاکوڑنگ جا رہا تھا کہ اُس نے اُن تینوں لوگوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا:-

”نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں اگر..... صاحب اسمبلی کے ممبر بن گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔“

”ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچر آجائے۔“
 ”ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟“

”وہ بیکار اگر کر بیٹھ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اُن میں کچر تو لگی ہوگی۔“

اس گفتگو نے منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور یہی بڑھا دی اور وہ اس کو اپنی جتنی سمجھنے لگا جو بہت بہت ہو۔
 ”نیا قانون.....“ وہ دن میں کئی بار ”سچتا“ یعنی کوئی نئی چیز اور ہر بار اُس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اُس نے دوس برس پہلے خود اپنی خوش سے بڑی اچھی طرح غلط سمجھا کر خرید لیا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔

بلکہ جگہ روپ کی نقل چڑھی ہوئی کیلیں چلتی تھیں اور جہاں جہاں چول کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دکھاتا تھا۔ اس لحاظ سے یہی نئے قانون کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگرو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سننا سنا، مگر اس کے متعلق جو معتقد وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا۔ بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی۔ ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور رشک پہنچے گی۔

آخر کار ماہر کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے موسم خلافت معمول مرد تھا اور ہوا میں تلذذ تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سیر سے استاد منگرو اٹھا اور صبح میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوڑا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر سرد تھی — وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اُس نے صبح کے سرد و صندھ کے میں کئی سنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اُسے ہر چیز پر اپنی نظر آتی — آسمان کی طرح پُرفانی اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلفتی کے جو رنگ ہر رنگ کے پودوں سے جی تھی اور اُس کے گھوڑے کے سر پر بھی ہوئی تھی اور سب چیزیں پر اپنی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلفتی اُس نے نئے قانون کی خوشامی میں اسرارِ حرج کو جو دھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز نہ کالی شرک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگاتے ہوئے پہلی کے کھجے، دکانوں کے بوڑھے، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروں کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی..... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ خدا ہر جہ کوئی بھی نہیں، لیکن استاد منگرو اس میں نہیں تھا۔

”ابھی بہت سیر رہا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔“ اس خیال سے اُسے تسکین تھی، اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ ہائی کورٹ میں فیجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظریہ لگے گا؟ جب اُس کا ٹانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعوت سے نوکھانے جو طلیا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے، خوش پوش تھے مگر استاد منگرو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کی جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

سمانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر نامرکی میں تھا۔ بازار کی آدمی دکانیں کھل چکی تھیں ادب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ طوائف کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بیڑ تھی۔ منادی والوں کی فائشی چیزیں شیشے کی لٹاریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں، اچھے بھلے کے تاروں پر گئی کیوتھاپس میں ملا جملہ گڑبے تھے مگر استاد منگرو کے لیے اہم چیزیں ہیں کوئی دلچسپی نہ تھی — وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا، ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگرو کے گھر میں سچ پیدا ہونے والا تھا تو اُس نے چار پانچ عینے بڑی بے قراری میں گندارے تھے اُس کو یقین تھا کہ سچ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو موت ایک

نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیادیری کے پیٹ کو دبا دیا اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے تسلی کی جانا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوری پر برس پڑ گیا تھا۔

تو ہر وقت شرم کے کی طرح چڑی نہتی ہے، اُنہو ذرا پہل پھرتے رنگ میں تھوڑی سی طاقت آوائے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو کہتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟
استاد منگو طبعاً بہت جلد بانہا قیام پزیر تھا وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا ذمہ داری خود پیش مند تھا بلکہ بہت حس تھا۔ اس کی بیوری لگا دینی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو رکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی کہ ابھی کنوئیں کھودا نہیں گیا اور تمہاراں سے بے حال ہو رہے ہو۔

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ کاغذ میں یا ہوا میں لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

یہ بدل کی فطرت کا اندازہ اُستاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گھوس ڈالے ہوئے چھوڑوں کے ہاؤس سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی میٹر گینسٹ کے چھوڑوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی ہٹلر کے جلوس میں بیٹر کے باعث دیر تین فساد ہوتے جرتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی تاروں میں توڑنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے کل کردہ مال ہڈی کی تشکیلی سطح پر اپنے مانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھانوٹی کی ایک سواری ملی گئی۔ گراہیے ٹکڑے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں بے خیال کیا:۔۔۔
”چلوں بھی اچھا ہوتا۔۔۔ شاید چھانوٹی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔“

چھانوٹی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر آگے بڑھانے اور حجب سے سرکٹ نکال کر انہیں ہٹلر کی فری دوزانگیوں میں دبا کر منگایا اور انارکلی انشت کے گھر پر پہنچ گیا۔ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی جیتے ہوئے واقعہ پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر انارکلی انشت چھوڑ کر گھیل انشت پر بڑے ایلٹائی سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی بائیں دایں ہاتھ کے گود پیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا اٹھوڑا سا ہنسنے کے بعد بڑی دبی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے بھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے تسلی نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں یوں پسپا کر چلی سنے ناگوں کے زبردستی کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابل غریبات کا نہیں

جہد کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا اُسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سماری نے اُسے بلایا ہے۔ نیچے پلٹ کر دیکھنے سے اُسے طرح کے اُس طرف نمودار بجلی کے کھجے کے پاس ایک گورا کھڑا نظر آیا جو اُسے اتھکے ہوا تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اُس نے اپنے تازہ گلابک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اُس کے لبوں سے آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اُس کو چھوڑ کر پلٹ جائے مگر بعد میں اُس کو خیال آیا کہ اُن کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے بلکہ پروجہت میں سارے جہد کرنے خرچ کر دیے ہیں، ان کی عجیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔

خالی طرح پر ٹری صفائی سے تانگر مڑ کر اُس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور تانگر چھپکنے میں وہ بجلی کے کھجے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی یاگیں گھس گھس کر اُس نے تانگر تھرایا اور بجلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔

”صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟“

اس سوال میں بلا کا نظیر یاد آ رہا تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اور کلامر خوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھ گیا اور پاس ہی گل کے اس طرف جہد مم ہی کھڑا نک کے تختے سے تھوڑی کے بالائی حصے سے کسب علی آ رہی تھی، ایک لڑش کے ساتھ گہری برگی گویا کسی نے لو کیلے چاٹو سے عیشم کی سالوں کلوی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا ہر وہیں رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس گورے کو پہننے کی آگ میں جلا کر جسم کر ڈالا تھا۔

جب گورے نے جو بجلی کے کھجے کی اوٹ میں ہوا کارخ بچا کر سگٹ سلگایا تھا۔ مڑ کر تانگے کے پاندان کی طرف قدم بڑھایا تو چانک اُستلا منگو کی اور اس کی نگاہیں چاروں تیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آٹھ سائے کی بند توں سے گویاں گلارچ ہوئیں اور آپس میں کھمکا کر ایک آتشیں گولیاں گولیاں کر اُپر کو اُڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھولی کر تانگے پر سے نیچے اُتارنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا، گورا وہ اس کے وجود کے ذریعے وقت کے کوئی نگاہوں سے چھایا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نئی پتلون پر سرخیر رتہ چیزیں جھاڑ رہا ہے۔ گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگٹ کا دھواں نکلتے ہوئے کہا: ”جانا مانگتا ہوں پھر گورے کا“

”وہی ہے۔“ یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چڑی چھاتی کے اندر زلچنے لگے۔

”وہی ہے۔“ اُس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور سادھی اُسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے کھیل برس اُس کی جڑپ ہوئی تھی اور اس خداداد خد کے جھگڑے میں جس کا ہٹ گورے کے داغ میں شری ہوئی شراب تھی اُسے طوعا کرنا بہت سی باتیں سنا چکی تھیں استاد منگو نے گورے کا داغ درست کر دیا۔

بوتا بکرا اُس کے پمڑے اُڑا دیے ہوئے۔ گردہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عادت کا زلہ عام طور پر کوچران ہی پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا: "کہاں جانا لگتا ہے؟"

اُستاد منگو کے لیے میں چابک رسی نیرتی تھی۔

گورے نے جواب دیا: "سیرا منڈی۔"

"کرایہ پانچ روپے ہوگا۔" اُستاد منگو کی مونچھیں تھر تھریں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلا یا۔ پانچ روپے۔ کیا تم —؟

"ہاں، ہاں، پانچ روپے۔" یہ کہتے ہوئے اُستاد منگو کا دنا بنا ہاں بھرا ہاتھ پہنچ کر ایک مذلتی گھونسلے کی شکل اختیار

کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بیکار بائیں بناؤ گے؟"

اُستاد منگو کا ہجر زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر اُستاد منگو کے سینے کی چڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ

اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اُلو کر بڑھا اور اپنی چٹری سے اُستاد منگو

کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پاش کی ہوئی پتلی چٹری اُستاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ جھوٹی

اُس نے کھڑے کھڑے اُوپر سے پست قدم گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اُس سے پس و آنا چاہتا

ہے۔ پھر اُس کا گھونسلہ کہاں میں سے تیر کی طرح سے اُوپر کھڑا اُتر چلا اور سچم ندن میں گورے کی ٹھنڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دھکا

کناں لے گورے کو پر سے ہٹا یا اور نیچے اُن کو اُس سے دھڑا دھڑ میٹھا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر صحت کر اُستاد منگو کے ذرتی گھونسلے سے پچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا

کہ اس کے مخالف پر دین کی کسی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شعلے برس رہے ہیں تو اُس نے ذرا دُور

سے چلا نا شروع کیا۔ اس جیخ و پکار نے اُستاد منگو کی بانوں کا کام اُرد بھی نیر کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ پاتا تھا۔

اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑنوں..... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑنوں — اب ہمارا راج ہے بچہ؟"

نوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے ٹری منٹل سے گورے کو اُستاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ اُستاد

منگو اُن دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کی پوڑی چھاتی چھوٹی ہوئی سانس کی وجہ سے اُوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ

سے جھاگ بہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاص خانہ اُڑا یا کرتے تھے — اب نیا قانون ہے یہاں — نیا قانون؟"

ادب بے پناہ گورا اپنے گلا سے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی اُستاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور

کبھی بزم کی طرف

اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ نیا قانون، نیا قانون، پتلا تار پا کر کسی نے ایک خوشی۔

”نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہیں۔“ قانون وہی ہے پُرانا

اور اُسی کو اصلاحات میں بند کر دیا گیا! (منٹو کے افسانے میں سے)

اصلاح کر دل کا کچرہ تباہی نہیں تھا میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس کو بڑھکھوٹے کی وجہ کیا ہے ؟

موت ؟ جو سکتی ہے میری اپنی تو کوئی غمی نہیں۔ جرتی وہ کاغذی ڈاکوٹ کی سی میں لٹہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ لیکن دو مٹروں کی گڑبڑ ہو جوتھیں۔ مثال کے طور پر اپنے مالی کی تھی۔ اپنا پنا ٹیٹ ہے۔ کچھ بڑھچے تو موت جہان ہرنی پہلے سے اور یہ ضروری نہیں کہ پڑھیں گس جواٹس کرنا جانتی ہو۔ آج کو نو ساری جوان گڑبڑیں ملتی ہیں۔ دکاغذی ڈاکوٹ کا عمارہ ہے جس کا اندر میں تمام ابدل موجود نہیں۔ موت کا تو سوال ہی اٹھ گیا اور موت کا پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ زندہ زیادہ دل پی نہیں جو کہ ہے اس پر قناعت ہے لیکن پھر یہ دل والی بات کیوں پیدا ہو گئی تھی۔

آدھی دینچہ ہوں۔ کوئی مسئلہ سامنے آجائے تو اس کی تڑتک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کاغذ نے حمل رہے تھے۔ کاغذ بھی پہل رہی تھیں۔ دیر پہلے پتھاپ پیدا ہوا تھا میں نے انک تھک ہو کر سرخشا شروع کیا اور دست ویر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دل کی گڑبڑ صرف اس لیے ہے کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔

کاغذی ڈاکوٹ میں تو نے بیسیوں نیک کام کیے تھے۔ مثال کے طور پر جب میرا دوست پانڈو رنگ مر گیا تو میں نے اس کی ڈاٹھ کو اپنے گھوٹال آیا اور دوسرے نیک اس کو دھندل کر نے سے روکے رکھا۔ ڈاکوٹ کی کڑی کی ڈانگ ٹوٹ گئی تو سے مٹی خرید دی۔ تقریباً چالیس روپے اس پر اٹھ گئے تھے۔ جتنا بانی کو گڑی ہو گئی سال کی دھماکت کیجیے گا، کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ میں اسے ڈاکوٹ کے پاس لے گیا۔ چھ مہینے برابر اس کا علاج کرتا رہا..... لیکن پاکستان آکر میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا اور دل کی گڑبڑ کی یہی وجہ تھی۔ دودھ اور سب شیک تھا۔

میں نے سوچا، کیا کروں ؟ — خیرات دینے کا خیال آیا۔ لیکن ایک روز شہر میں گھوا تو دیکھا کہ قریب تریب شخص بنگلہ دی ہے۔ کوئی بھوکا ہے۔ کوئی تھکا۔ کس کس کا پیٹ بھڑوں، کس کس کا انک ڈھانکوں ؟ — سوچا ایک انگلنڈ اسکول دوں لیکن ایک انگلنڈ سے کیا ہوتا اور پھر آج کہاں سے ملاتا ؟ بلیک مارکٹ سے خریدنے کا خیال پیدا ہوا تو یہ سوال بھی ساتھ ہی پیدا ہوا کہ ایک ملٹ کناہ کر کے دوسری ملٹ کا رٹوب کا مطلب ہی کیا ہے ؟

گھنٹوں میٹر میٹر کر میں نے لوگوں کے دکھ دیکھے۔ پہچ پوچھیے تو ہر شخص دگی تھا وہ بھی جودکانوں کے گھنٹوں پر سوتے ہیں اور وہ بھی ہوا تھی اگرچی ہو بیسوں میں رہتے ہیں۔ پیدل پہننے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کام کرنی بڑا نہیں ہوٹروں میں بیٹھنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کار کا نیا ماڈل نہیں۔ ہر شخص کی شکایت اپنی اپنی جگہ درست تھی ہر شخص کی حاجت اپنی اپنی جگہ متعلق تھی۔ میں نے غاب کی ایک خزانہ بخشے شولا پور کی آمیز بانی چٹنے کے سے ٹٹی تھی۔ ایک شعر یا درہ گیا ہے۔

کس کی حاجت دھاکے کوئی

صاف کیجیے گا یہ اس کا دسرا مصرع ہے اور ہر سکتا ہے پہلا ہی ہو۔

جی ہاں، میں کس کس کی حاجت دھاکتا جب سو میں سے سب کی حاجت مند تھے میں نے پھر یہ بھی سوچا کہ خیرات دینا کوئی اچھا کام نہیں بلکہ ہے آپ مجھ سے اتفاق کریں۔ بلکہ میں نے مہاجرین کے کمپوں میں جا بجا کہ جب حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا۔

تو مجھے معلوم ہوا کہ خیرات کے بہت سے ممبرین کو بالکل ہی گمابادیا ہے۔ دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ تماشہ کیلے رہے ہیں جو لگا ہو رہی ہے۔ دعوات کیجیے گا جنگ کا مطلب ہے، جو یعنی قمار بازی، گامایاں یک رہے ہیں اور نوکٹ یعنی سخت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔..... ایسے لوگ جہاں پاکستان کو مضبوط بنانے میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ عینک وینا برگزینی کی کام نہیں۔ لیکن پھر شکی کے کام کے لیے اور کون سا راستہ ہے؟

کپڑوں میں دھڑا دھڑاؤںی مرد ہے تھکے کبھی سہیندہ چھوٹا تھا کبھی پلنگ۔ ہسپتالوں میں قتل و دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مجھے بہت ترس آیا۔ قریب تھا کہ ایک ہسپتال غزادوں مگر سوچنے پر ارادہ ترک کر دیا۔ پوری سکیم تیار کر چکا تھا۔ عمارت کے لیے ٹھکر طلب کرتا۔ واسطے کی فیسوں کا رو پیر جمع ہو جاتا۔ اپنی ہی ایک کپڑی کٹری کر دیتا اور سٹڈاس کے نام نکال دیتا۔ خیال تھا ایک لاکھ روپے عمارت پر صرف کر دوں گا۔ ظاہر ہے کہ ستر ہزار روپے میں بلڈنگ کٹری کر دیتا اور پورے تیس ہزار روپے بچا لیتا مگر یہ ساری سکیم دھری کی دھری رہ گئی جب میں نے سوچا کہ اگر مرنے والوں کو بچا لیا گیا تو یہ ہزار لاکھ آبادی ہے وہ کیسے کم ہوگی۔ غور کیا جائے تو یہ سارا غلامی یا غلامی آبادی کا ہے۔ غلام کا مطلب ہے جھگڑا، وہ جھگڑا جس میں فیضی بھی ہو لیکن اس سے بھی اس لفظ کی بھڑی معنویت میں بیان نہیں کر سکا۔

جی ہاں غور کیا جائے تو یہ سارا غلامی اس نام غلامی کا باعث ہے۔ اب لوگ بڑھتے جاویں گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمینیں بھی ساتھ ساتھ بڑھتی جائیں گی۔ آسمان بھی ساتھ ساتھ پھیلتا جائے گا۔ بارشیں زیادہ ہوں گی۔ انداز زیادہ آگے گا۔ اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا — کہ ہسپتال بنانا برگزینی کام نہیں۔

پھر سوچا مسجد غزادوں۔ لیکن اللہ بخشنے شولا پور کی امین رانی چٹکے کا کا گیا ہوا ایک شعر یاد آ گیا —

مہم غمزہ ہے تو فیجی کے اسباب بنا

وہ منظور کو غمزہ فیض کو فیجی کہا کرتی تھی۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا پل بنا چاہا بنا مسجد تالاب بنا۔

کس کم بخت کو نام و خود کی خواہش ہے۔ وہ جو نام اچھلانے کے لیے پل بناتے ہیں نیکی کا کیا کام کرتے ہیں انہماک بدین نے کہا نہیں یہ مسجد بنانے کا خیال بالکل غلط ہے بہت سی الگ الگ مسجدوں کا بزم لگی قوم کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتا اس لیے کہ عوام بٹ جاتے ہیں۔

تھک پا کر میں حج کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اللہ میاں نے مجھے خود ہی ایک راستہ بتا دیا۔ شرمیں ایک جلسہ ہوا۔ جب عزم ہوا تو لوگوں میں بظلمت جھل گئی۔ اتنی جگہ ٹرچی کہ تیس آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کی خبر دوسرے روز اخباروں میں لکھی تو معلوم ہوا کہ وہ ہلاک نہیں بلکہ شہید ہوئے تھے۔

میں نے سوچنا شروع کیا، سوچنے کے علاوہ میں کئی مولویوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو اپنا ملک حادثوں کا شکار ہوتے ہیں انھیں شہادت کا تجربہ ملتا ہے یعنی وہ رتیر جس سے بڑا کوئی اور تیر ہی نہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر لوگ مرنے کی بجائے شہید ہوا کریں تو کتنا اچھا ہے۔ وہ جو عام موت مرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موت بالکل کار ت جاتی ہے۔ اگر وہ شہید ہو جاتے تو کوئی بات نہیں۔

میں نے اس باریک بات پر اور غور کرنا شروع کیا۔

چاندوں طوف بدحوہ کیخوشہ حال انسان تھے۔ چہرے نہاد، نکلہ زندہ اور غم زندہ نگاہ کے اوجھڑے پسے ہوئے، وجہیں ہوتی انھیں بے جان چال پکڑتے اندر۔ ریل گاڑی کے کشیم مال کی طرح یا تو کسی ٹوٹے پھوٹے جھوٹے سے میں بڑے ہیں۔ یا با نادلوں میں بے مالک و غریبوں کی طرح سزا خائے بے مطلب گھوم رہے ہیں گول بول رہے ہیں۔ کس کے لیے جی ادب ہے میں اور کیسے جی رہے ہیں اس کا کچھ کتابی نہیں کوئی دیا پچھلی۔ ہزاروں سگتے اور کچھ نہیں تو جھوک اور پیاس ہی سے گھل گھل کر مرے۔ سرووں میں اکر گئے، گریزوں میں ٹھوکر کئے کسی کی موت پر کس نے دوا نہر بہا دیے۔ اکثریت کی موت مصحک ہی رہی۔

زندگی بھر میں نہائی، شیک ہے اس سے حفظاً اقلید، یہ بھی شیک ہے..... وہ کس کا شعر ہے اللہ بخشے ضرور پوری اجنبی بائی چٹکتے کر کیا حد بھری آواز میں گایا کرتی تھی۔

نمر کے جی چین نہ پایا تو کوکر حریا میں گے

میرا مطلب ہے اگر مرنے کے بعد بھی زندگی نہ سبھری تو نعمت ہے شہسری پر۔

میں نے سوچا کیوں خیرہ بیمار ہے، یہ قسمت کے مارے، اللہ کے شکر اسے مرے انسان ہوا میں دنیا میں ہر جی چرنے کے لیے ترستے ہیں اس دنیا میں ایسا ذریعہ حاصل کریں کہ وہ جو یہاں ان کی طوف نگاہ اٹھا پا سہ نہیں کرتے وہاں ان کو انھیں اور شک کریں۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ عام موت خمریں بلکہ خمیدہ ہوں۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ لوگ خمیدہ مرنے کے بعد خلی ہوں گے؟ میں نے سوچا کیوں نہیں وہ کوئی مسلمان ہے جس میں فوقی شہادت نہیں مسلمانوں کی دیکھا تو کھی تو ہندوؤں اور سکھوں میں بھی بڑے تہرید کار دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے سخت نا اُمیدی ہوئی یہاں میں نے ایک سریل سے آوی سے پوچھا کیا تم خمیدہ ہونا چاہتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا: نہیں۔

سمجھ میں نہ آیا کہ وہ آوی کی کر کیا کرے گا۔ میں نے اُسے بہت بگلیا کر دیکھوڑے میاں، زیادہ سے زیادہ زیادہ سے زیادہ تم ڈر رہے ہو اور جیو گے۔ چلنے کی تم میں سکت نہیں کھانسنے کھانسنے سے فوطے میں جاتے ہو تو یہاں اگلے ہے کہس دم کل گیا چھوٹی کوڑی تک تھا سچا میں نہیں زندگی بھر تم نے شک نہیں دیکھا مستقبل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر اور کی کر کیا کرو گے فوج میں تم بھرتی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے غازی پانے وطن کی خاطر اڑتے اڑتے جان دینے کا خیال بھی جٹ ہے۔ اس لیے کیا یہ جتر نہیں کہ تم کو خشت کر کے یہیں بانا رہیں یہ ڈر رہے ہیں جہاں تم رات کو سوتے ہو، اپنی شہادت کا بندوبست کر لو۔ میں پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا یہ سامنے کیلے کا پسٹل پڑا ہے فزس کر لیا جائے کہ تم اس پر سے پھیل جاؤ..... نماہر ہے کہ تم مر جاؤ گے اور شہادت کا ذریعہ پاؤ گے یہ بے بات اس کی بھر میں نہائی کھنے لگا تھیں کوئی آنکھوں دیکھے کیلے کے چھلکے پر پاؤں دھرنے لگا۔ کیا مجھے اپنی جان عزیز نہیں۔ اللہ اللہ کیا جان تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ جھریوں کی گھڑی !!

مجھے بہت افسوس ہوا اور اس وقت اللہ بھی زیادہ ہنسا جب میں نے لکھا کہ وہ کجھت جڑی آسانی سے شہادت کا ذریعہ اختیار کر سکتا تھا۔ خیراتی ہسپتال میں لوہے کی چار پائی پر کھانا کھنا کر مار گیا۔

ایک بڑھیا تھی منز میں دانت نہ بیٹھیں تھیں آنت۔ آخری سانس لے رہی تھی۔ مجھے بہت ترس آیا۔ ساری نظر غریب کی منہسی اور بچہ و غم میں گم رہی تھی۔ میں اُسے اُٹھا کر دیل کے پاٹے پر لے گیا۔ مسات کیجیے گا۔ ہمارے یہاں پڑھی کو پاٹے کہتے ہیں۔ لیکن چٹا۔ جو مٹی اس نے ٹھوس کی آواز سننی ہوئی میں اگئی اور گوک بھرے کھلونے کی طرح اٹھ کر بھاگ گئی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن پھر مجھ میں نے بہت نہاری۔ بنیا کا بیٹا اپنی دھن کا پکا ہوتا ہے۔ نیکی کا جو صاف اور سیدھا راستہ مجھے نظر آیا تھا میں نے اس کو اپنی آنکھ سے اوچھل نہ ہونے دیا۔

منظوں کے وقت کا ایک بہت بڑا ساحل غامبی تھا۔ اس میں ایک سو کاروں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے بہت ہی مختصر سات میں۔ میری جبر کا رانکھوں نے اندازہ لگا دیا کہ یہی بڑی بارش میں سب کی چھتیں ڈھسے جائیں گی۔ چنانچہ میں نے اس احاطے کو ساڑھ دس ہزار روپے میں خرید لیا اور اس میں ایک ہزار غلوک اٹھال آدمی بسا دیے۔ دو مہینے کرایہ وصول کیا۔ ایک سو پیرا ہمارے حساب سے۔ پھر سے بیٹھے جیسا کہ میرا اندازہ تھا۔ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کمروں کی چھتیں نیچے آ رہیں اور سات سو آدمی چھتیں نیچے پڑے بھی شامل تھے۔ شہید ہو گئے۔

وہ جو میرے دل پر جوہر جوہر سا تھا کسی قدر دکھا کر گیا۔ آبادی میں سے سات سو آدمی کم بھی ہو گئے۔ لیکن انہیں شہادت کا تہ بھی مل گیا۔ — اور ہر کا پڑا بھاری ہی رہا۔

جب سے میں یہی کام کر رہا ہوں۔ ہر روز حسب تفریق دو تین آدمیوں کو جام شہادت پلا دیتا ہوں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ کام کوئی بھی ہر انسان کی محنت کو نہابی پڑتی ہے۔ اشد بخشے شولا پور کی ایندھنی جتنے کر ایک شہر کا یا کئی تھی۔ لیکن مسات کیجیے گا وہ شہر یہاں ٹھیک نہیں ٹھہرتا۔ کچھ بھی ہو، کتنا یہ ہے کہ مجھے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کو جس کا جو چھکڑے کے پاٹے میں پیچے کی طرح بے مٹی اور بیکار تھا۔ جام شہادت پلانے کے لیے مجھے پورے دس دن جگہ جگہ کیلے کے پھیلے گرائے پڑے۔ لیکن موت کی طرح جہاں تک میں بگستاہوں شہادت کا بھی ایک دن عتد ہے۔ دسویں روز جا کر وہ پتھر پڑا۔

آج کل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں۔ ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے۔ دو فاکہ کا ہے۔ اس میں سے دو پختہ ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ یہ میری ہی کرایا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ ڈاڑھ اوڑھ کر گرے گی۔ یہ کہہ کر مصلحہ ہی میں نے ایسا گویا ہے۔ اس وقت میں سو سو روپے کا کام پڑے گا۔ خدا کے گھر سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے۔ لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ پورے درجہ کا گناہکار ہے۔ جس کی شہادت اشد جہادک و تعالیٰ کو نکھو نہیں تھی۔

(آنرود کی خدائی نہیں سے)

بڑا نامور افسانہ نگار تھا

۱۳۷۳ھ

تصانیف

مختصر حالات

منٹو کے ڈرامے	منٹو کے افسانے	۱۱۔ جی ۱۹۱۲ء	پیدائش
دھواں	افسانے اور ڈرامے	سیرالہ۔ ضلع دھیانہ	مقام پیدائش
لذت سنگ	چٹند	نگہت، نوبت اور نصرت	اولاد
ٹھنڈا گوشت	یزید	امر سراوہلی گڑھی میں	تعلیم
سیاہ ماسٹے	تموہ کی خدائی	امر سراوہلی گڑھا لاہور والی دیرگھا	تایام
سلج مرسٹس شیریں	خالی تلمیں خالی ڈبے	۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء ڈھاکہ لاہور میں آگیا	انتقال
گنے فرشتے	سڑک کے کنارے	○	
اوپر نیچے اور درمیان	بادشاہت کا خاتمہ	ماٹہ	پہلی کہانی
پھندے	سرکشوں کے بیچے	کبوتر لاد کبوتری	آخری کہانی
شکاری عورتیں	برتے	○	
آؤ	منٹو کے مضامین	جن کہانیوں پر مقدمے چلے	
تین عورتیں	جنازے	دھواں	کالی شلوار
عصمت چٹائی	کرٹ	کھول دو	بو
سرگذاشت امیر (ترجمہ)	نور جہاں لڑجہاں	اوپر نیچے اور درمیان	ٹھنڈا گوشت
گور کی کے افسانے (ترجمہ)	دیرا (ترجمہ)	○	

افسانوں کا پہلا مجموعہ، منٹو کے افسانے ہے جو

۱۹۳۵ء میں شائع ہوا

○
ان کے علاوہ منٹو کی سات آٹھ کتابیں زیر طبع ہیں۔

(۳)

منٹو کے فن اور شخصیت پر مضامین

(جن میں منٹو بھی ہے اور سلاوت حسن بھی)

فن پر لکھنے والے

ممتاز شیریں
وقار عظیم
محمد حسن عسکری
عابد علی عابد
ابوالقیث صدیقی
عبادت بریلوی
ممتاز حسین

شخصیت پر لکھنے والے

سعید چغتائی
اوپندر ناتھ اشک
احمد نعیم قاسمی
عاجز مسرور
ابوسعید قریشی
حامد بنگال
غلام عباس
محمد طفیل

منٹو کی فنی تکمیل

منٹو کے آخری دور کی دو تحریریں، میری نظر میں منٹو کی ادبی تکمیل کی منظر ہیں۔ ڈراما اس منہجہ میں اور افسانہ نگاری کے لیے ”بابو گوپی ناتھ“ کو ایک بڑا اہم سطر تھا جس سے منٹو کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس میں منٹو نے غلامی، مول، بڑا بھری، پچیدہ اور عمل کردار پیش کیا تھا اور اس کردار کو پیش کرتے ہوئے منٹو کا دور یہی ایک سچے فن کار کا دور تھا۔ ایک عمل کردار کے ساتھ اس افسانے میں ایک عمل اور بھری تجربہ بھی تھا۔ جیسا کہ مسکری صاحب نے کہا ہے۔ منٹو تلوار چھوٹے چھوٹے انفرادی قہروں کو فوراً رقم کر کے افسانہ کی گرفت میں لے آتا تھا۔ اس سے چھوٹے چھوٹے تجربے آپس میں مل کر اور وقت گزرنے پر فنی کار کے ذہن میں داخل کر ایک عمل اور بڑے تجربے کی تشکیل پاتیں۔ افسانہ ”بابو گوپی ناتھ“ میں ایک تجربے اور اس تکمیل کا احساس پایا جاتا تھا۔

منٹو کے فن کے اس تبدیلی اور تھاکی تکمیل آخری دور کی ان دو تحریروں میں پائی جاتی ہے جن میں ایک تکمیل، ایک وسعت، ایک کائناتی گیرائی کا احساس ہے۔ زندگی اور وجود کا ایک فلسفہ ہے۔ سماج اور زندگی کی حقیقتوں کو ڈی بے ہم صداقت اور بے باکی سے بیان کرنے میں منٹو کے قلم کی قوت منفی اور تخریبی تھی۔ بعد میں منٹو میں اشبائی اقدار تو پیدا ہو ہی چلتے تھے۔ لیکن انہیں منٹو اس درجہ تک پہنچ چکا تھا جس میں کہ ایک فنی کار میں زندگی اور وجود کا ایک مثبت فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔

اگر کوئی اس منہجہ میں ”کی گزریوں کو کچھ سکے تو اسے یہ احساس ہو گا کہ اس میں منٹو نے منفی عناصر (NEGATIVE ELEMENTS) کو جن میں زندگی کی قوت نہیں، عدم اور فنا کی طوفانیت ہے۔ اور ان اشبائی عناصر (POSITIVE ELEMENTS) کو آپس میں ملا ہے جن سے حیات کی تجدید ہوتی ہے اور زندگی اگلے نرسخت ہے۔

یوں تو پہلی نظر میں اس منہجہ میں کلام موضوع وہی نظر آتا ہے جڑی، اریج لائنس کے (BABY CHATTERLEY LOWER) کا ہے۔ کردار بھی تقریباً وہی ہیں۔ ایک شہر پر شادی کے فوراً بعد مفلوج ہو جاتا ہے، اس کی سس، جہان صحت مند ہوئی، ایک جوان صحت مند مرد اس کی بیوی کو زندگی کی قوت دے سکتا ہو اور ایک نامور جو اس مفلوج ظہیر سے بھردہ ہو اور لگاؤ رکھتی ہے لیکن لارنس کی اس موضوع پر پیش کش سے منٹو کی پیش کش کیس اونچی اور فن کارانہ ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ایک ناول ہے، دوسرا ڈرامہ۔ اس میں ایک فلسفہ ہے، لارنس سے مختلف، حالانکہ لارنس کا بھی ایک فلسفہ تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لارنس نے جنس ہی کا ایک فلسفہ بنایا تھا۔

منٹو کی اس تحریر میں ”اس منہجہ میں“ ایک جمالیاتی (AESTHETIC) احساس ہے اور ایک جمالیاتی رویہ (AESTHETIC APPROACH) یوں تو زندگی کی قوت کو منٹو نے ہی لارنس کے معنی میں لیا ہے، یعنی جنس، لیکن یہاں منٹو

نے حسن کو زیادہ اہمیت دی ہے اور ان دوسرے اشیائی عناصر کو بھی جو حسن اور زندگی کی تکمیل کرتے ہیں۔

حسن ایک اشیائی عنصر ہے، جنس، جہانی، صحت، لطیف جذبات، محبت کی قوت یہ سب اشیائی عناصر ہیں جو جی میں بدھ قائم موجود ہیں اور کم و بیش اس کے طور پر کے چھوٹے بھائی میں بھی موجود ہیں۔ لیکن شہر جب وہ کسی حادثہ کی وجہ سے اس طرح مفلوج ہو جاتا ہے کہ اس میں زندگی کی قوت منقطع ہو جاتی ہے، ایک مفلوج عنصر بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غلطی کے ہاں اس مفلوج شوہر کو پیش کرتے ہوئے وہ بلی کی حقیر نہیں پاتی جاتی جو لڑائی کے صبر میں پاتی جاتی ہے۔ اس کے بذات منتظر کو اس کا دوسرے پوری ہو کر دی ہے، بلکہ منتظر نے اس بے پناہ ذہنی کرب و اذیت اور کشمکش کو ٹھکانہ کا اہم حصہ بنایا ہے۔ اس میں یہ محسوس کرنے کی صلاحیت ہے کہ اگر اس کی حسین اور نوجوان بیوی کو اس کا پھر راقی حاصل ہے کہ اس کے بھائی کی طرف متوجہ ہو جس سے اس کی سبک معنوں میں مثبت محبت مل سکتی ہے اور ان دونوں کو آپس میں بے اختیار کشش ایک فطری امر ہے۔ وہ خود تو اپنے مفلوج جسم، نفسیاتی کمزوری اور احساس کمتری کے ساتھ ایک مفلوج عنصر بن چکا ہے جس سے بعد وہ کی جا سکتی ہے، محبت نہیں، محبت، اس کے جانی خادوم سے ملتی ہے جو خود محبت کے قابل نہیں جو بد صورت ہے، اور بد صورتی بگاڑنے کو ایک مفلوج عنصر ہے۔ یہ دونوں مفلوج عناصر یعنی مفلوج شوہر اور مفلوج ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں، لیکن ان کی قوت، اس آپس میں ملاپ کوئی اشیائی قوت پیدا نہیں کر سکتے، لہذا وہ زندگی کی بجائے موت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، ایک ساتھ خود کشی کرتے ہیں، اس طرح یہ مفلوج عناصر فنا کی طرف جاتے ہیں۔

دوسری طرف مثبت عناصر بے اختیار ایک دوسرے کی طرف کھینچ جاتے ہیں، آزاد، بھلی نساءؤں میں، قدرت کے یلغی نگاروں میں ان کی محبت پر وہاں چڑھتی ہے اور جب مثبت عناصر آپس میں ملتے ہیں تو زندگی پر پیدا جاتی ہے۔ منتظر یوں تو ایک فطری فن کار ہے لیکن اپنی چند ایک تحریروں میں۔ چنانچہ "تو، تھنڈا گوشت" منتظر نے خود کو ٹھنڈا گوشت پر جو کچھ لکھا ہے اس سے اس بات کی پوری تصدیق ہوتی ہے، "مڑک کے کٹاؤ" اور اس بھدھار میں "دیر" میں وہ بڑی شگونی فرما کر (CONSCIOUS ARTIST) نظر آتا ہے۔

ایک اور اہم بات جو منتظر کے آخری فنکارانہ اور تحریروں میں پائی جاتی ہے اور منتظر کی ادبی تکمیل کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ ویرن کی وسعت ہے۔ اس دونوں تحریروں میں ایک کا کائناتی ویرن (COSMIC VISION) ہے یہاں منتظر کے ویرن میں وہ وسعت پیدا ہو چکی ہے جو انفرادی اور خصوصی (PARTICULAR) کو انسانی اور کائناتی (UNIVERSAL AND COSMIC) میں تحلیل کر دے۔

ایک خاص واقعہ، ایک خاص جہز، ایک خاص، انکھا، انفرادی کا وارپٹل کرنا منتظر کی ایک خصوصیت تھی، "مڑک کے کٹاؤ" میں بھی ایک خاص واقعہ ہے لیکن یہاں خصوصیت، "آنا قیت میں سلول ہو گئی ہے، افسانے کے ساتھ جزئیات میں صرف ایک چیز رہی ہے جو خصوصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مڑک کی آنکھیں، لیکن ان کی آنکھوں سے آسمان کی نیلا ہٹ کی تشبیہ، آسمان کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا، اس خصوصیت میں بھی وسیع کائناتی ویرن کا احساس پیدا ہوتی ہے۔

یہاں ہم زمان و مکان (TIME AND SPACE) کی تخصیص بھی قبول جاتے ہیں، یہ قبول جاتے ہیں کہ وہ واقعہ کسی خاص عورت اور خاص مرد سے وابستہ تھا، وہاں انزلِ عورت اور انزلِ مرد ہے۔ ان کا ملاپ وجود کی تکمیل، وہ انزلِ بنیادی گناہ، اور اس بنیادی گناہ کا اظہار صرف عورت اور کرتی ہے۔

تو دروں کا سمٹ کر ایک ہو جانا اور ایک ہو کر والہانہ وسعت اختیار کر جانا، اور اس سمٹ کر اس نئے سے نقطے پر پہنچیں جو پھیل کر کائنات بنتا ہے۔“

یہاں منظر کا جنس کا تصور بھی کتنا مختلف اور کتنا بلند ہے۔ گو منظر کا فطری جنس کے متعلق ہمیشہ مندر ہا ہے اور وہ
 دوسے ایک ازلی، فطری صحت و مزاج پر گہوارا ہے۔ لیکن پہلے منظر کے ہاں جنس کا تصور محض جسمانی تھا۔ لیکن یہاں منظر کا تصور
 اتنا بلند ہو چکا ہے کہ اسے وجود کی گہرائی اور دھڑکن کے لحاظ سے تعبیر کیا ہے۔

و چونکہ ٹیکس اوردیوؤں کے لحاظ سے اس کا تصور کے ساتھ ہی یہاں بنیادی گناہ کا تصور ہی شامل ہے اور حرکت کے گناہ نے میں بنیادی گناہ کا تصور آگاہ ہے جتنا کہ میں ہاں تصور ان کے ہاں ملتا ہے۔

اس گناہ کا نشانِ عورت کے سینے پر درخشا رہا تھا۔ اور عورت اپنے سینے پر اس دھبے کو آنکھوں کو کرکے اپنے آپ سے یہ چھپاتی رہی ہے، کیا یہ دروغی گناہ تھا؟ اور کیا یہ موت میرا گناہ تھا؟

”میں نے اپنی پھر چٹراتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی۔ اس کے گرد کی گیل کی تھی اور اس کے چہرے کے قدوں سے
 حق بستی کی تعمیر و گیل کی تھی.....“

یہ اس کی شخصیت کی تکمیل تھی کہ وہ ماں بن رہی تھی، ایک برقی اس کی کوکھ کی سیپ میں تشکیل پا رہا تھا۔ ماشا کی گلی اس کی ساری دنگوں میں سرایت کر گئی تھی اور اس کی دودھ بھری چھاتیوں کی گودہ تیروں میں مسجد کے اگلے پائینو میناروں کی سی تقدیس آ رہی تھی۔ وہ ماں بن رہی تھی، اس کی تکمیل تو آج ہوئی تھی۔ لیکن اب جبکہ اس کی تکمیل ہوئی تھی وہ اسے بھڑک رہا تھا.....

”اس کا تلاتہ میں ایک دو چ کبھی کبھیں گھٹیل چھوڑ دی جاتی ہے؟“

حکمت میں غموس کرتی ہے جیسے وہ ہاتھوڑی کی میشرنگ طرح ایک چوراہے پر کھڑی ہے۔ یہ دنیا ایک چوراہا ہے یا رو
نکہ پنجر پر انہیں انٹھیں گی۔ اور جب اس کی کوکھ کا موتی سیپ سے باہر نکلے تو گناہ کی زندہ علامت ہو جائے گا۔ ہاتھوڑی کے
(SCARLET LETTER) میں بھی موتی گناہ کی زندہ علامت ہے۔ موتی (PEARL) جو میشرنگ ناما ہارتھی کا نام ہے اور اس
نام میں بھی گویا ایک رمزی مضبوطی (SYMBOLIC-SIGNIFICANCE) ہے۔

..... یہ انگلیاں منہ پر لیاں ہیں جن کو ان کی طرف سے ان کو نشانہ دیا گیا ہے.....

اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی، زندگی موت سے بدتر ہوگی، اس کی بھی اور سچی کی بھی۔ اس سے بدتر ہے کہ اس نئی زندگی کو آغاز ہی میں ختم کر دیا جائے۔

اور جب ایک ماں، اپنے سارے جذبات اور احساسات کو گھل کر، اپنی اماں کا آپ گلا گھونٹ کر جب اس زندگی کو ختم کرنے لگتی ہے، جو اس کی اپنی زندگی کا ایک حصہ تھی، اس کے اپنے خون سے بنی تھی، اس کی کوکھ میں تشکیل پائی تھی، وہ ماں کس بے پناہ فریبی و درحالی کرب سے گزرتی ہوگی؟ اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے!

اور اخبار میں بھیجی ہوئی وہ چند سطریں، چند سہرہ، چند سطریں اس المیہ کو کہاں پاسکتی ہیں؟ لیکن فن کا دستور اخبار کی ان چند سطروں میں وہ گہرا المیہ تلاش کر لیتا ہے جو حیرت اور ماں کا المیہ ہے۔

اس المیہ کو اپنی ساری گہرائیوں اور ساری (PREGNANCY) کے ساتھ پیش کر چکنے کے بعد جب منظر اچانک اپنا افسانہ اس اخباری رپورٹ پر ختم کرتا ہے تو ہم کو یہ ایک دھچکے کے ساتھ بہت جلدیوں پر سے سطح زمین پر آگرتے ہیں یا وسیع گہرائیوں سے اچانک باہر نکل آتے ہیں، زمین سطح پر۔

اور کائناتی وسعت اور گہرائی سمٹ کر ایک غصہ منی نقطہ پر آجاتی ہے۔

افسانہ کے اختتام پر یہ اخباری رپورٹ، پہلی نظر میں، کچھ غیر خودی معلوم ہوتی ہے، اور غیر فنی کا مادہ بھی، جس سے افسانے کے ٹیپر، ٹون اور کیفیت کو ایک دھچکا سا ملتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ اختتام ٹھیک معلوم ہوتا ہے، غصہ نے ایک معنویت، ایک خاص (SIGNIFICANCE) پیدا کی ہے۔

اس افسانے میں جو سارا فنی کیفیات سے مشرب ہے، واقعاتی طور پر یہ جتنا کورٹ آخر میں لپی کو مارنے کی کوشش کرتی ہے بالکل مناسب اور موزوں نہ تھا۔ غصہ نے اس بات کا انکشاف، اخباری رپورٹ کے ذریعہ کر دیا ہے یہ زیادہ ضرورت ہے۔ علاوہ بریں اس رپورٹ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتنی زندہ رہ جاتی ہے اور اس دوسرے انکشاف پر کتنی اور سوال ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ یہ لپی زندہ رہ کر سماج کے ہاتھوں کیا کیا دکھ اٹھائے گی، وہ عورت بن کر شاید ہی گناہ کرے گی، دیا گناہ پر مجبور کی جائے گی جو اس کی ماں نے کیا تھا، شاید وہ بھی ماں بنے گی اور اپنے موتی اپنے گناہ کے پھل کو اپنے ہاتھوں.....

کیا یہ داستان پھر دہرائی جائے گی؟ اور کائناتی ایک دائرہ میں گھوم کر اسی نقطہ پر آجائے گی؟ یہی کا زندہ رہنا بھی گویا (IRONY OF FATE) ہے۔

اور پھر اس اختتام سے ایک تضاد کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ آفاقیت (UNIVERSAL) اور انفرادیت (PARTICULAR) کا تضاد۔

انہی مراد و انہی مراد و دور دوروں کا لاپ، جو رو کی گھٹیل، پہلا خیال ہی گناہ اور اس گناہ کا کھادہ..... اور پھر اختتام پر اچانک یہ احساس کہ یہ شخص ایک عام واقعہ تھا، ان میسجوں و ادواتوں میں سے ایک جو آئے دن ہوتی رہتی ہیں کائناتی وسعت اور گہرائی سمٹ کر ایک غصہ منی نقطہ پر آجاتی ہے۔

اور حقیقت کے دو سطروں، حقیقت کی دو سطروں کا تضاد!.....

ایک خاموشی، واقعاتی، سطح حقیقت جو خیال کی چند سطروں میں سموری گئی ہے۔۔۔۔ ایک نوزائیدہ بچی سردی سے ٹھہرتے شرک کے کنارے ہائی گئی، کسی سنگ دل نے بچی کی گردن کو کپڑے میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا اور گریباں جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں بانڈ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مر جائے۔
اور سنگدل کے لفظ پر ہم چرکتے ہیں۔

سنگدل کون تھا؟

وہ ماں جس نے رنجی رنگ میں سلائیٹ کرتی ہوئی مانتا کا خون کے کئی کئی گونے کے لیے چھوڑ دیا تھا؟
یا وہ مرد بچی کا باپ، جو عورت سے سب کچھ حاصل کرنے کے بعد اسے دھوکا دے کر اور اس نازک حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تھا؟

یا وہ ساج جس کے خوف نے عورت کو یہ غیر فطری حرکت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ ساج جو عورت کے سب سے اہم جزوہ ماں کا بھی گلا گھونٹ دیتی ہے؟
ایک خاموشی، واقعاتی حقیقت جو صرف یہ بتاتی ہے کہ ایک عورت نے گناہ کیا تھا اور اپنی نوزائیدہ کو مارنے کی کوشش کی تھی۔

اور دوسری گہری باطنی حقیقت جو سارے افسانے میں عورت کی فزکی کیفیات اور محسوسات کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ عورت کی مضطرب ذہنی کیفیتوں، جذباتی پھل (DISTURBED EMOTIONS) کے ذریعہ جب وہ ماں بنا رہی ہوتی ہے۔

کچھ بعد دیگے وہ ساری کیفیات — جب عورت نے رنجی غیر فطری بھائی بھائی درجہ مرد کے حراے کو دی تھی اور محسوس کیا تھا کہ دوروں میں سمٹ کر ایک ہو گئی ہیں، اس نے وجود کی تکمیل کی ہے، اور اس کی اپنی تکمیل اب ہوئی ہے۔ جب وہ ماں بننے والی ہے۔

عورت کے ماں بننے کی کیفیت جب وہ ایک بلند و بزرگ اور تقدس بستی بن جاتی ہے، جب مانتا کا گرم گرم خون اس کی رگوں میں بہتا ہے اور اس کے سینے کی دودھ بھری گودوں میں مسجد کے پاکیزہ بنیادوں کی نقادیں اور طہارت آجاتی ہے۔

پھر وہ اذیت ناک احساس — نہیں یہ تقدیس اور طہارت کچھ بھی نہیں..... وہ تو دنیا کی لگا ہوں کے سامنے ایک چرا ہے پر کھڑی ہے۔ اس کے سینے پر گناہ کی علامت، ایک سرخ نشان دبک رہا ہے۔ انگلیاں اس کی طرف اٹھ رہی ہیں، یہ سب لوگ اسے سنگسار کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں مگر اس پر پہلا پتھر اٹھانے کا امن میں سے کوئی بھی مجاز نہیں۔

اور پھر وہ پھل، وہ جذباتی طوفان، وہ کرب و اضطراب، وہ کش مکش اذیت

وہ کش مکش، اور چھوری اور بے بسی کی وہ آخری چیخ امت پھینکو، اسے

مت پھینکو، میری روح کا یہ ٹکڑا تجھ سے مت پھینکو۔

خارجی حقیقت کا پردہ چاک کر کے جب غٹر میں یہ باطنی حقیقت دکھاتا ہے تو وہاں صرف ایک روح نظر آتی ہے۔

ایک عورت اور ایک ماں کی زخمی پٹریں اترتی ہوئی روح !

مناز شیریں

منٹو کا فن

منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، اس کی انصافی آنکھ، اس کی انصافی دماغ، اس کی جرأت آمیز لہجے کا ذکر گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجداد وادیوں پر اس کی تلخ لیکن مصلحت منظر اور اس کی مزے اور نقد و بازوئوں کی وجہ سے سرا گیا ہے اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب کے بڑھ کر انسانی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے مصلحت کی کیا ہے اور اس کا وہ شخص اور جو شخص میں لوگوں کا جلد و تیرہ رہا ہے اس میں حق پسندی اور توازن بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ انفرادیت کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سادہ کھیل میں جو برسوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور پر کھیلا گیا رہا ہے، منٹو ایک شمالی سرزمین نظر آتا ہے اور شمالی زمینوں میں کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ اُسے جس شخص کا جسم سمجھ کر دیکھیں اور کچھ نگاہوں کو اس میں بڑائیوں کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھ جائے تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جلد باقی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھوکھلے کمرے کو سچانے کا موقع نہیں دیا۔ دنیا کی ہر دوری پر بڑی طرح منٹو شخص پہنچا ہے اور مصنف ہی، اس کے افسانے نے نہ ختم ہوا حسن و جمال کے مظاہر ہیں اور نہ محض برائیوں کے کھال اس کی حقیقت نگاری، اس کی انصافی آنکھ، اس کی دماغ اور توازن اور اس کی جرأت آمیز لہجے گوئی، اس کی تلخ لیکن مصلحت منظر اور اس کی شگفتہ فقرہ بازی کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو ہیں۔ کبھی بہت اچھے اور کبھی بہت بُرے۔

ان اچھے، بُرے اور کبھی بھی بہت اچھے اور بہت بُرے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلے انسانی کی نظر ان بے شمار موضوعات پر پڑتی ہے جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے۔ کلواک، مرنور، ملائف، دند خرابات اور لہر پائی کشمیر، بمبئی، دہلی، لاہور، نظم، اسٹڈیو، کالج، بازار، گھر، محل، چاء خانے، بچے، بوڑھے، جہاں جہاں سب کی قربانی، الجھنیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر نہیں اور اس کے گونا گوں مظاہر منٹو کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں۔ بعض کو چوں میں بیچ کر اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی بعض افراد کا ذکر وہ جس اتنے خاص سے کرتا ہے وہ ادا ہر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض دوزخ آمیز اشارے نہیں ہے جو زائقہ ہے وہ دوسری باتیں کہتے اور کرتے وقت شاید محسوس نہیں ہوتا لیکن ذکر کسی کو بچے کا ہو، کسی شخص کا ہو اور کسی بات کا ہو یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ منٹو اس کو بچے کے سادہ سنج و غم، اس شخص کے دل کے سادے پیچیدہ اور اس بات کی ساری نرا کمزوری اور ملامتوں سے واقف نہیں۔ جہاں تک ان گونا گوں موضوعات کا تعلق ہے ان کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سوں کی دل اندازی کی ہے بہت سوں کی بھائی بھائی

لی ہے اور بہت سوں کی گامیاں ٹسنی ہیں اور اس کا ترجمہ بڑا ہے کہ بہت سے ٹسنے والوں نے انھیں گایوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مرتبہ کا اعزاز لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر وہی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے غزوہ کجپانے کے لیے اس کے فنی پر دیکھتے ہیں لفظ فنی خود ہی ہے۔ اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے جی کا منٹو نے پوری ضرورت سے انتخاب کیا ہے اور اس نقطہ نظر کی اہمیت ہے جہاں موضوعات کے انتخاب کا ذریعہ ہے یہی حقیقت ہے جس چیز نے منٹو کو منظر بنایا جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسر نہیں وہ اس کا فن ہے۔ اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ نگہ جاتے اس کے فنی کا ذکر کریں اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ منٹو کا ذکر کریں تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ منٹو نے جو بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں ان کے افسانہ کا اسلوب کیا ہے اور اس کے افسانہ کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فنی کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فنی کی کیا حدیں ہیں اشیاء اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطہ نظر سے الگ ہم اس کے فنی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فنی کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منٹو کی طرف پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے تکنیک کے وہ مبادیات اور مطالبات ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں باہم امتیاز سمجھے جلتے ہیں۔ داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گویا ناول نگار اور ڈرامیٹسٹ اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈراما یا افسانہ کہتے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرض آویں جانتا ہے تاکہ ایک خاص صنف ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے اس کے غلوں اور حدود اقت کا قہقہہ ہے کہ وہ اس صنف ادب کے ان اختیاری اصول و قواعد میں سے پوری طرح واقف ہو کر انھیں پوری طرح برتے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک اس کی ہدایات یا اس کا فن ہے۔ جانتا، سمجھتا اور ان کا صدیقی دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔ اس لیے کسی فنی کار کے فنی کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے کہ اس فنی کار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو ان اصول و قواعد میں کو اس کی ہدایت کو کس حد تک جانا بھجا بہترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔ فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فنی کار نے فنی کی ہدایات کی پابندی کرنے کا فنی ادا کیا ہے اپنے خیال اور احساس کو منٹو کی تکنیک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کیے ہیں۔ ان مختلف وسائل کے استعمال میں فنی کار کے تخیل، انکسار اور فنی کاوش اور انتخاب کو توجہ کو خاصا داخل ہوتا ہے اس لیے جو فن کار اپنے فن کو کس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے اس حد تک اس کی توجہ اور انتخاب کی روشنی کی بدولت افسانہ اور افسانہ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ جاتے ہیں۔ افسانہ اور افسانہ کی یہی منزل ہے جہاں صنف کا تخیل اور فکر حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء اور عناصر میں افسانہ اور افسانہ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ یہی رنگ صنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا منظر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جزو سمجھنا

جانا ہے جس میں فنی مذاہبات اور اظہار و باخ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔

فنی جائزہ لیجئے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فنی کار کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگاتے وقت چند اور باتیں بھی ایسی ہیں جو پیش نظر نہ رکھی جائیں تو یہ فنی جائزہ اور دور رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انعام، توجہ اور کاوش سے انعام کے وسائل میں سے نئے پہلو پیدا کرتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے عزم رنگ بھرتا ہے ان پہلوؤں کا انکشاف اور اس رنگ کی شرفی ہمیشہ قائم نہیں رہتی فنی کار کے اصحاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس انعام اور کاوش کے اہل نہیں رہتے جس سے انعام کے وسائل کو نیا پن اور تازگی ملتی ہے اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا غلبہ ہوتا ہے تو فنی کار رنگ بھی پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ ان حقائق کو پیش نظر رکھ کر بغیر فن کار کے فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ اگر شخصیت کے عناصر کے انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں اغلاط پیدا ہونا لازمی ہے لیکن فن کار کو فن کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر انکار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انعام اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوب انعام میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتی ہے جو اس کے فن کی انفرادی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ظاہر ہونے کے بجائے کثرت کبھی کبھی اُبھرتے اور اندر سے ہیں چمک دکھ کر غائب ہو جاتے ہیں۔

منشور کے اضافی فن میں فن کے یہ سارے عناصر بدیع اتم موجود ہیں۔ اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سراغ نہیں ملتا۔

افسانہ ناول، ڈراما، داستان، کہانی — ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی ڈراما واقعہ اس قصبے سے تعلق رکھنے والے کردار واقعہ کی ابتدائی اور اس خاتمہ تک اس کے مختلف عناصر، مصنف کا ایک مخصوص انداز فکر، نظریہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو کہ پال میں بیٹھنے والے بڑی سادگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں، اس کہانی میں بھی جو بڑی بڑیاں مدت کی خاموشی میں بچ کر کوئی ہیں۔ اس افسانے ناول اور ڈراما میں بھی جو فن کے لیے حساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک، ایک، امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔ داستان میں تخیل اور قصہ کی رنگینی، ڈرامے میں کوئی ڈرامائی کشش، ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی کہانی یا امتیازی اور انفرادی خصوصیت ہیں۔ افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور قصہ دی ہوتی ہے۔

ایک کردار، ایک واقعہ، ایک فنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہے، ایک ہو، عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیادی خصوصیت کی طرف سے غفلت بہت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا اثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔ اُردو کے افسانہ نگاروں

میں پریم پسند نے اکثر افسانہ کی اقتضائی خصوصیت کو پیش نظر رکھا ہے لیکن کبھی کبھی جذبات کی زبوں بکراں سے بھی اس معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے غلطیوں پر پوری ترقی زندگی میں بھی اس حیثیت کو فروغ نہیں کیا اگر انھیں اپنے افسانہ میں کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے سامنے بے شمار چیزیں آتی ہیں۔ یعنی منظر کا ہر گوشہ و ہر جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانہ کا پس منظر بناتا ہے۔ واقعہ اور کردار کے ذکر میں منظر بہت کم اس جرم کے ترکب ہوئے ہیں کہ وہ واقعہ اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کیے بغیر اس کے تعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں۔ لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فروعی اور خفیہ کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحول یا کردار کی مقدری کو اپنی افسانہ نگاری کا مقصد نہیں بناتے۔ یہ سارا علم تو اُن ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے پس منظر یا وسیلہ کام دیتا ہے لیکن حقیقت میں اس پس منظر کے پیچھے کوئی ایک تاثر، جذبیہ، ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصد ہے۔ مثلاً ان کے افسانے "نیا قانون"، "خوشیا"، "نعرہ" اور "نیلا" ہر طرح پڑھنے والا افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے خیال، فکر اور چتر خیالیات کی بدولت بے شمار چیزیں کاغذ پر اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ لیکن ان بے شمار چیزوں کا شاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے۔ افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی اُن گنت تصویریں اس کی نظر کے سامنے آتی اور نصرت ہوتی رہتی ہیں اور ان سے حسب موقع پڑھنے والا سلف و منظر محسوس کرتا رہتا ہے، لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے متوازن قلم کے بنا کئے ہوئے پیشیاد نقش نصرت ہو جاتے ہیں اور خود نصرت ہوتے وقت صورت ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ چیز "نیا قانون"، "خوشیا"، "نعرہ" اور "نیلا" سال کے مرکزی کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعاتی اور نفسیاتی زندگی کے باوجود مجموعی حیثیت سے صورت اس گہرے تاثر اور اس جذباتی کیفیت کے ترجمان ہیں جس میں ایک خاص فرد قبلا ہے۔ منظر اور میرا اور اس کا انتقام اپنی دلچسپ اور دواماتی تفصیلات کی بنا پر شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں میں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں۔ ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی منظر و خصوصیات کا نقش ہے۔ لیکن افسانہ پڑھ چکنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے نمایاں اثر قبول کرتا ہے وہ صورت ایک واقعہ ہے۔ ایک صورت میں واقعہ کی ہلکی چھلکی سنسا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں دوام اور مزاج کا ایک ملاحظہ تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے۔ اسی طرح "جنگ" ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے بسنے والے گونا گوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر جنگ کی سرورق سوسگندی کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔ وہ ساری فضا جو افسانہ نگار نے مشاہدہ، تخلیق اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی مدد سے اس فضا کا خصوصی رنگ واضح ہوتا ہے بلکل کی سرورق سوسگندی کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ دیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت

کچھ ہونے کے باوجود سوگندی ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر سوگندی کے علاوہ باقی سب چیزیں کو باقی رکھنا اس کو بحال جاتے ہیں۔ وہ گورویشی کی ہر چیز پر قابو کر لاس طرح چھا جاتی ہے کہ ہمارے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ صوف سوگندی کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد رکھیں جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر راز ہمارا راز ہے۔

فٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گزری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض منزل کی۔ لیکن ان میں سے ہر منزل میں منٹو نے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعہ صرت ایک چیز یا ایک بات تعاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اتار دینی اور جاگزیں کرنی ہے۔ افسانہ نگاری کے ہی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم کرنے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیے۔ لیکن فیصلہ تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف فن کی وسیلے استعمال کرنے چاہتے ہیں۔ یہ فنی وسیلے اگرچہ بڑی بڑی اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور اقداری خصوصیت ہے۔

افسانہ نگاریہ سرچ کو اگر یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعہ تعاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے۔ اپنے افسانہ کا ایک ٹوٹا بچا بنانا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح ختم ہوگا۔ اچھی کہانی کی خصوصیت جہاں ایک طرت یہ ہے کہ وہ ختم ہو چکے تو پڑھنے والے کے ذہن کو تاثرات کے انتشار میں مبتلا نہ کرے۔ دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ کھنڈے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس جگہ پر تھوڑے بڑے نظری انداز میں قبول کرے۔ فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کا نقطہ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی اٹالیاں ہوتی ہیں۔ جنہیں ہم افسانے کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم، بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطہ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگرچہ پوری طرح قدم جھا کر سہاری اور استعدادی کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جاتے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم مل کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ تعاری ہیں جو افسانہ کی موزوں تمہید سے تاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار کسی اپنے افسانے کی تمہید کی طرت سے غفلت نہیں برتتے۔ تعاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا ہر فضا یعنی افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ منٹو نے ایک دیانت دار اور محفل فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی حیثیت اسی میں جانی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے تعاری کے ذہن پر چھا جائے۔ منٹو نے اچھے اور برے جتنے افسانے بھی لکھے ہیں ان کے موضوع

اور خیال ہے پڑھنے والا خواہ مخواہ ہر ایک افسانہ کی تمید میں اسے ضرور ایک دلکش محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور پایا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں کی تمید سے مختلف موقعوں پر مختلف کلام لکھا ہے، لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا ہو تھوڑی کے ذہن پر ابتدا ہی سے ایک گہرا نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ منٹو کے چنانچہ افسانوں کی تمید میں دیکھ کر اندازہ لگائیے کہ تمید کو پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے اسے کن کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

نیا قانون اس طرح شروع ہوتا ہے:-

”منٹو کو ان اپنے ڈاکو جس بہت عقیدہ آدی بچا جاتا تھا، گواہ کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا سر بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ ڈاکو کے وہ تمام کوچان جن کو بے جانے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اند کیا ہو رہا ہے، اسٹالینگو کی وسیع معلومات سے کبھی طرح واقف تھے۔“

اسی طرح ”جاؤ“ کی تمید یہ ہے:-

”کچھ دنوں سے عین بہت بے قرار تھا، اس کا دھوکا پھوٹا سا بن گیا تھا، کام کرتے وقت بائیں کرتے جوئے لٹا کر سوچتے رہے اسے ایک گلیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کی گورہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔“

ان دونوں تمیدوں کے ذریعہ نگاری کا انداز دو کرداروں سے ہوتا ہے۔ لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی اور اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر کھسکتی اور مجبور کرتی ہے۔ دو تمیدیں اور دیکھیے:

”نکھر میں بڑی چیل چیل تھی، تمام کمرے لٹکے، لڑکیوں، بچے، بچوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ خود ہر پامور ہاتھ لگا کر کان پڑی آواز سناتی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے پیٹھے دوڑھ پھینکے، یہ بھلا رہے ہیں، تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھونڈ لگی یہ بے گھری لڑکیاں اڑ رہی ہیں۔ نہ آں کی خبر ہے نہ لے کی بس گائے بھاری ہیں، نیچے ڈیڑھ سو سے لے کر بالائی منزل تک مکان مکانوں سے کچھ کچھ بھرا تھا، کیوں نہ ہو ایک مکان میں دو یا دو سے تھے، رہے دونوں بھائی اپنی چاندی و لٹیریں بیاہ کر لے گئے تھے۔“

”تیری اور اس کی ملاقات آج سے تھیک دو برس پہلے اپرو بندہ ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ شہر کی آخری کرنیں سمندر کی ان قد واز نہروں کے نیچے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے پنج پر چڑھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تھیں معلوم ہوتی تھیں، میں گیٹ آف انڈیا کے

اس طوط پیلانیچ چھوڑ کر سہ پہر ایک آدمی گچی والے سے اپنے سر کی ماضی کار باغ تھا۔
دوسرے پنج پر بیٹھا تھا اور حد نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دور بہت دور
جہاں سمندر اور آسمان گھٹکی مل رہے تھے، جہاں بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں
اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑا لہر کے رنگ کا قایم ہے جس نے دھرتی اور مٹی پر آواز

پہلی قید شورش کی ہے اور دوسری باغچہ کی۔ دونوں قیدیوں میں افسانہ نگار نے آنے والے عداوتات کے لیے ایک
نصایات کی ہے اور اس نصایات میں دونوں جوتھوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں غرق ہوتا اور
جذبہ برتاؤ محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر گدگدائیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افسانوں کو آگے بڑھتا ہے۔
”چھاپا کی قید صرف ایک جگہ ہے۔ لیکن اس جگہ سے افسانہ نگار نے اپنا کلام ایک دوسری طرح نکالا ہے۔ وہ کہتا ہے
”گوپال کی ران پر جب یہ ٹراپھوٹر انکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔“

گوپال کے متعلق افسانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے اوسان بھی غصہ بہت غصہ خطا ہو
جاتے ہیں اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ یہی افسانہ نگار کی حیثیت ہے۔ اس نے
ایک معمولی سی خبر سن کر قاری کو اپنے ساتھ اپنے نیچے پلنے پر مجبور کر دیا۔
ایک اور افسانے کی قید دیکھیے،

”ایک نہایت ہی تھوڑا کلاس چوٹی میں دسی دسکی کی بڑی ختم کرنے کے بعد بے ہوا کہ باہر
گھر رہا ہے اور ایسی حالت کی تلاش کی جائے جو چوٹی اور دسکی کے پیدا کردہ گندہ گندہ کر سکے۔“

یہ قید بچان کی ہے۔ اس میں دسکی کردار کا تعارف ہے، اذ کوئی نصایات یا قول نہ ملے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے
نہ کوئی پیکار دینے والی خبر سنائی گئی ہے۔ بلکہ بڑے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ گے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ
کے اشارے سے قاری کو گریبا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ آؤ، اگر تم میں ان شریروں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آجاؤ۔ اور
معصوم قاری فوراً یہ دعوت قبول کر دیتا ہے۔
اور نتیجہ،

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ستون نہ رہیں اس کے کاغذ صوریہ و معرکہ کی گئی ہیں۔“

یہ معرکہ کی قید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کی شمولیت کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی
کوشش کی گئی ہے اور بڑی شایستگی کے لگا لگا افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لیے کہ شمولیت کے اس
شدید احساس کے نیچے کیا واقعہ کام کر رہا ہے اس کے دل میں یہ جلتے کی غلط پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں بھیجے کہ افسانہ
نگار کا یہ نشانہ پر بیٹھا۔

”دن بھر کی تھکن مادی وہ بھی اپنی بستر پر لیٹی تھی اور میٹھے ہی سو گئی تھی۔ میرا دل کیڑی

کا بار دوشمنی، جسے وہ میٹر کے نام سے پکارا کرتی تھی، اب بھی وہی اس کی ہڈیاں پسلیاں
جھنجھوڑ کر شربت کے نقشے میں چرند لگ کر داپس گیا تھا۔ وہ رات کو نہیں ٹھہر جاتا،
گلاس (نئی دھرم پتی) کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی :-

یہ تہذیب جنگ کی ہے اور اس میں انسانہ نگاروں نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہیں، ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں، اس
لیے کہ انسان میں آگے چل کر جو گھسان شروع ہونے لگا ہے اس کا تعاقب انہی یہ ہے کہ وہ بات سیدھے ساوے انداز میں کہنے
کے بجائے ذرا نیچے توڑ کر کے ساتھ کہے۔ تار، انسانہ نگار کے ان نیچے توڑوں کو بچان جاتا ہے اور یہ سچ کر کر دیکھیں یہ تعجب نہ
کو رہ جائے والی اور اپنی پیری کا مجرب دار دوشمنی آگے چل کر کیا لکھتا ہے، انسانہ کے ہنر میں کوڑ پڑتا ہے۔
منٹون نے انسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے بہترین کامیت، کلرک صحیح اندازہ لگایا
ہے۔ انہی تیروں میں سے ایک تیر اس کے انسانہ کی قید ہے، جو ہر انسان میں ایک نیا کام کرتی ہے، کہ نگار کو متعارف کرنے کا،
ایک خاص انضایا ہوا بل بنانے کا، ایک پڑھتی ہوئی خبر سننے کا کسی کو نگار کی ذہنی مکمل کش کی معنوی کرنے کا، آئے اندازہ اقلیت
کے لیے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی ایک وقت کئی بے تحاشہ مقصد پر اسے کرنے کا، لیکن ان کو ناگوں کاموں کے علاوہ جو کام غلط
کے انسانہ کی ہر قید نے اپنے فتنے لیا ہے یہ ہے کہ وہ نگار کے ذہنی کو بیدار کر کے اس کے دل میں گدگدی پیدا کر کے یا اس
کے ذہن میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کر کے انسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔ منٹون کی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور
یہ منزل طے کرنے کے لیے اس نے ٹوٹا پڑے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تہذیب انسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل، انسانہ نگار اپنی تہذیب کے ذریعہ پڑھنے والے کے ذہن اور دل
پر تسلط جمانا اور اسے انسانہ کے نئے دماغی حلقوں میں دلچسپی لینے کی طرف آواز دینا ہے۔ آنے والے سچے سفر کی مختلف منزلیں
میں جو میں طرح طرح کی صورتیں مسافر کی راہ میں سامنے ہوتی ہیں۔ نہ بدلنے کیسے کاٹتے ہیں جو اس کے طولوں میں جیسے کچلے
پے قرار نظر آتے ہیں۔ انسانہ پڑھنے والا ان صورتوں کی آسان بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کاٹوں کو راستے
سے بنانے کے لیے انسانہ نگار کی رہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بالآخر انسانہ نگار کی رہنمائی اسے اس منزل مقصد تک
پہنچاتی ہے، جسے ہم انسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کششیں غریب طے کرنے اور خستہ دماغ کا ٹھنڈ کی منتقلی کو گوارا اور آسان بنا
دینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لیے سکون و راحت کا طریقہ
ہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے انسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی
بحال کرنا پڑتی ہے جو فوری حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لیے قابل قبول بھی ہو یہی
وجہ ہے کہ انسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ انسانہ کے خاتمہ پر انسانہ نگار کی
ذرا سی سستی، ذرا سی تنہائی، ذرا سی سہل انگاری اور بالکل معمولی سی غفلت اور تنہائی اس کے انسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور
پڑھنے والے کے لیے گرفت اور تلاش کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ غلطی نے اپنے انسانی فتنے میں انجام کی ان زائکوں

کو چوری طرح محسوس کر کے عورت اپنا فتنی منصب پر ادا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس لیے اس انجام سے ہماری کفہ نہیں کو تیار کرنے کی خدمت میں بھی انجام دہی ہے اور فساد کو انسان کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ بطور کے بعض انسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فتن کی شخصیت کا اندازہ ملگایے۔

ان کا افسانہ ”نیا قانون“ اس طرح ختم ہوتا ہے :
 استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھامے لے گئے — راستے میں اور تھامے کے اندر وہ
 ”نیا قانون، نیا قانون، نیا قانون چلا آ رہا، مگر کسی نے نہ سنی۔“

”نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو — قانون وہی ہے چنانچہ“
 اور اس کو حالات میں بند کر دیا گیا۔

”پچا ہاتھ انجام یہ ہے :

نرملہ بڑے اٹھاک سے پچا ہاتھ رہی تھی۔ اس کی پہلی پہلی انگلیاں تھنی سے بڑا نفیس
 کام لے رہی تھیں پچا ہاتھ نے کے بعد اس نے تھوڑا سا سر ہم نکال کر اس پر پھیلا دیا اور
 گردن جھکا کر اپنے کرتے کے ٹخنوں کے سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُجھار تھا۔ ایسا
 معلوم ہوتا تھا کہ غل پر صبا بن کا چھوٹا سا مکمل ”لبلا“ اٹکا ہوا ہے۔
 نرملہ نے پچا ہے پر پھونک ماری اور اس نکتے سے اُجھار پر بجا دیا۔

”شہ نشین پر کے آخری الفاظ یہ ہیں :

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے
 بڑے دھیمے بھیر میں کہا : ”مجھے زندہ رہنا ہو گا۔“

اس کے اس دھیمے بھیر میں غم کے ”مار تھے۔ اس ٹھنڈی مرنی جوانی کی دلگتی ہوئی چائنائی
 میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔

”جنگ کی بیرونی سرگند ہی ہم سے اس طرح فوجت ہوتی ہے :

تہمت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل
 پر چلانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے
 پھڑکے ہلکے پر اسے پہلو میں لگا کر سو گئی۔“

”..... اس کے حلق سے ایک نعرہ..... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ
 پھیلے ہوئے گرم گرم لادے کے مانند نکلا ————— بہت تیزی.....!
 جتنے کمزور بڑی کی منڈیروں پر اوندھو رہے تھے، ڈر گئے اور نظر پڑانے لگے۔ نعرہ
 مار کر جب اُس نے اپنے قدم زمین سے بڑی شکل کے ساتھ ملٹو دیکھے اور واپس مڑا تو
 اسے اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ بڑی کی عمارت اڑا اڑا دوسرے گئی ہے۔
 اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی پیروی سے جو یہ ضرور سن کر ڈر گئی تھی کہا۔ ”بگلا ہے!“
 (نعرہ)

”..... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ مگر فوراً ہی سب مسائل
 سامت ہو گیا ————— سیوا اچھی میری ضروری میں اپنی جسا یہ سلطنت پر نہایت کامیابی
 سے چھا پادار گئے تھے۔“ (سیوا اور اس کا انتقام)
 ”آس وافر کا ایک نماز گر پر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے غروں
 میں شور مچا ہی جیسے لگتی ہیں ————— یہ ناکمل بوسہ پیشہ میرے غروں پر لٹکا رہے گا۔“
 (ناکمل تحریف)

”جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا: ”ٹاکٹر صاحب! یہ
 اس کی سٹھی میں کچھ ہے۔“ میں نے اس کی بند ٹانگی کو کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کپ تھے
 اس کی ٹانگی کی یادگار!
 ”آئی کو نکالنا نہیں، یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔“ میں نے غسل دینے والوں سے
 کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفن چلا گیا۔“ (ریگو)

”وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ
 اس جگہ کا نشان ٹھاننا چاہتا ہے۔ اس بل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر
 کرسی پر بیٹھ گیا ————— سر جھکا کر اور کانٹے سے ڈھیلے کر کے اس نے ٹھکی ہوئی آواز میں کہا: ”
 تھا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے.....“ (سجدہ)

’منشور کی مختلف کمپنیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس شہر کی خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے
 والے کو اپنے ذہنی انتشار کے مجمع کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کمائی کے انجام میں اپنے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر رہا ہے

جو کمائی کی رفتار کے ساتھ ساتھ احساس میں پیدا ہوتا اور بڑھتا رہا تھا، دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری تہی بنا کر جو کمائی کی قید سے شروع ہو کر بار بار زیادہ عظم بنا رہا تھا، اساد کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی، منظر نے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انھیں مضبوط بنانے میں ہمیشہ اپنی کامیابی کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

نیا نیا فن کے خاتمہ میں استاد منظر خال کی اس جذباتی شدت کا ایسا متضاد رد عمل ہے جس سے پڑھنے والے دل میں حد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ پچاس کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا سیدھا سا سادہ اور ایک ایسا غیر متوقع انشراح ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔ شیشیوں پر کا انجام جذباتی کھینچاؤ کشش اور اس کے بڑے سادہ لیکن فنی کارڈز عمل کی تصویر ہے۔ جنگ کے انجام میں افسانے وسیع پس منظر ایک خاص کردار کے شدید رد عمل اور زندگی کے ایک بڑے ڈکھتے ہوئے ناشر کو بظاہر ایک معمولی سے واقعہ کے ذکر سے اس طرح مل گیا ہے کہ اس کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صحت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سونڈی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم آواز ہو کر ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سونڈی کے نزدیک قابل نفرت ہے۔ غور کے آخری چند جملوں میں کمائی کے مرکزی کردار کیشر لال کی جذباتی شدت اور احساسی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی اساد کی فضا کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے لنگ کی ٹریجڈی کو تلخ تر بنا رہی ہے۔ جذباتی شدت اور فضا کی فنی کو اس طرح کی اسادگی سے نمایاں کرنا منظر کے افسانوں کے خاتمہ کی ایک واضح خصوصیت ہے۔ پیکر کا انجام منظر کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منظر اپنے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر اہل جبریم اور معمولی بات کو پڑھنے والے کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی چوڑی سے ان سادے واقعات میں گمار دیتے ہیں جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مزید معمولی کی جبریم بات گڈے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔ تیسرا اور اس کا اختتام میں آخری جملے میں بھی ہوتی ملکی سی ایمائیت کمائی کے دونوں مرکزی کرداروں کی فنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشنی دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کمائی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا وہ کمائی ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف نتائج اٹھ کر لے گئے ہیں اس سیدھے سادے جملے سے ان میں مکمل ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف ایک واضح اور مزین نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ تا مکمل تحریر میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے روحانی واقعہ کو ایک ناقابل فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔ سجدہ کا انجام منظر کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے، اپنے فنی کے بچے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منظر کی مختلف کامیابیوں کے ان خاتمہ پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات

محسوس کرتا ہے کہ قریٰ کے نقطہ نظر سے سب غنائے افسانے کے مجموعی تاثر کو مکمل کرنے کی جدوجہد انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے اس مشرت کا باعث بنتے ہیں جو پہل بھی فنی تخلیق کے ساتھ ساتھ بستر ہوتا ہے۔ ان سب خاتروں میں کھنے والے کی خدمت بیان اور اس کے انداز نگار کی خدمت اور شوقی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے کبھی محسوس سادگی بیان سے، کبھی تضاد سے، کبھی تکرار سے، کبھی مزاح کی شوقی سے کبھی طنز سے، اور کبھی شاد بہہ، طنز اور غزل کے امتزاج سے وہ اپنے فنی تخلیق میں حدود بیکار ہے اور پڑھنے والا اگر خود سے دیکھے تو یہ محسوس کر لے میں وقت نہیں جوتی کہ افسانہ کے خاکہ کا یہ انداز پوری طرح سوجا کھیا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے خاکہ کو وہ چند عجیبے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت، عظمت اور شوقی نمایاں ہے بعض اتفاقی کا نتیجہ نہیں۔ افسانہ اتار پڑھاؤ کے مختلف مرحلے کے کہ یہاں تک پہنچا ہے۔ بلکہ شاید میں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ ہر شخص کا شانبر کبھی پیدا نہیں ہوئے یا افسانہ کے انجام میں وہی نازکی و توانائی یہاں بھی ہے جس کے آغاز میں تھی۔ اور یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم جنس دوم سفر ہے۔ افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام — ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ انگلیوں سے کسی ایک کی طرف سے بھی غفلت رہنے یا بے نیازی رہنے تو افسانہ کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ مشرقیوں کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اس لیے کہ ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے سے گزرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی خلق ہوتی ہے جس کو پڑھنے والے کی محسوس فزینیں ہوتا لیکن وہ اس سے نشانہ دہر ضرور ہوتا ہے۔ افسانہ ضرور ہر جگہ بڑی رسمی لیکن فنی خیال سے۔ بڑے نرم لیکن بڑے فنی ناکدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور وہاں ہوتا آگے بڑھتا ہے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا بغیر زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس رسمی اور فنی قلی رفتار سے افسانہ اپنے انجام کی پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مشرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے کہ اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے ایسا کہ ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے۔ ایک رسمی کامیابی جیوں ہی انتفاضا ہوتی نہیں آجاتی اس میں کھنے والے کو پورے سفر کے ہر مرحلے پر کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کلاسی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ چڑھنا پڑتا ہے جہاں اس کے لیے زیادہ منزلوں ہیں۔ کوئی کلاسی اگر فزین بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہر اور ربط ہے اس میں جھجکے پیدا نہیں اور پڑھنے والے کے لیے اس ربط میں ایک خوش گوار جھجکار کا جو تصور پر مشید ہے وہ مزہ و مزہ ہو جائے۔ جہاں کہ افسانہ نگاروں نے کلاسیوں کے ربط کی اس جھجکار کے احساس کو کامیت دی ہے اور محسوس نے دی ہے انھوں نے ہر شخص اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا غٹر فنی کا یہ اور امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی کامیت کو کبھی نہ بھلائے ہوئے سیدھے افسانہ کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصوں کی ساخت، مشرت، رفتار اور تاثر خاصہ کو فنی ذمہ داری کے ساتھ ہوتا ہے مشرت کے نزدیک فنی کے ان مراحل کی جہاں کامیت ہے اس کا آغاز و مشرت کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر سمجھو۔

نیا قانون کے استاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے بدعنوانی کی خبر سن کر غصے سے پھولا نہیں سنا تو اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہو جانے سے جو ہونے کے بعد دنیا سے ایک گورے سے دو گنے کے حجم میں حالات میں بند کر دیا جاتا ہے اس آغاز اور انجام کے درمیانی سطحوں کو اس طرح پرکڑنا کہ اس نے کا انجام پڑنے والے کے لیے حدود کو بگاڑ دیا ہے منٹو کے فنی احساس اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی ترتیب و تنظیم کا منظر ہے۔ نیا قانون نافذ ہونے کی خبر سن کر منگو خاں کو جو خوشی ہوئی تھی اس کے لیے نئے قانون کے نافذ ہونے کی تکیہ تک منٹو نے کئی ایسے موقعے پیدا کیے جن پر منگو خاں کی حالت دیکھ کر قاری برابر اندازہ لگا آتا ہے کہ اس کی سرت آہستہ آہستہ اور فنی و دروازہ کی کلاخ اختیار کر رہی ہے اور بالآخر جب وہ دوز سید کا پتھل ہے تو اس کی سرت اور فنی اور دیوانگی، شوق آزادی کو ختم دیکھنے کے لیے ہے۔ تاہم نظر آنے لگتی ہے اور میں اس وقت جب اس واز فنی شوق کو بظاہر اپنی تحصیل کا مرحلے طے مل جاتا ہے اسے حالات میں داخل ہونا پڑتا ہے — اور اس طرح منگو خاں نے جذبات و احساسات کے جو مقصد نازک مرحلے طے کیے تھے ان کا یہ غیر متوقع انجام دیکھ کر وہ تو غرق استغجاب ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک ایسی زبردستی کا نقش قلم ہو جاتا ہے جو اپنی انتہائی سادگی کے باوجود محدود و تحریف و اپنے والی ہے۔

نیا قانون منٹو کی بڑی مشہور اور بڑی اہم کہانی ہے اس لیے اس میں آغاز اور انجام کے درمیان واقعات کا یہ فنی و آثار چڑھاؤ، یہ نازک اور پتھل، اور ایک شدید قسم کا نقطہ عروج شاید بعض لوگوں کو یہ سوچنے کی طوط نال کرے کہ منٹو اس طرح کے مرحلے صرف ایسے افسانوں میں طے کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں۔ حالانکہ خود سے دیکھا جائے تو یہ بات نہیں۔ منٹو کے نقطہ نظر سے اپنے ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں امتیاز برتنے کا نال نہیں۔ فن کے جو مراحل اہم اور ضروری ہیں وہ اس کی ہر کہانی میں یکساں توجہ اور انماک کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ اس انداز سے کے لیے منٹو کی چند اور کہانیاں پر ایک سرسری سی نظر ڈالیے۔

منتر اور میرا اور اس کا اختتام موضوع کے اعتبار سے دو بالکل سیدھی سادی اور غیر اہم سی کہانیاں ہیں جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ بڑھنے والا انھیں پڑھ کر یہ محسوس کر سکے کہ اس نے ایک نئی پھلکی تفریح کی چیز پیش کی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا مجموعی تاثر کسی طرح کے قاری پر بھی اس تفریح کی تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن منٹو نے ان دونوں کی ترتیب میں بھی پورے فنی انماک سے کام لیا ہے۔ دونوں افسانوں کا آغاز، دونوں کا انجام اور دونوں کے آغاز اور انجام کے درمیان کی فز میں سب چلے فنی دیکھ رکھاؤ کے ساتھ طے ہوئی ہیں۔

”چھا“ بلڈوز اور گالی ایسے موضوعات کی کہانیاں ہیں جن میں منٹو کے عجیب موضوع کہا جا سکتا ہے اور جن عجیب موضوعات کے قریبی تعلقی نے منٹو کو اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار بنایا۔ ”چھا“ اور بلڈوز میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ان بھولے بھالے اور محسوس احساسات کی مصوری ہے جو شباب کی مبرا آواز اور گھٹنیں منزل میں قدم رکھنے سے پہلے دل میں جھجک اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو بڑے سادے سادے انداز میں شروع کرنے والا سی سید سے

سادہ انداز میں غم کرنے کے علاوہ آغا زاد اور انجام کو گمراہی معنویت دینے کے لیے افسانہ نگار نے بہت سے چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات کو جوڑ کر ایسی نصابیاری کی ہے جو پوری توجہ اور پورے احساں کے بغیر غور میں نہیں آسکتی۔ افسانہ نگار کے اس نئی خاک اور جود و فکر نے دو جدید سادہ اندازوں کو ایک عملی حیثیت دے دی ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ افسانہ نگار نے نفسیاتی نقطہ نظر سے دو اہم مطالعے ہونے کے باوجود فن کے ان حدود سے باہر نہیں جاتے جہاں سے نکل کر کہانی کی مانی نہیں رہتی۔

یہی صورت کالی شلوار کے ساتھ ہے۔ کالی شلوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے اعمال سے تعلق رکھنے والی بہت کچھ چھپ کر چھپنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی معاملہ میں واقعات میں ایسا آٹار پڑھا پڑھا ہوتا ہے اور وہ ایسے ہیچ دیو ہیچ معاملے سے گزرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پس کی طرف متوجہ ہو کر بغیر صرف ان نفسیاتی محرکات میں دلچسپی دیتا ہے، جو کہادوں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ کالی شلوار اور طوائفوں کی زندگی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لیے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کہادوں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلچسپی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں یہ نفسی چھوٹی ٹہری باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے۔ ان میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی سخت سے سخت علوش سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کہانی کے مختلف کہادوں میں یہ بھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی ٹہری بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ پس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں اور دونوں منطقی طور پر یوں غیر مشترک ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ ہی جائیں منطوقہ فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے ہر افسانہ میں (یا کم از کم اکثر افسانوں میں) موجود نظر آنے کی منطوقہ اپنی اسی خصوصیت کے ذریعہ بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گویہ بنایا ہے۔

(۲)

منطوقہ افسانوی فن کا ایک پہلو یہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مجموعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر میں چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تعمیر، اس کی آفتاب، اس کے واقعات کا آٹار پڑھا پڑھا، ان واقعات کے ہیچ اور الجھاؤ، اس کا پڑھنے والا پڑھنے کے بعد افسانہ کا نقطہ شروع اور اس کا خاتمہ۔ ان سب چیزوں کا تعلق افسانہ کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے، اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لیے دو سب سے اہم چیزیں ہیں۔ منطوقہ نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر کو جو اہمیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور یہ تعمیر اندک کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منطوقہ ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے ان ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اس لیے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے مقصد سے لکھے گئے ہیں۔ گویا فن کار کا مقصود بالفاظ فن کے یہ ظاہری پہلو ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لیے منظر کے فن کا تجزیہ کرنے کی یہ ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منظر کون سے اقسام میں تقسیم کیا جائے گا؟ اس کے لیے ان عناصر کی تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے ہوتے ہیں اور استعمال کیے ہیں جنہیں ہم اس کے اسلوب نگارش کی خصوصیت کر سکیں یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان عناصر ہری پر موقوف کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے لیکن ان سے بھی خاص حیثیت انعام اور اہمیت کے ان طریقوں کو حاصل ہے جنہیں مصنف اپنی اپنی پسند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتتا ہے۔ ایک سیدھی سادی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا اندازہ کیا ہو اس کے لیے کسی خاص محل پر سیدھے سادے فقرے، اشارے، نکات، اظہار، استعارے، اقتضایہ نگاریاں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہو گا یہ بات مصنف اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق سوچتا اور انہیں صلاحیتوں کے مطابق اپنی پسند سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لیے موزوں اور مؤثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔ فقروں، فقرات، اشاروں، ان کی ترتیب، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص اور مفروضہ انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔

منظر کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور انعام کے ان وسائل کے نقطہ نظر سے پرکھنا اور جاننے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز برقرار رکھنے والے کوشش کے ساتھ ساتھ کرتی ہے یہ ہے کہ منظر کے پاس معمولی سے معمولی بات کے انعام کے لیے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔ فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی انطور کے ہوتے ہیں تو وہی سی بہت پسند اور بہت اہم اور بڑی گہری بات کو اس طرح ادا کر دینے کی قدرت کہ جیسے وہ بات ذرا ہم سے ذرا عینی منظر کے انداز انعام کے بعض واضح پہلو ہیں۔

بعض محلوں کو دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پرکھنا اور جاننے کی کوشش کیجیے۔

(۱) سب سے پہلی شاعری یا قانون کی ہے استاد گلشنے قانون کی خبر سن کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لیے بے قرار ہے۔ استغنیٰ میں غمگینا ڈھلے پڑا ہے۔ منظر بلند آواز سے اس سے کہتا ہے:

”اتھ ادرلا، اسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔“ تیری آمد گئی گھر ٹری پر بال آگ آئیں۔“

(۲) پہچان میں بانڈا جتن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے۔ ”یہ رنگ برنگی عورتیں دکانوں میں کچے سوتے پھلوں کے مانند ملتی رہتی ہیں۔“ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔“

(۳) پہچان میں ایک ٹوک کا ذکر کیا ہے۔ ”مردیاں اس کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا سلوم ہوتا تھا کہ اتنا دور ہے اور یہ مردیاں اس کے منہ میں تھیں۔“

(۴) پہچان میں ایک اور باراری عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”وہ اس انداز سے پڑنا اچھا جلدی تھی جیسے نکارہ دوکاندار کی طرح ڈھکی مارے گی اور کبھی پوری قول نہیں تو لے گی۔“

(۵) ”شوٹو“ میں ایک جگہ کہا گیا ہے — شوٹو..... شوٹو..... ارے یہ کیا؟ دو عجیب باز اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پرنٹ کی گوبیاں چوس رہا ہوں۔

(۶) ”شوٹو“ میں سونے سے پہلے کی کیفیتوں پر بیان ہوتی ہے ”میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھکی ہوئی روٹی کے بہت بڑے ٹکڑے انبار میں دفن جا رہا ہوں۔“

(۷) ”خوشیا“ میں کاٹا کاٹا کھانا جسم موم کے پتے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور کھل کھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔“

(۸) ”آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملہ میں باخبر ہیں۔“ (بانجور)

(۹) ”..... محبت کا استقامت بھی ہو سکتا ہے۔“ (بانجور)

(۱۰) ”اندھی اندھ اس نے اپنے ہر وقت کے کویم بنایا تھا کہ وقت پر کلام آئے۔“ (نور)

(۱۱) ”عجب تشکیر نے سینے کی ہر خار کی توہوں کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر بڑے کئی غبارے چٹختے تھے۔“ (ملاؤ)

(۱۲) ”نقشہ کے دل پر ایک گھونسا سا دھماکا سے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہر کی دھوپ میں اترنے والی ساری چلیں اس کے داغ میں گھس کر چھینے لگی ہیں۔“ (اس کو پتی)

(۱۳) ”کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہر اس میں بہت اونچی جگہ چل رہی ہو۔“ اوپر ہر اونچے ہوا، اونچیں ہوا، بائیں ہوا، پس ہوا ہی ہوا ہے۔ اور پھر اس میں اس دم گھٹنا میں ایک خاص خزاں رہتا ہے۔“ (جنگ)

(۱۴) ”فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اندر گونم نرم خواب یوں پھٹ جاتے ہیں جیسے ادنیٰ پکڑے۔“ (وصال)

(۱۵) ”میں نے آنکھوں سے اس کے ہاتھوں میں کٹھنی کرنا شروع کر دی۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے اُچھے ہونے خیال میں بھی کوئی اپنے ذہن کی آنکھوں سے ٹوٹ رہا ہوں۔“

(۱۶) ”آسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس۔ دوسروں کی بہت پروہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔“ (دنیا سال)

(۱۷) ”محبت ایک عام چیز ہے۔ محبت تو ہم سے لے کر ماضی تا ایک سبب بہت کرتے آئے ہیں۔“ (تغیض)

(۱۸) ”زندگی کیا ہے؟۔ میں گھبرا ہوں کہ یہ ایک ادنیٰ جراب ہے جس کے دھانگے کا ایک سلا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں جب ادھیڑتے ادھیڑتے دھانگے کا دوسرا سلا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ ظلم جسے زندگی کہا جاتا ہے۔ ٹوٹ جائے گا۔“ (مصری کی ٹول)

منظر کے افسانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے انداز بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثالی اُبرا میں منظر نے جب یہ بات کہی کہ اس نے خیر سناؤں کو بھی خوش ہو جائے تو یہ پھر کی بات تھی لیکن یہ بظاہر معمولی معلوم ہونے والی بات منظر کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منظر نے منظر کے مزاج اس کی ذہنی سطح اور گہنے فتویٰ مختلف خصوصیتوں کو سمجھ کر کے ایک ایسا

جملہ لکھا جو منگو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منگو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لیے منٹو نے جو جملہ وضع کیا ہے وہ منٹو کا منفرد نمونہ ہے۔ ایک پختے ہوئے غیر تجیدہ فقرے کو ایک بے حاشم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنا کر منگو کی ہمت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال نمبر ۵ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہ آتی ہے، اسے دیکھ کر کڑھنے والے کو اس کے نظریہ کا احساس تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا۔ لیکن منٹو یہ کہتا ہے کہ آپ نیچے سے ڈھیٹے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں۔ تو پوری تشبیہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے، اس لیے کہ جملہ جو خیال یا بیان کے اختیار سے باطل معمولی سا اور چلتا ہوا ہے، یا نازاری قدرت کے کردار اور اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بے نقاب کر رہا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا امتیاز بن گئی ہیں۔ تیسری مثال میں ابتدائی کڑھنے میں مشاہدہ کی جو باریک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرز فکر کی ایک خصوصیت ہے۔ لیکن جس عورت کے ہاتھ سے وہ مرد زبیاں نیچے گر رہی تھیں اس کے لیے منٹو کے دل میں گھٹن بھی ہے اور نفرت بھی اس گھٹن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لیے اکثر کھٹے دلوں کو کھر منکر میں غوطہ زنی کر کے نہ جانے کیسے کیسے کوہر آباد رکھنے کی فکر ہوتی۔ لیکن منٹو کے پاس شدید سے شدید جذبہ کے اظہار کے لیے آسان سے آسان الفاظ موجود ہیں اور ان فقرات کو ایک سادہ سی ترتیب دینا کہ جملہ کی خواہی حیثیت تو سادہ و حقیر ہو جائے لیکن اس کی مصروفیت کئی گنا زیادہ ہو جائے منٹو کی قدرت بیان کا ایک ادنیٰ کر ٹمہ ہے۔ — ادنیٰ اس لیے کہ یہ کر ٹمہ کبھی کسی نہیں پیشہ طور پر پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہ صورت مثال نمبر ۶ کی ہے جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جہاں کے نزدیک قابلِ غور یہ ہے — لیکن نفرت اگر ایسے فطرتوں کے ذریعہ ظاہر کی جائے جو بدیہی طور پر جذبہ نفرت کے نظریوں تو یہاں میں غوریت آجائے منٹو نے اپنے انداز کو ہمیشہ غوریت سے بچا یا اور سادگی بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے۔

مثال نمبر ۷ تا ۹ انگریزی کی خصوصیت کے لحاظ سے اس کی دونوں مثالوں سے ملتی جلتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہاں منٹو کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لیے بھی شرمشک کے نام میں وہی نفرت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا دل پوری طرح آشنا ہے۔

پچھٹی اور ساتویں مثال منٹو کے انداز بیان کی قدرت اور قدرت کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثرات اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے فقرات میں کر دیتے ہیں کہ وہ شدید تاثرات اور نازک اور لطیف جذبہ عجم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آ جاتا ہے۔ ایک غیر فنی اور خردی حس ایک غمگین اور مرنی حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

آخر میں اس میں منٹو نے دو نئے تصورات پیش کیے ہیں۔ ”بانجھا“ اور ”استقاط کا ایک“ واضح معنی مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے اس لیے جب منٹو محبت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بانجھ ہو سکتی ہے یا اس کا استقاط ہو سکتا ہے تو ہمارا ذہن

اس کا جو فردی اثر قبول کرتا ہے اس میں الجھن اور ٹکھن کی ایک نئی عملی کیفیت ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ نئے سیاق و سباق میں ان فنکاروں کے منہم پر پڑ کرنا شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ غلطی نے ایک کہنے فلسفیانہ خیال کے اظہار کے لیے وہ ایسے فنکاروں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفیانہ فکر کا بوجھ اٹھائے کے اہل نہیں تھے۔ لیکن فنکار کی پاکیزہ سیاق کی بدولت ان دونوں معمولی اور حقیر فنکاروں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انھوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار فرمایا کہ مایابی سے بھر دیا جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے اہل نہیں تھے، بلکہ پڑھنے والے کے لیے سورج بھار کے دھڑانے بھی معمول دے۔ فنکار کے اسلوب کی حدت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے فنکاروں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی فنکاروں میں وقتیں طور پر ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔ — میں صورت ان دونوں شاعروں میں ہے۔

دوسرے سے کہ چند حواسِ مثال تک ہر جملہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ خطو کے طرز اور اسلوب نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو بھی بالکل سادہ جملوں سے کبھی رسمی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے کہنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے عمل معلوم ہوتا ہے وہاں فنکار نے انھیں کامیابی سے برتا ہے اور کبھی بہت سی نئی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کو دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے احساس کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کا مکمل اثر قبول کر لیتا ہے۔ — دل کی بات ایک زندہ اور حقیقی حقیقت ہے کہ اس کے سامنے انگریزی ہوتی ہے اور بالاطمان کہتی ہے کہ کچھ کہیں یہ ہوں۔ مجھے بھی طرح پہچان لو اور دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لیے ناقابلِ فراموش بن جاتی ہے۔

سولہویں مثال میں فنکار کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے مسلسل میں قاری کو کوئی خبر نہ کرے اور ایک دوسرے جملے سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ خصوصیت کی کیفیت جس کا بیان مقصود ہے آئینہ کی طرح روشن اور شہر آشوب کی طرح تاباں ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

سترھویں مثال میں اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے میں ایک خبر کو کہ شادی کو محبت، ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لیے جو مثال پیش کی وہ بظاہر بزدلانہ اور طنز کی ایک بات معلوم ہوتے کے باوجود اس قدر منطقی ہے کہ کوئی سننے والا اسے جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ فنکار کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی محتاج نہیں۔ یہاں بھی سادگی بیان اور اہم ترین بات کو محدود و معمولی کچھ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت بڑا کار فرما ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی فنکار کے فکر اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی آمیزش اور استخراج سے جہاں گہرے خیال اور سیدھی سادی عبارت اور معمولی سی تعبیر کی اس طرح ایک سہری زنجیر کی کڑیاں بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سمجھنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقتیں واضح کرنے کا بہترین اور موثر ترین انداز وہ ہے جسے فنکار نے اپنایا ہے۔

فنکار نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے، اس مثالوں اور تشبیہوں جو دوسروں

کی نظر میں باطل حیران رہے حیثیت میں ادا ایسے چلتے ہوئے نفوس سے جو میں سجدگی و خضوع کا شاعر تک نہیں ہوتا، گہری سے گہری، پیچیدہ سے پیچیدہ اور نور سے نور بات کہنے کا کام لیا ہے اور جیسا کہ اس سادگی اور عذوبت کو تصور فرمیں، انکار انگیز اور خیال افزا نہ لایا ہے۔ پھر بھی بہت کم تعلقات ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ وہ سوں کے ٹکڑے اور جھٹکی کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لیے اپنے ذہن پر زور دیا ہے منٹو نے جو کچھ کہا ہے، اس میں اور ذرا کام کو نہیں، ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی منظر ہے۔ منٹو کے بارے میں اسلوب پر یہی ہے لفظی اور بے ساختگی چھانی ہوئی ہے۔ اس کا پر تو ہیں منٹو کی ان تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کے ترکش فن کے جسے حیدر انگوتیر ہیں۔ ایسے تیروں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگا لے کر منٹو کا ہر رنگ اور ہر صفت فن ان تشبیہوں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔

استاد منٹو نے فہمی گدوں کے چہرے کا جو تصور بہاؤ سے سامنے پیش کیا ہے، دیکھیے وہ کس قدر مکروہ اور گستاخانہ ہے۔
 ”آن کے قال جھروں بھرے چہرے دیکر گر جھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم پر
 سے ادھر کی جھلی گل گل کا جھڑ رہی ہو“ (دینا قافون)

منٹو کے دل میں دیا منٹر کے کسی کو داکے دل میں، کسی چیز کسی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک جان کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ، تعقید اور دیکھوں کی کمی نہیں، اسی طرح ان کا ذہن تانہ شکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل نمائندگی اور لطافت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے دستی تشبیہیں وضع کر لینے پر تیار ہے۔ جس کی طرف کسی اور کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا یہی خصوصیت ادھر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور دیکھوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہم قرار بنا سکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے — اور اکثر بالکل سلی سلی تشبیہوں سے — وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جیسا باگنا بنا کر ٹھٹھنے والے کے ذہن میں اتار دیتے ہیں۔ وہ جذباتی طور پر پوری طرح اپنے آپ کو انسانی نگاہ کے سپرد کر دیتا ہے — استاد منٹو کی زبان سے ماہر ایوں کو فریبوں کی کٹیا میں لگنے سے کٹھن کٹھن کھلانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرنے میں کوئی تانہ ان کے لیے کھوتا تھا جس پانی ہوگا منٹو کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

جب استاد منٹو کی نگاہیں گورے کی آنکھوں سے چار چوبیس تو ایسا معلوم ہوتا کہ یہ ایک وقت آنے سے پہلے کی بندوڑوں کی گویاں خارج ہوئیں اور نہ اس میں ٹھکرا کر ایک تشبیہ لگا دیں کہ وہ ہو کر آگئیں۔ بندوڑوں سے نکل مرنی گروں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں بلکہ اس کے برعکس صوفی نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مرنی شکل دے دی ہے۔
 اسی تشبیہ میں میں یوں بظاہر کوئی تباہی نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں، لیکن منٹو کا منٹو ہی تصور چشمہ در چشموں میں ماحولوں میں خفاست تلاش کے اُسے بڑی جرات منگی سے صرف کرتا ہے اور ایک مکمل اور بظاہر ہے حقیقت ہی

تجسید ایک مکمل منظم کی حامل اور ایک گہرے تجزیہ کی محتاس بن جاتی ہے۔ چند دہائیوں سے نکلی ہوئی گریزوں جیسی اور بہت سی میدانی مساوی زمینیں اپنے نازکے محاذ سے ایک تجسیدیں منطوق کے ہر افسانہ میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ایسی چند شاخیں ملاحظہ کیجیے: ”وہ بڑی خوفناک اور تھمی اس کا نہ کہہ اس انداز سے کہتا تھا جیسے یہاں پر ٹولنے والی مشینیں کا کھتا ہے۔“ (پہچان)

”اس کی آنکھیں مست تھیں اور برنٹ تلوار کے تانہ زخم کے ماند کچلے ہوئے تھے۔“ (شوشو) خوشیا کے مزاج و تھار کا اس بات سے سخت دھچکا لگا ہے کہ کتاب ہر شاخ کے سامنے اگر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز نہ کہہ کر پیش کیا تو کہہ دیا خوشیا ہی تو ہے یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے ٹوپ بھراؤ سے ستانی اور پریشانی کرتی ہے۔ ان بے شمار رد و پل میں سے ایک یہ ہے: ”خوشیا نہ ہوا، سالادہ، پلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اور نگہباز رہتا ہے۔“ (خوشیا)

”بائچھر یعنی ایک منظر کا دستور منظر نے اس طرح پیش کیا ہے: ”کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دھچپ کا کافی منے کے دوران میں کسی نے اندر سے بون کی ہے۔“ (بائچھر) یہ تجسید بھی غیر معمولی نہ سمجھ لیکن اس تک منظر کے سوا کسی اور کے ذہن کی نادرسانی اسے غیر معمولی بھی بنا دیتی ہے اور منظر کی فنی عظمت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

”کمال — یوں کیجیے کہ کالوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شاخیں شیش کرنا اس کے دل میں اتر گیا۔“ (نعرہ)

”باہر پر دو گایاں، جریسٹ نے باطل پاؤں کی پیک کے اندر اپنے منہ سے اگل دی تھیں، اس کے کالوں کے پاس نہ بریل پتھروں کی طرح صہبنا ناخریلا کو دیتی تھیں۔“ (نعرہ) ”دو گایاں، جیسے اس نے اپنی گتے سے دادر کی میں سے دو کھل نکال کر پیٹیک دیے ہیں۔“ (نعرہ)

”دو گایاں — اس کے پی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی جیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے۔“ (نعرہ)

ایک کمال یا دو گایاں — میرے ادب آپ کے بے دوشی سنائیے حقیقت باتیں ہیں جنہیں آدمی سمجھ سے

شام تک ہر ایک کے منہ سے نکلتے سنتا تھا۔ لیکن کیشور لال کے دل پر ان گائیوں نے جو اثر کیا ہے اس کی شدت اور تریپ کو منٹوان گنت تشبیہوں کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر قائل ہیں اور ہر ایک پانچویں تشبیہوں میں کوئی نیا ہی نہیں لیکن ان فرسودہ تشبیہوں سے منٹو نے بار بار جو کام کیا ہے اس سے عورت میں خصوصیت پیدا ہوئی ہے۔ سطحیت میں گرائی آئی ہے۔ منٹو نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کشی کرنے اور نقصان قائم کرنے کی جو خدمت کی اس کی چند اور تصویریں دیکھیے پہلی دو سطریں دھواں کی ہیں:

”موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو رڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔“

(دھواں)

”ایک بھرتواں ایک بھرتوی پاس پاس پر پھیلے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم بھرت کی ہوائی جھٹکا کی طرح گرم ہیں۔“ (دھواں)

”توہ کچھ اس طرح مٹھی جیسے کسی نے بلندی سے رڑھی پڑے کا ٹھکان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے۔“ (دھواں کی ٹولی)

دو ایک منہ سے وار تشبیہیں اور دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیسے گوشتوں میں سے نکال کر منظر پر رکھتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش بنانے میں مدد دیتا ہے:

”یہ اشوک لکڑی عجیب چیز ہے۔ ہر دم سے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی پائی رہا ہے۔“ (سجدہ)

”چونے آپ کو چھپانے کی جود ٹڈی کو شش میں وہ ایک ایسا بے جان لیغض ہے کہ وہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنا یا گیا ہو۔“ (سجدہ)

”توہ کرسی پر اس انداز سے ایک بیٹھا تھا جیسے خطرے کا پٹا ہوا امرہ بسا دے بہت دور پڑا ہے۔“ (سجدہ)

”اس کی شراوت اب ٹوم کئی گھری بن کر رہ گئی تھی۔“ (سجدہ)

”نئے سال کی آمد پر وہ غرض تھا۔ جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان

اپنے نئے دم مقابل کی طرت تم ٹھونک کر بٹھکتا ہے۔“ (نیا سال)

یہ سب تشبیہیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک لہر دے گا۔ ایک ایسی تصویر بنائے گی

مردود تھی جس کا ہر رنگ تنگسا اور ہر نقش واضح ہے۔ منٹو کی کشمیسوں کا یہاں خیار ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی تڑپ اور تیزی سے غالی نہیں۔ ہر کشمیس کے نیچے ایک مکمل اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جسے منٹو کی فنی چابک و ستی اس طرح برہم استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصور کا پورا آثار قبول کرتا ہے اور وہی فنی اور جغرافیائی خفا کی انگڑاوتا ہے جو افسانہ نگار کے دہریں میں ہیں۔ منٹو کا اسلوب اعتماد جس میں اضافہ، نفوذ اور کشمیسوں کو یکساں اہمیت ہے۔ مکمل تاثر کی تکفیل کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور شاید بہت کم موقعے ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی مقصود حاصل کرنے میں پوری کامیابی نہ ہوتی ہو۔ اس کی اس کامیابی میں کشمیسوں کے علاوہ ایک اور خاص جز کرکھی دخل ہے۔ اور وہ ہے نگرار۔

’نگار اور فنی اسلوب‘ انظر کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظم میں برتا گیا ہے۔ لیکن اودھ اور نارس میں عمر کا نگرار کو ایک فنی صنعت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس فنی صنعت سے کھنڈ والوں نے عمر اس فنی ترقم اور اثر انگیزی کا کام لیا ہے۔ گونجی بھی یہ تاثر محض فنی ترقم و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیات کے انظار کا وسیلہ بھی بناتا ہے۔ نثر میں فنی اسلوب کے اثر سے انظروں اور نفروں کی نگرار خاص عام ہو گئی ہے چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جا بجا اس کی شائیں ملتی ہیں لیکن کسی افسانہ نگار نے انظار کے وسیلہ کو اپنے فنی اسلوب میں اس طرح شامل نہیں کیا جیسے منٹو نے منٹو کے منظر افسانوں میں غرضاً، لغزاً، بلا و زنجبک، انیا قاتوبن اور ہستیا کم سعوت افسانوں میں آنو کا شا اور قبض اس فنی کے ترسے کا یہاں منظر میں۔

دو تین افسانوں پر منٹو ڈال کر کہے کہ اس نگرار سے منٹو نے کیا کیا کام لیے ہیں۔

’نظر میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتوں منزل والے بالاتانے سے نیچے اترا تو افسانہ نگار کے منظروں میں:

آسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کانہ صوں پر دھری گئی ہیں۔‘

اس لیے کہ دو مینے کلک کر ادا کرنے کی منزل میں سیٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں اور دو گالیاں اس کے پورے وجود میں سمائی جا رہی تھیں۔ ان گالوں سے کشتورال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے انظار کا ہنر ہی ذریعہ منٹو نے نگار کو بنایا ہے یہ گالیاں اس کے نہر میں اور جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چھاتی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی ذہنی تسبیح:

..... مالک مکان نے مختصر میں آکر اسے گل دی — گال دیوں کیجیے کہ

کانوں کے داسے چھو بھرا مسیحہ شائیں شائیں کرنا اس کے دل میں آکر گیا اور اس کے سینے کے اندر جوڑ پڑی گیا اس کا کچھ شکا تاہیں نہ تھا.....

اس کے جی میں آئی کہ اس گال کو جسے وہ بڑی مذہب نکل چکا تھا، سیٹھ کے بھر پور پڑے چہرے پر تے کو دے کر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اس کا غور تو باہر نٹ یا تھر پڑا ہے.....

سیٹھ نے اسے پھر گال دی، اتنی ہی مرنی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی — اور اسے یوں لگا کہ کس نے اُس پر سے اس پر کوئی کرکٹ پھینک دیا ہے.....

ایک نہیں دو گالیاں — باہر یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بائبل پان کی بیک کے انڈر اپنے منہ سے اُگل دی تھیں، اس کے کانوں کے پاس زہریلی بٹھروں کی طرح جھنبھٹاتا شرور کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکڑ ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا رنگ بدگلی دیا گیا ہے چاؤں کیا اور پرے بٹ گیا، اور وہ کجا کہ سیٹھ نے اسے پھر گال دی ہے..... گالی..... گالی..... گالی..... اسی طرح اس سے اُلجھ کر رہ گئی جیسے جھڑپری کے کانٹوں میں کرنی پکڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چڑانے کی کرتا تھا اتنی ہی زیادہ اس کی مود زخمی ہوتی جا رہی تھی۔

سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا — دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو — پر مٹی کا پتلا کیسے بھا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلنے دیکھا، جیسے دو بڑے بڑے چپے موریوں سے باہر نکلے ہوں۔

جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی تیتیاں روشنی کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پچھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔

گالیاں — گالیاں — کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی جیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دسے مارے۔

اس کا دماغ آگ کا ایک پتھر سا بن گیا۔ اس پتھر میں اس کے سارے پرانے ان نئے خیال ایک بار کی صورت میں گندھ گئے — دو جیتے کا کرے، اس کا پتھر کی بلڈنگ میں دو آٹا

لے کر جانا۔۔۔ سات خنزروں کے ایک سواہرہ نیٹے، سینٹری بھتیجی آواز، اس کے سر پر مسکاتا ہوا بلی کا میپ اور..... یہ ٹوٹی کالی..... پھر دوسری..... اور اس کی خاموشی..... یہاں پہنچ کر انگ کے اس چیکر میں جو تیرہ گویاں سی نکلتا شروع ہو جاتی ہیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ بھینچنے پر لگا۔

نعمو میں گامیوں والے واقعہ کی نگار سے غشو نے آہستہ آہستہ کیشر لال کے ذہنی اور جذباتی پہان کو واضح کرنے میں مدد کی ہے اور اس نگار اور ڈرتے ہوئے پہان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لیے نفسیاتی اور فنی جملہ پیدا کیا ہے جس میں کیشر لال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعمو بن گیا جس سے کیشر لال کے دل کو مزید تسکین مل گئی لیکن مسئلہ دلوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ ٹینگلا ہے۔۔۔ منٹو اپنے فنی میں انسان کی متید، اُس کی اٹھان اس کے نقطہ عروج اور اس کے انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے خطوط اور اٹھان سے ربط اور تسلسل کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں وہ نعمو میں گامیوں کے ذکر کی نگار سے پیدا ہوا ہے۔ نگار ہی نے اس مسئلے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے، نگار ہی نے انسان کو آہستہ آہستہ اٹھان کی عورت ہے جا کہ ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچایا ہے اور نگار ہی نے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو قادی کے نقطہ نظر سے اس کا مقصد ہے۔

بلکہ وہ شباب کی نازک اور جہاں گوارہ خزل میں تدم رکھنے والے موسم کی اس منہمی بیداری کی کہانی ہے جس کے سنی اسے خود بھی کبھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی منظر نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں بند کر تصورات کی شکلدار کی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتداء اوں ہوتی ہے کہ ایک دن موسم کو:

”تمہیلہ کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آگیا..... یہ گچھا اسے بہت جھلا معلوم تھا۔ اس ایک سلسلی سی اس کے سامنے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی سر تکھیں من بائیں“۔

مومن کے دل میں اس کے بعد وہ جلد بیدار ہوتے رہے لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹرمک کھول کر اپنے حید کے لیے بنے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو.....

”تو ہی ٹرپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا چہنڈنا آگیا اور چہنڈنا فوراً ہی ان کا سہاگے ہاؤں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے حید کی شکل میں دیکھا تھا۔“

اور پھر کمرہ صحت کرنے ہوئے اس نے سائٹ کی تکمیل تشریں اپنی جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی الگ جگہ پر ان کے دھانگے الگ کرنے شروع کر دیے.....

”حق کو دھانگے کے چھپنے بڑے مکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو بانٹ میں نے کر وہ دبا تا رہا، ستارہ — لیکن اس کے تصور میں شیکل کی وہی نقل تھی جس میں اس نے کالے کانے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا رکھنا تھا۔“

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آکر بلاؤ کو دیکھتا تو.....

”اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جس نے شیکل کی نقل میں دیکھے تھے۔“
اور بالآخر ایک رات کو:

”جب وہ سر ہاتھ اس نے کئی اوٹ چٹانگ خوب دیکھے — ٹرچی صاحب نے پتھر کے کونوں کا ایک بڑا ڈھیر سے کونٹے کو کما۔ جب اس نے ایک کونٹا اٹھایا اور اس پر تھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔ یہ کالی کھانڈ کے مین مینیں تار غلطی کا کار لانا ہوا تھا۔ پھر، کالے کانے رنگ کے خیار بے ہی کر ہوا میں اٹھنے شروع ہوئے۔ بہت آہ پر جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر آدھی لگنی اور مومن کی دہنی ٹرنی کا پھٹنا کہیں غائب ہو گیا۔ پھٹنے کی تلاش میں نکلا۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا۔ ایک کالی سائٹ کے بلاؤ پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکنی برقی چیز پر اپنا ہاتھ پھرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہر ٹرا کے اٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے.....“

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے اٹھان، اس کے ارتقا، اس کے منتہا اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منظر نے ایک خاص تصور کی تکرار کو فنی کی بنیاد بنایا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشش کے جو مراحل طے کیے ہیں ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے، لیکن منٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے تصورات کی جس تکرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔ فنی کار کی حیثیت سے منٹو نے اپنے لیے یہ امتیاز مخصوص کیا ہے کہ جب کسی خاص عمل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس عمل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔
’نورہ اور بلاؤ کی مثالوں سے منٹو کے فنی میں تکرار کی اس حیثیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب کے جنک، خوشیا، آؤر کا پشما اور قیمن سیے افسانوں میں بھی آ جا کر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔“

منٹو نے سکرا کی طرح تضاد کو بھی اپنے اثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افکاروں میں برتنا ہے۔ ہماری سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں تبدیوں کا جو حیرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشے اور خوشیوں کی نظر سے دیکھا اور اپنے افکاروں کے ذریعہ اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلج کے مختلف طبقوں میں اور پانچ پنج اور معاشرتی اور معاشرتی کشمکش، زندگی کے متعلق دو مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد، ایک ہی فرد کے ظاہر اور باطن میں بدیہی فرق اس تضاد کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔ منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف طبقوں میں ظاہر ہونے والے ہر ایسے تضاد کو جو انسان کو فریب میں مبتلا کرتا اور اس کے سکون و مسرت کی برابری کا باعث بنتا ہے، ایسے اسلوب اور اسے جس میں ضد، فقرے اور اسلاف کے مختلف اجزاء مل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں بے نقاب کیا ہے۔

تضاد کی یہ مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے ہمارے خیالات میں برتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے :

پہلا اقتباس نمبر ۱۰۰ کا ہے جس میں کیٹر لال کے جذبات کی مستوری میں نصرت کے اس تضاد سے مدد لی گئی ہے جو طبقاتی امر پنج پنج کا پیدا کیا ہوا ہے :

”اس کے گھر کا اندھا لپکنی بار پھلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو بانک مکان کے گنبے سر کے اوپر سکرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے پیرے پیرے ان کھوتوں پر ٹک کر پھر اس کے بدن سے چٹ گئے، ہر دو دریں گلابی چمک رہی تھیں۔“

اسی طبقاتی تضاد کی ایک شکل بلور میں اس طرح دکھائی دیتی ہے :

”..... نوکروں کے متعلق کوئی لڑکھانا ہے ؟ بچپن سے لے کر چڑھ چلے تک وہ تمام فز میں پیدل ملے کر جاتے ہیں اور اس ہاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں دیتی۔“

دو کردار ایک ہی صورت حال کو اپنے اپنے جذبات اور نصرت کی روشنی میں کس کس رنگ میں دیکھتے ہیں۔

اس کا اظہار جسکے میں کئی جگہ ملاحظہ اور سوگندھی کے جذبات کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے۔ ان کی تصویروں میں سے ایک یہ ہے :

”ایک ہاتھ سے سوگندھی نے چوڑی داسے کی تصویر بنائی اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو تھا۔ مادھو بنی جگہ سمٹ گیا، جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکڑ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔ فوٹو مقررہ لگا کر اس نے اونٹنی کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے

باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کا پانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی شکل سے

”اس نے ہنس کر اتکا کیا اچھا کیا۔ مجھے بھی یہ نو پسند نہیں تھا۔“

آخری جملہ میں مادھو نے جو کہہ لیا ہے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایکسپریس جھوٹ کی شکل اختیار کی ہے۔ اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھیے :

..... مادھو سوڑ گیا۔ وہ کمری ہوئی لڑکی اٹھانے کے لیے جبکہ تراسو گندھی کی کراچی سنائی دی۔

نہرواد — پڑی رہنے دے دیں — تو جا، نیرے پرنا پختے ہی میں اس کو مٹی آؤ اور
کدوؤں گا۔“

سو گندھی کے اس تلخ طنز بھرے جملے میں کئی تضاد ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ایک تضاد تو وہ ہے جو سو گندھی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے، جس میں حالات نے ایک نایاں مغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس طنز میں پوشیدہ ہے جس میں سو گندھی کا ایک ایک لفظ ٹوبا بجا ہے۔ تیسرا تضاد ان الفاظ کے اس منہم سے ظاہر ہے جو گندھی نے واقعات اور موجود صورت حال میں تضاد میں بنا کر درخشاں کیا ہے۔

”بٹک کا خاتمہ جذباتی کشش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فنی کاروائی تصور ہے :

تبت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سر پہ پچلے کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل

پر جانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے غارش زدہ کتے کو گود میں لٹایا اور ساگراں

کے چڑے چنگ پر اسے پہلو میں ٹکا کر سونگئی۔“

معاشقہ جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کر کے ہر منظر کو جو قدرت حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں یہ تضاد بعض دوسری عقلی اور مغربی صورتوں میں بھی رونما ہوتا ہے۔ ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لیے اب تک جو بحث کی شایاں پیش کی گئیں ان میں جگہ جگہ اس کے مختلف رنگ چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً نعرہ کے پورے افسانے میں ابتدا اور انجام کا تضاد، دو طبقوں کی زندگی کے انداز کا تضاد اور دو آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو تضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد اور یہی طرح نمایاں ہے اور اس کو کوئی ختم کرتے وقت محبت کے مسلسل منٹو کی کوئی برائی وہ بات اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے اسٹر شاد تک ہر انسان نے محبت کی ہے۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فنی کے ان مطالبات سے ہے جنہیں ہم تکنیک کے عبارات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار اور بلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال، اس کے اثرات و تصورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کہہ کتا ہے وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص محل کی ضرورت کے مطابق ان میں سے ہر وہ جزئیات کا انتخاب، یہ افسانہ نگاری کے فن کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔ ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگاران مطالبات سے کام لیا ہی کے ساتھ مجدد ہوا ہوئے ہیں۔

فرق صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد انداز فکر کی بنا پر جزئیات نگاہی کا ایک یا ان انداز قائم کیا ہے جتنا چھڑا اس خاص نقطہ نظر سے غٹھو کا ایک اپنا رنگ ہے جو کسی دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔ غٹھو نے جیوتھ کسی واقعہ یا تاثرات و لغتوش کی وضاحت کے لیے دسی جزئیات کو زیادہ اہمیت دی ہے جنہیں دوسرے علماء غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ منطقی طور پر بیان و اظہار خیال کے مسائل میں اور اپنے تعقیرات کی وضاحت کے لیے تفسیروں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کچم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی شدت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے مسئلہ میں بھی انھوں نے بظاہر غیر اہم اور معمولی پہلو کو اہم اور غیر معمولی پہلو کو اہم پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ وہ واقعی ہو یا نہ ہو انھیں معمولی و ننگوں سے شرح اور یکساں بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں دیکھیے :

تدارکاروں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں درخو ملوائی کی دکان پر آدھ سیر دی
کی تھی لی کر ایک بڑی دکان والی اور موچکوں کو منہ میں دبا کر ان کو بڑے سترے ہوئے ایسے ہی بلند
آواز میں کہا: بہت تیزی سے ایسی کی تھی۔
یہ استاد منگو ہیں نیا قانون میں — اسی انسا نے میں انہی کی وہ تصویریں اور ملاحظہ ہوں :

”چھاؤں پہ سچ کر منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر آنا دیا اور جیسے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی تازی دوا نکلیوں میں دبا کر ٹھکایا اور اگلی نشست کے گاہک پر منتقل کیا۔“

گھوڑے کی باگیں کھین کر اس نے آٹھ ٹھلے یا اور کچھ نشست پر بیٹھے گھر سے
 بچھا، صاحب ہمارا کہاں جا آتا تھا ہے؟

اس سوال میں بلا کا طنز یہ انداز تھا۔ صاحب پہلو کہتے وقت اس کا اور کامرانیچہ و سیر ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو دم سے ٹیکہ لگا کے ٹھٹھنے سے شلوٹی کے بالائی حصے تکس جل آ رہی تھی۔ ایک لڑکھ کے ساتھ گری ہو گئی۔

انہی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہیں استاد منگو کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یہاں انہیں گویا ہال کے کتابچی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے:

اس کو اپنے پیسے کی دھواٹ لہی طرح یاد تھی..... اس کے پیسے لالہ پر شوقم داس
تھامے دار لنگوٹ باغ سے لے کر دھار کیسے چپے اپنی گلی چنڈیڑھے اور بڑی توغہ ٹرہاٹے
موتیوں میں سے ام کارس نچرے سے تھے؟

پہچان میں کچھ شبہ زندہ داروں نے جن کوں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو نے یوں بنائی ہے :

سکونے میں ایک بہت بڑا پنک تھا جس کے پائے رنگیں تھے۔ اس پر سیلی سی چادر لٹھی ہوئی تھی، چمکی بھی چلی تھا جس پر شروع رنگ کے پھول لڑھے ہوئے تھے۔ پنک کے ساتھ والی دیوار کی کادوس پر تیل کی ایک سیلی بول اور کھڑکی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دائیں میں روبرو سیل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پنک کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنب تھا جس پر ایک کالی گرگابی رکھی تھی۔“

سپرے اس کے عشرت سالت میں تھے، لیکن میلے نہیں تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے گانڑی حلقے کثرت استعمال کے باعث لکھس گئے تھے اور پھوٹے ٹل آئے تھے۔ کال رکھلا تھا اور تیس میں ایک اور مصلاتی کی مار تھی۔“ (پانچ)

”باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوبلاٹا اور دھکوں سے چھت میں دایک گوجا سی دڑ جاتی تو عموں کے ننگے پیروں کو یہ رزش بہت بھلی معلوم ہوتی“ (پلاور)

وہ ساگوان کے لمبے اور پوٹے پنک پر اوڑھ سے منٹو تھی، اس کی بائیں جو کاندھوں تک نکلی تھیں۔ پنک کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اس میں بھیگ جانے کے باعث پتکے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شگن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا، جو بار بار منٹو نے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے چٹی ہوئی مٹی کی کھال کا ایک ٹکڑا واپاں رکھ دیا گیا ہے۔“ (شک)

یہ منٹو کی جزئیات نگاری کی صورت چند شاخیں ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو نے کسی واقعہ کی معنوی کرنے، کسی اصول یا فضا الجھنی ساثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات بنانے کے لیے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں کبھی چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو چھوڑا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ منٹو فن کا ارتقا اور فن کار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور حقیر نہیں ہوتی۔ دوسروں کو معمولی اور حقیر نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں، بشرطیکہ فن کار انھیں صحیح انداز سے ادھر رکھ کر ہنسنے پر قادر ہو۔ اور یہ قدرت منٹو میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انھیں عزیز بھی ہیں انسان کی نظروں میں حقیر بھی جزئیات کی قدر چھانسنے، انھیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے

منٹو کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔

منٹو کے فن کے مختلف پہلو جن میں انسانی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزاء کے علاوہ اسلوب نگاہ، فن کی سائنسی وسعتیں شامل ہیں، یعنی طبیعیات، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقرات کی شکل اور ان کے استعمال میں تضاد و کثرت اس کی شخصیت مزاج اور اندازِ نظر سے متاثر ہوئے ہیں۔ منٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور ان کے مسائل کو مختلف اور متناظر میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور ہر کچھ دیکھتا اور سرچکتا ہے، اسے بغیر الجھاک، خوف اور اندیشے کے برأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں اس کے شدت پسند مزاج اور توانا شخصیت کا بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظر میں گہرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق — معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے اس کی باریک بین اور نکتہ رس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچھائی بُرائی اور صیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی اس طرح صیب و ہنر پوری طرح اساطیر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو دھوکے میں رکھتی ہیں، ان سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کس سے انسانی زندگی اس سکون و مسرت سے محروم ہوتی ہے جو فطرت کا مقصود ہے۔ منٹو انسانی زندگی کو اس کے سب اجتماعی اداروں یعنی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق میں فطرت کے بندے ہونے لگتے اور اس کے بنائے قوانین کے مطابق پوری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہے اور صیب اس پہلو سے زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے کرچہ چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت نا انصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ نا انصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون نا انصافی کر رہا ہے اور کس کس طرح کر رہا ہے۔ منٹو نے اس نا انصافی کو مٹانے، اس کا پردہ خاش کرنے اور اس کا ظلم توڑنے کو اپنے فن کا مقصود بنایا ہے۔

زندگی کے اس ہستہ و ہستہ اور عید و ہجم کام کا طرزِ اظہار یا بیان خود ایک محم ہے، لیکن اس سے سخت تر محم یہ ہے کہ اسے کوئی ملکی شکل دی جائے۔ منٹو کی مخصوص نظر نے انہیں جو کچھ دکھایا اور اس شہدہ کے بعد ان کے احساسِ درد نے انہیں جس کام کی طرف مائل کیا، اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ہر نا انصافی کرنے والا، سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں ایسا وہ داری کی لذتوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے مزاج سے قریب اور ظلم کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھناؤنے پن کو رسوا کرتا ہے۔ اس لیے اس اہم کام کا بڑا خطرہ اٹھانے والے کو اتنا ڈر، اتنا بے خوف اور جری مزاج بنانا ہے کہ وہ ہر دشمن کے مقابلے کے لیے سینہ سپر ہو سکے۔ منٹو کو فطرت کی طرف سچے بے خوفی، یہ برأت اور سرسراہٹ عطا ہوئی تھی۔ اس کے احساس میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر دلو کو دلیری سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شگفتہ طبع سے جھیل لے۔

منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اچھا بھی اور بُرا بھی، اچھا اس طرح کہ زندگی کی خواہشوں کا تجزیہ کر کے، انہیں بے نقاب کر کے اور اس پر کڑواہت ایسی کاری ضرب لگا کر کہ چوٹ کھانے والا ملکا کر رہ جائے۔

انسانی اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور مگر اس طرح کہ حیات انسانی کے بعض ستون پستوں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی زندگیہ نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوئے ناموروں کی نمائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اور کبھی کبھی حقیقت بینی اور حقیقت نگاہی سے دنیا والوں کو صرف حیرانی سکھائی ہے۔ یوں اس بڑے پستو کا ایک اچھا پستور ہی ہے اور اس کی بھی تائیدی یہی کہہ کر کی جاسکتی ہے کہ سب خیر کھراج تھا، اس کی شخصیت تھی اور مشغور بہ کھانے کی طرح غریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن میں اپنے آپ کو بڑی طرح بے نقاب کیا ہے۔

مشغور بہ کھراج کی یہ سب خصوصیتیں، جنہوں نے ان کی شخصیت اور فن دونوں میں امتیاز اور انفرادیت کے پستو نمایاں کیے ہیں۔ سیاسی ماحول، معاشرتی انتشار، کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور نجی حالات سے متاثر ہوتی رہیں، مشغور نے اپنی زبردست قربت ارادی سے ہر طرح کے انتشار، کشمکش اور کاروں میں پیدا کردینے والے حالات کا مقابلہ بڑی دیرپائی اور پراگندگی سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر مشغور نے ان سب قوتوں کو مغلوب کر کے اپنے لیے نچ کی راہ نکالی اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں نے بڑے درد و غم کے ساتھ حالات کے طوفانی، انتشار اور کشمکشوں کی فکر اور پیسے سے اس کے پیروں کو ڈھونڈتے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دشوار گزار سفر کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض غزلوں میں اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لیتے پر آمادہ پایا ہے۔ شکست کا اس احساس نے اس کے اعصاب پر برا اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لیے کسی آپ زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بسی اور بے جبر ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشمکش اور عارضی ماحول، بیرونی زندگی کے اس تصادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب ہی آئی ہے اور مشغور کی شخصیت کی عظمت اور بڑی نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ مغلوب اور پسپا بنانے کا پیش خیمہ ہی ہے۔ مشغور کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیات فن کے ہر دور میں کسی نہ کسی طرح جاری رہی ہے لیکن اس کے فن کا آخری دور اس تصادم اور کشمکش کا سخت ترین دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشغور نے اس دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے توازن کی جھلک نمایاں ہے کبھی ایسا ہزارے کہ مشغور نے ان قوتوں کو نہیں لکھا کبھی ایسا ہزارے ہے کہ اس نے کئی دن تک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح قوت اور تسلسل سے لکھے ہوئے افسانوں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا۔ مثلاً غٹو کے بمبوئے شہزاد گوشت کے سب افسانے دسوائے شہزاد گوشت کے، ۱۴ اور ۱۲ جولائی شہزاد کے درمیان لکھے گئے، بادشاہت کا خاتمہ (مجموعہ) کے سب افسانے یکم جون شہزادہ ۱۴ جون شہزاد کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح زیرِ بحر، بحر کے سب افسانے ۴ اکتوبر اور ۱۵ نومبر شہزاد کے درمیان لکھے گئے۔ مشغور کے آخری دور کے بعض اور مجموعے جو زیرِ ترتیب اور زیرِ اشاعت ہیں۔ مشغور کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان افسانوں کو کڑھ کر پڑھنے والا نمایاں طور پر تین باتیں محسوس کرتا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر تحریری حیثیت سے

منٹو کے کمرزد ہے کے افسانے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن و مخطوطہ کی منزلوں سے گزند ہا ہے اس نے چھپا چھپا ہر بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی جنس ہم عمر کی حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے تاہم منٹو کی ذہانت، ان کی جدت پسندی، ان کی تخلیقی طبع، ان کی گہری فکر اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جملہ کو نظر آتی ہے۔ منٹو کی تعداد نکلائی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں۔ اس وقت میں بھی اسی سبب کی اور توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے — بہت اچھے اور نرے سبب افسانے — دیکھ کر پڑھنے والا ان کی اس خصوصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہاں ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔ منٹو کو فطرت نے ایک قصہ گو بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو بہتنے کی چوری قوت تھی اور جب اس نے مجوز اور بے بس ہو کر مرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے فطری حماس کے ساتھ نمودار تھی۔ منٹو کی ایک قصہ گو کی حیثیت سے کہی گئی باتیں مسلم قہیں اور قصہ گوئی کے ساتھ ان کے فطری سلطان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں ملگاؤ نے اس میں ان گہری باتوں سے پوری طرح غافلہ و غافلے کی حالت پیدا کر دی تھی۔ منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے۔ ہر افسانہ اور ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم چلتی ہو اور کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا بڑا موزوں اور دلچسپ موضوع ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے اور بظاہر معمولی مسلم ہونے کے باوجود یہ شرط قصہ گوئی کے لیے بڑی اہم ہے۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی کہنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرنا چاہتا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سننے یا پڑھنے والے میں انتہائی یکاغلت اور بے تکلفی کا درشت قائم ہو جائے۔ پڑھنے یا سننے والا یہ محسوس کر سکے کہ قصہ گو اسے اپنا ہم راز سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتانے میں بھی تامل نہیں کرے گا، وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔ کہانی سننے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو عالم ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس طرح کہنا کہ وہ بے حد اہم ہے، کہانی کہنے والے کی بڑی حیثیت ہے۔ منٹو قصہ گوئی کے میدان میں یہ حیثیت حاصل کرنے میں اہم تھا وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح باتیں کہنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا کہ وہ سرے اس کے جھوٹ کو، اس کے پُر غریب خیال کو، اس ذہانت کی آغوش میں اپنے ہوتے عجیب و غریب تصور کو سمجھ کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ معمولی سی بے حقیقت بات کس طرح کہانی بن سکتی ہے۔ اس کی مثال منٹو کا افسانہ پھر ہے وہاں ہے کہ کہانی میں کس طرح باتوں کا مزہ پیدا کر کے اپنے اور پڑھنے والے احساسات میں مکمل مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے اس کا اندازہ چند مسٹین والا، میراث نام رادو سا ہے، ٹوٹا، ٹھنڈی آواز میں، حلقہ کا بچہ، رحمت خداوندی کے ٹھنڈی، خوردشت، باسط ٹیٹھال کا کتا، چور بھٹی اور دلو صاحب جیسے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے اور کس طرح عجیب و غریب اور ناقابل اظہار خیال افسانوں میں جگر پکا کر منٹو کی چابک دستی کے حلقہ گزشتہ بن کر پڑھنے والوں کا دل مودہ سکتے ہیں یہ بہرین، صاحب کومات، بانجشا کاغذ، کتے کی دوا، اور عورت کے بے، جیسے افسانے پڑھ کر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ منٹو اپنے تقریبی اہل میں سے جن

آسانی سے کوئی کمائی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ گپ کو کس طرح سنجیدہ مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا، یہ بات اور بھی زیادہ حیرت کی تھی۔ — لیکن یہ سب کچھ لیے تھا کہ منٹو کمائی کمنا جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی نئی کمزوریوں کے باوجود اپنے آخری دور انحطاط میں بھی وہ کمائی کتنا بخوبی نہیں تھا۔ اسی لیے اس انحطاط کے زمانہ میں منٹو کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

یہی ساری باتیں ہیں جو نیل کر منٹو کے فنی زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور انفرادیت اور عظمت بھی۔ لیکن غلطیوں میں اگر اسکینڈل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمروری نہ ہوئی، پڑھنے والوں میں کبھی بھی ایک جنگامہ اور گراگنی پیدا کر دینے کے لیے وہ اگرچہ لکھنے والی باتیں کہنے اور لکھنے پر اصرار نہ کرتا، وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے ذہن میں بچھے ہوئے تیروں کی طرح برتنے اور دوسروں کو گولہ کے دے کر اس میں لذت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور جنسی تجزیہ کو نفسیات کی نازک حدود میں رکھنے کے بجائے اسے کوچہ بازار میں رسوا کرنے سے احتراز کر سکتا تو خدو خدو یقیناً اس سے بھی بڑا فنی کام ہوتا جیسا کہ وہ اب تھا۔ — اس لیے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوالی نہیں کہ وہ ان چند کمزوریوں کے باوجود بہت بڑا فنی کار تھا۔ اس کے مشاہدہ، تجزیہ، تصور، فکر اور احساس میں اس کی شخصیت کا بڑا گہرا رنگ ہے اور شخصیت میں غیر معمولی قوت و توانائی۔ — وہی قوت و توانائی اس کے پورے فنی پرچھائی ہوئی ہے اور نہ صرف ہر دور میں ہر طرح کے حادثات کے خلاف پھر بھی کہ اس فنی کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی۔ — منٹو مر گیا۔ لیکن اس کا فنی اس قدر نہیں مے گا۔

وقار عظیم

منٹو کا مقام

جس دن منٹو مرا تھا اُس دن بھی میں نے یہی کہا تھا کہ منٹو جیسے آدمی کی زندگی یا موت کے بارے میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، میں تو اُس کی زندگی اور موت دونوں کے معنی متعین کر لے چکا ہوں۔ غلط تو ان لوگوں میں تھا جو موت ایک فرد یا ایک ادیب کے کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر اب تو جذبات پرستی کی گناہنشل یوں بھی نہیں رہی کہ منٹو کو مرے دو مہینے سے زیادہ ہر گز اور چارے پے یہ سوال نہ زیادہ اہم ہو گیا ہے کہ اُن کا ادب میں یا کس سے کم پہلے بیس سال کے اُن کا ادب میں غلطی جگہ کیا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں منٹو کو اسباب سے بڑا انسان نہ لگتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ منٹو چاہے مر یا نہ مر اس کی عظمتوں نہ اُس کے لیے کسی طرح کے اچھے خاصے افسانہ نگاروں سے اُس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں سے متعلق ہوں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر منٹو مر یا نہ اس کے برابر میں ہی رہ سکتا تو اس میں اتنا تصور خود منٹو کا نہ تھا جتنا اُس ادبی روایت کا جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ بات میں منٹو مر یا نہ اس سے پہلے وہ جاتا ہے۔ وہ مر یا نہ اس کی شہر ہے۔ اور وہ مر یا نہ اس کو جس قسم کی نثر کا واقعی وہ فرائض میں ادا ہو نہیں سکتا تو دو سو سال سے منٹو دنیا پاری تھی۔ مر یا نہ اس کے لیے روش کو تھا، واقعہ تھا، استعارہ وال تھا، غلطی تھا۔ منٹو کے لیے کون تھا؟ میری بات کا وہ مطلب نہ کیجیے جو اُن کو کے اُن کے لیے نہیں کہیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اُن کو شہر یا کل فصول ہے۔ اس میں بھی بہت سی غریباں ہیں۔ لیکن منٹو کو جس چیز کی ضرورت تھی وہ اُن کو شہر کی روایت میں موجود نہیں۔ منٹو کو پانی پینے کے لیے اپنے آپ کنواں کھودنا پڑا۔ جو شروع اور بہتت دونوں میں منٹو کی حیثیت ایک پیش رو کی ہے۔ اس لیے منٹو کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اُس سے پہلے اُن کو میں کیا تھا، اُس کے بعد ہم دیکھ کر کیا کہہ سکتے تھے، غلطی کہ اس کا ادب کیا نہیں کر سکا، یہ باتیں دیکھ کر فریغ منٹو کا چھپا ہوا تھا تو کہیں گے، مگر ادب میں منٹو کی حیثیت باریک بگھڑی نہ تھی۔

منٹو نے جو کنواں کھودا تھا وہ میٹر صاحب جیسے گلاس، اور اس میں سے جو پانی نکلا وہ گدلا یا کھاری سی مگر وہ باتیں دسی ہیں جن سے اُن کا ادب نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو یہ کہ منٹو نے کنواں کھودا ضرور، دوسرے یہ کہ اُس میں سے پانی نکالا۔ اب خدا گھپے تو سہی کہ اُن کو کے کہنے اور جوں کے متعلق یہ دونوں باتیں کہیں۔

میں اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ آج سے نہیں بلکہ شروع سے ہی بہت سے خوش ذاتی تحفہ منٹو کو منٹو کی ان دونوں چیزوں سے انکار رہا ہے۔ اس کے برخلاف ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اقبال کی وفات سے لے کر آج تک کسی اُردو ادیب کا نام اس طرح نہیں ہوا جس طرح منٹو کا نام کوئی چیز تو تھی جس نے لوگوں کو اتنا سوگ منانے پر مجبور کیا خیر

بعض لوگ اتنی بقولیت کہیں مثنوی کی سنی کا آخری اور قطعی ثبوت سمجھیں گے، کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ ادیب کو ہر آدمی کے لیے نہیں لکھنا چاہیے۔ ایسے لوگوں کو پچیس سال سے مثنوی پر ہی اعتراض رہا ہے کہ مثنوی تو اس ایسی باتیں کرتا ہے جس سے لوگ پرہیزگار نہیں بنیں۔ شاید یہ کوئی ضریفانہ یا غیر ادیبانہ بات ہو، لیکن میں نے جو حضورِ اہست ادب پڑھا ہے اُس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو چھوڑ کر ادب کا ایک مقدس فریضہ رہا ہے۔ بلکہ میل دل لے کر ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جو ہر کلام سے ڈرتے ہیں۔ مثنوی کو چھوڑ دیتے۔ ہر آدمی پر جیسے عظیم شاعر کو کیا کیجے گا جس کا ایک ادبی اصول یہ تھا کہ متوسط طبقے کو چھوڑ دیا جائے؟ اگر چوں کہ ناگوئی بہت بُرا اور ادبی نقص ہے تو چونکہ اسے ڈرنا ایک فرائضی بیماری ہے، مگر وہ شخصیت کی نشانی ہے جو آدمی دوسروں کو چھوڑنا چاہتا ہے اُس میں پہلے خود چرچنے کی صلاحیت ہونی چاہیے جس سے اُس کے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اعصاب زندہ رہیں وہ کسی کو کیا چھوڑ سکے گا۔ جیسا کہ اس نے کیا چھوڑے گی۔ اگر کوئی ادیب اپنے پڑھنے والوں کو چھوڑنا چاہے تو یہ کوئی شکایت کی بات نہیں۔ درجہ پھر تو ہر قسم کی شکایت کیجیے کہ اُس نے کونسی کیوں بنائی۔ ایسا ادیب تو بعض اپنا فریضہ ادا کرتا ہے۔ ہاں، ادیب سے آپ یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ تم نے میں کو دکھانے کے بعد دکھایا کیا۔ اگر میں جھنجھوڑ کر جھگڑنے کے بعد مثنوی نے میں انسانی فطرت اور انسانی معاشرے کا کوئی تماشا نہیں دکھایا۔ اگر اُس نے ہمارے مذہب و زندگی کا کوئی نیا شعور پیدا نہیں کیا تو پھر ہم اُسے گالیاں دینے میں حتیٰ بجانب ہوں گے کہ اس نے میں میں سے کونے بھی نہیں دیا۔ جو لوگ کسی قیمت پر جاگنا ہی نہیں چاہتے، انہیں تو ان کے حال پر چھوڑ دے۔ لیکن کیا آپ نیا قانون، ”بھگت“ یا جو کوئی نائنہ“ جیسے افسانے پڑھ کر دیانت داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مثنوی نے میں چھوڑنا کہ رفت میں ہماری خند خواب کرائی؟ اچھا، مثنوی نے چھوڑنا یا بھی ہے دو طریقے سے۔ ایک تو اُس کے اچھے افسانے میں جنہیں پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ انسانی حقیقت ہمارے لیے کچھ بدل ہی گئی ہے۔ دوسری طرف اُس کے بُرے افسانے ہیں۔ مثنوی کا دھندلوی ہوئے کے باوجود مجھے تسلیم ہے کہ اس نے بعض بہت ہی خواب افسانے لکھے ہیں، لیکن اُس کے بُرے سے بُرے افسانے میں بھی آپ کو وہ ایک فقرے ایسے ضرور ملیں گے جو کسی نہ کسی آدمی یا چیز یا خیال یا احساس کو خود کے دکھ دوس گے۔ —

جہاں یہ روشنی ایسی ہو جو آپ کو پسند نہ آئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں بھی آمد و زبیرا ہے، یہ بھی مثنوی کا مذہبی رہن تھا۔ مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ آمد اور آمد کا فرق ادیب ہی کو ہی سمجھنا نہیں رکھنا۔ کوئی چیز آمد ہو یا آمد، فیصلہ کی بات تو یہ ہے کہ اس سے نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ اگر آمد کے ذریعہ کسی تجربے کو اظہار مل گیا تو وہ آمد سے بہتر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآنِ مہر و شمع بھی دو طرح کی جاتی ہے، کبھی تو مردوش اپنے آپ بول پڑتا ہے، کبھی اس کے کان مردوش نے پڑتے ہیں، مردوش کی نیا غنی سے تو ہر آدمی ہی ادیب ہی ہو سکتا ہے، لیکن مردوش کو زبردستی بردارنے کے لیے بہت دھکار ہے کیونکہ مردوش کے کان مردوش نے کا مطلب ہے اپنے کان مردوش نا۔ آپ یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ میں دفعہ مثنوی نے مردوش کے کان اس طرح مردوش سے کہہ دئے کہ بھائے، جتنے پڑا یا اول قول کہنے لگا۔ لیکن مثنوی نے حوصلہ تو دکھایا۔ یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ مثنوی کو یہی کیا تھا، دو بے چارے باتوں کو مردوش کرتا تھا، مگر یہ کبھی شکل ہے کہ اس ان ہی بے چاروں میں آدمی

علیہ عجز جاتا ہے۔

بڑے قیاس اور کوئی نہ کوئی بڑے کار

سے

منٹو کے اندر اس شہید سے بازی کی تیر میں جو چیز کام کو رہی تھی وہ یہ کہ منٹو اپنے چھوٹے چھوٹے احساس یا ہڈیے کو رہانے یا ارد کرنے کا نانی نہ تھا۔ ہر چیز اُس کے اند کوئی نہ کوئی رد فعل پیدا کرتی تھی، اور وہ اس رد فعل کو قبول کر لیتا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے اور وقتی تجربات کو ایک دوسرے سے متعلق اور منضبط کرتے رہنے کی عادت اُس میں نہ تھی۔ وقتی رد فعل کو وہ اتنا دلچسپ یا وسیع سمجھتا تھا کہ اس پر انصاف دواتیا کو قربان کر دیتا تھا۔ اس لیے اس کے افسانے کبھی تو بہت اچھے ہوتے تھے، کبھی بہت بُرے۔ اور کبھی افسانے میں ایک آدھ فقرہ ہی کام کا نکلتا تھا۔ غٹو میں یہ بہت بڑا نقص تھا۔ لیکن اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کا حال یہ رہا ہے کہ وہ یہاں تو اپنے احساس کو ایک ڈھکے پر لگا دیتے ہیں، اس ڈھکے سے ہٹ کر کسی اور قسم کے تجربے کی صلاحیت ان میں باقی ہی نہیں رہتی، یا پھر وہ چھوٹے چھوٹے اور ہنگامی تجربات کو حقیر سمجھ کر رد کرتے چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادیب دو چار اچھے افسانے لکھ کے غطب ہو جاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں بس منٹو ایک ایسا آدمی ہے جو کسی ہڈیے یا احساس سے نہ ڈرتا تھا اور جس کے لیے کوئی احساس حقیر یا غیر دلچسپ نہ تھا۔ بعض حضرات نے منٹو کے کارنامے کو یہ کہہ کر اُٹانے کی کوشش کی ہے کہ منٹو کے یہاں افسانے کا خام مواد تو ہے، افسانے نہیں ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کے پاس خام مواد تک نہیں ہے، کیونکہ خام مواد تو احساسات اور جذبات ہی فراہم کرتے ہیں۔ جب آدمی اپنے احساس پر ہرے بشادے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ منٹو کی شخصیت اُردو کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ آزد وقتی، اس معنی میں کہ اُس نے اپنے احساسات پر کسی قسم کی بندشیں نہیں لگائی تھیں۔ جب اُس کے احساسات ایک دوسرے سے آزاد ہونے لگتے تھے تو یہی چیز اُس کے افسانے کے لیے صلب بھی بن جاتی تھی۔ لیکن اُردو میں کوئی افسانہ نگار ایسا نہیں، جو احساسات کی آزدی سے اتنا کم ڈرتا ہو۔ احساسات اور ارتعاشات کی پہل میں منٹو کی شخصیت خود پاش پاش ہو گئی، لیکن اپنی زندگی اور موت سے منٹو نے یہیں اتنا خود دکھا دیا کہ فی الحال ہر ناموس ملے حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے ہر اوجھ کوٹنے کا کام سرعام اور سب کی نظروں کے سامنے کیا۔ اسی بے اُردو میں اُس کی حیثیت محض ایک ادیب سے زیادہ ہے۔ اسی لیے اس کی موت اُس کی زندگی کی منہوت کو مکمل کرتی ہے اور اسی لیے اُس کے بڑے افسانوں کو بُرا سمجھنے کے باوجود میں منٹو کا افسانہ کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہتا ہوں۔

محمد حسن عسکری

جو آگاہ تو تھا۔ لیکن مشرق کی وسعت داری اور قنات کے غلط کسی بات کو دور مختصر افسانہ ہی کیوں نہ ہو، گروہ کو رکھتا تھا ایک وہ گروہ تھا جس کے دل کے چرچرے جانتے تھے بلکہ افسانوں میں ان کے دل چوری کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے ان کی جھلک سہت بجا تھی وہ اب تک تمام ہے اور غالباً سچی دنیا تک قائم رہے گی۔

یہ مقام کو کوئی شخص کسی نفسیاتی بیاری کا شکار نہ ہو بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوتا ہے۔ غم کے بکتر، غم اور غم کو مرض نہ سمجھا جائے۔ یہ فن کار کو اپنی مہارت پر جونا زنا تھا، اس کا اظہار تھا۔ اور صرف ان مضمون پر ہوتا تھا جب فن زیر بحث ہوتا تھا۔ حقیقت کی دکھاس میں، فن کار کو کہ جزئیات کا انتخاب کوئی فرق ہے، اور اپنے اصول کی رجحانی تصویر کشی کے لیے اس کو طے کرنا پڑتا ہے کہ زندگی کے یہ پہلو دکھائے جائیں گے اور یہ نہیں۔ غم نے یہ کام بہت سلیقے سے کیا تھا۔ اس کے افسانوں کے مطالعے سے ہماری صاف مزہ زندگی اور اس کے اصول کے بہت سے پہلو سی طرح اچانک ہوتے ہیں کہ مختلف افسانوں کو دکھ کر ایک مکمل تصویر بنتی ہے۔ اس تصویر میں جنس کے رنگ بھی پھولے گئے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ جنسی معاملات میں، ہمارے ملک میں ہر لڑکا لڑکی کی جنسی وابہیات کتاب سے یا کسی دہائیات تروست یا سیسل سے جنسی معلومات حاصل کرتا یا کرتی ہے اور یہ معلومات اس ناقص اور محدود ہوتی ہیں کہ بہت سی جنسی گمراہیوں اور کج فہمیوں کا موجب بنتی ہیں۔ غم اس گمراہی اور گمراہی کی دکھاس کرتا ہے اور جنس بھوک کا تذکرہ بھی کرتا ہے، بات ذرا اعلیٰ چوٹی کی ہیں کہ رہا تھا کہ حقیقت کی دکھاس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ یعنی ذہنی بیماری میں۔ غم اس اعتبار سے اپنے دور کا فراعصمت مند اور بے تھا۔ اس نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کو بالی کر کے بچے اور بچیاں پڑھیں تو ان کے اخلاق پر بڑا اثر ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خود غم کی نیت کا کیا عالم تھا؟

حقیقت کے دکھاسوں کو زندگی نے پیش نہ کیا تھا کہ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔ انھیں تو وہ نقاش پسند تھے جس پر وہ نقش نگاہیں کر دل کو بچلے معلوم ہوں۔ موضوع تصویر کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ذہنی شکل پیدا کریں کہ کوئی گھنٹوں دیکھا کرے لیکن اب کو بچلے دکھاس کی ضرورت ہے، پھر نقاشی، اصلیت معلوم ہوگی تو وہ تصویر بنائی جائے گی، جو غم کو ہے اور نقاش نے دل سے دیکھا ہے۔ بالکل اس وقت تک خلج میں تشکل نہیں ہو سکتی۔ جب تک پہلے فن کار کے بغیر کے اندر پیدا نہ ہوئے دنیا بھی وجود میں آ سکتی ہے کہ ادب میں ہر مصلے پر دکھاس پیدا ہوئے ہیں۔ تاکہ انسان حقیقت سے آگاہ رہے اور انھیں بند کر کے نہ بھولے کہ کب کچھ ٹھیک ہے۔

دنیا سے غمراہی میں کوئی معیاری معاشرت اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتی جب تک حقیقت کے دکھاس پر غمراہی میں نہ آتے ہیں اور پریشان خاطر ہو کر بھی یہ سکون طلب اجزاء کو دیکھ کر ایک رجحانی تصویر نہ بناتے رہیں کہ نقاشوں کو معلوم ہو سکے کہ اصل صورت کیلے۔ نئی دنیا بنانے کے لیے، انی اقتدار دریافت کرنے کے لیے، انی انفرادی تربیت کے لیے، رجحانی اصلاح کے لیے پہلے اس دنیا کی دکھاس کی ضرورت ہے، جو ہے۔ تاکہ وہ جو ہونا چاہیے، وجود میں آ سکے۔

افسانوں میں فن کار اپنی معلومات ذہنی اپنے کلاموں کے ذریعے بات کرتا ہے۔ اس لیے جو کچھ اُسے کہنا ہوتا ہے وہ بالواسطہ کہا جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں اگرچہ مصنف کی اخلاقی اور اخراجی ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان کے اخلاقی عقائد کا ذہنی ہر اس کے غمراہی

سوانح بہت کم ملتا ہے۔ میں مکتبہ کے کاتب نے میں مصنف ان تمام خیالات سے اختلاف کئے، جو کہ دلائل کی زبانی ظاہر کیے گئے ہیں۔ مکتبہ کے افسانوں میں ایسا اکثر ہوتا ہے۔ افسانوں کے متعلق، فنی کے متعلق، زندگی کے متعلق اور بہت سے دوسرے مسائل کے متعلق، مکتبہ کا نقطہ نظر زیادہ وضاحت سے اس کی کتاب گنجے فرشتے کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ یوں بھی یہ کتاب منٹو نے جونی کی مغز میں ملے کی ہیں، ان میں منٹو کی میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوانح نگاری اور ذاتی اخراجات کے متعلق سے کم و بیش ادوار میں ایک نئی صنف ادب وجود میں آئی ہے۔ یہ ملے کر ان کا اس صنف ادب کا نام کیا لکھا جائے۔ چنداں ضروری نہیں۔ صرف یہ ملے پا جاتا ضروری ہے کہ گنجے فرشتے میں منٹو نے بہت سے عناصر کو محکمہ سوانح نگاری کا ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے۔ اس کتاب میں قائد اعظم (مرحوم)، آغا خاں (مرحوم)، اختر شیرانی (مرحوم)، میراجی (مرحوم)، وادی (مرحوم)، عصمت چغتائی، شمیم، میری چو شمیم بانو، نکس، ایسیا، امداد بابر، وکیل کے متعلق مضامین ہیں۔ ان مضامین میں منٹو کے سوانح حیات کے بہت سے تاردا گئے۔ جو کہ ہیں صنعت فلم سازی کے تذکرے موجود ہیں۔ ہمیشہ اتفاقاً وہ پرکلی ملے گئے ہیں۔ بھی ہیں۔ جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا کردار ادا ان کی شخصیت منفرد ہے۔ لیکن ان کے تذکرے میں ایک قدر مشترک ہے۔ منٹو کا بے تکلفانہ انداز نگارش جو اس طرح کے تمام شخصیتوں کو گویا ایک لہری میں بہا دیتا ہے۔ (ذاتی تعلقات کو نظر میں رکھتے۔ قائد اعظم (مرحوم) کے سوا)۔ لکھا ہر پر مغز، بارہ آدمیوں کے متعلق ہے۔ لیکن درحقیقت اسی کا سوانح ایک تیز جواں آدمی بھی ہے اور وہ خود منٹو ہے جس کی شخصیت اس کتاب میں بے نقاب ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ منٹو، ایسی کی حدود پر ہر شخص غلطی دینا میں وہ کہہ سکتی جذباتی رہا۔ مخلص کاغذ، اس اور حال حزرے کی بات ہے کہ منٹو نے اپنی جذباتیت کو اپنی ہیروں کو اور اپنے مخلص کو نہ اتنا ہی اہتمام سے پڑھنے والوں سے مخفی رکھنا چاہا ہے لیکن ہر شخصیت اس کتاب میں سب سے زیادہ ابھرتی ہے۔ وہ منٹو کی ذات ہے۔ معلوم نہیں کہ ترتیب میں ترتیب زمانی کس حد تک ملحوظ ہے لیکن سلسلہ وار مطالعے سے منٹو کی ایک شخصیت ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، پہلے فوجیان، سادہ دل، فنی کاروں اور مصنفوں پر برتری، پھر دنیا کی عظمت سے دوچار، کارنامہ حیات میں ہر آزما اور آخر اپنی ہی ذات کی ایک کڑی سے شکست کھانے والا اس و نامہ اور انسان۔ آغا خاں سے جن دو ملاقاتوں کا منٹو نے ذکر کیا ہے، اس میں ہیں وہ کم عمر منٹو نظر آتا ہے جس کی طبیعت پڑھائی سے اچھا ہر پہلی تھی اور جو اپنے اندر گہرے حالات کو ترنظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس زمانے میں اس پر مشہور صحافی اور مہذب بادی کا بہت اثر تھا۔ جو منٹو کے خیال میں حدود پر ہندو واقع ہوئے تھے۔ اختر شیرانی سے ملاقات کا ذکر کیا ہے اس سے منٹو کے جذباتی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی گوتے ہیں (میراجی کے متعلق مضمون ہے) منٹو نے پراسسڈ ٹیلیٹ کا انسان شروع کر کے بڑی چپے کی باتیں کہی ہیں اور میراجی کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے اس سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف، یہ اور بات ہے۔ لیکن منٹو نے جو دہرہ روشنگاری دی ہے اس سے انکار کی جرات کسی کو نہیں ہو سکتی وہ لکھتا ہے :

”حسی عشق اور مرث اس تیلیٹ کے تمام اقلیدہ سی زاویے صرف ان

تجی گروں کی بدولت اس کی بھویں آئے تھے۔ یہی تھی اور عشق کے انجام کو جو عمارت اس نے شکست خوردہ بینک سے دیکھا تھا جس کے فیضیوں میں ترڑے تھے۔ اس لیے اس کو جس شکل میں اس نے دیکھا تھا، ایسا ہی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ اس کے سارے وجود میں ایک ناقابلِ بیان وہام کا زہر پھیل گیا تھا جو ایک نعلی سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پر کہ اس کا ہر نقطہ اس کا نقطہ آغاز ہے اور وہی نقطہ انجام۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اہام تو کیلا نہیں تھا۔ اس کا رخ موت کی طرف تھا۔ نہ زندگی کی طرف۔ وہ بابت کی سمت نہ تفریط کی جانب۔ اس نے آغاز اور انجام کو اپنی مٹی میں اس طرح پیچ رکھا تھا کہ ان دونوں کا ہر پیر پیر گراں اس میں سے ٹپکا رہتا تھا۔ لیکن مادیت پسندوں کی طرح وہ اس سے سرور نظر نہیں آتا تھا یہاں پھر اس کے جذبات گول ہو جاتے تھے۔ اُن میں آہنی گروں کی طرح جی کوہن ٹھہری رہتے حسن بلڈنگز کے غلیٹ لبریک میں دیکھا تھا۔“

منظر کو اپنے معاصروں سے، فن کاروں سے خاص طور پر اور انسانوں سے عام طور پر کتنی محبت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے برائی کے مرلے پر یہ لکھا کہ اچھا تھا کہ وہ جلدی ہو گیا۔ کیونکہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور خراب ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ بظاہر ان فقروں سے مستعدی لگتی ہے۔ لیکن ان کے یہاں اسطور پر نظر کیجئے تو معلوم ہو گا کہ منظر کا دل و دم سے جیسے بھرا ہوا ہے، اور میرا کی وہ انسان کی مزید وقت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اس کے مرلے پر اچھا ہوا“ کے کلمات استعمال کرتا ہے۔

آدھتیت استدام آدی

باخبر شراز معتام آدی

باری پر منظر کا مضمون نہایت شگفتہ لیکن نہایت دقیق مشاہدات پر مبنی ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ منظر باری کو بہت بڑول تصور کرتا تھا۔ اپنے لیے کاہن باری جو حکیم وہ بنانا تھا اس میں فرا کا چند دھارہ سرور ہوتا تھا کہ اگر حالات ناخوشگوار ہو جائیں اور محاذ سے پیچھے ہٹنا پڑے تو ایک راہ کھلی رہے۔ باری کو جس طرح منظر نے دیکھا ہے۔ ان کے کردار کا تھنٹس ایک جلیں میں مضمون کر دیا گیا ہے۔

”باری صاحب قبر میں ہیں۔ معلوم نہیں، ماسوں میں کوئی ایسی کھڑکی ہے جس سے وہ کوڑ کر باہر نکل سکیں۔“

باری کے متعلق منظر کے مضمون میں طنز کا رنگ بہت چمکا ہے اور مذکر سخی کے کرشمے بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ گو یا منظر کو باری سے جو محبت تھی۔ وہ اُسے طنز و جملوں کے پردے میں چھپانا چاہتا ہے تاکہ

پڑھنے والے کیس یہ نہ کہیں کہ، اس منٹو ایک بڑول کو دوست رکھتے ہو، لیکن سارا مضمون پڑھ جائیے۔ وہ بارہ و تیرہ جلد ہے، تو معلوم ہو گا کہ منٹو نے دینی کو دشمنی کا سارا رنگ دے دیا ہے۔ دنیا کاری کی یہ عجیب و غریب شکل ہے۔ لوگ صنعت کو تو نظر نہ کر دینی کو بھی دوست کہتے ہیں۔ منٹو دوست کے لائق بھی حسب و نحوہ نہیں گانا کہ لوگ اس کی اس کمزوری پر مطلع نہ ہو جائیں کہ وہ جذباتی ختم کا آدمی ہے اور دوستوں کے تمام عجیب معاف کر دینے پر تیار ہے۔ منٹو کے اپنے بیان کے مطابق باری کی زندگی کے کچھ سیلو ریڈ بانی خدا سے جو غلط میں بیان کیے گئے ہیں، اس سلسلے میں غلط کا ایک فقرہ اس کی اصلیت کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن غریب جیڑی یہ مٹی کو ان صحافیوں سے اس کے خلاف (یعنی غور سے) لکھوا دیا گیا، جن کی ناگفتہ بہ حالت کی عکاسی اس میں کی گئی ہے۔ اب معلوم ہو گیا کہ منٹو کا جو مضمون باری پر ہے اس میں وہ صرف باری پر ہی نہیں اپنی ذات پر بھی طنز کر رہا ہے کیونکہ خود اس نے بھی زندگی صحافی کی حیثیت سے شروع کی تھی، اس مضمون میں وہ حقیقت منٹو نے اس زمانے کو یاد کیا ہے جب اس نے کارزارِ حیات میں قدم رکھا ہی تھا۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ تعصیف و تایبیت کا چسکا پیدا کرنے کا ٹوک باری مرحوم ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب منٹو یہ دنیا منت کر رہا تھا کہ اس کی عظمت کے ممکنات کیا ہیں اور تعصیف و تایبیت کی طعن متوجہ ہوجانے کے بعد اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کامیاب ہو گا، کامیاب ضرور ہو گا۔ لیکن لاف زوال، شہرت، بے پناہ مخلص، ہجرت، انگریز مشاہدہ، بے تکلفی، کھٹے کی تندت، کوئی چیز بھی آخر اُسے اس معاشی بحران سے نہ بچا سکی جس کے صدمات کو بھلانے کے لیے وہ شراب پیتا تھا۔ باری پر جو مضمون ہے۔ وہ دانے کی طرح ہے۔ اس میں طنز جہاں سے چلا ہے وہیں واپس آتا ہے۔ معاشی بے ایمنی سے معاشی بے ایمنی تک۔ ان دونوں حدود کے درمیان وقتی ثروت کی کئی مثالیں ہیں۔ لیکن ان سے منٹو نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ قرباری پر جو مضمون ہے وہ صرف باری کا ہی نہیں منٹو کا اپنا مشرب بھی ہے۔ اور کم و بیش ہر صحافی، اور بے ادنیٰ کار کا مرثیہ ہے اس مضمون کا زہر خند غالباً بے نظیر ہے اور منٹو کی کسی اور دینی تخلیق میں ایسے تکیے فقرے نہیں ملیں گے مثلاً:

”یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ پروفیسر سکول کے استاد سے قرضی کرتے کرتے کسی ریونیوٹی کے ریڈر ہو جاتے۔“

”جادو کوئی اور کام نہ ہو۔ سچل اور کامل ما کس نکھاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ غریب باری بھی ابھی تک ان کے طے کرنے کو ابھی طرح نہیں سمجھا۔“

”آقبال کی غرضی کا فلسفہ ان کو اس قدر پسند آگیا تھا کہ اس کو اپنا اور صنا بھوننا بنایا۔ مگر سرواں میں معلوم ہوا کہ کام نہیں دے سکتا۔“

”ان کی طبیعت شعلے کی تھی، دل کا عارضہ ان کو بہت دہر سے تھا۔ مگر اس کا علاج انھوں نے جب بھی کیا، مصالحت آمیز طریقے سے کیا۔ اس کی ملافت میں ان سے کبھی جارحانہ اقدام نہ اُٹھا۔“

وہ انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ لیکن یہ عرفت نا شا ہے کہ جب انگریزوں کا گیا تو وہ اُن کے

نوکر ہو گئے۔

منظروں کے معاملے میں بڑی سوجھ بوجھ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کا مطالعہ درست وسیع نہیں تھا۔ اس لیے جب وہ نقاد کا ہر وہ بجز ناخوشی پر غور کیا تو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی۔ اس کی زبانیت اور لطافت بعض اوقات اسے ایسے گھٹے بھاتی تھے کہ ہمیشہ وہ نقاد منہ دیکھتے رہ جاتے تھے اور کبھی وہ ایسے دلوں کو ترنا تھا جن کا اثبات ممکن ہی نہیں۔ عصمت چغتائی پر جو اس نے مضمون لکھا ہے۔ اس میں اسی قسم کے تضاد کا نہایت پر غور کیا گیا ہے۔ ایک بار عصمت سے زبان کے مسئلے پر جو گفتگو شروع ہوئی، تو عصمت نے بھی شاید کئی تاخیر کی کہ منظر سے زبان کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں عصمت نے غلط دست درازی استعمال کیا۔ منظر نے کہا: ”مجھے غلط دماغ ہوتا ہے۔“

”شاید قصہ ختم کرنے کے لیے دوسرے کمرے سے نفرت اٹھا لیا۔ روال کی تختی میں غلط دست درازی موجود ہی نہ تھا۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ منظر سے کہنا چاہتا ہے کہ دست درازی کرنا، کوئی عارضہ ہی نہیں۔ نہ دست درازی کوئی صحیح ترکیب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لغات میں دست درازی مندرج ہے اور اس کے معنی بھی طاقت اور زبردستی و خود غرضت لکھے ہیں۔ معلوم نہیں۔ شاید نے کوئی لغت دیکھی۔ اسی طرح عصمت کے افسانوں پر انتقاد کرتے ہوئے اس نے جو چیزیں کہیں۔ ان کی تنقید پر غور کیا ہے وہ اس کی ذہنی نگاہ کی اثرات ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ہر رنگے میں موجود ہے جو اس کے گھٹے میں ہر ہر رقم پر ہماری دہنائی کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمزوریوں کو ہم مصنف کی جنس سے متاثرہ نہیں کر سکتے۔ مگر اس پر زیادتی ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے گھٹے ہونے افسانے پر اثر کر کے اثر پڑ چلتا ہے کہ مصنف عورت ہے اور مرد کے افسانے کا بھی اثر پڑ جاتا ہے کہ مصنف مرد ہے۔ یہ غلط مزاج ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ عورت مردوں کی عظمت کی تصویر کشی میں مرد مسخروں سے کم ذہین ہے۔ نہ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ عورت مردوں کے جذبات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ فن کار کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہوتا ہے۔ وہ شاید مطالعے اور تحقیق سے مدد کر کہ جنس مقابل کے جذبات کی صحیح تصویر کھینچ سکتا ہے۔ عورت اور مرد کے جذبات بنیادی طور پر یکساں ہوتے ہیں کہ انسانیت دونوں میں مشترک ہے۔ اور انسان نے جو کچھ عموماً کیا ہے اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہاں کسی افسانے کے حلقے میں معلوم ہو کہ لکھنے والی عورت ہے تو ہر نفسیاتی اثر ضرور ہوگا اور ہم کہیں گے کہ جذبات کی یہ لطافت اور یہ لطافت صرف عورت ہی کے افسانوں میں مل سکتی ہے۔ منظر بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہا کہ عصمت کے بعض افسانوں کو عورت کے نازک اور ظالم افسانے کہتا ہے۔ منظر کی نظر میں یہ افسانے عورت کی ادائیں ہیں۔ عادت و عفتان ہر قسم کے تصنع سے پاک ہیں۔ نے عرض کیا تھا کہ غریب نقاد کا ادب و سادہ سادہ ہے تو نہ کلام میں کہیں یا کہیں نکل جاتا ہے۔ عورتوں نے ایسے ایسے غیر نازک اور ظالم افسانے لکھے ہیں کہ بارید شاید ادھر مردوں نے بھی ایسی عزت و خیال دکھائی ہے کہ سمان اللہ۔ اس سلسلے میں یہ بڑے کے ادب کا ذکر بھی منظر نے کیا ہے۔ بطور کسی پیشتر نے یہ بھی جیست کی تھی کہ یہ طیف

پطرس نفوسہ بازی ہے۔ یہاں یہ بیڑے کے اوپ کاڑ کر لگایا ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ خاص منظر ملازی ہے۔ جگہ نئی اختلاف کے مسئلے میں دلیل کی نعم ابدل نہیں بن سکتی۔ دعوے ابد دلیل میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اسی منظر میں فنی قیصر کے متعلق بھی ایک آدھا متقاضی نفوسہ بازی سے بھی دو گندہ کر ہی دیا جائے تو اچھا ہے۔

صحت چٹائی کے بعد جن لوگوں سے منظر ہمارا تعارف کراتا ہے وہ سب فلم کے صنعتی آسمان کے درخشندہ لیکن دور بندال ستار ہیں۔ فلمی زندگی کے حلقوں کے دلوں میں ہر رومانی تصورات ہمدیش پاتے رہتے ہیں ان میں سے کچھ تو ان مضامین کے مطالعے کے بعد ہیہ نشوونما پاتے ہیں۔ اور کچھ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ فلم کی گزینا خود منظر کی ذات کی طرح متضاد باتوں کا مجموعہ ہے۔ منظر نے بڑی چابکدستی سے اس تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ بیشتر مضامین کا اسلوب ہمدوا ہے۔ ان مضامین میں بھی منظر بے حد جلد بازی نظر آتا ہے اور سب معمول اپنی جذباتیت کے انخلاء میں مصروف ہیں۔ وقت برصغیر چند پاک کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ منظر بھٹی کے نگار خانوں میں مسلم ادبی حیثیت اور دجاہت دکھاتا تھا۔ ہزاروں روپے ماہوار کا آقا تھا۔ ہا کے پاکستان آنے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ ہاں یہ تھا کہ بعد میں ٹماگیز میں بڑے بڑے منصب مسلمانوں کے تصرف میں تھے تقسیم کے بعد بعد میں ٹماگیز کے ارباب اقتدار کو گناہم خطوط وصول ہونے لگے کہ مسلمانوں کو الگ کر دو، ورنہ اسٹریو جلا کر داکو کر دیں گے۔ منظر نے دل میں سوچا کہ بعد میں ٹماگیز کے ارباب اقتدار یعنی اشوک کمار اور دجاہ کو تکلیف میں مبتلا کرنا ٹھیک نہیں۔ اس نے جیسے ٹماگیز جانا ترک کر دیا۔ پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا اور خود اس کے مفکروں میں :-

”میں چپ چاپ باجو کی لگی سے پاکستان چلا آیا“

اس کے بعد :

تجھ سے مخفی ہے جو مجھ پر گزری

تو قریب دگ جہاں رہتا ہے

منظر نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ لیکن فارغ البالی اور آسودگی کے بعد ایلا کی معاشی بے اطمینانی میں مبتلا ہو جانے کے نتائج ظاہر ہو کر رہے۔ اور وہ منظر جو کسی سے نہیں ڈرتا تھا جس نے کسی سے شکست نہیں کھائی تھی۔ خود اپنے آپ سے شکست کھا گیا۔ ڈاکٹروں نے اس سے کہا، شراب پینی ترک کر دو، ورنہ مزہاؤ گے۔ کچھ عرصہ اس نے اس مشورہ پر عمل بھی کیا۔ لیکن :-

پیسہ ان فی پرند

مریدان بھی پرانند

والا قصہ ہوا۔ اور آخر شراب نوشی کی کثرت نے منظر کو بھی ہلاک کر دیا یہ اتفاق دیکھیے تاکہ مجھے فرشتے میں تین اور بھی ارباب ایسے ہیں جن کو شراب سے ٹھوہری۔ یعنی آقا شہزادہ اختر شہزادی اور میراجی۔ آدی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ہاک

ان زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کا سوائے شراب کے شاید اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ باری مرحوم دل کے مریض تھے۔ معلوم نہیں شراب کس حد تک ان کی موت کی ذمہ دار ہے۔

میں ذرا بے گناہ ہوں۔ اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ مجھے فرشتے بارہ آدمیوں کے حالات پر مشغول نہیں۔ اس میں ایک تیرہویں شخصیت بھی ہے۔ یعنی خود منٹو۔ ایک طرح یہ کتاب منٹو کے خود نوشت سوانح حیات کے چند ٹکڑوں پر مشتمل ہے اور چونکہ منٹو کا ذکر کتاب میں گویا مختصراً آیا ہے۔ اس لیے اس کتاب کے مندرجات منٹو کی شخصیت کو اجاگر کرنے میں مضمون "منٹو" سے کہیں زیادہ معاون ہونے میں جو سرکشوں کے پیچھے کا آخری مجزو ہے۔ یہ کہ وہ اس مضمون میں "منٹو" میں مصنف کی باتوں کو معنی رکھنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یوں ہی اپنے سوانح حیات لکھنے کی شعوری کوشش میں دیباکاری کو زیادہ دخل ہوتا ہے اور مختلف مضامین میں بغیر سوچے ہوئے مصنف جو کچھ لکھ جاتا ہے اس سے انکشاف ذات و صفات میں زیادہ مدد ملتی ہے۔

"مجھے فرشتے" کا پہلا مضمون میرا صاحب ہے۔ اس میں قائد اعظم کا شوقِ رانی زبان میں ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے۔ یہ مضمون نہ صرف آزاد ہے۔ اس مضمون میں شروع سے لے کر آخر تک محبت و احترام کا بڑا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہ جو میں نے کہا تھا کہ منٹو شدید قسم کا جذباتی انسان تھا۔ اس کا مزید ثبوت ملتا ہے۔

منٹو ہمیں کس نگار خانوں میں کامیابی کے تمام مراحل طے کر چکا تھا۔ ایسی کہانیاں لکھ چکا تھا جو مقبول ہوئی تھیں۔ مکالمات تبلیذ کر چکا تھا۔ سینار یو لکھ چکا تھا۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس کے ڈرامے اس معیار تک نہیں پہنچے جو اس کے انساؤں نے حاصل کیا۔ پانچ ناولس میں اس کی ٹھکی کہانی نگاری پوری تعقیبات کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ کہانی کا موضوع یہ ہے کہ ایک نواب صاحب ہیں (بڑی سرکار) جنہوں نے جہان میں وہ سب کچھ کیا تھا، جو لوگوں کو کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اپنے مالی کی بیوی سے بھی عشق فرمایا تھا۔ ان کے صاحبزادے ہیں، بچھوٹی سرکار، وہ باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں بلکہ بڑی سرکار اب ٹرک اس منزل پہ ہیں کہ بچھوٹی سرکار کو محبت کے جال میں شکار پھانستے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں، اور میں۔ بڑی سرکار کا مالی ایک لڑکی کا باپ ہے جس کا نام چینیلی ہے۔ دراصل یہ لڑکی بڑی سرکار کی ہے جو مالین کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ مرنے وقت مالین نے خاوند کو حالات کی صحیح صورت سے مطلع کر دیا تھا اور اس نساء کا اظہار کیا تھا کہ حرامی لڑکی کا کھلا گھونٹ دیا جائے۔ لیکن مالی کے دل میں شیطان جاگ پڑا اس نے بڑی سرکار کی لڑکی کو اپنی لڑکی بنا کر پالا اور جب سیانی ہوئی تو بچھوٹی سرکار کو منوج دیا کہ اس بچی سے ہمہ دم کیل دہرا دیں جو مالین کے باپ نے مالی کی بیوی سے کھینچا تھا۔ یوں مالی نے خوفناک قسم کا انتقام لے کر اپنے دل کی آگ بجھائی۔ اس کہانی کا موضوع ایسا ہیبت ناک تھا کہ منٹو اگر چاہتا تو بچھوٹی سرکار، بڑی سرکار، مالی، مالین اور اس کی لڑکی چینیلی، انہی کرداروں کے ارد گرد تمام واقعات گھوم جاتے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس

تیس صفے کی نملی کمائی میں بڑی سرکار کے غشی کا لاکھ لاکھ پیروے اور خانہ بدوشوں کے قبیلے کی ایک لاکھ لاکھ پیروے ہے۔ جیسا کہ ڈرامے کے نام سے ظاہر ہے۔ یوں بھی واقعات کے اندر چڑھاؤ کے اعتبار سے یکجہل میلو ڈرامہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میلو ڈرامہ بھی گہرے رہا ہے۔ کٹاری اور گلاب کی داستانیں محاشقہ جو چھوٹی اور بڑی سرکار کی ہوس رانہوں کے متعلق کہتی ہیں۔ یہ اہل بیچارہ قومیں، آخری سین میں گلاب اور تیشی کی تقدیر میں جو مشابہت ہے اس کا ذکر کر کے غشائے کٹاری کے مددگار کوئی ڈرامے کا ضروری جز بننا پڑا چاہا ہے۔ لیکن بات یہی نہیں۔ یوں بھی ڈراموں میں غشو کی زبان میں وہ متاعاً، اختصاراً جو بجا لایا گیا ہے۔ پنچا پنچا ہوتا چلا ہے، موجودہ پیش ملا بہ روزمرہ کی ہے۔ یہ تو خبر کوئی جب کی بات نہیں لیکن غش سے ہے کہ بہتر زبان کلام ہوتی ہے اس پر غشو زیادہ کور، صحت نہیں کرتا۔ چھوٹی سرکار اور بڑی سرکار کی کوئی واضح تصویر بھی پڑھنے والے کے ذہن میں نہیں آجھرتی اور کٹاری اگرچہ ڈرامے میں برابر نظر آتی رہتی ہے لیکن اس کے اوصاف بے ہادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں حبیبی جوتی جاگتی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ خانہ بدوشوں کے قبیلے کی ایک لاکھ لاکھ غشائے مددگار میں متاعاً جو حیثیت رکھتا ہے جو غشائے کٹاری کے ڈراموں میں دوسرا صنفی پلا شدہ کھتا تھا۔ کٹاری کی داستان خارج کر دینے سے اصل ڈرامہ کس طرح تیار نہیں ہوتا۔ ڈرامہ جو اس ایک غلطی کا متروک نہیں ہوتا وہاں غشو نے پوری داستان کی داستان کا تو نگاہی ہے۔ یوں بھی اس کھیل میں ان گہری غشوں کے اندر کھائے سادہ، دکھائی دیتا ہے جو خانہ بدوشوں کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ خانہ بدوشوں کا سردار ڈرامہ وہ تمام باتیں کرتا ہے جس سے پڑھنے والے کی فہم اس کے حیرت انگیز کردار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اس کے پاس ایک بانجو جس کے تار نہیں، گھڑی ہے جس کی سوئیاں نہیں۔ لیکن اس کے باوصف وہ کسی انگریزی فلم کا سلائیڈ کاٹلر ہے جسے غشو نے کسی انگریزی فلم سے نکال کر یہاں چپکا دیا ہے

یہی موضوع اگر غشو اپنے افسانے کے لیے انتخاب کرتا تو آپ دیکھنے کر کیا صورت پیدا ہوتی۔

”غشو کے ڈرامے“ ڈریڈیائی، میں بھی یہی بات ہے کہ غشو افغان کو بغاوت، اختصاراً متعال نہیں کرتا۔ اس میں سے گہری خاص میلو ڈرامہ ہے لیکن غشو نے اس میں کچھ (PROBLEM PLAY) کا سا انداز پیدا کر دیا ہے۔ اس ڈرامے کی کردار کی فہم ہے۔ جس پر ایک لال لال آنکھوں والا کھیل پوش ترک ہے۔ فوگ کی شادی ایک تھاندار سے ہوتی ہے اور اسے آخری سین میں کوئی لڑکی سے مارا مٹا ہے۔ یہ اشارہ ملتا ہے کہ قاتل تھا تھاندار خود ہے۔ لیکن کھیل پوش عاشق قاتل کا ہرگز نہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غشو کے خیال میں فوگ کو دو آدمیوں نے قتل کیا ہے۔ اس کے ہم کلاس کے شوہر تھاندار نے، جسے شبہ ہو گیا تھا اس کی گہری کسی کھیل پوش کے من میں جلی جاتی ہے اور اس کے دھڑکنے کی کھیل پوش نے جوا اپنے آپ کو گہری کے لیے پیش کرتا ہے کھیل بھی حاشیہ اہمیت کا حامل ہے۔ عروہ ہے کہ عاشق کے متعلق یہ دریافت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کا نام فوگ کیا ہے۔ ”انتظار کا دور سرائخ“۔ لیکن بار پڑھنے کے بعد بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا۔ ایک لڑکی بقیس نے سادھے آغوش سے کسی سے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کی ماں اُسے روکنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ بھائی کی حد سے ہانپتا نا کہ گہرے غلو داتا ہے۔ دوسرے غلو جس سے ملنے کے لیے نکلتی ہے اس کے متعلق یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دل کا دورہ چرا، مر گئے یا سو رہے ہیں۔ اس

میں بھی وہی (PROBLEM PLAY) کا سارنگ ہے لیکن (PROBLEM) یا مسئلہ کوئی نہیں۔

ان ڈراموں میں کیا ہیں اندازہ کرنا بہت دشوار ہے۔ نہایت کچھ برائی اور خیر بھی نہ ہونی چاہیے۔ اس میں تعلیم ایک آزاد خیال تعلیم اور فوجی اور جبریت میں اس مسئلہ کا حل کی علامت ہے۔ جو ہر قسم کی تعصب اور الجھنوں اور تباہیوں سے آزاد ہے۔ مختلف جگہوں سے نکالا جاسکے۔ ہارنر میں پختہ چاہتا ہے تو بارگاہی حکمت آئے آتا ہے۔ ایک مجلس میں شریک ہونا چاہتا ہے تو دعوت ملنے کی عدم موجودگی پریشان کرتی ہے۔ ایک کلب میں ایک لڑکی سے باتیں کرنا چاہتا ہے وہ اپنے پیاسے اجازت لینا چاہتی ہے۔ ایک لڑکی آج کل کی وہ طرحی کھی شائستہ لڑکی ہے جو اپنے حسن، اپنی شائستگی اور اپنی تعلیم کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا چاہتی ہے۔ تعلیم کے بے موثر ہونے کے لیے کوئی اور شائستگی کے بے سماج میں ایک اور نظام، آخر تعلیم اپنے گھر پہنچا ہے۔ اور لوگوں سے کہتا ہے کہ یہاں تو نہ آسان میرا ہے، نہ زمین، نہ ہوا اور پانی۔ آخر وہ ایک طوائف کے ہاں پہنچا ہے جس کے انا کا سے پتہ نہیں آتا۔ اوت پیچھے کے بلوں کی تلافی ہے (یہ طوائف زندگی سے گریز کی علامت ہے۔ مومن سے جہاں انسان پناہ لینا چاہتا ہے لیکن خود یہ طوائف اپنے پیار کی منتظر ہے) اس سارے کھیل میں علامت کا اختصار کرادیں کا شخص اور کرداروں کی علامت کی اہمیت کی طرف اشارے، منظر کی عمارت فی کلامت میں ملتی کہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ یہ چیز غرضائے کی صورت میں ملکتا تو اس سے یقیناً بہتر لکھا۔ آخری ڈرامہ بہت مشکل منظر کے اسی نام کے مشہور افسانہ پر مبنی ہے۔ اس ڈرامے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ طوائف کے اندر بھی ایک خود دار قدرت مخفی ہوتی ہے اور اس کے منہ پر پلٹور کی تختی نہیں کیوں نہ چڑھ جائیں لیکن نیچے درگوں میں خون حرکت کرتا ہے جو وقت آنے پر کھول بھی سکتا ہے۔ ڈرامے اور افسانے کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ جو فاضل اور جو فنکاری افسانے میں ہے وہ ڈرامے میں نہیں۔

منظر کے افسانوں پر تبصرہ ایک نہایت مستقل مضمون کا اقتضا کرتا ہے۔ مجھے اس مضمون میں زیادہ تر مجھے فرض ہے کہ مطالب اور ان کی اہمیت سے بحث کرنا چاہی۔ لیکن ظاہر ہے کہ منظر کا ذکر ہوا اس کے افسانوں کے متعلق کچھ نہ کہا جائے تو یہ عجیب فریب بات ہوگی۔ منظر کے افسانوں کے کہنا زندگی کے ہر شعبے سے متعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دلال ہیں، دروہی ہیں، استاد ہیں، پہلوان ہیں، کوچی کے لڑکے، دیکن ہیں، قریب قریب ہر معاشری طبقے کے افراد منظر کے افسانوں میں ہیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس معاشرت کا منظر ملے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جس کے افراد کو ہمیشہ منظر کے تمام میں سب ننگے ہیں۔ وہ متوسطہ الحال طبقہ ہے جو غریبوں اور رئیس کے درمیان گھڑی کے پندوں کی طرح متحرک رہتا ہے اس طبقے میں سے کچھ اور کچھ طبقے میں ملے جاتے ہیں اور وہ درختے کھاتے ہیں۔ کچھ اچھے اچھے ہیں اور اس قسم کے ناموں سے سجانے جاتے ہیں، مہجور، کسان، بلوچ، دروہی، منظر کے افسانوں میں ان خصوصیات ایسی ہیں جو اسے اپنے معاصروں سے بالکل علیحدہ کر دیتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کبھی کسی چیز کو افسانے کا موضوع نہیں بناتا جس کے بہت سے وہ بجز ان کے ہر اس کی حیرت انگیز قوت مشاہدہ اس کے نہیں ہیں واقعات کا مختلف اس کی چیز یعنی یہ چیزیں اسی سلسلے میں نظر آتی ہیں۔ اس کی درسی خصوصیت جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے وہ ہے کہ وہ کسی نفسیاتی لحاظ کا شکار نہیں۔

ذہنی طور پر غالباً انحصار کا سبب زیادہ توانا اور صحت مند لوگ ہیں۔ اس لیے ذہنی بیماری نفسیاتی الجھنوں کو دور کر دیتا ہے۔ یعنی ان چیزوں کو دور اپنی ذات کی نسبت سے پہچانتا ہے۔ اصطلاح میں یوں کہنا چاہیے کہ اس کی ذات ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی پہلوئوں کے لیے (SYSTEM OF REFERENCE) ہے یعنی نظامِ مشبقت (اس کم چیز کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ متحرک ہے۔ مگر ایک نظامِ مشبقت ایسا موجود ہو جس میں مسئلہ طور پر چیزیں سامنے آتی ہوں۔ دور سے کہنا ناگہان ہے کہ فلاں چیز سامنے ہے اور وہ متحرک ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی امراض کا جو خمیسا ثابت ہوتا ہے کہ ایک نظامِ مشبقتی ان کے لیے بھی موجود ہو۔ مثلاً اپنی ذات میں ایک عمل نظامِ مشبقتی تھا۔ اس لیے جہاں کہیں وہ نفسیاتی الجھنوں یا مرض کا ذکر کرتا ہے۔ نہایت اثر نکالتا ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ جو مرض اسے اپنی ذات میں نظر نہیں آتے۔ انھیں وہ نہایت مندرجہ کیفیات تصور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دل کے چرچہ پر آسانی سے پکڑ لیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کچھ وقت کوئی سماجی یا ثقافتی ممنوعات اس کے رستے میں کھڑی نہیں ہوتیں اس کے پاس (TABOOS) یعنی ممنوعات ذہنی یا عملی نہیں ہیں۔ پڑھنے والوں کی جھنجھلاہٹ اور صحیح جواب کا اصل راز اسی خصوصیت میں مخفی ہے۔ ان ممنوعات کو جب منظرِ اسٹیج سے ہٹا دیتے ہیں تو جو لوگ ان کے سامنے آتے یا ان کی دیواروں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ ان کو اپنی اس دنیا کے سنوں لڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جتنیں کا ہنسی جوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اور مدلیاں باہر کی طرف گر پڑتے ہیں۔ اس طرح بعض لوگوں کو نگے ہونے کا، بے آسرا ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ منظر کو گاہکیں سے گراہنی فلسفست غمگینی کی نعت مٹاتے ہیں۔ تخریب و تہذیب معاشرہ، ثقافت یا سماج، جو چاہے کہہ لیجئے، ان کے مفروضات، معتقدات، نظیات اور توہمات کو منظرِ ادب پر نوچ کھتا ہے۔ اس طرح زندگی کی اعتباریں برکھائی جاتی ہیں اور جو لوگ کچھ نظیات اور ممنوعات کو بھی اقدار سمجھ کر تاریک جہزوں میں دھپتے تھے، ان کو میدان میں کھڑے ہو کر منظر کی روشنی میں اپنی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ بڑا تعلیم دہ عمل ہے۔

یہ وہ خصوصیت ہے۔ جو منظرِ ادب میں کہیں میں غالباً اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ایک اور خصوصیت بھی اس کے افسانوں میں ہے جو کچھ سات تا نو سال کے عرصے میں بچپانی میں ہوتی تھی۔ افسانوں کے کردار اس طرح گفتگو کرتے ہیں، جسے اصطلاح میں (SPEAKING IN CHARACTER) کہتے ہیں۔ مثلاً ادب میں یہ خصوصیت بلاغت کا ایک جزو ہے اور اس کے معنی ہیں کہ کام کا مستفاد سال کے مطابق جو تا منظر کے افسانوں میں بچپان کے بکھرے واقعاتی سرگرم ہیں۔ مگر وہ ادب کے خطوط ساز نہیں ہیں۔ منظر کے افسانوں میں کوہِ جان وادھی گھوڑا ہانکتے ہیں۔ وہ کسی نہیں فراتے۔ ان کی بات چیت سے کشمکش پیشروں اور حریفوں کی دھم دھم کی، پیسے کی کڑواہٹ ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے تہی ستم خلعے ہوتے ہیں اور وہ بھی ہمیشہ شعر چڑھ کر کہا کرتے ہیں کہ۔

انیس دم کا بھروسہ نہیں فدا مشرور
چراغ لے کے کہاں ملنے ہوا کے پلے

ستید عابد علی عابد

منشور

منشور بھی عجیب و دلی تھا اور کتابی عجیب و نادر اور شروع شروع میں مجھے منشور کی شخصیت اور اس کے افسانوں میں سے کسی سے کسی سے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہوئی، شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ منشور کے بعض افسانوں میں اس طرح کی گندگی تھی جس کا اظہار کوئی مقصد نہ تھا، سوائے اس کے کہ منشور نے اس میں اپنی مزید اضافہ نہایت کا اظہار کیا تھا اور یہ غلطی محض جنسی قسم کی تھی اور مجھے اس اعتبار سے منشور اور میر تقی میر کا دوسرے سے بہت قریب آنے نظر آئے تھے، ابھی میں یہ سوچتا کہ میر تقی میر کے پاس جو تین گوتے تھے ان میں سے ایک گولہ خود منشور تھا، اتنا ہی بہم اور کتابی دلچسپ۔

تقسیم کے بعد مجھے آخر منشور سے ملنے اور اس کے افسانے اس کی زبانی فہمنے کا موقع ملا، اسی قسم کی ایک صحبت میں منشور نے ایک افسانہ پڑھا، افسانے میں ایک اچھا سپاہی کا کردار تھا جو بات بات پر لگائی جکتا اور اکثر کہیاں مٹائی مختلفا تھیں، لوگ منشور پر برس پڑے، اس نے بار بار سمجھانے کی کوشش کی، لگائی منشور نے نہیں کی، اس سپاہی نے کی، یہ جہاں آپ کو اٹھ گئے آپ اس کی تواریخ کو میں منشور نے تو صرف اسے اپنے افسانے میں پیش کر دیا ہے، اس افسانے میں اور کوئی اہم نہ ہوئی ہیں، آپ اس لگائی کے بچے پڑ گئے، ان باتوں کو دیکھنے اور سننے کے بے آوازہ نہیں، آپ لگائی چاہئے آپ لگائی لئے میں لیکن افسانے ضرور پڑھنے کی کوشش کریں میں کہتا ہوں منشور نے عجیب کہا تھا، بلاشبہ اس کے بعض افسانوں کے موضوعات ایسے طبیعتی مسائل ہیں جو ہمارے ادب اور معاشرہ میں اتنی غمو مانت ہیں، یہ بھی درست ہے کہ بعض افسانوں میں بعض لوگ اپنے کی غلطی سے اس کی تشریح، ایسی نہیں ہیں، استعارے اور کلمات ملتے ہیں جن کا مقصد محض آتش شوق کو بڑا کرنا اور جھڑکتے شعلوں سے اس آگ کو بھلانا ہوتا ہے، کہیں وہ جزئیات نگاہی میں ایسا اہل ترقی کرنے لگتا ہے، جیسے کوئی سرخ ہو، لیکن یہ عمل ترقی کسی ہسپتال کے آپریشن جتنی نہیں جو تو کوئی ہرج نہیں، منشور سے شارع عام پر لڑنے لگتا ہے، کہیں منشور ملازم بائبل اور کہیں علاج بالمشکلات کی تعلیم ہوتا ہے، وہ دہر کا علاج زہر کے کونا چاہتا ہے، لیکن شکل یہ ہے کہ زہر کے زہر کا علاج نہ ہر طبقہ کے میں کال ہے اور نہ ہر مرض پر آنا یا جاسکتا ہے اور منشور جیسے شرابی کے لیے ان محدود کاموں کا کھانا ممکن نہ تھا، لیکن ان سب باتوں کے علاوہ منشور کے بیان کچھ اور بھی ہے اور اس کچھ اور نے منشور کو بحیثیت افسانہ نہ سمجھنا ہیئت افسانہ نگار ایک مرتبہ بخشتا ہے۔

اپنے افسانوں کے بارے میں منشور نے ایک کھانا ہے تو نہ مانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے، اگر آپ ان افسانوں کو بخشتا نہیں کریں گے تو اس کا مطلب یہ

ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے، میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا ایک نقص ہے۔ اس بیان میں کچھ صداقت ضرور ہے کچھ مکر شلو کے علاوہ اوراد میں، شاعروں، افسانہ نگاروں کی تحریروں کا جائزہ لیجیے تو یہ نقص اور بھی کہیں کہیں مل جائے گا۔ میری کی شاعری کا بڑا حقدار، دانش کی بعض چیزیں اسلام ٹیلی وژن کی بعض ٹیلی ویژن کے بعض افسانے اس طرح کے ہیں جو بہت سے لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان میں ایک طرح کی فرسودگی اور ریاضانہ نوعیت پائی جاتی ہے لیکن اس صورتِ حال اور نفسیاتی کیفیات کے پیدا ہونے کی ذمہ داری اس ماحول پر ہے جہاں میں ان لوگوں کی نشوونما ہوئی۔ ان کی تحریریں ایک طرح کی ٹھوک اور تشنگی اور محرومی جھلکتی ہے۔ اور جب ان چیزوں کی نفسی کے فطری ذرائع مسدود ہوتے یا ان کی ماہرین میں روڑے آگتے ہیں تو یہ پھرا پٹنے لے نئی راہیں تلاش کر لیتی ہیں۔ اور یہ آج ہی نہیں ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور شاعری میں امر پرستی، معاملہ بندی یا بقول میر جادو پائی اس نوعیت کی ترہاں ہے نظیر عبدی شاعر جس کے یہاں فنی شعور کی معراج تک پہنچنے کے امکانات سبک زیادہ تھے، اس کچھ نہیں حاصل ہوتا ہے اور آج تک اس کی سزا پارہا ہے۔ تو ظاہر ہے آج کے زمانے میں جب شستہ کلائی، صحت اور فضا پرستی پسندی ہمارے ماحول میں آپ جیات کی طرح خطرات کے برابر ہر دوں ہیں بھی ہیں، ان لوگوں کو کیسے آسکتی نفس۔

ایک بات آپ ضرور کہہ سکتے ہو، وہ یہ کہ اس طرح کے کھٹنے کانے پیاریوں کی نظیر کرنے ہیں۔ خلافت کے ٹھیکروں پر سے جس دغا شک کے غلات اذکر بھینک دیتے ہیں لیکن ان پیاریوں کا علاج نہیں جانتے، اس خلافت کو پیدا ہونے سے روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے، یہ غالی ان میں ابتر ہے، یہ غمخوار اور غصیل نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے ان کے پاس ساز و سامان نہیں۔

لیکن میں غشو کے افسانوں کے اس پہلو پر زیادہ نہیں لکھ سکتا، کیونکہ اس کے لیے بعض بنیادی طویل بحثیں درکار ہیں، ہم کس چیز کو غش کہتے ہیں، کیا غش کا تصور کوئی بنیادی تصور ہے یا محض افسانے کے حالات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور جس کے ساتھ غش کا تصور گہ اور کم ہوتا رہتا ہے۔ ایک فطری فعل اور اس میں شریک بعض افسانہ کی فاعل اور ان کا ذکر گہ اور کم ہوتا ہے۔ کیا غش کا تصور گہ اور کم ہوتا ہے۔ کیا غش میں معاشرتی ارتقاء، مذہب اور اخلاق کی تاریخ اور نفسیات کی ترقی و تہذیب اور بدلتا رہتا ہے جس کا یہاں موقع نہیں، شاید اس سے بہتر یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ میں غشو کی غش نگاری کی صورت میں کڑا چاہتا ہوں۔ لیکن اس وقت پر یہ مقصد نہیں۔ میں غشو کے افسانوں کو صرف افسانوں کے فنی معیار سے دیکھنا چاہتا ہوں، ان میں ایسے افسانے بھی ہیں جو غش ہیں اور ایسے بھی جو غش نہیں ہیں۔ اس بحث میں میرے سامنے غشو کے تین نمونے ہیں، غشو کے افسانے، نمونہ اول اور نمونہ دوم کے نیچے:

غشو کے افسانے میں پہلا افسانہ نیا نیا نیا ہے۔ غشو کو جوان جو سیاست دان اور میڈر نہیں صرف ایک کو جوان ہے، انگریزوں سے نفرت کرتا ہے، اس لیے نفرت کرتا ہے کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں، طرح طرح کے

ظلم ڈھالتے ہیں اور ملگلوں کو جہاں گستاخے ہیں، شرابی گوروں سے اس کا کڑھکھٹا ہوتا ہے اور ایک روز ملگلوں کو جہاں کو خیر ملتی ہے کو نیا قانون بننے والا ہے جس سے ہندوستان کو آزادی مل جائے گی۔ استاد ملگو نے یسین اور کلرل مارکس کی کتابیں جن میں پرسی ہیں انہیں وہ خود اس دے بادشاہ واپان کے قانون اور دوسری کتابیں جو کہتے ہیں کہ ہندوستان اس نے ہندوستان میں ہر نوع کی تبدیلیوں کو دوس دے بادشاہ کے تختی سے وابستہ کر دیا، نئے قانون کے نفاذ کا کام آگیا اور استاد کے دل میں بھی انہوں نے کوٹ لی۔ اب وہ گوروں سے نہیں ڈرتے گا، استاد ملگو کی طاقت ایک شرابی گورے سے ہوتی تھی پہلے ایک مرتبہ اس سے جھگڑا کر چکا تھا، آج بھی جھگڑا ہوا، لیکن نیا قانون بن چکا تھا، گورے کی بید کی پاش کی ہوتی تھی استاد ملگو کی دان سے چھوٹی اور اس کے جواب میں استاد ملگو کا گھونسا گورے کے منہ پر جم گیا۔ وہ گورے کو سیٹ رہا تھا، وہ دن گزر گئے جب فیصل نماں ناخدا ڈالتے تھے، اب نیا قانون ہے نیا قانون۔

”نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو — قانون وہی پڑانا ہے۔“
اور اس کو حوالہ میں بند کر دیا گیا۔

اس افسانے میں منظر کا کوئی کردار پولیس نہیں اُبھرتا، یہ ہماری سیاسی جدوجہد کے دور کا آئینہ دار ہے جس میں ہماری آزادی اور انٹیلیجنٹس، تھائیس اور ناکیاں جھبکی ہیں اور نئی معیار سے بھی یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اچھے مختصر افسانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کا اتنا باقاعدہ نہ بکھرا ہو، بات سے بات نقل کو طرالت نہ پیدا ہو جائے، مرکزی خیال ایک رہے۔ کردار، واقعات اور مکالمات، اس ایک خیال کو جانک کر کے اور آخر میں شدت پیدا کر کے میں ملکہ مساوات ثابت ہوں، یہ بات بھی پران پوری طرح حاصل ہو گئی ہے کہ کردار صرف ایک ہی ہے، استاد ملگو، واقعات ملکہ مساوات مناظر اور پس منظر کا محور بھی ایک ہے یعنی نئے قانون کے نفاذ کا اشتکار، لیکن اس ایک محور پر مضامہ اور مطالعہ کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں مثلاً:

”آس نے سچ کے مرد و حسد کے میں کئی تنگ اور کھلے باز آؤں کا پتہ لگایا، گورے ہر چیز پر اپنی نظر آتی — آسمان کی طرح پڑانی، اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں گورے اس کھنی کے جو رنگ، رنگ کے پردوں سے بنی تھی اور اس کے کھنڈے کے سر پر تھی اور سب چیزیں پر اپنی نظر آتی تھیں، یہ نئی کھنی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو خود سری صدا بخن سے ساتھ سے جودہ آنہ میں خودی تھی۔“

مختصر افسانے میں جزئیات نگاری کا موقع نہیں ہوتا لیکن چاہے سب افسانہ نگار مختصر افسانوں میں ہی جزئیات نگاری کا حق ادا کر دیتا ہے، استاد ملگو کی طاقت گورے شرابی سے ہوتی ہے اور وہ تا نگہ غور اگر کھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھتا ہے،

”صاحب ہمارے کہاں جانا مانگتا ہے۔“

اس سوال میں بلا کا نظریہ انداز تھا، صاحب ہمارے کہتے وقت اس کا اوپر کا اونچوں بھرا ہوا منہ نیچے کی طرف ہکچ

گیا اور پاس ہی کے کمال کے اس طرف جو دم سی کھینچنا کے نختے سے تھوڑی کے بلائی تھے کھجلی آہی تھی، ایک لڑش کے ساتھ گری ہوئی گویا کسی نے نوکیلے چاکرے سے عظیم کی سانلی کھڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔
اس طرح کی شایں اور افسانوں میں بھی ملتی ہیں:-

تساویوں کی ریشیں سرسراہٹ، کلفت لگی شعلوں کی کھڑکھڑاہٹ اور چٹروں کی کھٹکھٹاہٹ ہو اس
تیرنے غلیں، تہاتے ہوئے کھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی ٹپیں، نختے نختے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی جند
آوازیں، اونچی اونچی ایڑی کے بوٹوں پر تھرتھرتی ہوئی ٹانگیں، چٹکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے بچے، پھرتی
ہوئی گرہیں اور پھران اظہر دیکھوں کی آپس میں سرگوشیاں یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گی کے
پتھریے فرش پر جن و شباب اپنے قلم سے اپنے معافی لکھ رہا ہے۔

اسی لمحے میں ایک اور افسانہ جنک ہے، اس میں بھی اس طرح کی جزئیات نگاری کی شایں موجود ہیں اور پھر یہ
ایک ہی مجموعہ پر منحصر نہیں، سارے مجموعوں میں بکھری پڑی ہیں۔

عام حالات میں اس تکنیک سے افسانہ نگار پڑا غائبہ آٹھا سکتا ہے لیکن منظر جہاں بعض اعضاء اور احوال و احوال
حرکات و سکناات کے بیان میں اسے استعمال کرتا ہے، وہاں قاری دیکھوں کرتا ہے کہ منظر دراصل صرف غزے سے لے کر
اسے لکھ رہا ہے، اس کا مقصد لذتیت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ دھواں، بلاؤں، کالی شلوار، مصری کی ڈلی، چھاپا خوشیا
اور مندر ڈی کر شا پڑھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ منظر کے افسانوں میں ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے، یہ نفسیاتی مطالعہ
ہے۔ ایسے اندوش یہ روایت نئی نہیں، مگر یہ غیر احمد کے یہاں کم اور کم تو جتنا تصور میں اس کی روشنائی نسوج اور کلیم
کے کرداروں کی تخلیق میں موجود ہیں اور پھر یہ سلسلہ غزاد سہا کی دھواں جہاں آواز سے ہوتا ہوا ہمارے زمانے تک پہنچا ہے۔ مختصر
افسانے میں یہاں بھی تفصیلات کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن افسانوں اور کہانیوں میں کرداروں کی ذہنی کیفیات اور ان کے
دوئل کا جائزہ لے لیا جاتا ہے۔ منظر کے کردار طرح طرح کے ہیں اور وہ ان سب کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ طیب نہیں
کہ نفسیاتی پیادوں کا ملاحی تجربہ کرے لیکن اس کی نظر ان پیادوں پر پڑ رہی ہے، اس طرح کے ایک مثال منظر کے بدنام افسانے
دھواں میں ملتی ہے، اس افسانے میں دریا میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان باپ کے تعلقات کا اثر دھواں اور
پر کس طرح ہوتا ہے۔ منظر نے یہاں بات افسانوں میں کی ہے جس کا وہ کم عادی ہے لیکن بات صاف ہو گئی ہے:-
”اُدھر اُدھر جتنے کہتے تھے سب کے سب بندھے، بارش اب رگ گئی تھی، مسودے ہاکی اور گند نکالا اور
صحن میں کھیتا شروع کیا، ایک باوجود اس نے تھوڑے سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے درمیں با تھوڑے سے
کے دھواں سے پر گئی، اندر سے مسودے کے باپ کی آواز آئی، کوئی جی میں ہوں مسودہ، اندر سے آواز آئی کیا کر رہے
ہو، جی کھیل رہا ہوں۔ کھیلو، پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا تھا، اری ان میرا سر دبا رہی ہے۔
زیادہ شہرہ پہنچانا۔“

ماں باپ کا سرد بار ہی ہے۔ وہ خود تھوڑی دیر پہلے انہی بہن کی کردار چکا تھا، اور وہ سر سے لے اس نے ایک اور عجیب منظر دیکھا، اس کی بہن کلثوم اور اس کی سہیلی بلالہ..... اس افسانے میں بلاشبہ نفسیات کا سادہ کامیاب ہے اور پڑھنے والے کو ایک جگہ تو کچھ عجیب سی محسوس ہوتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک خاص اصول کی وجہ سے ہمارے یہاں صحت مندانہ جنسی تعلیم کا امکان نہیں اور اسی لیے اس طرح کی پھیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں چنانچہ بھی اسی طرح کا ایک افسانہ ہے اور مصری کی ٹولی میں بھی تحت شعور میں یہی مسئلہ ہے۔

طوائفوں اور عیاشی عورتوں کے نفسیاتی مطالعے منٹو کو خاص طور پر بہت درخوب تھے۔ منٹو نے جس طرح کی زندگی خاص طور پر رچوتہ، دہلی اور بمبئی میں گزاری تھی اس نے منٹو کو ان طبقوں کے کرداروں کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا تھا۔ اس کی ایک مثال غوثیا میں ملتی ہے۔ غوثیا ایک شیشہ و دلال ہے، اسے علاقے کی چھوڑوں کا سارا حال معلوم ہے لیکن کاغذ جب اس کے سامنے بالکل ننگی چلی آتی ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے کیونکہ اس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک طور پر نہکا نہیں دیکھا تھا۔ یہاں سے کہنے کا تانا بانا شروع ہوتا ہے اور غوثیا کا کردار پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔

نفسیاتی مطالعوں کے سلسلے میں معروف بھی ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ کیثو لال ایک سیٹھ کے مکان میں کرایہ دار ہے۔ برسوں کرایہ دار کا رہتا ہے۔ اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ دو بیٹے کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا اور سیٹھ اسے نکالی دیتا ہے۔ اس نکالی کوئی کرکیشو لال پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا منٹو نے ٹری غریبی سے تجزیہ کیا ہے اور بلاشبہ یہ افسانہ منٹو کا اس طرح کے دوسرے افسانوں کے مقبول سے پاک اور مثالی افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں، شک اور کالی شلواری بھی اسی طرح کے افسانے ہیں۔

ایک اور مختصر منٹو کی تمام تحریروں میں جاری و ساری ہے۔ ایسا بھر پور طنز جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا، جس میں شہد بھی ہوتی ہے اور مخفی بھی۔ اس طنز میں ہی شو کبھی کبھی تنگ ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ کیا کہے جن زخموں کو وہ دکھانا چاہتا ہے وہ ہمارے معاشرے کے جسم پر صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور جس دس کرنا شو میں چکے ہیں، ہم ان کا علاج کرنے کے بجائے انھیں کپڑوں کی تلوں میں چھپانا چاہتے ہیں اور اس طرح خود غریبی کا شکار ہیں۔ ہم نے اخلاق اور شرافت کا ایک معیار بنا رکھا ہے۔ لیکن ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے دیوانہ ہو چکا ہے اور ہم صرف کپڑوں اور عورتوں کے ہمارے زندہ رہنا چاہتے ہیں، جنھوں نے منٹو کا افسانہ 'جنگ پڑھا ہے وہ اس زخم کو دیکھیں جو طوائف کھلاتی ہے۔' اب یہ موضوع نیا نہیں رہا۔ نذیر احمد کی ہریالی سے مرزا آسوا کی امرا و جان اور قاضی عبدالغفار کی سیلی تک ہم اپنے افسانوی ادب میں اس کے بہت سے روپ دیکھ چکے ہیں۔ نذیر احمد بے چارے مولوی تھے، یہی کہہ سکتا تھا کہ انھوں نے ایک طوائف کو ادب کے مقدس اہوان میں آنے کی اجازت دے دی۔ یہ اور بات سمجھ کر انھیں اپنے اس کردار سے آخر تک مولویانہ نگہ رہی ہے

منٹو کی حقیقت نگاری

غٹو اردو کا سب سے بڑا نہیں، تو بہت بڑا افسانہ نگار ضرور ہے۔ اُس نے بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں اور بہت برے بھی۔ اس کے یہاں جلدی اور پستی، روشنی اور تاریکی، سب سے بڑیک وقت دو چار ہونا چڑھتا ہے۔ اس کیفیت کو عمومی طور پر اس کی خامی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کمری اور جلدی کا یہ تقابل فکر و فن کی استواری سے محروم کر دیتا ہے۔ لیکن غٹو کے یہاں اس خامی میں ایک خوبی بھی نظر آتی ہے۔ اور وہ خوبی یہ ہے کہ منٹو نے زندگی کے بُرے اور بچے، صاف اور کٹھن، پر پہلو کو دیکھا ہے اور ان میں ہر ایک کی نرنگائی کچھ اس طرح کی ہے کہ اُس کے تمام امرا اور وزرا کھل جاتے ہیں اور سارے منشیب و فزار آنکھوں کے سامنے آ جلتے ہیں۔ منٹو کی خوبی یہ ہے کہ وہ باتیں اس کے یہاں کائنات کی طرح کشمکش میں، ان میں بھی زندگی کی حقیقت کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ اور اس کی اصلیت کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف حقائق، ملک اس کی نظریں بڑی بے باکی اور دراکی کے ساتھ پہنچتی ہیں اور ان کو پوری طرح نمایاں کر دیتی ہیں۔ غٹو اس اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس کے رنگا رنگ پہلوؤں کو شدت سے محسوس کیا ہے اور اسی لیے افسانہ نگاری اور اس کے مختلف حقائق اپنے تمام تنوعات کے ساتھ اس کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ اسی کو اس کی حقیقت نگاری کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

حقیقت نگاری کا ادبی تنقید میں آج جو صحیح مفہوم ہے وہ پوری طرح تو منٹو کے افسانوں میں نہیں مہرے۔ کیونکہ زندگی کے بارے میں ایک واضح نقطہ نظر جس کو موجودہ دور میں حقیقت نگاری کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، وہ غٹو کے افسانوں میں نہیں ہے۔ منٹو نے زندگی کو دیکھا ضرور ہے، اس کو گھینے کی کوشش ضرور کی ہے، لیکن اس سلسلے میں ان معیاروں اور قدروں کو اس نے اپنے پیش نظر نہیں رکھا ہے جن کے ہاتھوں نقطہ نظر اور منظر پر حیات کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسی لیے منٹو کے افسانوں میں کوئی مخصوص فکر و فلسفہ نہیں ملتا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ زندگی کو کس طرف سے جانا چاہتا ہے۔ اس کو کس سانچے میں ڈھلوانے اور کس شیشے میں آئینہ دکھانا چاہتا ہے۔ اس کو منزل کا علم نہیں ہے، وہ تو صرف راستے کا ایک مسافر ہے اور سفر کی کوئی منزل سمجھتا ہے۔ منزل سے بے نیازی اور صرف راستے پر گامزن رہنے کی خواہش نے منٹو کو اس کے تمام منشیب و فزار سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس کے سارے امرا اور وزرا اس پر مد و مل سمجھ گئے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں زندگی کے ان گنت پہلو اس کے سامنے آ گئے ہیں۔ اس لیے اس سب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور انہیں سے اپنے فن کی مختلف سمجائی ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل اور جزئیات موجودہ افسانہ نگاروں میں یہی غٹو کے یہاں ملتی ہیں، کسی اور کے یہاں اس کی حشر و خیر بھی نظر نہیں آتی۔ اس لیے نقطہ نظر اور منظر پر حیات نہ جرنے کے باوجود اور معیاروں اور قدروں کے نہ ہونے کے باوجود اس نے زندگی کے حقائق کو اس

نے زندگی کے حقائق کو اس غریبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے برہاں خود بخود زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی زندگیوں جو کچھ بھی ہے، جو کچھ بھی سرد ہے، جو کچھ بھی تھا، جو کچھ بھی ہو رہا ہے، منشور اس تفصیل و جزئیات کو پیش کرنے کا ن کار ہے۔ یہی اس کی حقیقت ہے۔ یہی اس کی حقیقت نگاری ہے۔ یہ جاننے ہوئے بھی کہ حقیقت نگاری کا یہ تصور جدید نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے، ہی چاہتا ہے کہ اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جائے۔ کیونکہ اس میں انسانی زندگی کے ماضی اور حال کے حقائق کی تفصیل و جزئیات موجود ہیں مستقبل کا احساس بھی اس میں ہوتا تو اس کی تشکیل بر جاتی لیکن منشور نے ماضی اور حال کی متوالی میں جو کمال دکھایا ہے اور اس سلسلے میں جس طرح مختلف رنگوں کی آمیزش سے اپنی پیش کی ہوئی تصویروں میں زندگی کی گیلیاں بھری ہیں، وہ مستقبل کے خیال کو انہوں سے ادھجیل کر دیتا ہے۔ لیکن ماضی اور حال کے مختلف پہلوؤں سے زندگی کے بے شمار حقائق سامنے آتے ہیں۔ منشور نے ان حقائق کو ایک نوزگار و فرکی طرح پیش نہیں کیا، بلکہ ایک صورت کی طرح ان کی تصویریں بنائی ہیں اور رقصے تیار کیے ہیں۔ اسی لیے حقیقت نگاری کے مجدد و معوم سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہونے کے باوجود منشور کی یہ ترجیح حقیقت نگاری معلوم ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ منشور نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے، اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کرنا ایک بہت بڑا دعوئی ہے۔ بعض کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ خصوصاً وہ اس سے فدا بھی متعلق نہیں ہو سکتے جو بعض اصولی و نظریاتی کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک تو زیادہ سے زیادہ رنگ و کیفیت نگار یا فطرت نگار (NATURALIST) کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے پیشروانہ انداز میں اس نے زندگی کو جس طرح دیکھا ہے، اس پر ہر سوا سی طرح پیش کر رہا ہے۔ اپنی طوط سے کوئی خاص بات نہیں کہی ہے۔ لیکن خداوند سے دیکھا جائے تو منظر کے فسانوں کے بارے میں یہ خیال پوری طرح صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا خاص میدان واقعیت نگاری رہا ہے۔ زندگی جس روپ میں بھی اس کے سامنے آئی ہے، اس نے جو بہر اس کو اسی طرح پیش کر رہا ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کی پیش کرتے ہوئے وہ کھل کر بہت کچھ نہ کہنے کے باوجود کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ انسان اور انسانیت کی آواز جگہ جگہ اس کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اس زندگی کے سماجی پہلو کا گہرا شعور نہیں رکھتا۔ اس لیے اس کے یہاں انسان اور انسانیت کی آواز بڑی حد تک مدولے باز گشت (MERI CHOES) میں جاتی ہے۔ لیکن اس کا احساس آفاقی شعور اس کی نظر اتنی گہری اور اس کا تحلیل اتنا بلند ہے کہ وہ اس محدود دائرے میں رہتے ہوئے بھی زندگی کے سمندر سے حقائق کے موقی نکال ہی لاتا ہے۔ منظر کے یہاں اس سلسلے میں بڑی صداقت نظر آتی ہے۔ بڑی ہی جذب و شوق کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ ایسا کہتے ہوئے ان حقائق کو بھی سامنے لانا ہے جو عام طور پر انہوں سے اچھل جاتے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی میں بھی کیسی وہ زندگی کے سماجی اور فطری پہلوؤں کو حقائق کے روپ میں دیکھتا ہے، کیوں انسانی زندگی سے مام و واقفیت اس کے یہاں حقائق کو دونا کرتی ہے۔ غرض اس کے یہاں مختلف روپ ہیں۔ اس نے ان حقائق کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔

مختلف پہلوؤں سے ان پر نظر ڈالتے ہے۔ — یہی سب کی تہذیب انسانی زندگی سے دلچسپی کا ایک خیال ضرور کارفرما نظر آتا ہے۔ یہی انسانی زندگی منظر کے فنی میں حقیقت و واقعت کارنگ بھرتی ہے اور اسی کے سارے اس کا فن حقیقت نگاری سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ منظر کے انسانوں کا بنیادی مورعام انسانی زندگی ہے۔ اس کے تمام موضوعات اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے تمام خیالات کی بنیاد اسی انسانیت، انسانی زندگی پر استوار ہے۔ منظر اس دائرے سے باہر نکلا کر کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔ ہر حال میں وہ اسی کو اپنے سامنے رکھتا ہے۔ انسانیت اس کے نزدیک ترقی سے عبارت ہے۔ اس لیے وہ ہر انسان کو ترقی پسند دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ادب یا تو ادب ہے۔ ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے۔ لگو حاسب مکان ہے ورنہ ہے۔ یا کوئی اور چیز ہے۔ کہا جاتا ہے سہولت میں منظر ترقی پسند انسان ہے۔ یہ کیا چودہ کی ہے۔ سہولت میں منظر انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ ترقی پسند کو کر کو گیری صفت۔ یہاں نہیں کہتے بلکہ اپنی برائی کا ثبوت دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں ہیں یعنی وہ خود ترقی نہیں چاہتے۔ میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہش مند ہوں۔ اور ترقی سے اس کی مراد انسانی اور انسانیت کی تکمیل ہے۔ — یہ جذبات اس کے یہاں براہ کار قرار جاتا ہے۔ — اہمیت اس جذبے کے اس کے یہاں مختلف روپ ہیں۔ — کہیں انسانیت کا سدھار ہے۔ کہیں انسانی جذبات کی تہذیب ہے، کہیں انسانی روابطہ کی اہمیت کا احساس ہے، کہیں انسانی دشمنوں کی ضرورت کا خیال ہے۔ — کہیں انسانی زندگی کی کمزوریاں ہیں، کہیں اس کی خامیاں ہیں، کہیں اس کی پیدا ہوئی ہے، کہیں بے عزتی ہے۔ — کہیں اس کی بے بسی ہے، بھرتی ہے۔ — غرض انسانی زندگی کے ان گنت روپ منظر نے اپنے انسانوں میں پیش کیے ہیں۔ —

انسانی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو پیش کرنے میں منظر کے یہاں ہر زندگی ممتی ہے، وہ بدلتے ہوئے حالات کے شدید احساس کا نتیجہ ہے۔ — منظر تبدیلی کے عمل کا ناگاہک ہے۔ وہ کلیئر کے قانون پر ایمان رکھتا ہے۔ — اس کے خیال میں حالات کی یہ تبدیلی ادب اور فن کو تیز رفت سے ہلکا کر دیتی ہے۔ — ایک دور کا ادب دوسرے دور کے ادب سے اسی بے خلقت نظر آتا ہے۔ — اس کے خیال میں حالات کا اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے خارج ابالی تھی۔ لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی داخلی عیاشیاں نظر آسکتی ہیں، وہ خود کی بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں جو اس زمانے کے ادیبوں پر بخاری تھی اس زمانے کا شاعر اپنے اسیل شرع کی برنامہ پر زور دار نظم لکھتا تھا اور بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج کا شاعر اپنی بے نامرنگی کے کڑے لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اُس دور کا ادب مطلق انسان تھا۔ آج کا ادب ایک غیر مطلق انسان ہے۔ اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی غیر مطلق ہے۔ اُس کی بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اُسے ترقی پسندی کہتا ہے، کوئی عشق نگاری اور کوئی منظر پرستی۔ — یہ سب ہی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر لگات سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر عوا آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر لگات سوار رہی ہے اور یہی وہ ہے ہر مرد کے اعصاب پر کیا جاتی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے، جب گھوڑے گھوڑوں کو دیکھ کر گھٹتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ کر غزال یا انسان کیوں نہ لکھیں۔ — عورتیں گھوڑوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور فکر خیز ہیں۔ — اس لیے اس نے ان عورتوں کے بارے

میں بھی افسانے لکھتے ہیں، اور محنت کی زندگی کے ہر پہلو کو پیش کر دیتا ہے۔ اس مسئلے میں اس کی حقیقت نگاری کا اثر یہ ہے کہ جیسے جیسے حالات کے زیر اثر وہ محنت سے متعلق شخص جذباتی اور روانی پہلوؤں ہی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس سے بڑا ہو کر اس کی زندگی کے بڑے ہی متغی پہلوؤں کی طرف بھی توجہ کرتا ہے۔ چنانچہ محنت اس کے لیے یہاں لطافت کے روپ میں بھی آتی ہے۔ لیکن یہ لطافت قیامت کا فریاد اور ویسٹن میں رہتی، ایک بے یار و مددگار صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ نقوش اس کی زندگی کے تلخ اوقات ایک پہلوؤں کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان پہلوؤں پر ان کی نظر زیادہ پڑتی ہے۔ اور نسبتاً زیادہ گہرائی کے ساتھ پڑتی ہے۔ غور و فکر سے سادی باتوں پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کی نظری قوت تکسہ بنتی ہے۔ اور وہ بڑی بڑی سطحی باتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی بہت پسند طبیعت چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اہم پہلو تلاش کر لیتی ہے۔ اس نے خود اس صورت حال کو واضح کیا ہے۔ لکھتا ہے: جب میں ٹری میں بیٹھا بیٹھا اپنا خیال پھیلاتا تھا تو میری آنکھیں ہلکتی تھیں، صوف اس غرض سے کہ لوگ اسے دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سفر ہی بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ میرے ٹروس میں اگر کوئی صحت پروردہ خاوند سے مراد لگتی ہے اور پھر اس کے بوجھتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اس کے لیے ذرا بابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی، لیکن جب میرے ٹروس میں کوئی صحت اپنے خاوند سے لڑکا اور خود کشی کی دھمکی دے کر سینہ پھیل جاتی ہے اور میں خاوند کو دھکے لگاتے تک سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے۔ کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اسے زکام کے برابر ہی سمجھتا ہوں۔ مثلاً۔ مگر وہ لاکھیری توجہ کو خیر سمجھتا ہے کہ بظاہر اسے کہ اس پر سینکڑوں اولیاں جاں دیتی ہیں، لیکن وہ حقیقت وہ محبت کا اتنا ہی جھوٹا ہے، جتنا لڑکال کا غارت زدہ باشندہ۔ اس بظاہر کامیاب عاشق کی دلہنیں باتوں میں جو ٹریڈی سسکیاں بھرتی ہوتی، اس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سنوں گا اور دوسروں کو سناتاں گا۔ پہلی پیمنے والی محنت جو میرے کام کرتی ہے، امداد کو اطمینان سے سہ جاتی ہے، میرے افسانوں کی سرروئی نہیں ہو سکتی، میری سرروئی چھلکے کی ایک ٹھکیاٹی دھڑی ہو سکتی ہے، حرارت کو جاگتی ہے اور وہ کو سوتے ہیں کبھی کبھی یہ قزاق ناخواب دیکھ کر کڑھ جھپٹتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دل و دماغ پر دستک دینے آیا ہے۔ اس کے بھاری بھاری چہرے جن پر برسوں کی آجٹی ہوئی غنیمتیں چھڑ ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں، اس کی غلاطی، اس کی بے ادبی، اس کا پڑ پڑنا۔ اس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں۔ اور گھر میں عورتوں کی افسانہ نگاریوں کی شستہ کلاسیوں میں ان کی صحت اور ان کا افسانہ پسندی کو نظر انداز کرتا ہوں۔ گویا ہلسان کیا ہوتا ہے، حالات اُسے کیا بنا دیتے ہیں، زندگی اُس سے کیا کیا کچھ کھاتی ہے، اُسے زندگی کو میر کرنے کے لیے کہ کن راہوں سے گزرتا پڑتا ہے، غشو کے یہاں ان سب کی طرف توجہ زیادہ ملتی ہے اور اس غیر معمولی توجہ کا سبب یہ ہے کہ وہ زندگی کے ذمہ داری پر کڑھتا ہے۔ اس کی ناسازگار حالت پر افسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے زندگی کے ان پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے اس کے یہاں شریعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس شریعت میں صحت کو سزا دینا اور ان کو کسی نئے سانچے میں ڈھالنے کا ایک دبا ہوا احساس بھی کا فرما رہا ہے۔ اور یہی کیفیت اس کے فن کی حقیقت نگاری سے قریب کرتی ہے۔

غشور زندگی کی تحنیوں اور اس کی خون آشامیوں کا فن کار ہے۔ اس کی لذتوں اور سرور کا احساس اس کے یہاں نہ

ہونے کے برابر ہے۔ زندگی کی اس سازگار حالت کے شدید احساس نے منٹو کو ان لذتوں اور سترقوں کے احساس سے قریبی حد تک محروم کر دیا ہے۔ وہ سترقوں کو دیکھتے ضرور ہے۔ لذتیں اُسے ضرور آتی ہیں لیکن زندگی کی بے عنوانیوں کا شدید احساس ان لذتوں اور سترقوں سے اُسے غفلت نہیں سجالے دیتا۔ اسی لیے اُس کے افسانے بعض اوقات ناقابلِ برداشت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جن حالات کی ترجمانی اور جس ماحول کی عکاسی وہ کرتا ہے، وہ خود ناقابلِ برداشت ہیں۔ اس نے خود لکھا ہے ”میں نے کبھی دوسرے ہم گزرتے ہیں اگر آپ اُس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھ میں جو بُرائیاں ہیں وہ اس حد تک بُرائیاں ہیں۔ میری تحریریں کوئی نقص نہیں جس شخص کو یہ نام سے منسوب کیا جاتا ہے، اور اصل موجودہ نظم کا نقص ہے۔ میں ہنگام پر بند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں رجحان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تنذیب و تقدیر کی اور سوسائٹی کی چٹائی کا آئینہ نگاہ ہے ہی نگلی۔ میں اُسے کچلے پٹالے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ میرا کام نہیں دوزخوں کا ہے۔“ منٹو نے سوسائٹی اور تنذیب و تقدیر کو نگاہ دیکھا ہے۔ اور اسی لیے اُسے ننگا دکھایا بھی ہے۔ اس لیے لوگ اُسے دیکھ کر شہنشاہی جانتے ہیں۔ ان میں گھبراست بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کا دورِ واپسی بگڑ باقی رہتا ہے کہ سوسائٹی نگلی ہے، تنذیب و تقدیر رہتے رہتے۔ اس کو کچلے پٹالے کا کام بھی منٹو کو پہنچے فرقے لینا چاہیے تھا، اس کام کو دوزخوں کے سپرد کر دینا کوئی بڑھی بات نہیں ہے۔ بہر حال منٹو اس برہنگی کا فخر کا رہا ہے۔ اس لیے زندگی کے جذبات پر اس کی نظریں بڑی گہری پڑتی ہیں۔ وہ اس سلسلے کی تمام حقیقتوں کو معلوم کر دیتا ہے۔ اور اسی کا یہ اثر ہے کہ منٹو کے یہاں روایت نام کو بھی نہیں ہے۔ اس نے زندگی کی سنگین اور حلقہ حقیقتوں کی نقاب کشائی کو اپنا مزاج بنالیا ہے۔ حلیہ و چہرہ افسانہ نگاروں میں وہ واحد فنکار ہے جس کے مزاج میں روایت کا اثر نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منٹو تکنیکی پرست نہیں ہے وہ ہر کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے، اُسی کو اپنے فنی کا موضوع بناتا ہے۔ خارجی حالات کو دیکھ کر جو باتیں اس کے ذہن میں آتی ہیں انہیں اس کی تفصیل و جزئیات کو چیل کر لیتا ہے۔ منٹو نے اپنی طرے سے خیالی و تخیلی تمام باتیں کہیں۔ اپنی طرے سے اس نے بہت کم باتیں کہیں ہیں۔ جو کچھ اُس کی آنکھوں نے دیکھا ہے، وہ اُس کے لبوں پر آگیا ہے اور اس کی تفصیل اس کے قلم سے افسانوں کی شکل میں نپسک پڑی ہے۔ اسی لیے وہ اپنی پہلا اس کے یہاں خدا بھی نمایاں نہیں ہوتا۔ وہ شروع سے آخر تک زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں کا ترجمان اور عکاس ہی رہتا ہے۔

یہ صورت حال منٹو کی جڑانی پر ولادت کرتی ہے۔ کیونکہ جس وقت اس نے لکھنا شروع کیا ہے، اس کے آس پاس ان گور و پیش روایت کی روایت خافتی مستحکم صورت میں موجود تھی۔ ہر چند کہ اس وقت تک جذباتی روایت کی اس تحریک کا خاتمہ ہو چکا تھا جس نے ایک زمانے تک ادراشیت کے گرتے گرتے تھے۔ لیکن اس کے بعد واقعیت کا جو برا رجحان پیدا ہوا تھا، اس میں بھی روایت کا رنگ سما گرا تھا، انقلاب کے قصرات تک اس زمانے میں جذباتی اور انسانی تھے۔ اس میں گھنے دلوں کے وہابی مزاج اور جذباتی انقلابی طبع کو بڑی دخل تھا۔ اس کے نتیجے میں اس کی واقعیت اور حقیقت بھی روایت سے بالکل سلوم جھرتی تھی۔ افسانے میں اس روایت کے اثرات کچھ زیادہ ہی نمایاں تھے۔ پریم چند نے اس وہابی روایت کے بُت کو توڑ دیا لیکن ان کی روایت شکنی جنگلوں کا غارتگر کی تھی۔

اس زمانے میں بھی روایت کی یہ روایت روپ بدل بدل کر اپنے آپ کو مختلف افسانہ نگاروں کے یہاں دوڑا کر رہی تھی۔ کڑی چند اور عصمت اس زمانے کے چرچے کی کا رہتے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کی عادت عدم اثر یا ضرور ہے لیکن چونکہ روایت ان کے ضمیر میں داخل تھی، اس لیے ان کا بھی اس سے پتا دہاں ہی نہیں سکتا تھا۔ غرض روایت کے اثرات اس وقت تک موجود تھے۔ مثلاً اس روایت کے ثبوت کو یہی طرح توڑا، اس کے مخرج میں روایت نہیں تھی۔ اس لیے اس کے اثرات اس کے افسانوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ مثلاً اکمال یہ ہے کہ انسانی زندگی کے بڑے ہی نازک جذباتی معاملات کو پیش کرتے ہوئے بھی وہ جذباتی نہیں ہوتا اس کے یہاں جذبات کی اہمیت کا احساس تو ہے لیکن جذباتیت نہیں ہے۔ اسے محض عقل کے دھارے پر بہا نہیں آتا۔ اسی لیے اس کے یہاں روایت کا اثر نہیں ملتا۔ وہ اپنی ذات کو خیال کے بغیر زندگی میں اس حقیقت کو دیکھتا ہے جو ایک خارجی وجود رکھتی ہے۔ اسی لیے مثنوی کے یہاں حقیقت کا ادراک ہے لیکن اس میں عسوسات کو دخل نہیں ہے۔ بزلف اس کے گہرا شعور ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ حقیقت مثنوی کے یہاں ایک خارجی وجود رکھتی ہے اور وہ حقیقتوں کو اسی طرح دیکھتا ہے۔ اسی لیے اس کے فنی میں حقیقت نگاری کے خط و خیال اس درجہ نمایاں ہیں۔

مثنوی حقیقت نگاری کی یہی تیز زندگی کے شدید احساس اور صحیح شعور کا نتیجہ ہے۔ ان کے دماغ میں اس دور کے بعض حقیقت پسند افسانہ نگاروں کے گہرے اثرات بھی اس میں شامل ہیں۔ مثنوی زندگی اور اس کے مختلف شعبوں سے قریب رہا ہے۔ اس نے ان میں سے ہر ایک میں گہری دلچسپی لی ہے۔ اس کی ایک بات کو اس نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ ایک ایک پہلو کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس طرح زندگی کی تمام حقیقتیں اس پر بے نقاب ہو گئی ہیں۔ زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے خفائی سے وابستگی نے مثنوی کو بعض اہم حقیقت پسند افسانہ نگاروں کا گرد و بنایا ہے۔ انہی اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں مثنوی نے روس اور فرانس کے افسانہ نگاروں سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے افسانہ نگاروں کے یہاں اسے زندگی اور اس کی حقیقتیں اپنے اصل روپ میں بے نقاب مل چکی ہیں۔ چھوٹے، حریفیت، انسانی، ہر آسماں، بالذات اور نظریہ و فروع کے اثرات اس پر بہت گہرے ہیں۔ مثنوی نے ان افسانہ نگاروں کو بہت غور سے پڑھا ہے۔ ایک زمانہ اس پر ایسا گہرا ہے کہ جب اس نے ان افسانہ نگاروں کے بہت اچھے تجربے بھی کیے ہیں۔ اسی لیے ان کی حقیقت نگاری نے مثنوی کو براہ راست متاثر کیا ہے۔ اور جب آگے چل کر اس نے خود افسانے لکھے ہیں تو ان افسانہ نگاروں کے رنگوں کی جھلک خود اس کے فنی میں پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مثنوی نے ان افسانہ نگاروں کی تقلید کی ہے۔ اس کے یہاں اس سب سے زیادہ تعلیم نہیں بلکہ اجتہاد ہے۔ اس نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنا ایک مخصوص انداز پیدا کیا ہے۔ اسی لیے اس کی حقیقت نگاری ترجمیت، ترجمت، موہیاں اور بالذات سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ اس سب کے یہاں حقیقت کی ترجمانی میں ایک دیباچہ ملتا ہے۔ مثنوی کے یہاں اس کے برعکس ایک تیزی، تندہی اور نکلیا پی ہے جس کے اثرات اس کے فنی میں ہر جگہ اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں۔ مثنوی حقیقت نگاری اسی تیزی، تندہی اور نکلیے پی سے ترجمانی جلاتی ہے۔

جدید افسانہ نگاروں میں سے ہر ایک نے اپنے فنی کے لیے ایک مخصوص میدان تلاش کیا ہے، ایک مخصوص راہ نکال چکے

منظر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے افسانوں کا بھی ایک مخصوص میدان ہے۔ اس نے بھی اپنے فن کے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ منظر کا یہ میدان دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح محدود نہیں ہے۔ موضوعات کے تنوع سے اس نے اس میدان میں وسعت پیدا کی ہے۔ منظر زندگی کا فن کار ہے اور زندگی تنوع سے عبارت ہے۔ اس لیے اس کے افسانوں کے موضوعات میں زندگی ہی کی طرح تنوع نظر آتا ہے۔ منظر نے زندگی کے سماجی اور عوامی معاملات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ عام انسانی مسائل کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ انسانی حقائق پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ طرہ اس کے یہاں زندگی کے تمام پہلوؤں کی ساری رنگارنگی کے ساتھ بے تعصب نظر آتی ہے۔ منظر نے ان سب کی تفصیل و جزئیات کو گہرے مشاہدے کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان سب کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ اس کا زور یہ نظر انسانی رہا ہے۔ منظر کے یہاں اس انسانی زاویہ نظر کے مختلف روپ ہیں۔ اور اس کے ہر سائے میں اس کا کوئی نہ کوئی روپ ضرور دکھائی دیتا ہے۔ منظر نے اپنے افسانوں کے مختلف اور متنوع موضوعات کی بنیادیں اسی انسانی زاویہ نظر پر استوار کی ہیں۔ یہ انسانی زاویہ نظر منظر کے یہاں زندگی کے عام حقائق کی ترجمانی و مدعا سی میں محدود معاون ہوتا ہے اور اس طرح اس کی حقیقت نگاہی اس کو اپنے وجود کے لیے ایک سہارا بنالیتی ہے۔

یہ بات کسی قدر عجیب ضرور ہے کہ منظر کے فن نے سیاسی اقتصاد اور معاشرتی فرقہ واری کی آغوش میں آنکر کھڑے کے باوجود، ان معاملات کی طرف اس کی نگاہ زیادہ توجہ نہیں کی۔ وہ سیاسی اور سماجی اقدار کی ناچھوری کا احساس رکھتے ہوئے بھی ان معاملات سے متعلق کوئی بڑی گہری باتیں نہیں کہہ سکا ہے۔ صرف جگہ جگہ چند تاثرات کا اظہار ہے۔ ان تاثرات میں کسی قسم کی کوئی گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ اولیٰ کی ایک تصویر ضرور سامنے آجاتی ہے۔ حالات کا ایک مختصر منظر ان گھوڑوں میں پھیر جاتا ہے۔ جستہ جستہ تو یہ کیفیت خطر کے بہت سے افسانہ نگاروں میں مل جاتی ہے، لیکن عمومی طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں اس کے افسانے کیا قانون اور لغتہ ایک نمایاں حیثیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ ان میں گہرا سیاسی اور سماجی شعور تو نہیں ہے۔ لیکن ان کو پڑھنے کے بعد یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اپنے زمانے کے بعض حالات نے منظر کو متاثر ضرور کیا ہے۔ انہیں تاثرات کا اظہار ان افسانوں میں ملتا ہے۔ اور یہ تاثرات محض بعض حالات کی عکاسی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔

”کیا قانونیوں میں دیکھیے تو ایک کچھران استاد منگلو کے بعض خیالات اور چند حرکات و سکنات سے متعلق ایک کہانی ہے، لیکن ان سب کو پیش کرتے ہوئے منظر نے اس زمانے کی سیاسی حالت کی ایک تصویر بھی بنائی ہے۔ اور سیاسی حالت نے جس کشش کو پیدا کیا ہے اس کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ لیکن کوئی رسمی بات نہیں کہی ہے جس سے اس کشش کا کوئی مل بھی نکل سکے۔ خوشی پر اور اس حد تک نہیں ہے۔ اس کی نظر تو صرف کشش میں کھوکھورہ جاتی ہے۔ لیکن ویسے اس کیفیت کی ترجمانی اس نے بڑی ہی چابکدستی سے کی ہے۔ دو مصلوہ دیکھا تو یہ چاہتا ہے کہ استاد منگلو جس کو سب مذہبیت عقلمندانی کہتے ہیں، ایک جڑے آدمی، تہذیبی کو سمجھتا نہیں۔ اس کا قریب کھانا ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اُس سے

یہ افسانہ ہی ہوا کہانی پڑتی ہے۔ استاد منگلو کا یہ خیال تھا کہ پہلی اپریل کو جیٹا قانون نافذ ہونے والا ہے اور زندگی کے ہزاروں بدل دے گا۔ اس لیے وہ خوش تھا کہ کیا قانون آئے اگر انہوں کی غلامی سے نجات دلا دے گا۔ کیونکہ استاد منگلو کو اگرگزروں سے

بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب وہ یہ بتلا کر آتا تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم اٹھاتے ہیں۔ مگر اس کے ختم کر کے سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاپہ ڈالنے کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل گتہ ہے۔ اسی لیے وہ اکثر گتہ قسم ہے جگوں کی ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب بھی ان خاص چہرہ دیکھتا ہوں انگوں میں انگوں کوٹنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون و قانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔“ نئے قانون کے ساتھ استاد منٹو کے دل میں صدمہ غلامی سے چھٹکارے سے ہی کا خیال نہیں آیا، یہ امر بھی اٹھی کہ ماسٹر میں اور ان کے سونہر میں اس کا اثر پڑے گا۔ اور اس کے بعد وہ فریجوں کا خون نہیں چوس سکیں گے غریبوں کی گلیوں میں گھسنے ہوئے کھنسل۔ نیا قانون ان کے لیے کھولنا جڑ پانی ہر گا۔ اور پھر یہ بات بھی اس کے ذہن میں مانی کہ اس کے بعد اس کا بادشاہ بھی کچھ نہ کچھ منٹو کے رہے گا۔ اس کے علاوہ جب بھی وہ کسی سے ٹشنا کر انلاں شہر میں منٹو سے ملتا ہے گئے ہیں یا غلام چکاڑتے آدیوں اور بھارت کے انام میں مقتدر پھلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیال سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا۔ نئے قانون کی اہمیت اس کے دل میں اور بھی بڑھ گئی جب اس نے دو گریوٹ طلبہوں کی زبانی یہ ٹشنا کر جو بیکار گریوٹ اسے مارے چہرہ ہے ہیں اور اس میں کچھ توکی ہوئی۔ لیکن یہی اصل کوئی یہ کہ نیا قانون تو ناخبر ہو گیا لیکن زندگی تبدیل ملکی نظام تبدیل نہ ہو سکا اور استاد منٹو کو اس حقیقت کا احساس اس وقت ہوا جب چھاپہ ڈالنے میں ایک گورے کو پھٹنے کے سلسلے میں اسے جیل خانے کی ہر کھائی پڑی۔ وہ گھبتا تھا کہ نئے قانون کے تحت حالات بدل چکے ہیں اس لیے اپنے دل کی بھڑاس نکالی جا سکتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ پولیس آئی تو وہ نیا قانون، نیا قانون چلا دیا لیکن انھوں نے ایک دشمنی اور اس کو حالات میں بند کر دیا۔ اس مختصر سی کہانی میں کئی حقیقتوں کا انھما ہے۔ ہندوستانی قوام کی انگریز سے نفرت، ہندی کی خواہش، آزاد خیالی، مبراہ دہوں کی دست و درازی، اشتراکی نظام کی استواری، تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری، سب (غیر اپنی) مگر حقیقتیں ہیں۔ منٹو نے ان کی ترجمانی غریب سے کی ہے۔ ہر چیز کو ان حقیقتوں کے پیش کرنے میں کوئی بہت واضح سیاسی نقطہ نظر نہیں ہے لیکن جو حالات ہیں ان کی خلفی ہی نے اس کو حقیقت نگاری کی سرحدوں میں داخل کر دیا ہے۔

غلامی سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ معاشی اعتبار کی ناہمواری کے باعث پیدا ہونے والی الجھنوں اور پریشانیوں کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ بہت سے انساں لوگ اس کی طوط اشارے ہیں۔ لیکن غلامی میں اس نے اس صورت حال کو بڑی غور سے پیش کیا ہے۔ غلامی ایک ایسے شخص کی الجھنوں اور پریشانیوں کی کہانی ہے جو انڈیا کا شکار ہے اور جس کو موجودہ سماجی نظام آخر میں غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ کیٹر لال کی غلامی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی گھولی لکائی تنگ دامنیں کو سکتا، اور جب اس گھولی کا آکا۔ اس سے وہ مینے کا بھایا گویا یہ طلب کرتا ہے تو اس کی کچھ نہیں آکا کر گیا کہ وہ گھبرا جاتا ہے پریشان ہو جاتا ہے اور زمانے نے مختلف ادوات میں اس کے دل پر جو زخم لگائے ہیں وہ سب کے سب ہرے ہو جاتے ہیں۔ کل کے تمام نوکروں اس کے لیے آج کی تکلیفیں ہیں جاتے ہیں اور وہ اپنی زندگی کی باسی دوشیاں پھر انکادوں پر سینکنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے اور تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ سوچتا ہے۔ اور اس کی نظروں اپنے گھر کے اندر سے لپ کوئی یاد بھی ہے اس

بلب سے ٹکراتے ہوئے دیکھتی ہیں جو ایک مکان کے گننے سر پر مسکرا رہا تھا کئی بار اس کے ہونڈے کچھڑے ان گھنٹوں پر ٹک کر پھر اُس کے سیٹے بدن پر چھٹ جاتے ہیں جو دروازے میں گڑی چمک رہی تھیں کئی بار اُسے اس داغ جگہ کا خیال آتا ہے جو بہت دور جدتے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے۔ اسی حالت میں مکان دار اُسے گل دیتا ہے۔ اور یہ گالی اس کے دل میں کچھ اور بھی ہنگامہ برپا کر دیتی ہے۔ وہ اس کی بات ہے۔ لیکن اُس کے جی میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نکل چکا تھا، سیٹھ کے جبریاں صبرے چہرے پر کرتے کر دے۔ مگر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اُس کا خود تو باہر فٹ پاتھر پر پڑا ہے۔ غرض اس کا داغ ان گنت خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ غریب ہے، اسی لیے اُسے گالی دی گئی ہے اور اسی لیے اُسے یہ گالی سننا پڑی ہے۔ اگر اس کا راج ہوتا تو وہ اس سیڑ کو گزرا کھلا دیتا جو اُسے اُپر رستے دو گالیاں سننا کہ اپنے گھر میں لوں اور م سے چٹا تھا جیسے اس نے اپنی گھر سے مار کر میں سے دو کھل نکالی کہ باہر بیٹک دیے ہیں۔ پھر اگر اس کا پناہ راج ہوتا تو وہ چوک میں رست سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیڑ کو چپ میں کھڑا کر دیتا اور اس کی کئی چندیا پر اس زور سے دھپاتا کہ جیلا اُفتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو، جی بھر کر ہنسو، اور خود آٹا ہنٹا کہ ہنٹے ہنٹے اس کا بیٹ ڈکھنے لگتا۔ اس وقت اُسے بالکل ہنس ہی نہیں آتی تھی۔ کیوں؟ — وہ اپنے راج کے بغیر ہی تو سیر کے گننے سر پر دھپا دے سکتا تھا، اُسے کس بات کی رلاوت تھی؟ — رلاوت تھی تو وہ گالیاں سن کر خاموش رہا۔ لیکن اس کے سوچنے کے کل میں کوئی رلاوت پیدا نہ ہو سکی اور اس نے کہیں ٹوڑ توڑیاں ہلتی ہوئی دیکھیں، کہیں اُسے آگ کا ایک پتھر نظر آیا جو گھومتے گھومتے غصوں کی ایک بہت بڑی گیند سی رہی تھی جو اُس کے آگے آگے زمین پر اچھلے کوڑنے لگی۔ وہ سڑک پر چلتا رہا۔ اور سڑک پر چلتے ہوئے اُسے انتقام کا خیال بھی آیا۔ انتقام کا خیال آتے ہی اُسے اپنی زبان پر لہو کا نلیکس ڈال کر محسوس ہوا اور اُس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ سو۔ سو۔ اُسے آسمان زمین سب محسوس رنگے ہوئے نظر آنے لگے۔ سو۔ اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رنگوں میں سے بھی صبر غریب نکلتا تھا۔ لیکن انتقام اس کے بس میں نہیں تھا، اُس کی اس ذہنی کیفیت نے بہت سے حقائق اس پر روشن کیے۔ اپرو بندہ اور گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے جب اُس نے بہت سی سڑکیں نظر آئیں تو اُس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گندہ بد پر جوڑے کسی لاش کے ہونگ دیکھتے ہیں۔ ان حقائق پر غور کرتا ہوا تھا کہ رب کے عالم میں وہ ایک عاید شاہ جڑیل تک پہنچا۔ اور وہاں پہنچ کر بے اختیار اس کے ملنے سے ایک غور نکلا۔ کان کے پردے پھاڑ دینے والا غور دیکھنے ہوئے گرم وارے کی مانند نکلا۔ بہت تیزی۔ اسے یقین تھا کہ اس نعرے سے جڑیل کی عمارت زمین پر جا جائے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا، ایک شخص جس نے اس نعرے کو شناسا نہیں پیری سے کہنے لگا۔ ”بگلا ہے“۔ منٹو نے اس فلسفے میں غصوں کی زبوں حالی اور اس بے ہوشی کے زبردست پیدا ہونے والی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی اقیقت سے بڑی جبروت تصور بنائی ہے۔ سنس اس نظام میں ایک فرد کی جگہ جی کو بڑے خود سے دیکھتا ہے اور اس جگہ جی کو پیش کر کے اس نظام کے تضاد کو واضح کرتا ہے۔ بلکہ جگہ اس میں عمل کی طرف اشارے بھی دیتے ہیں۔ انقلاب کا خیال بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے، ایک نئے نظام کی تقابلی اپنے آپ کو کہیں کہیں رونما کرتی ہے لیکن ان سب باتوں کی تان ایک احساس شکست ہی پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ غرض اسی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے کہ جو گندہ وجود

نظام کے ہاتھوں ہی بات ایک حقیقت بن گئی ہے۔ اسی لیے منٹو کے یہاں ان معاملات کو پیش کرتے ہوئے کوئی جا بجا نہ انداز پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے کھانڈا زل اور انقلاب کے بارے میں سوچتے ضرور ہیں لیکن کچھ کر نہیں پاتے۔ حالات نے انہیں بے بس بنا دیا ہے۔ منٹو اسی لیے زندگی کے ان پہلوؤں کا صورت نگاہی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس سے اگے نہیں بڑھتا۔ لیکن اس کی یہ عکاسی بے مقصد نہیں ہوتی۔ اس عکاسی میں قدم قدم پر وہ کچھ کہتا بڑا محسوس ہوتا ہے۔ زندگی کو سدھانے کا پیام دیتا بڑا معلوم ہو رہا ہے۔ اور اسی خصوصیت کا سارا لے کر حقیقت نگاہی اس کے فنی میں اپنے آپ کو ردنا کرتی ہے۔

دوسری اسلوب میں حقیقت نگاہی کے اوج مختلف روپ ملتے ہیں، ان کے اثرات منٹو کے فنی پر گہرے ہیں۔ وہ مختلف اور گہری سے خاص طور پر وہ متاثر ہوا ہے۔ گہری کے یہاں زندگی کے نظام اور کابو کا جو رخ اور گہرا شعور غما ہے، وہ عشق کے یہاں نسبتاً کم ہے۔ اسی لیے وہ گہری کے مقابلے میں مختلف کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتا ہے۔ یہ کونکر گہری کے یہاں زندگی کا تجربہ ہے، مختلف کے یہاں اس کی عکاسی ہے۔ عشق کا ایک افسانہ شغل ہے جو یکسکس گہری کی یاد میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں منٹو نے گہری کے مشورہ افسانے (TWENTY SIX MEN AND A GIRL) کی تکنیک استعمال کرنے کی طور پر کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں گہری کی حقیقت نگاہی کا انداز پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا موضوع بھی بہت پامال ہے۔ کچھ ضرور میں جو سب سے شام تک ایک پیادری طرح پر کام کرتے رہتے ہیں۔ وہ انداز بارہ گھنٹے کام کرتے رہنا ان کی مشرت میں لکھ دیا گیا ہے۔ کیونکر اسی طرح وہ اپنا دھیت پال سکتے ہیں۔ ایک دن اس طرح پر ایک موٹر آئی اس میں ایک لہجہ ان نکلا۔ اور وہ مستحقہ چار کی دلی مام دلی کو لے کر گم ہو گیا۔ بعض مرد اور اس واقعے کی تشریح کر رہے تھے۔ بعض تو نے اس سے چشم پر پٹی کی۔ وہ پشوت جس نے مام دلی کو اس لہجہ ان کے ساتھ بٹھا دیا تھا۔ اس نے مزدوروں کے اضطراب کو دیکھ کر مسرت یہ بات بتائی کہ میں نے ان سے دریافت کیا ہے کوئی بات نہیں۔ وہ دلی کو ذرا غریبی کی سیر کرانا چاہتے تھے۔ انیسٹر صاحب کے یہاں ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ قصوریٰ نور نے چاکر چھوڑ دیں گے۔ (یہ کوئی ہیں، ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔) یہ سن کر یہ کام کرنے والے درنگ خدا معلوم کن باتوں میں فرق رہے کہ وہ غصہ فضل کی آواز نے انہیں چمکادیا۔ دوسرے نور سے ٹھوک کر اس نے اپنے ہاتھوں کو گھسایا اور یہ سچے کو سنگرزوں کے ڈیڑھ میں گاٹتے ہوئے کہا۔ اگر میرے پیروں کے یہی شغل ہیں تو ہم بیروں کی ہر مٹیوں کا اللہ تباری ہے۔ جیسا کہ اس افسانے سے ظاہر ہے یہ سپاٹ ہے۔ اس میں ایک سماجی بد حال کا ذکر ضرور ہے لیکن کسی گہرائی کے ساتھ اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اسی لیے اس میں وہ نکھار پیدا نہیں ہو سکا ہے جو منٹو کے بعض دوسرے افسانوں میں ملتا ہے۔ لیکن بہر حال اس افسانے کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکر اسی باتیں ایک غلط سماجی نظام میں عجیب نہیں ہیں۔ منٹو اس افسانے میں اسی حقیقت کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اظہار میں نظر بہت نڈس لیکن سبھی زندگی کے ایک تاریک پہلو کا اظہار تو ہے۔ اسی لیے اس حقیقت کے اظہار میں گہری سے کہیں زیادہ خوف کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس میں وہ سادگی اور صراحت ہے جو مختلف کے ساتھ محسوس ہے۔ وہ گہرائی، انشیت اور نکھار میں نہیں جس سے گہری حقیقت نگاہی پہچانی جاتی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغلوں کی سماجی حقیقت انگیزی، بشریت اور نیکوئے بن سے یکسر غائب ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ منظر کے یہاں گہرائی کا احساس ابتر کم ہوتا ہے، لیکن بشریت اور نیکوئے بن اس کی سماجی حقیقت نگاری میں جگہ جگہ اپنا اثر دکھاتے ہیں اور یہ صورت حال اس وقت اس کے افسانوں میں خاص طور پر پیدا ہوتی ہے جب وہ انسانی زندگی کے حدود پر تاریک پہلوؤں کی پیدہ دہی کرتا ہے جب وہ انسانیت کے جسم پر شرے برسے زخموں کو بڑی بے رحمی سے کرتا ہے۔ اس خیال سے کہ افراد کو ان زخموں کی اصلی حالت کا صحیح اندازہ ہو۔ اور منظر کی حقیقت نگاری کے جوہر میں سمجھتے ہیں۔ یہاں وہ اصل حقیقت کو دکھانے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ کہتا ہے اور ابھی معلوم ہوتا ہے۔ اس مسئلے میں اس کے سب سے اچھے افسانے وہ ہیں جو اس نے طوائفوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لکھے ہیں۔ اور جن میں اس نے ان حقیقتوں کو واضح کیا ہے کہ طوائف انسانی زندگی کے خوشگوار حصے پر ایک بدنامدار رخ ہے۔ وہ ایک ایسا نامور ہے جو سا لہا سال سے دس رہا ہے۔ اس نامور کو دکھاتے ہوئے منظر نے طوائف کو ایک انسانی مخلوق کی طرح دیکھا ہے۔ اسی لیے وہ اس کی سترتوں، اس کے غموں، اس کی سسرتوں، اس کی ناکامیوں اور اس کی باریبوں کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے۔ منظر کے ایسے افسانوں کو پڑھ کر طوائف سے بھلائی اور غلط نظام اقدار سے گہن اور نفرت کا احساس ہوتا ہے۔ اور ہمیں سے مغلوں کا مہمانی کی حد شروع ہوتی ہے۔ اس موضوع پر منظر نے یوں تڑپت سے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن جنگ، خوشیاں، کمال شہر اور پہچان اس رحمان کے سب سے اچھے نمونے ہیں۔

منظر نے ان افسانوں میں اپنی مخصوص حقیقت نگاری کو سراج کمال پر پیش کیا ہے۔

’جنگ‘ سوگندھی کی کہانی ہے۔ وہ سوگندھی جو ایک طوائف بھی ہے اور ایک عورت بھی۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جو طوائف ہوتے ہوئے بھی ایک عورت ہے جس کو عورت بننے کی قتا ہے لیکن حالات جس کو طوائف ہی رہنے دیتے ہیں اور وہ ہمیشہ ایک طوائف ہی رہتی ہے۔ سوگندھی وہ دس روپے میں اپنا جسم بیچی تھی جس میں سے ڈھائی روپے اُسے دام مال دلال کو دینے پڑتے تھے۔ سوگندھی اپنے کام میں بڑی ہوشیار تھی۔ اُسے بے شمار گمراہ تھے۔ عام طور پر وہ یہ گرسب کو بیا کرتی تھی۔ اگر آدمی شریعت ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو تو اُس سے خوب شرارتیں کرو، ان گنت باتیں کرو، اُسے چھیڑو، ستاؤ، اُس کے گدگدی کرو۔ اگر ڈاکھی رکھتا ہو تو اُس میں انگلیوں سے لٹکی کتے کتے دوچار بال بھی فوج لوریٹ بڑا ہو تو چھپاؤ۔ اس کو اتنی ہمت ہی نہ ہو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے۔ وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی۔ ایسے مرد جو گسب چپ رہتے ہوں، بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ بڑی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا دامن چل جائے۔ غرض اس میں طوائف کی تمام خصوصیات موجود تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک جذباتی عورت بھی تھی اُسے بے شمار گمراہوں کے شیک کرنے کے لیے یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ملک مردوں کی کوئی ایسی دوسری بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ جیسے دیکھے ہیں کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فحش ایک پیاسی عورت باقی رہ جایا کرتی تھی۔ ہر روز اس کا نہا نہا یا ٹالٹا قاتی اُس سے کہتا تھا۔ سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔ اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے پس دم ہوجاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ سچ اُس سے پریم کیا

جاری ہے۔ — پریم کتا سندریل ہے۔ — یا پھر وہ خود اس کے اندر پل جاتے۔ — اس نے چار مردوں سے اس رسم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ — اور ان کی تصویریں اپنے سامنے لٹکانی تھیں۔ لیکن یہ مرد اس کے نہ بڑے۔ — انہوں نے سوگند بھی کر ایک طوائف ہی سمجھا۔ — ایک زمانے میں مادھو کی باتوں نے اس پر اثر کیا تھا۔ — مادھو کو نامیں عطا کرتا تھا۔ — اور اس عطا کردہ کی پیشانی پر تین غنیمتیں کروہ چند لکھتے تھے۔ — خود کو عطا کردہ کی سمجھنے کی تھی۔ — مادھو ہر چہ تپتا ہے۔ — آؤں غنیمتیں باتیں کر کے اُسے خوب سہانے چٹنے دکھایا کرتا۔ — لیکن کبھی کبھی وہ سوگند ہی کے کام نہ آتا۔ — اس سے کچھ نہ کچھ سے ترافقا۔ — اور وہ دسے رتی تھی۔ — ایک دن مادھو نے سوگند ہی سے بچا اس روپے طلب کیے۔ — اس پہانے کے گھر اس پر کوئی کیسی ہو گیا ہے اور یہ رقم اُسے ۱۵ روپہ کو بیٹی ہے۔ — سوگند ہی کا کاروبار جاری تھا لیکن اب اس کی گرم بازار نہیں تھی۔ — چند روز ہوئے ایک سیٹھ بڑی شکل سے اُس کے پاس آتا تھا اور باج کی روشنی میں اُس کے ہرے کو کھڑکڑا سے ناپسند کر کے نصیحت ہو گیا تھا، گویا اس نے سوگند ہی کی جنگ کی تھی۔ — سوگند ہی پر اس وقت کے کار اثر تھا۔ — چنانچہ جب مادھو نے بچا اس روپے کا سوال کیا تو اسے کچھ اس بات کا احساس ہوا کہ مادھو اُس سے بڑی قوت بنا رہا ہے۔ — چنانچہ اُس نے اُسے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ — کھری کھری ستائیں۔ — اور اس کے عمارتوں کو دیکھتے تھے کہ مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ — اور جب مادھو چلا گیا تو سوگند ہی نے اپنے عمارتوں کو دیکھتے تھے کہ کو گویں اٹھایا اور ساگر میں کھینچ کر لے چلا گیا۔ — اُسے پہلو میں لٹا کر مرنے لگا۔ —

غٹو نے اس کہانی میں طوائفوں کے حوالے کی جو جو تصویریں کھینچی ہیں وہ اس کی نفسیات کا زندگی سے جو بھرپور نقشہ بنایا ہے۔ اس میں قدم قدم پر حقیقتوں کے پیکر ابھرتے ہیں۔ — طوائف ہر حال ایک عورت ہوتی ہے لیکن طوائف کو عورت ہونے کے باوجود ایک طوائف ہونا چڑتا ہے۔ — حالات اُسے ایسا کرنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ — اس سے بڑی حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ — اس کہانی میں سوگند ہی کی زندگی، اس کے جذبات و احساسات، دام دل و دل سے اس کے روابط، اپنی ہمیشہ عورتوں سے اس کی ہمدردی، سیٹھ کے ہاتھوں ہونے والی اس کی جنگ، ایک چوڑے چار مردوں کے ہاتھوں میں اس کی غلط فہمی، لیکن اس حقیقت کو معلوم کرنے کے بعد مادھو سے اُس کی سخت کلامی، ان سب باتوں میں حقیقت کی جھلکیاں بکھرتی ہیں۔ — غٹو نے اس میں اپنی طوط سے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ — صرف حالات، انسا اور ماحول کے بعض ایسے پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے جس سے اس کی زندگی کی بعض بڑی ہی اہم حقیقتیں ذہن نشین ہوتی ہیں۔ — غٹو نے اپنی حقیقت نگاہی کا یہ بڑا بڑا حد تک انہیں حقیقتوں سے تیار کیا ہے۔

غٹو کا موضوع جنگ سے ذرا مختلف ہے لیکن حوالے میں ہے، اور غٹو نے اس انسا میں بھی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ — کاتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ — کاتا ہمیشہ کرتی تھی اور خوشیا اس کا دلال تھا۔ — ایک دن خوشیا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے کاتا کی کھولی میں داخل ہو کر اسے بالکل رہنہ دیکھ لیا وہ اس پر گھبرایا لیکن کاتا نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ — اور یہ کہ اس کی حیرت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ — جب تم نے کاتا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا مروج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے، اُنہ دو.....“ — اس بات نے خوشیا کی حیرت کو تو کسی حد تک دور کر دیا لیکن

اس فقرے میں اس نے بہت سے مطلب کر دئے شروع کر دیے لیکن وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اور اس کو ایک الجھن سی رہی۔
 اس برس کی دہائی کے عشرے میں وہ ایسے وقت سے کھلی بھی دوچار نہیں بنی تھا۔ اس لیے اس نئی عورت کو دیکھ کر اسے یوں غموں بھرا
 پیسے وہ خود شکا ہو گیا ہے اس کے جذبات میں یہ جہاں کیفیت طاری ہو گئی — اور کائنات کے جسم کے خطوط نے اس کے دل میں اس
 خیال کو پیدا کر دیا کہ کائنات اس روئے میں مشغول نہیں ہے — انہیں خیالات میں گم ہو گھر پھنسا اور اپنے آپ کو خوب سہا یا بنایا، نئی دھواں
 پھنی، بالوں میں نگلی کی، دائرے میں منڈائی — اور پھر ایک جیسی لی — جس کے لئے کہ وہ ایک اور دلال کے ساتھ کائنات کے گھر پہنچا
 — دلال معاملے کو کے کائنات کو جیسی میں لے آیا — اور جب وہ جیسی میں داخل ہوئی تو اس نے خوشیا کو دیکھ کر اس کی چیخ نکلی
 گئی اور اس نے کہا خوشیا تم — خوشیا نے جواب دیا، "ہاں میں — لیکن تمہیں رو پے لی گئے ہیں نا؟" — خوشیا کی موٹی اور
 بلند ہوئی، دیکھو ڈر نمود — جو تھوڑے چلے — اس واقعے کے بعد خوشیا پھر اس بازار میں نظر آیا — اس افسانے میں منظر
 نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مرد بھی ہر حال میں مرد ہوتا ہے — دلال تک اس سے مشتعل نہیں ہوتے۔ خوشیا کے کردار میں اس
 نے ایک ایسے مرد کو دیکھا ہے جس کے جذبات، دس سال کی دہائی کے بعد بھی مرد نہیں ہوئے ہیں، اور جو ایک زمانے تک کائنات کی
 دہائی کو لے کے بعد خود اس کی فسانیت کا شکار ہو جاتا ہے — زندگی کی اس زیادتی حقیقت سے کس کو انکار کی جرأت ہو سکتی ہے؟
 عشق کی ایک اور کہانی پہچان بھی ملے انہوں نے متعلق ہے لیکن اس میں ایسی طوائفوں کا ذکر ہے جو بازار میں نہیں اپنے گھر میں
 میں پیشہ کرتی ہیں منظر نے ان پیشہ ور عورتوں کی زندگی کی ساری زبوں حالی اور اس کے ساتھ کوپ کو اس افسانے میں مجسم کر دیا
 ہے — چار دوست شراب سے مرشار ہو کر یوں تو تفریح کی غرض سے عورت کی تلاش میں نکلتے ہیں لیکن چار جگہ جانے کے بعد بھی
 انہیں تفریح کی جگہ تھن حاصل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تلنگے والا انہیں بمبئی کے یہاں لے جاتا ہے — ایک ایسی جگہ جہاں
 کہیں میں گھپ اندھیرا تھا — اور جہاں انہیں وہ کالی بھنگی انتہائی بد صورت عورتیں نظر آئیں اور جبیں کو دیکھ کر ان دوستوں میں سے
 ایک نے کہا کیا لڑیکہ لاناں ہیں — یہ بات سن کر کیموں میں سے ایک جس کا سیاہ چہرہ شرعی لٹانے کے باعث زیادہ ہنسی ہوئی
 رشتہ کی ہی دلگت اختیار کر گیا تھا، ہنسی — یہ لوگ بھی ہنس دینے — اور ان دوستوں میں سے ایک نے پوچھا — کیا ہم
 ہے آپ کا؟

جولی — "نہی۔"

دوسرے دوست نے آگے بڑھ کر پوچھا — "آپ کا۔"

اُس نے جواب دیا "میری۔"

تیسرا بھی آگے بڑھا یا — "ہمیں صاحب آپ کیا کام کرتی ہیں؟"

دونوں جاگتیں — ایک نے اٹھ سے کہا — "کیا بات کرتا ہے تم؟"

دوسری نے کہا — "چلو جلدی کرو — دہنا لگتا ہے یا نہیں۔ میں روٹی پکانا ہے۔"

اور ان لوگوں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو وہ کیلے کٹے سے بھرے ہوئے تھے اور وہ اس کی مڑیاں بنا رہی تھی۔

— تاغے والا قطعی طور پر غلط سمجھ کر انھیں یہاں لے کر آیا تھا۔ موشریاں اس عورت کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ کاناچ دودھ پا رہا ہے اور یہ موشریاں اس کے آنسوؤں میں — اس منظر سے تنگ آکر وہ لوگ وہاں سے چل دیے۔ اور اس کے بعد لنگھنے والی انھیں ایک پنجابین گھر کے یہاں لے گیا جو بڑی ہی خوشحال عورت تھی — وہاں سے یہ لوگ اٹھنے پاؤں وہاں سے ہوئے — اور پھر انھیں تھانگہ والا ایک میلے کیلے گھر میں لے گیا جہاں ایک بڑھیا نوناں جھونک رہی تھی — یہ سب اس مکان میں اندر جا کر بیٹھ گئے۔ اور وہاں انھیں ایک شگفتگی سی کمرہ دکھائی نظر آئی اس کا رنگ سا لالہ تھا۔ بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے چل سکتی تھی۔ اسے چار نیپ ایک سو دم رنگ لکھی ہے۔ اس کے پیرتوں میں بریک رنگ تھے جن اور اس کے کھڑے کھڑے اس کا سارا رنگ بدلنے و دھوپ اور بادشہزادہ کی آفریاد ہے اس عرض جلدی سے جلدی رنگ کے جسم میں جو ایک قسم کی شوخ جانوریت ہوتی ہے، اس میں بالکل نہیں ملتی — کپڑوں کے باوجود وہ شگلی دکھائی دیتی تھی — بہت ہی پیورہ اور ناں جب مریختے پر نکلے — اس کے جسم کا پورا حصہ قطعی طور پر فرسوائی تھا — یہاں سے جی بے ہوش لوگ جان چھڑا کے جدا گئے — تاغے والے نے یہی کہا کہ ایڑی آپ کو پہچانی نہیں — اور کہہ کر اس نے گالیوں کے دوپے حسیب میں ڈالے اور — سداون کے نظارے میں — لگا نا بڑا چلا گیا — اس افسانے میں زندگی کے متعلقہ پہلوؤں کو دکھا کر منظر نے حقیقت کو واضح کیا ہے — ایک طوفان فرسوخ اور دھواں شکی کا خیال اور اس کی کج توجہ تلاش ہے لیکن اس کا حصول بے معنی ہے کیونکہ جس ماحول میں اس کو تلاش کیا جا رہا ہے، اس میں ایک کرب کی سی کیفیت ہے — جہاں بھی یہ لوگ پہنچتے ہیں وہاں انھوں کی نظریں گندگی اور ناہی کی کوہمکتی ہیں، لائشوں کی اندھی دو شنی میں بڑی شکل سے انھیں راستہ ملتا ہے — ساتھ ہی ہر جگہ ناگندہ خانا، خانا اور دینی کچھ دکھائی نظر آتی ہے — کواسی کے لیے یہ سارا کادہ بار چلتا ہے — غصہ اسی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے — اور اس لیے کالی جینائی عورت کے ہاتھوں سے آنے کی جو موشریاں کچے فرش پر گر گئی ہیں، ان کو دکھ کر اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لنگھ دودھ پا رہا ہے اور یہ موشریاں اس کے آنسوؤں میں۔

اسی طرح کالی شلوار میں بھی اس نے زندگی کے انھیں پہلوؤں سے ایک پہلو کی تصویر کشی کی ہے۔ کالی شلوار، سونگھ سی اور کاٹا جس کی طرح ایک طوائف سلطانہ کی کہانی ہے۔ سلطانہ پہلے انانے میں پیشہ کرتی تھی۔ وہاں اس کے دال خدا بخش نے چند گڑوں کو اس کا مستقل کام کیا۔ یہاں تک پہنچے کہ وہ اپنے خدائے بخش کے دل میں کیا ساقی کر اس نے سلطانہ سمیت دلی منتقلی ہونے کا ارادہ کر لیا۔ سلطانہ تیار ہو گئی اور وہ دونوں دلی آ گئے۔ لیکن دلی میں ان کا کاروبار نہ چلا۔ سلطانہ کی چڑیاں تنگ ہو گئیں۔ پیٹ بھی کڑھ کر کسی جیل سے بھرتا تھا۔ عزم کا سینہ آیا تو سلطانہ کو ایک کالی شلوار بنانے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ اس کی چڑیوں میں انوری اور محتاج نے بھی عزم کے موقع پر لانے کیڑے پہنے۔ کالی شلوار بنانے کا کام اس نے خود کیا تھا۔ خدا بخش اس سلسلے میں کوئی مدد نہ سکا۔ ایک شخص شکر ناہی ایک دن سلطانہ کے یہاں آیا۔ اس کو دیکھ کر سلطانہ کی باچھیں کھل گئیں لیکن وہ اچھا لگا ایک ثابت نہ ہوا۔ دوسری دفعہ جب وہ آیا تو سلطانہ نے اس سے کالی شلوار لانے کی فرمائش کر دی۔ شکر نے کہا کہ وہ کو شش کے گاہ اور چھتے وقت سلطانہ کے بوندے ملے جو اس نے انار کے سے دیئے۔ عزم کی پہلی تاریخ کو شکر آیا اور ایک اخبار میں لٹھی ہوئی اس کے پاس کالی شلوار تھی۔ شکر نے کہا کہ یہ سائن کی شلوار ہے دیکھ لیتا ہی نہ ہو اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ سلطانہ نے اخبار ہٹا کر دیکھا تو اسے سائن کی شلوار نظر آئی۔ ایسی ہی شلوار جو اس نے

انہی کے پاس دیکھی تھی — محرم کے موقع پر سلطان نے یہ شکار پرستی ہی تھی کہ وہ اس سے پردہ تنگ ہوئی اور اتنی ہی داخلی ہوئی — اور اس نے کہا کہ شکار تو بالکل نئی معلوم ہوتی ہے — اس پر سلطان نے جواب دیا آج ہی روزی لایا ہے — یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں اتنی ہی کے کانوں پر پڑیں تیرہ بندے تم نے کہاں سے لیے — اتنی ہی نے جواب دیا آج ہی منگوائے ہیں — دونوں کو تھوڑی دیر غامض رہنا پڑا — اس کی کہانی میں بھی خطر نے طوائف کی زندگی کی ذہنوں میں کوشش کیا ہے۔ اس کی کہیں پر سیاہ اور زہریلی حالی کی پرکھا قصہ اس کہانی سے آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے — اس کی ہر بات اور ہر پہلو میں زندگی کی سنگین اور مخصوص حقیقتوں کا احساس دھرتا ہے۔

خطر نے ان موضوعات پر اور بھی انسان لکھے ہیں لیکن حقیقت نگاری کا ہر کمال ان چارہ خسانوں میں ملتا ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں آتا۔ ان افسانوں میں طوائف کے ذکر کے ساتھ کسی قسم کی لذت، دلچسپی کی جنسی تسکین یا جسمانی آسودگی کا خیال نہیں پیدا ہوتا — اس لیے طوائف خطر کے سماں دلچسپی کا سامان باقی نہیں رہتی۔ برعکس اس کے انسانیت کے جسم پر ایک ناخوشی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ خطر طوائف کو اسی ذلوت و نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لیے اس کے یہاں طوائف کی زندگی سے تخلیق تیار کیا پہلو بہت زیادہ نظر آتے ہیں — مشرقی پہلوؤں کی وضاحت، بہت تفصیل سے کرتا ہے۔ یہ تفصیل ایک طرف تو گھٹن کا احساس پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف اس سے ہمدردی کا خیال بیدار ہوتا ہے — گھٹن تو اس ماحول سے پیدا ہوتی ہے، جس میں زندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور ہمدردی کے خیالی کو دوسری طرف اور ایسی سیال پیدا کر دیتی ہیں، جن کا اس ماحول کے افراد کو قدم قدم پر سامنا کرنا پڑتا ہے۔ — عشقی حقیقت میں نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ طوائف پیٹل کی خاطر انسانیت کا سطح سے نیچے گرنے کے باوجود پتہ پیٹل نہیں ہال سکتی۔ اس کی زندگی معاشی بد حالی میں گزرتی ہے — اس کی ساری زندگی جذباتی اعتبار سے نا آسودگی کے عالم میں رہنا پڑتا ہے۔ — ”جنگ“ کی سوجھ بوجھ، نورستانی کا کٹنا اور کالی شوار کی سلطنت سب معاشی اعتبار سے بد حال اور جذباتی اعتبار سے نا آسودہ ہیں۔ خطر نے ان طوائفوں کی نفسیات کے ہر پہلو کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے، اور جس ماحول میں یہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ اس ماحول کی زندگی سے بڑی بھرپور تصویریں نکلتی ہیں — خطر جب ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے تو گویا ایک غلط سماجی نظام اقدار کے خلاف احتجاج کرتا ہے جس نے صدیوں سے طوائف کو باقی رکھا ہے — وہ اپنی زبان سے کہہ نہیں سکتا لیکن جن حالات کی تصویر کشی کرتا ہے، ان سے یہ حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے کہ خطر اس غلط سماجی نظام کا بانی و دشمن ہے — وہ اس نظام و اقدار کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا کوئی واضح و مؤثر عمل پیش نہیں کرتا لیکن اس کے خلاف نفرت کے جذبات کو ضرور ابھارتا ہے۔ لیکن بغیر محض نفرت نہیں رہتی۔ کیونکہ اس کی ساری انسانی ہمدردی سے ملتی ہوتی ہیں — طوائف کے ماحول اور اس کے معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کا عنصر خطر کے یہاں ہر جگہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے — اور انسانی ہمدردی کی یہی خصوصیت اس کی حقیقت نگاری میں جان ڈال دیتی ہے۔

یہ بات بظاہر تو عجیب ہے کہ خطر نے جذباتی روانی موضوعات پر انسا لے نہیں لکھے ہیں لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ بات اتنی عجیب معلوم نہیں ہوتی۔ خطر فطرتاً ہی جذباتی اور روانی نہیں ہے — اس کے یہاں جب کبھی یہ پہلو نمایاں ہو جاتا ہے تو

قوان میں سے بھی کوئی نہ کرنا حقیقت ابھرتی ہے۔ مذکر کا کوئی نہ کوئی، ہم دوسرے آتا ہے۔ اس لیے اس کی جذباتیت اور
 رومانیت اپنے آپ کو کہیں دونا نہیں کرتی۔ اس پر اگر کسی اس کا دور مڑتا بھی ہے تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے۔
 میں نے انفرادہ مذاق اُس سے محبت کا ذکر کیا تھا۔ دراصل اس وقت فصلا بیسی دلفریبی تھی کہ اگر کسی صورت پر عاشق پر جاتا تو
 مجھے افسوس نہ ہوتا۔ جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں۔ نیم تہ کی میں پہلی کے قلعے قمار اندازہ تھا رانگیں جبکہ شروع کر دی
 ہوا میں خنکی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی صورت کے پاس جو اس کی ضرورت
 محسوس ہوتا کرتی ہے۔ ایک ایسی ضرورت جس کا احساس تحت تصور ہی میں چھپا رہتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے
 — پر کیفیت اور وہ دلفریبیاں صورت کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ غلوں سلسلے میں کسی
 رومانی فضا کو پیدا نہیں ہو سکتا۔ موسم اور فضا میں تصور ہی رومانیت کا رنگ وہ ضرور دے رہا ہے لیکن اس کی ان زندگی کی
 ایک بڑی ہی اہم حقیقت پر یاد رکھنی ہے۔ میں تو بعض افسانے جذباتی رومانی موضوعات پر مشغول کے یہاں ہی غور رہا کرتا ہوں
 لیکن ان افسانوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے خود مشغول نے ان افسانوں کو اہمیت نہیں دی ہے اور اس لیے افسانے مافی
 حیات شہ کی پیداوار رہا ہے۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہے۔ ”مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو
 بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم صورتوں سے ملتا ہوں۔ وہ افسانے جو میں نے صورتوں کے متعلق
 لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے گئے ہیں یا محض دماغی حیا شہ کے لیے۔ میرے ایسے افسانوں میں جو نگہ
 غلوں میں نہیں ہے، اسی لیے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا۔ ایک خاص طبقے کی لڑکی میری نظر سے گزری ہیں اور
 ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں، مگر وہ ادیان نہیں ہیں۔“ وہ کسی نہ کسی حقیقت کے گرد گھومتے ہیں۔ مشغول کی طبیعت
 کا رجحان ہی رومان کی طرف نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جب محبت کا تذکرہ ہو تب بھی وہ اپنے گرد رومانیت کا حسد نہیں بھرتا۔
 اس کی نگاہ میں یہاں بھی حقیقت پر ہی رہتی ہیں۔ محبت کے ساتھ اُسے یہ خیال آتا ہے کہ محبت کی یوں تو بہت سی قسمیں ہمارے
 باپ دادا بیان کر گئے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ محبت خواہ ملتان میں پیدا ہو یا ساہیوالہ کے یا بہت سب افسانوں میں، سب وہاں ہی پیدا ہو یا
 گرمیوں میں، اتر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں۔ محبت تو بصورت کریں یا بد صورت، بد کردار کے یا نیکو کار، محبت محبت
 ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ایک سی پہلی آدمی ہے، اسی طرح
 محبت کی پیداوار بھی ایک ہی طرح پر ہوتی ہے، یہ جذبات ہے کہ سیدہ بیگم ہسپتال میں بچے جننے اور راج کمار جیگر میں۔
 غلام محمد کے دل میں جسٹس محبت پیدا کرے اور غلام علی کے دل میں کوئی دانی جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں
 اور کمزور رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے۔ بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں
 بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے۔ میں طرح صورتوں کا عمل کر جاتا ہے، اسی طرح محبت بھی گرا جاتی ہے۔ بعض
 دفعہ ہاتھ پر پیدا ہو جاتا ہے۔ ادھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے ناچھو ہیں۔ اس کا یہ مطلب
 نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش ان کے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہے، یا ان کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا، نہیں، یہ

جوانان نے نفسیاتی حقائق کو غیبیہ بنا کر نہیں کھسے تھے۔ میں ان میں بھی تمام قدم پر نفسیاتی حقائق کی زنجیری نظر آتی ہے۔ زندگی کے سلامت اور کسادوں کی ہر حالت و سکنت کو پیش کرتے ہوئے یہ نفسیاتی شعور اپنے شباب پر دکھائی دیتا ہے۔ ”مردم میں ایک نوجوان لڑکی سے اچانک ٹھیکڑ لگا تب مزہ ہوتا ہے۔“ میں نے پھر نئی ساسی کی طرف طرف سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ایک ایک کی اس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ کچھ اس طرح کچھ اس کو دھکا سا لگا۔ وہ سنبھل اور فوراً ہی منہ سے حال ہی میں نکال کر میری سنہرا یا۔ اپنی سیل سے کان میں کچھ کہا۔ اس سیل نے ٹکلیوں سے میری طرف دیکھا۔ یہ سب ماحصل پر سینہ اگیا۔ خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی کسی عورت کو یوں اچانک طور پر بربز نہیں دیکھا تھا جب اچانک کا فاصلہ ہو کر اس کے سامنے آ جاتی ہے تو وہ ٹپٹکا سا جاتا ہے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہے۔ اس کی نظریں بھی ایک دم غریبی سے دو چار ہو گئی تھیں۔ اپنے آپ کو کیس چھپا چھپا ہوا تھا۔

اس نے جلدی جلدی صورت اٹھا کر جاؤ۔ جاؤ تم خناو۔ پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی جیسے تم غلطی تھیں تو سزا دہ کھولنے لگا۔ ضرورت تھی۔ اندر سے کھڑا ہوتا، میں پھرتا جاتا۔ لیکن جاؤ۔ تم خناو۔ کاشا مسکراتی۔ تب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سر جاکیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے، اکنے دو۔ پھر خوشیا یہ سوچنے لگتا ہے اور دل میں کہتا ہے۔ ”بھئی یہ ایمان نہیں ہے تو کیا ہے۔“ یعنی ایک چھوٹی سی رنگ و طرح تمام کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

تم خوشیا ہی تو ہو۔ خوشیا نہ ہوا سا وہ جتا ہو گیا جو اس کے بہتر پر وقت اور گھٹا رہ گئے۔ اور بات خوشیا پر ایک خوشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک رات وہ دقل سے ایک لاکھ بیں جاتا ہے۔ اور کاشا اس کے پہلوں میں ہوتی ہے۔ ایک مرد کی نفسیات کی تصویر کشی یہاں حقیقت سے کتنی بھر پور کھینچی گئی ہے۔ اسی طرح نعرہ میں کینٹھ لال جب بیٹھ سے گھایاں سنتا ہے تو اسے بہت برا لگتا ہے لیکن پھر اس کے دل میں اس طرح کے خیالات بھی اٹھتے ہیں۔ ”اے شاہ، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ تم نے تو بیٹھ سے یوں گھایاں نہیں جیسے میں بیٹھ میں ہوں یاں تھیں۔ بیٹھ میں بیٹھ میں ہوں یاں تھیں۔ بڑے مزے دار گھوٹ تھے۔ پھر لڑکی کسی۔ اب تو میں بچھا چھوڑ دو اور بیچ کتا ہوں، دلچاہہ ہواؤں گا۔ یہ لوگ جوڑے آرام سے کھادھر مل چھوڑ رہے ہیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کا سر پھڑوڑوں گا۔ بھنگان کی قسم اب مجھے زیادہ تاب نہیں رہی میں ضرور دیوانے کہنے کی طرح سب کو اٹھا شروع کر دوں گا۔“ لوگ مجھے بالکل غافلے میں بند کریں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکا کر مر جاؤں گا۔“ مر جاؤں گا، بیچ کتا ہوں ہرجاؤں گا۔“ یہ جیسے نفسیات خشکت کو آنکھوں کے سامنے دکھانا کرتے ہیں۔

”پھر ہنگ“ کی سونگھنی کو دیکھیے۔ اس پر جو کیفیات طاری ہوتی ہیں وہ حقیقت سے کتنی قریب ہیں۔ ”سونگھنی دماغ نا عورت تھی لیکن جو مٹی کوئی نرم و نازک بات، کوئی کوئل بل، اس سے کہنا تو محبت بچھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ محمود اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل منہول سمجھتا تھا مگر اس جسم کے باقی اعضا سب کے سب اس کے کھڑی طرح قائم تھے۔ وہ ٹھکن چا جتے تھے۔ ایسی ٹھکن جو انھیں بھنہوڑ کر۔ انھیں مار کر سنانے پر مجبور کر دے۔ ایسی نیند جو ہنگ کو پورچر ہونے کے بعد اٹنے کو مٹی مزیدار ہوتی ہے۔ وہ بے ہوشی جردا کھا کر ہند بند ڈھیلے ہو جاتے ہی طاری ہوتی ہے۔ کاشا آندھرتی ہے!۔ سونگھنی ایک طوائف ہے لیکن وہ عورت بھی ہے۔ چنانچہ جب بھی وہ کسی شخص سے محبت کا سند لے

سنتی ہے تو موم ہو جاتی ہے — یہ جانتے ہوئے بھی کرے سب فریب ہے، مجبوت ہے، امکانی ہے — تہرہ و لذات کو اس کا پیمانہ یا نیا ملا تاقی اس سے کہا کرتا خطہ سو گندمی میں چھوڑے پریم کرتا بہوں — اور سو گندمی یہ جان بوجھ کر کہ وہ مجبوت ہوتا ہے، اُس موم ہو جاتی تھی — اور ایسا محسوس کرتی تھی ایسے ہیکچر اس سے پریم کیا جا رہا ہے — پریم کشتا سندربول ہے — وہ چاہتی تھی اس کو چھٹلا کر اپنے سدرے انگہ پر لے لے، اُس کی ماضی کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے سامنوں میں برج بدلے — یا پھر وہ موم اس کے اندر چلی جائے، سمٹ سٹا کر اس کے اندر داخل ہو اور اُس پر بے ڈھکن بنا کر دے — فرض اس طرح انسانی نفسیات کے اُن گنت حقائق غلطی نے اپنے انسانوں میں پیش کیے ہیں — غشو کا کمال یہ ہے کہ وہ ان حقیقتوں کو نئے زاویوں سے دیکھتا ہے — اس کی نگاہیں اس مسئلے میں اس جگہ جا پہنچتی ہیں جہاں عام افراد کی نظروں کا پہنچنا آسان نہیں ہوتا — غلط انسانی نفسیات کو انسانی زاویہ نظر سے دیکھتا ہے، اس لیے اس میں حقیقت کے بے شمار پہلو دفن ہوتے ہیں — اس کی فکر میں نگاہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی انسانی زندگی کی بڑی اہم حقیقتیں بنا دیتی ہے — اس کے انسانوں کے یہ پہلو بھی اس کی حقیقت نگاہی کو سدا دیتے ہیں —

یہ نفسیاتی شعوریوں تو خوشی کے برائے سامنے میں ملتا ہے لیکن بعض انسانے اس نمائے میں کھسے ہیں جن کا بنیادی موضوع ہی کی کوئی نہ کوئی اہم نفسیاتی حقیقت ہے — ان میں سے بیشتر انسانی زندگی کے جنسی پہلوؤں سے متعلق ہیں — لیکن انہیں جنسی پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے غشو نے انسانی نفسیات کے سب سے سدا روز کی حقیقت داخل کی ہے — غشو، بلاؤ، بھابہ اور اسی طرح کے بعض اور انسانے وہی نفسیات جنسی کے مختلف حقائق کو پیش کرتے ہیں — غشو ایک فوجانہ لڑکی کی کہانی ہے جو کسی فساد میں شرکت کی فرض سے آئی ہے اور اپنی سیلیوں کے ساتھ لذت گند رہی ہے — وہ اُس میں دمنوں کے متعلق بے شمار باتیں کرتی ہیں — جن سے ان کے جنسی دباؤ کا اندازہ ہوتا ہے — غشو یہ باتیں کہتے ہوئے بآواز اپنی سیلی حقت کے گوشوں پر اپنے ہونٹ جمادتی ہے لیکن حقت معترض نہیں ہوتی، خاموش بیٹھی رہتی ہے — اور پھر غشو دیر کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ٹال کر سو جاتی ہیں — غشو نے یہاں فوجانہ لڑکیوں کے جنسی جذبات کی حقیقت سے بھرپور ترکانی کی ہے — بلاؤ، مومن، ٹیکلہ اور فیہ کی کہانی ہے جو بروج کی خنروں سے گزر رہے ہیں — ٹیکلہ ساتھی کی ایک بلاؤ بیٹھی ہے اور فیہ کو دکھاتی ہے — مومن کے داغ میں یہ بلاؤ زحلیب و غریب خیالات پیدا کرتا ہے — اور ساتھی کا یہ بلاؤ سیسا جا رہا تھا — اور مومن کے داغ میں عجیب و غریب خیالوں کے ٹانگے اُڑ رہے تھے — جب اُسے کمرے میں بلاؤ جاتا اور اُس کی نگاہیں ٹیکلہ کی ساتھی کے بلاؤ پر پڑتی ہیں تو اُس کا ہی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے ٹھوکر اُسے دیکھے — صوف چھو کر ہی نہیں — بلکہ اس کی لٹام اور دوش سے اس پر بڑبڑنگ ہاتھ پھیرتا رہے — اپنے گھوڑے ہاتھ — اس میں بھی ایک نفسیاتی حقیقت پنہاں ہے — چاہا بھی کم دیش اسی طرح کی کہانی ہے — گھوپال کی ران پر چھوڑا نکل آتا ہے — وہ اور اس کی بہن اس پر بھابہ لگاتے ہیں — لیکن آخر میں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوہا تھانی میں اپنے پیہ بھی ایک بھابہ تراشتی ہے — اور پھر جو کچھ ہوتا ہے اُس کو غشو ہی کے الفاظ میں ٹھینے — چھابہ لکھنے کے بعد اُس نے غشو کا سا

مرحہ نکال کر اس پر پھیلا دیا اور گردن جھکا کر پٹے کرتے کے بن کھولے۔ سینے کے داہن طرف چھوٹا سا آجیہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگلی پر چھوٹا سا ناکھل لیلیہ اٹکا ہوا ہے۔ رنگانے پھا ہے پر چھوٹک ماری اور اسے ٹھٹھے سے آجیہ پر جا دیا۔ اس افسانے میں بھی منٹو نے طبع کی نفسیات کو واضح کیا ہے۔ غرض اس طرح اس نے بہت سے افسانے اس موضوع پر لکھے ہیں۔ ان افسانوں کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے۔ لیکن بر زندگی کے بعض بنیادی نفسیاتی حقائق کو ضرور پیش کرتے ہیں۔ دوسرے ان حقیقتوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ منٹو ان حقیقتوں کی پردہ دہی کرتا ہے۔ اس لیے ان افسانوں میں بھی اس کی حقیقت نگاری اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

منٹو نے خاص جنسی موضوعات پر جو چند افسانے لکھے ہیں، اور جن پر خاصا جھگڑا مچا ہے، وہ بھی نفسیاتی حقائق کی ترجمانی کے سلسلے میں کی ایک کڑی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان افسانوں میں سے اکثر کے موضوعات بڑی حد تک مثل ہیں لیکن ان میں جگہ جگہ فزکی نفسیات کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ اور اس نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی جو ترجمانی منٹو نے کی ہے، اس کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ”دجواں“ اور ”خشتہ گوشت“ منٹو کے ایسے ہی افسانے ہیں۔ ”دجواں“ کا کوئی خاص اہم موضوع نہیں ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ مسعود ایک اسکول کا لڑکا ایک قصائی کو گوشت لے ہاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس گوشت میں سے اسے دھواں سا اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے دل میں اس گوشت کو چھونے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اُسے انگلی سے جھپٹتا ہے اور گوشت کی لڑی اُسے ابھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ نودا وہ اپنی ماں اور بہن کا کھنم کھاتا ہے۔ اس کی بہن پر مسعود کی کڑب کینیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ مسعود سے یہ کہتی ہے کہ اس کی کمر میں شدید درد ہو رہا ہے اور وہ مسعود سے کہہ رہا تھا جاتی ہے۔ چنانچہ وہ دبا دیتا ہے۔ پھر اس کی بہن کا کھنم اپنی سیلی بٹاکے ساتھ ایک پتنگ پر رکھی جاتی ہے۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں اس افسانے کا موضوع ہیں۔ اس کے موضوع کے سستے ہیں سے قطع نظر اس میں جگہ جگہ ایسے مقامات آتے ہیں جہاں گھر سے نفسیاتی حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ مسعود اور کھنم کی گفتگو اور کھنم اور بٹاکے کی حرکات میں ان حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ نڈا گوشت کا جو مرقع ہے اس کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ موضوع اس کا بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ نفسیاتی حقائق اس میں بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ منٹو نے ان باتوں کو اپنے گھر سے نفسیاتی شعور سے کام لے کر حقیقت کا دلچپن مسود سے دیا ہے۔ اور اس طرح اس کی حقیقت نگاری میں یہ باتیں مساوی ہوتی ہیں لیکن ان کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ منٹو کے یہاں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن ان چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں اس نے زندگی کی حقیقتوں کو دیکھا ہے۔ ان حقیقتوں کی تلاش میں وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ٹٹوٹا ہے۔ اس کی ساری تفصیل اور جزئیات کو دیکھتا ہے۔ یہ جزئیات حقیقتوں کو اجاگر کرنے میں بڑا کام کرتی ہے۔ اور اس کی منٹو کا مشاہدہ سونے پر ساگر کا کام کرتا ہے چنانچہ اس کی نگاہیں ان جزئیات میں ایسے پہلوؤں کو بھی دیکھ رہی ہیں جن کو دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے منٹو کے یہاں جزئیات کی حقیقت اور حقیقت کی جزئیات بر یک وقت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ مشاہدہ کی تیزی کے سلسلے سے جزئیات کی حقیقت اور

حقیقت کی جزئیات جس طرح منظر کے یہاں نمایاں ہوتی ہے۔ شادی ہی اُنہوں کے کسی اور انسانہ نگار کے یہاں اس طرح نمایاں ہوتی ہو۔ لیکن اس میں منظر کے تخلیق کو بہت کم غل ہوتا ہے۔ — منظر صرف دیکھتا ہے اور دیکھتے ہوئے اس کی نظریں خارجی منظر ہر کی انسانی کمزوریوں کے ساتھ ملتی ہیں اور جب وہ ان کی تفصیل بیان کرتا ہے تو اس میں بے شمار حقیقتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ — اصل میں حقیقتوں کی تلاش ہی منظر کو خارجی منظر ہر کی تفصیل و جزئیات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ — اور وہ اس کی بہتر اور تلاش میں بہت دُور نکل جاتا ہے۔ — لیکن اس کے باوجود رہتا ہے اسی دنیا میں۔ — منظر کے یہاں خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اس کو نیکی کی باتیں ہیں۔ — اسی ماحول کی باتیں ہیں۔ اس انصاف کی باتیں ہیں۔ — منظر ان باتوں کو بہت نمایاں کر کے پیش کرتا ہے۔ — اور ان باتوں کو نمایاں کر کے پیش کرنے ہی میں اس کے یہاں حقیقت کی جزئیات اور جزئیات کی حقیقت اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ — گوہر الہی میں کی دان پر پھوٹا ہوا تھا، اس کے اپنے کے کردار کی تفصیل ہے کہ اس کے پتائی لالہ پر شوقم داس تھا، انداز رنگوں باندھے تل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندا رکھے اور بڑی توڑ بڑھائے کو پھینک دیا۔ — آہ کاس جس رہے تھے۔ سامنے بالٹی میں ایک درجن کے قریب ام بڑے تھے جو انہوں نے ایک شیشے والے سے اس کا چالان لٹا کر حاصل کیے تھے۔ گوہر الہی کی بیٹی نے دہاتھا اور تل کی مر دیاں بنا دہاتھا جب اس نے ہاتھ صاف کرنے کے لیے بالٹی میں ڈالے تھے اور چپکے سے ایک آم ان ناپا ہاتھا آلودگی نے بڑے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوٹے سے آم کو کو پھینک دیا۔ — منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا، ابے شرم تجھے بڑوں کا لٹا کرنا جانے کب آئے گا۔ — اور نھو کے کردار کی جزئیات ان جہلوں میں موجود ہے۔ — منظر کو گلوں کے درجہ پر ہے اور اس کے اندر چنے والے کا ماحول معلوم تھا۔ مثال کے طور پر اسے معلوم تھا کہ بڑی کی گائے نے بیس سو روپے ایک بکھر دیا ہے اور مادھو کے منگے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی ہے۔ — کا ماحول اپنی کو پھینک کے بال چھوڑ دہاتھا کہ اس کے ہاتھ سے آئینہ لڑکھڑکھ گیا اور ایک سیر فو دو کو کھریے نانی کو بطور قیمت دینا پڑے۔ — اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ دو اچلوں پر پر تمام اور گلوں کی بیچ بیچ جوتے جوتے رہ گئی تھی اور سالک دام نے اپنے بچوں کو پاؤں بٹھون کر کھلائے تھے۔ — حالانکہ وہ بیچنے کے منہ کی کھاتا کہ ان کو چوں والی کوئی شے نہ دیکھی جاتے۔ — اور ایک نظم کہنے کے ماحول کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔ — چلوں کی نظریں کی شرمگ نام شب ہو آ رہی تھی۔ رات کے ٹھکے ہاتھ کے۔ آئینہ کمری کے کمرے میں جو کھینچی کے دلن نے اپنے ایک۔ آپ کے لیے خاص طور پر تیار کیا تھا اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹ اور ایکٹریس سیٹھ کی ہال حالت پر جمع ہو گیا کرتے تھے، مہروں اور کرسیوں پر اوٹھ رہے تھے۔ — اس چوٹی کمرے کے ایک کونے میں جلی تپانی کے اوپر دس پسندہ پائے کی خالی سیالیاں دو دسی سیدھی بڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ نہ کرنے کے لیے ان ایکٹریسوں نے لی تھیں۔ — ان بیڈروں پر سیٹھ کڑوں کھینچاں بیٹھنا ہی تھیں۔ — کمرے کے باہر ان کی بیٹھنا بیٹھ سن کر کسی فواد کو کسی معلوم ہوتا کہ اندر کبلی لا بکھا چل رہا ہے۔ — اور سوگندھی کے ماحول کی تصویر اس طرح بنائی ہے۔ — "اور آج پر دستک ہوتی۔ — رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب اکوڑ کافوں میں دستک کی آواز بیٹھنا بیٹھ سن کر کچھ۔ — "اور آج جب اندر سے کھٹکھٹایا گیا تو وہ چرک کر کھڑی ہوئی۔ — وہ ٹی ٹی ٹی ٹی اور دھاتوں کی کڑیوں میں بیٹھنے ہوئے پھیلی کے بڑوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کھٹکھٹا اور لیسوار تھا۔ دھاتی کے چلو سے اس نے یہ جہلوار لعاب صاف کیا اور آکھیں ملنے لگی۔ — چٹک پر وہ لکٹی تھی۔ — چٹک کو اس نے چٹک کے نیچے دیکھا تو اس کا منہ سوگندھی کے چلوں پر رنڈے سے سوراخ تھا۔ —

اور شرمش خشی و شباب کے طوفان اور لگ بھگ ہر ایک معنوی اس طرح کی ہے۔ شادیوں کی ریشیں ہر اس سٹ، کھٹ لگی شلوہوں کی کھڑکھڑاہٹ اور بڑوں کی کھٹکھٹاہٹ جو اس تیرنے لگی۔ کھٹاتے ہوئے کھڑوں پر دوڑا لگتی ہوئی ہیں، نکلے نکلے سینوں پر زور دے کر نکال رہی ہیں۔ آوازیں، اور کئی ڈری کے بولوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں، چمکتی ہوئی انگلیاں اور کھٹے ہوئے سچے، چمکتی ہوئی گیس اور پھولان المڑ و کیوں کی آہیں میں سرگرم شیشیں — یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگا تھا کہ گی کے پھرے فرش پر جس و شباب اپنے قدم سے اپنے مسافے گھور رہا ہے۔ منظر کے افسانے اس طرح کی تفصیل و جزئیات سے بھرے پڑے ہیں۔ اس تفصیل و جزئیات سے اس افسانہ اور اول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے جس میں حقیقتیں پر روشنی پڑتی ہیں، اسی لیے منظر کو یہ تفصیل و جزئیات زندگی کی ان گنت حقیقتوں کو ظاہر کرنے کا ایک وسیلہ اور ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ منظر نے اپنے افسانے میں تفصیل و جزئیات سے یہ کام کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، منظر کے یہاں محض خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اس نے حقیقتوں کو ظاہر کرنے کی بنیاد تفصیل پر نہیں رکھی ہے۔ ان کو جو سیر اور اس وقت پیش کر دیا ہے۔ لیکن جگہ جگہ حقیقتوں کو واضح کرنے میں جو انداز یا یہ اختیار کیا ہے، اس میں منظر کی رنگ آمیزی ضرور نظر آتی ہے۔ اس رنگ آمیزی سے منظر نے حقیقتوں کو نمایاں طور پر پیش کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ اس کے افسانہ اور منظر کی رنگ آمیزی کا مقصد صرف اسلوب کی پرکاشی ہی نہیں، بعض بنیادی معاملات کی توضیح و تشریح ہے۔ اسی لیے حقیقت کی رنگ آمیزی منظر کے یہاں مقصد نہیں ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور اس فیلے سے مختلف حقیقتوں کو واضح کرنے کا جو مقصد ہے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ منظر کے افسانوں میں ویسے ہی تعلقات پر حقیقت کا حسن بھی نمایاں ہوتا ہے اور اس کی حقیقت بھی — جگر شلوہوں کا ناز بارہ منج ہے کہ جب یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے تو حقیقت حسن بن جاتی ہے اور حسن حقیقت کا ادب اختیار کرتا ہے۔ منظر کے ہر افسانے میں ایسے مقامات آتے ہیں اور ان کے بنیادی موضوعات میں جو مختلف حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں ان پر مختلف نالیوں سے روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ جگہ جگہ کی رنگیں کاری کے باعث کئے جیسے لیکن حقیقت سے کئے بھر پور ہیں۔

”بھرنگی بھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈپے کو جسے اپنی نے دھکا دے کر چھوڑا اور بائیکلے چلوڑا پر چڑھا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی چٹری پر دھکا دے کر پھینک دیا ہے اور وہ خود بخود جارہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چل جا رہی ہے۔“ (کالی شلوہ)

”شام کا بیٹھا تھا۔ مٹی مٹی ہو چکی تھی اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اسی گھل ہوئی تھی جو ان کو دے آدھوں کے دل میں ایسی اور اسی ضرور موجود ہوتی ہے جو سب کو ایسے قوتوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتا ہے۔ میرے بعض پر ایک کچھ عادی ہو گئی جب میں نے جو ہر کے سفیدی کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو کم آلود ہوا میں یوں ملتی ہیں جیسے ہلادی بھاری برقی ساڑھیوں میں کہ اور ترس جاتی ہیں۔“ (پیشانی کا سبب)

ہر شے پر کھائی دیتی تھی جیسے ہلوں کے وزن کے نیچے دلی ہوئی ہے۔ موسم بھر ایسی ہی

کیفیت کا حال قباور کے ٹختے پر کھٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔“ (دھواں)
 تو پھر اس طرح کھٹی جیسے کسی نے بندی سے دھکی پڑے کا تھان کھول کر نیسے پھینک دیا ہے۔
 (مصری کی ڈولی)

”اس کے اندر ش زدہ تھنے نے جھونک جھونک کر بلا صو کو کرے سے باہر نکال دیا۔ بیڑیاں
 اُتار کر جب گنا اپنی ٹھٹھنڈ ڈوم بلا تا سو گندھی کے پاس واپس آیا اس کے قدروں کے پاس
 بیڑ کر کان چڑھنے لگا تو سو گندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک جھونک
 بنا ڈھونکا۔ ایسا ستا ابراس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ”ہے ایسا ناگہر شے
 خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے لڑی ہوئی ریل گاڑی سب شیشیوں پر مسافر زادکر
 اب لوہے کے ٹیڈ میں بالکل ریل کھڑی ہے۔“ (ہٹک)

”تا چونکی ماں کھڑکی کے ساتھ گی، خاموش اور نیم دوشی جھونک پھیل گئی ہوئی کچھ تو محنت بھری
 نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کھڑکی کے اس طرف لوہے کے کچھ پر ایک دھیس دھیس کی سڑی
 میں چھوڑی ستری کی طرح اونگھ رہی تھی۔ سامنے بھٹیاریے کی بندھوکان کے باہر سچ تو سچ
 اٹھکشی میں سے کوٹوں کی چنگاریاں خدی تھیں کی طرح پھل پھل کر نچے گر رہی تھیں۔“
 (سوم تھی کے آنسو)

”تیرے دھیس ہاتھ کو ایک اونچا ٹیلہ تھا جس کے ڈھلوانوں میں گندم کے ہرے پودے
 نہایت ہی دم سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ یہ سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی
 تھی۔ انھیں بند کر لو تو یہ معلوم ہوتا کہ تصور کے گوندے قلعینوں پر کئی گنواں ریشمی
 ساڑھی پہنے چل پھر رہی تھی۔“ (دوسم کی شراوت)

”یہاں جیسا تھا وہاں دو باتوں، ایک بجراتی اور ایک پارسی زبانے ب کے جھرمٹے تھے۔
 دونوں بگڑتی رہتے تھے، مگر مختلف اب دھیس پارسی کی آواز میں دوڑتے کبھی پارسی
 ٹر میں بات کرتا تھا، کبھی سوٹے ٹر میں۔ جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا
 معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے۔“ (بانجھ)

”شہر میں بانجھ کے تھرکے جوئے تاروں کی جھنکار میں پائی جاتی ہے۔ آپ یہ نام پکارئیے
 تو ایسا معلوم ہو گا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پر نوازے گا پھر دیا ہے۔“

(طروش)

”اُس بانا کا راستہ ہم جانتے تھے، جہاں لڑتیں لی سکتی ہیں۔ کالی نیل، پیلی، مال اور

جہاں رنگ کی گہرائیں، پیشوں کی طرح ان کے مکان ایک قطار میں گودھک دوڑتے چلتے ہیں۔ یہ دیکھ کر بھی گہری باتیں ان میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند ٹپکی رہتی ہیں۔ آپ نیچے سے ٹوپی لے کر پھر بارگاہیں گرا سکتے ہیں؟ (دہچان)

ان اعتبارات میں تخیل کی رنگ آمیزی اپنے شباب پر ہے، اور اس رنگ آمیزی نے ان میں بلاکسٹن پیدا کر دیا ہے۔ لیکن یہاں تخیل کی رنگ آمیزی عذابِ خواتینِ ہمیت نہیں رکھتی جتنی کہ وہ حقیقتیں جن کو غنڈہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مقصدِ رشیدہ نظر آتا ہے۔ ان بلاکسٹن برائے شمس نہیں ہے بلکہ صحن برائے حقیقت ہے اور اسی لیے ان میں یہ ایک وقت حقیقت کا صحن بھی نظر آتا ہے اور صحن کی حقیقت بھی!

منٹو اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اس میں اس کا کوئی ثانی نہیں!

اب تک منٹو کی حقیقت نگاری پر جو بحث ہوئی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منٹو کے یہاں حقیقت نگاری کا میدان محدود نہیں ہے۔ اس کے فنی میں اس حقیقت نگاری کے بے شمار پہلو ہیں۔ ان کی گنت روپ ہیں، اور اس کی حقیقت کو دیکھنے والی نگاہیں ان تمام شعروں پہلوؤں کو دیکھتی ہیں۔ یہ سارے مختلف روپ اس کے سامنے آتے ہیں اس نے عام انسانی زندگی کے حقائق کو بھی دیکھا ہے، سماجی زندگی کے معاملات و مسائل کی حقیقتیں بھی اس کے سامنے آتی ہیں۔ انسانی نفسیات کے تاریخی اور ایب کمال دونوں پہلوؤں کے حقائق اس کی نظروں کے سامنے رہے ہیں۔ لیکن ان سب کو پیش کرنے میں وہ خود ماری رہا ہے۔ کیوں کہیں ایب تاریخی نفسیات کو پیش کرتے ہوئے تھوڑی سی احتیاط پسندی اس کے یہاں ضرور پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی وہ عام انسانی سطح سے نیچے نہیں گرتا۔ برخلاف اس کے ایسے مقامات پر تو اس کی حقیقت نگاری اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ جاتی ہے۔ باوجود یہی ناخوشگوار حقائق اور مرنے والی اس کے لیے یہی شاہکار انسان ہے۔ بلاشبہ یہ یقینوں کو دہرا دیکھنے میں عجیب معلوم ہوتے ہیں لیکن عجیب دکھانے کے باوجود منٹو انسانی زندگی کی حقیقت سے پیش کرتا ہے۔ اور اسی لیے ان کی تمام حرکات و سکنات حقیقت سے اتنی قریب نظر آتی ہے۔ منٹو نے ہی سب کی حقیقت کے روپ میں دیکھا ہے یہاں میں اسے حقیقت کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔ ان حقیقتوں کو کیسے کہیں اس نے حالات و واقعات اور معاملات و مسائل میں بھی تلاش کیا ہے۔ اور اسی لیے اس کے یہاں فضا اور اعمال کے بھی بعض بہت اچھے افسانے ملتے ہیں لیکن حقیقتوں کو دیکھنے کا جو حکمہ اسے کارروائی میں حاصل ہے، اس کی مثال سارے ادبِ افسانے میں کیوں اور نہیں مل سکتی۔ اسی لیے اس کے بہترین افسانے کارروائی کے مطالعے پر مشتمل ہیں۔ اور ان افسانوں میں حقیقت نگاری کا کمال نظر آتا ہے۔ بہر حال منٹو کے یہاں تنوعات کی حقیقت نگاری اور حقیقت نگاری کے تنوعات ہیں۔ لیکن ان میں ہر چیز مشترک ہے۔ اور وہ ہے ایک انسانی زاویہ نظر!

یہ انسانی زاویہ نظر منٹو کی حقیقت نگاری کی بنیاد ہے۔ اور اسی زاویہ نظر کا یہ اثر ہے کہ منٹو کے تمام افسانوں میں انسانیت اور انسان دوستی کی ایک گہری و بڑی جوتی نظر آتی ہے۔ وہ انسانی طور پر ایک انسانیت (HUMANISM)

ہے اور اس انسان دوستی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ انسانی زندگی اور اس کے مختلف مظاہر سے گہری محسوس رکھتا ہے۔ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے، جو کچھ بھی سوچتا ہے، مخلوقان سب کو دیکھنے کا فائدہ ہی ہے۔ اسی لیے اس کے یہاں عام انسانوں کے جذبات و احساسات، واردات و کیفیات، ان کی آرزوئیں اور تمنائیں، ان کی محسوسات اور وابستیاں سب کی حقیقت سے ہمہ گیر تصویریں موجود ہیں۔ اس سلسلے کے کسی پہلو کو بھی منٹو نے چھوڑا نہیں ہے۔ ہر پہلو کی ترجمانی کی ہے۔

لیکن منٹو کی انسانیت اور انسان دوستی صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے۔ وہ سماجی معاملات سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ منٹو کے یہاں اس حقیقت کا گہرا شعور ہے کہ انسانی زندگی میں فرد ہی سب کچھ نہیں ہے۔ سماجی معاملات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ فرد بہ حالِ سماج کا ایک بڑا ہوتا ہے اور سماجی حالات اس کو ہر اعتبار سے متاثر کرتے ہیں۔ چنانچہ سماجی زندگی کے ایسے معاملات کی ترجمانی جن سے افراد کی زندگی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوتی ہے، منٹو نے بھی لے کر ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ان مظالم کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا ہے جو مذکورہ کے خلاف نظامِ اقتدار نے تاریخ کے مختلف ادوار میں افراد پر روا رکھے ہیں اور جن کی وجہ سے انسانیت کا ہر وہ مسخ ہو گیا ہے۔ زندگی کو جس سانچے میں ڈھلنا پلیدے تھا نہیں ڈھل سکی ہے۔ اور اس کی رفتار آٹھ گھنٹہ پر ہوتا ہے۔ اس میں زندگی اور تباہی کی ہے۔ اور خوش اس گنگی اور تباہی کی ہے۔

گڑبھٹا ہے۔ اس پر غصے کے آنسو بہتا ہے۔ اس طرح اس کے تمام پہلو افراد پر روشنی ہو جاتے ہیں، لیکن خود منٹو ان کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ ان حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے کوئی واضح لا محضل منٹو کے یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ ان کو دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ اُسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ ان حالات کو ٹھیک کس طرح کیا جائے۔ بہتر کس طرح بنایا جائے۔ لیکن اس کی قریبوں میں ان حالات سے بیزاری ضرور محسوس ہوتی ہے۔ وہ ان سے باہر نکلنے کا احساس دلاتا ہے، ضرور مسکوم ہوتا ہے۔

منٹو کے یہاں ان حالات کی تنقید نہیں ہے۔ عکاسی ہی عکاسی ہے، ترجمانی ہی ترجمانی ہے۔ اس عکاسی اور ترجمانی میں کہیں کہیں فطرت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ اور اس فطرت سے کسی حد تک تنقید کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ زندگی کی ترجمانی اور عکاسی میں دو چیزیں منٹو کا اس میں بھی نہیں چھوڑتیں۔ ایک تو عقلی ذورِ نظر اور دوسرے عام انسانی ہمدردی۔ منٹو انسانی روح کا تامل ہے۔ اسی لیے انسانی زندگی اور اس کے مختلف معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ ایک عقلی ذورِ نظر اختیار کرتا ہے۔ اُسے جذبات کے دھارے پر بہنا نہیں آتا۔ اسی لیے اس کے یہاں جذباتیت نام کو بھی پیدا نہیں ہوتی۔ عقل و شعور ہر جگہ کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان سب کی ہمیں انسانی ہمدردی پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ یہی باتیں اُسے انسان دوست بناتی ہیں۔ اس انسان دوستی نے اس کی حقیقت نگاری کو زندگی بخشنے میں نمایاں حصہ لیا ہے اور انسانی دوستی سے بڑی حقیقت پسندانہ زندگی میں اور کوئی نہیں۔

منٹو اشتراکی نہیں ہے، اسی لیے اس کے یہاں اشتراکی حقیقت نگاری کا وہ تصور نہیں ابھرتا جس کی بنیاد سماجی زندگی کے طبقاتی اور جلدیاتی شعور پر استوار ہوتی ہے۔ منٹو کے یہاں یہ شعور نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے ادوار شعور کی روشنی میں زندگی کے مختلف اور متنوع حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے اس کے یہاں اشتراکی اور تنقیدی حقیقت نگاری نہیں

لیکن جن حقیقتوں کو اس نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ ہماری عام زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ ان نے اپنے زمانے کی بدلتی ہوئی زندگی کے بدلتے ہوئے معاملات و مسائل سے موضوعات منتخب کیے ہیں اور اس سلسلے میں اس کا ذریعہ نظر ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا ہے۔ اس کے افسانوں میں جو حقیقتیں نظر آتی ہیں وہ اس کے تحقیق کی پیداوار نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ غصہ نے تاریخی طور پر انہیں سماجی زندگی میں دیکھا ہے۔ اُسے ان کی تلاش و جستجو میں کوئی بڑی کاوش نہیں کرنی پڑی ہے۔ زندگی کے شدید احساس اور حالات کے گہرے شعور نے انہیں اس کے سامنے لا کھڑا کر دیا ہے۔ اس کی قوریں اور قوریں نظریں ان سب پر حاوی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لیے اس نے ان حقیقتوں کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کے یہاں جگہ جگہ ان میں سے بعض نئی حقیقتوں کے پیکر ابھرتے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں۔ اور یہی اس کی حقیقت نگاری ہے !

عبادت بریلوی

سعادت حسن منٹو کی یاد میں

چونکہ منٹو کا تعلق کسی خاص ادبی فرقے (SECT) سے نہ تھا اس لیے اس بات کا اندیشہ محسوس کیا جاتا تھا کہ کیسے اس کی لاش پر بلا ہونے کے مختلف ادبی فرقوں کے درمیان خدائی ڈھونڈیں غوثی قسمتی سے منٹو کی اس وقت موت آئی جبکہ ادب میں جمہور تھا اور سیاسی فضا کسی قسم کے جنگلے کے لیے سازگار نہ تھی۔ پھر بھی منٹا ہے کہ جب ان کے انتقال کی خبر و انتقال کیوں موت کی خبر لاہور ڈیڑھ شیشی سے منٹو کی گئی تھی اس لیے ان کے لاش پر قبضہ نہیں ہو پاتے تھے، اگرچہ فرقہ پرست قسم کے لوگ مرحوم کے گھر پر اس نیت سے بھی گئے لیکن وہ لوگ اتنی دیر میں پہنچے کہ ان کی لاش پر قبضہ کیا جا چکا تھا۔ یہ قبضہ شوقیادوں میں کے کسی فرقے نے کیا تھا اور نہ شرکے رؤسا اور بھانڈے اور نہ حکومت نے بلکہ اس انبوہ کیلئے جس میں اکثر و بیشتر کے کرکٹر سوسائٹی کی تنگدستی میں مشغول تھے۔ ان میں سے شاید نادر ہی کوئی ایسا تھا جس کا تعلق دولت کی پیداوار سے براہ راست رہا ہو، اور نہ وہ سب کے سب دولت اڑانے والوں کے لیے سامانی تقریباً ہم پہنچانے والوں میں سے تھے۔

اکثریت یقیناً انہی لوگوں کی تھی لیکن ان میں جا بجا ایسے لوگوں کا چھوڑ کر مزید مشتبہ کرکٹ کے لوگ بھی تھے۔ انہی میں ایک مروی صاحب اور کچھ سکے لوگ بھی تھے جو اپنے مخصوص طبقے کی وجہ سے خواہ مخواہ نمایاں معلوم ہو رہے تھے۔ چونکہ مرحوم مروی اور سکے دونوں کو بدداشت نہیں کر پاتے تھے اس لیے ان کی جگہ دیگر مشتبہ کرکٹ کے لوگوں کے درمیان کھسکے بیٹھ گئی۔ یہ جو بلدی دہ گئی۔ کیونکہ اتنی سی بات پر وہ ان سے مخالفت مول لے کر اپنا بڑا نفس قربان کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کی یہ کالہ بادی رواداری کس قدر قطعی تھی اور وہ اپنے متنازعہ میں کس قدر حسرت پرست واقع ہوئے تھے اس کا اندازہ اس وقت ہوتا جبکہ مروی صاحب نے غلہ جواز کی تیاری میں اپنی دھڑ سی اور شامانا کر زمین پر رکھ دیا۔ وہی گروہ جو چند منٹ پہلے بڑے نفس کا خیال کے خاموش ہو رہا تھا احتجاج پر اتر آیا مروی صاحب نے اعتراض کی نوعیت کو سمجھنا چاہا اور بھیجے سے مخاطب ہو کر کہا: "بھئی میں نے تو بڑا دھڑ سی اور شامانا رکھ دیا ہے اس کا کچھ بھید ہے کہ مرحوم بالخصوص میری ذات سے متعلق اسے کڑھ بھلاؤ گا اور کڑھ کر کہتے تھے۔ وہ مذہب کی اس پریشانی معنی خدمت خلق اور اس قسم کے دوسرے اصول حسنہ کے خلاف نہ تھے لیکن ان طریقوں اور افادوں کے خلاف مخالفت تھی جس کی کہیں گاہ سے انسان کو شکار کیا جاتا ہے۔ مرحوم کی ایک کافی صاحب کا بات قرآن پر حضرات نے فریادیں ہی ہوگی۔ میں بھی اس کی مانی کا ہیرو یا دہیں ہوں اور نہ تو ٹھوس اور بڑا جس کے اتارنے پر اتنا احتجاج ہو رہا ہے وہی ہے جسے ایک باری میں موج کے گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ مروی کے اس اعتراض پر مشتبہ کرکٹ کے لوگوں کے درمیان اور بھی زیادہ احتجاج بڑھا۔ وہ علانیہ کہنے لگے۔ ہم کبھی بھی ایسے مروی کو بھیجے گا تو بڑے سنے کے لیے تیار نہیں جو بددلی جہان ہے نہ اعتراض کی عجیب و غریب نوعیت مروی صاحب کے لیے سخت پریشان کن تھی۔ چنانچہ انھوں نے مجمع کو

ایک بار پھر مطالب کیا حضرات ہمارا تعلق قوم ہیود سے نہیں کہ ہر ایک کام کا افتتاح کے لیے کسی معصوم سنی کو تلاش کریں اور نہ مروجہ نے بھی ایسی تلاش کو بائو کیا۔ وہ تو سب سے زیادہ گنہگار آدمی کو سب سے زیادہ ایک کام کا اہل سمجھتے تھے اور یہ بات حتیٰ پر مبنی ہے جیسا کہ آپ کو اپنے ذاتی تجربے سے بھی علم ہو گا کہ نیک کا تو کل صوف گنہگار آدمیوں ہی پر تو سب سے زیادہ نیک آدمیوں کو تو برائی ہی کی طرف دیکھتے پایا ہے۔ مولوی صاحب کے اس جملے پر (NO PERSONAL REMARK) کا ایک زیروست شروع تھا لیکن مولوی صاحب کی آواز سن کر ہنا کر کے ہنسنے لگی تھی۔ آپ کے ذہن میں میری ذات سے متعلق کچھ غلط فہمیاں ہیں جو غالباً فقہ کی نامواقفیت سے پیدا ہوئی ہیں، میں نے جو کچھ کیا اس کا جواز فقہ میں موجود ہے، کسی اپنی غلطی کو اس کا حلاق دینے والا ہو اس وقت تک مستحق تلافی میں نہیں لاسکتا ہے جب تک وہ غلطی صورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے اور وہ دوسرا مرد اسے طلاق نہ دے۔ فرض کیجیے اگر جوہر کی غلطی صورت میں پہلاں کو میں اپنے نکاح میں نہ لانا اور دوسرے ہی دی بیچ اپنی مرضی سے اسے طلاق نہ دے دیتا تو پھر جوہر کی شادی دوبارہ پہلاں سے کیونکر ہوئی کیونکر اس کا امکان بھی پایا جاتا تھا کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہو تو وہ پہلاں کو طلاق دے دیتا۔ میں نے جو کچھ کیا سوچا اور پہلاں کی بھلائی کے لیے کیا اس میں بغاوت میری زندگی ہے نہ کہ برائی۔ اس پر مجھے خوش ہو گیا حالانکہ اعتراض بد باطن پر تھا۔ اور اسی خاموشی میں چاہی کہ میرے کسی بھی بدعت پر لوگوں نے اعتراض نہیں کیا۔

جب نماز جنازہ ختم ہو چکی اور پھر مرحوم کی لاش کو قبر میں اتارنے کا وقت آیا تو باوجود کہ انھوں نے اسے موزوں، یعنی اور تو باوجود کہ انھوں نے خاص طور سے حضرت علیؓ کو اور گروہ لوگ بھی تھے اور جب یہ دم پر میری سرچھی اور مرحوم کی لاش سنی کے کھانے کی ہانگی تو مولوی صاحب نے اڑیوں سے درخواست کی کہ وہ مرحوم کے ادنیٰ کارناموں پر روشنی ڈالیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ کوئی شخص مرحوم کے اعظا میں اپنا حرمیت مطلب نکاش نہ کرے اس پر ناخوشی حضرات دیکھے بیٹ گئے اور صرف افسانہ نگار حضرات آگے بڑھے۔ اردو کے ایک مشہور افسانہ نگار جنھوں نے اپنی زندگی کے کئی سال عشق کے ساتھ گزاریے تھے، ان کی شخصیت کو آئینہ دکھانا چاہا۔ لیکن وہ جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ ایک ہی آواز جملے کے بعد یہ کہہ کر دوڑنے لگے گریا رشتہ خراب یا رادہ مست تھا افسانہ نگار کے اس ایک جملے نے وہ کام کیا جو غالباً کسی بھی چرٹی تقریر سے ممکن نہ تھا۔ میں نے وہ دیکھا کہ ہر شخص کی آنکھوں میں ہنسو آگئے اور مرحوم کی شخصیت، فرخندگی، راست گری اور دھندلی کی تصویر بن کر چھا گئی اب ان کی جگہ ایک دوسرے مشہور افسانہ نگار تشریف لائے جنھوں نے شخصیت سے بیٹ کر ان کی افسانہ نگاری کو اپنا موضوع بنایا۔

حضرات! مشرقی افسانہ نگاری اس کی شخصیت کا آئینہ ہے اور شخصیت کا یقین خواہ غلط ہو یا صحیح ہم لوگ باعوم آدمی کے مزاج سے کیا کرتے ہیں۔ حکیم جالینوس کا خیال ہے کہ آدمی کے مزاج میں سودا، سفر، بلغم اور خون ان چار اجزاء کے مختلف انواع تناسب کو دخل جوتا ہے لیکن مرحوم نے اپنی شخصیت سے اس حکم کو جھٹلایا۔ ان کے مزاج میں سودا، سفر اور خون تو تھا لیکن بلغم بالکل نہ تھا۔ وہ نہ تو غمی واقع ہوتے تھے اور نہ ہنسو۔ ان کے افسانوں میں غمی اور غمی ہے نہ کہ شہیاد یا حق پر لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے افسانوں میں غمی اس وجہ سے ہے کہ وہ افسانہ نگار تھے پہلے کوئی کڑوا گھونٹ آتا رہتے تھے لیکن میں اسے بالکل صاف غلط سمجھتا ہوں۔ آدمی کو کچھ دیکھا ہوں۔ نہ تو غمی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور نہ اس وجہ سے کہ کسی کے وہاں تلخ ہیں،

یہ بھی آزمائشوں کو چکاہریں، محض اس کے افسانوں کے تحت اور ترش جوئے کا سبب یہ ہے کہ وہ ہم لوگوں سے زیادہ حساس اور زیادہ ذہین واقع ہوا تھا۔ اس کا رد عمل اور اس کی گرفت دونوں ہی ہم لوگوں سے زیادہ تیز اور شدت تھیں۔ وہ جس قسم کے سماج میں رہ رہا تھا اس میں صرف عنفوت اور غلظت ہی نہ تھی بلکہ شدید قسم کی جہانگیری اور دینی بے بسی بھی تھی۔ بڑے سے بڑے حادثات اس طرح پاس سے گزر جاتے جیسے وہ کسی جوانی بندوق کے دہانے سے نکلے ہوں، غلط ہماری اسی بے بسی سے اکتا کر کبھی کبھی اصلی بندوق چلا دیا کرتا اور بالکل ہی سنجیدہ رہتا۔ کیونکہ نہ تو وہ دلے کے لیے مہلتا آؤر نہ ہنسنے کے لیے کھلاتا۔ وہ جو کچھ کرتا وہی اس کا مقصد ہوتا۔ اس کا مقصد سوسائٹی کی دوشیز کو مسترد کر دینے، یعنی دھڑے پر چلنے والے پیسے کو روک دینے کا تھا۔ ایسا آدمی جیتنا باقی ہی کتنا آسان۔ لیکن اس کی بغاوت میں نہیں ہے بلکہ ناکٹ بائس والا انداز ہے۔ اس میں غلبہ نہیں کہ اس قسم کے آدمی کی طرف دہی آتے ہیں جن پر قبول غلامیوں نبوت ضرور ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کتنا بڑے کا کارٹھ سے حمد و برا بھی وہی ہوتے ہیں جو اپنے نبوت کو کھنگالتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی خوبی یہی ہے کہ اس سبب زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے نبوت کو کھنگال دیا تھا۔ وہ صدیوں تک عوام کے تجربات پر زندہ رہنے والے پکا بولنے کے بجائے منکشف جھوٹ بولنا زندگی کے ان تجربات کے ذریعے نہیں جن کا سادہ کج سمجھا جاتے ہیں، بلکہ ان تجربات کے ذریعے جو ہیں خواب میں پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ کشش کے لیے اسی قسم کا میٹرل زندگی سے ملتا ہے اس لیے کہ اس کی کم مقداری پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور یہ اسی ناکست کا نتیجہ ہے کہ فنی کار اپنے آپ کو دہرایا بھی کرتا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے بھی اپنے آپ کو دہرایا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ ہم اسے پکڑ لیں۔ وہ ہر بار اپنے تجربات کے سپلر بدل دیا کرتا۔ منٹو کے اس منکشف جھوٹ کی بنیاد صرف انہی ہی بات پر ہے کہ اگر دنیا کے سارے انسانوں کی کھالی یکساں ہے یہ اعتبار تو اصل توان کی نوع بھی یکساں ہے۔ جیسی ادج دلچسپے فرشتے اسے وہ لوگوں کا تاثرات و امور بتلاتے۔ اگر کھالی راحت اور تکلیف کے اصول کی پابند ہے تو نوع بھی یکساں طور پر نیک و بد کی تیز کی پابند ہے۔ کیونکہ قرابت میں کھلیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اس وقت باغ عدن سے نکالا جبکہ اسی میں نیک و بد کی تیز پیدا ہو گئی تھی چنانچہ ان لاشیاں ہے کہ ایک زندہ آدمی کو اس کی زندگی میں اس قدر امور کی کار فرمائی سے پہچانا جا سکتا ہے وہ اپنے سماج کو غالب کر کے پا چھتے۔ آخر یہ کس قسم کا پلچر ہے۔ یہ کوئی ہی تجارت ہے جس میں اگر کھالی راحت و تکلیف کی جواب دہی سے بے نیاز ہو جاتی ہے تو نوع نیک و بد کی تیز نتائج کو دیتی ہے۔ "کالی ظوار" سے لے کر کھول دو تک میں جہاں انسان کی نوع پیدا کر جاتی ہے اور صرف ظوار اور جاتی ہے اسی تمدن اور پلچر پر مبنی ہے۔ اسی مفر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ منٹو کسی خاص نظام کا نام نہیں لیتا ہے لیکن کیا کافی کا پس منظر نظام کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے۔ منٹو کی کمائیاں اسباب کی طوٹ نہیں بلکہ اثرات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر سٹیشن کا مقدر نہیں پہلایا گیا بلکہ اس بات کا کہ وہ سٹیٹ یا اثرات پیش کرتا ہے اس سے ہمارے پلچر اور تمدن کا مریض ہر لازمی ثابت ہوتا ہے۔ وہ خارجی کمائیوں میں آدمی کو آدمی کے تعلقات نہیں بلکہ آدمی کو خود اس کی ذات کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ اور چونکہ مروجہ آدمی ناخداوند تھا جیسا کہ ہم آپ ہیں اس لیے وہ سٹیٹ کو اس کے حواس کے لئے جاتا۔ اس سے بہت سے لوگ چڑھتے۔ لیکن چڑنے کا اصل سبب یہ نہ تھا کہ جو چیز اشارے اور کنا لے سے بتلانے کی ہے اسے

وہ جاری ناک میں کیوں شونے دیتا ہے بلکہ یہ تھا کہ کیوں نہیں وہ غیر مرض کی باتیں کرتا ہے، کیوں خبر کی ثقہ کے لیے شریک اہمیت کو میں نے نقاب کو کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس سے خبر کا اظہار آج ہی جاتا رہتا ہے۔ آؤ، یہ سوچنے پر مجبور ہوا ہے کہ یہ دونوں ہی جڑوں ہی کے نیچے ہیں ایک کی جڑیں دوسرے کے نیچے جڑتی ہیں۔ خبر کا شمع ہے۔

اٹھی کیسے جوتے ہیں جنہیں بے بندگی خواہش
 ابھی تو شرم و انگیر جوتی ہے عندا کتے

اگر خدا کھنے میں بھی شرم کا ایک پہلو ہے تو ہر زندگی کی خواہش کیوں کی جائے لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم صرف اپنی زندگی ہی پر غور کرتے ہیں؟
تصور یہ ہے کہ یہ آدمی جس کو فلسفیوں نے مختلف نام دے رکھے ہیں بڑا فلسفہ ساز ہی ہے۔ اگر ایک طرف وہ آدمی کو شکار کرنے والا
فلسفہ گذرتا ہے تو دوسری طرف شکاری کو صید کرنے والا فلسفہ بھی وہی گذرتا ہے۔ لیجئے معلوم نہیں مروجہ کے پاس کوئی فلسفہ فلسفہ
تھا یا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان کی ہر کہانی میں شکاری کے لیے استعمال اور سوچنے والے کے لیے تحریک ہوتی۔ اس ایک گڑ
کے علاوہ ان کے پاس لٹنے بٹھنے کا کوئی اور ذائقہ نہ تھا۔ نہ تو وہ اپنے افسانوں میں ہمارے شعور کی طرح تیزو لچکاتے، دھڑپڑپٹتے
یعنی ریبار کو آواز دیتے اور نہ ہمارے جاؤ گڑ شکاری کی طرح ہم وزن فقروں کے گنبد غرق میں اچھلتے اور نہ ہمارے کتب باز طرز اور
مزاحیہ مضموں نگاروں کی طرح لفظ سے لفظ اور جملے سے جملے کی پہچان نکالتے جاتے۔ وہ اس قدر براہ راست قسم کے آدمی تھے کہ وہ ان
پیرزوں کو بھی فرادہ سمجھتے وہ تو صرف آرٹسٹ تھے۔ لفظوں کے انبار کو چیر کر مقصد تک پہنچا جاتے تھے۔ ان کی کشمکشیات اور استعاروں
میں الفاظ کو کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ ہمارے بعض نازک مزاح شرفا کو ان کے اس کمال سے بھی بڑھتی ہے۔

فاضل افسانہ نگاری کی یہ تقریر اس قدر بے منفرد ہو چکی تھی کہ سامعین کے درمیان محنتِ فہم کی گنجائش پیدا ہو گئی، لیکن چونکہ معزز بروشید تھا جیسا کہ بتلایا جاتا ہے کہ وہ افسانہ نگاری چھوڑ کر مزاحیہ کالم لکھنے لگا ہے اس لیے اس نے اپنی تقریر کا شروع مزاحیہ۔
محضرات! آپ گھبراہٹ میں نہیں ابھی میں مرحوم کی زندگی سے متعلق مزے دار باتیں سناؤں گا۔ مرحوم نے ایک بار اردو کے مشہور افسانہ نگار دیوبند مستیادہ قلی کی دارسی کو شرب سے رنگ دیا اور یہ مصرع پڑھا:

۵۔ اسی دفتر کے معنی فرق لئے کتاب اولیٰ

اس پر جمع اور بھی بے فروغ نہ ہو گیا اور انھیں میٹر جانا پڑا۔ ان کا جیٹا تھا کہ جب کترے صاحب جنھیں ساری دنیا جیب کترا ہی کہتی، کھڑے ہو گئے اور پھر مولوی صاحب کی اجازت کے قعر پر کرنے لگے :

تصنفات، ہنسنو صاحب کے آرٹ اور زندگی پر لکھنے کا سچی جیسا مجھے ہے کسی کو نہیں ہے کیونکہ میں انہیں اندر سے جانتا ہوں کیونکہ قبل اس کے کہ میں ان کے آرٹ اور زندگی پر روشنی ڈالوں میں اپنا تعارف کرنا چاہتا ہوں، میں جیب کتراہوں جس نے ایک جھوٹی کہانی میں بیگم میر زمان کے ہیئر بیگ سے ان کا (LOVE LETTER) اڈا دیا تھا اور میں نے ہی ایک ریڈ یاٹی ڈرائے میں بلا کر اس کا ہیئر بیگ واپس کیا تھا۔ میرا نام خدو کا نشی ہے اور نہ گھانسی، نام اس کو دیا جاتا ہے جس کی کوئی ضرورت ہوتی ہے اور جو کہ میں اپنے خالق کے ہاتھوں اس صفت سے محروم رہا ہوں اس لیے وہ مجھے صرف جیب کترا کہہ کر یاد کرتے اور

شارٹ ٹائم میں صرف جب تک (TACK) کر کر بکایا کرتے جہاں کسی (HYPOCRITE) طرح پرش کو جالتے دیکھا، بارے جب تک اس کا پھر پاٹ اور دے گا اور دوسرا ہوتا نہ کریں، چنانچہ مجھے دوسرے کا چور کیا جانے کو نہ کہ مجھ میں اپنی اخلاقیات تو ہے ہی نہیں تو یہ نام فخر مناسب نہ ہوگا، بشرط صاحب نے میرے وجود کی اس کمزوری سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے جب بھی انھیں اپنے فطریات کے لیے کوئی دوسرا ذمہ تو مجھے بلا لیتے، اور یہ بات تو آپ حضرات جانتے ہی ہیں کہ فطرہ صفت منفی ہوتا ہے بلکہ اصلی خاصیت سے بھی عاری ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کی کمزوریاں سلنے آجاتی ہیں اور وہ خود ایک گراؤ میں مبتلا جاتا ہے۔ ایک فطرہ نگاہ پر داشت کرنے کے لیے بہت ہی مذہب قسم قسم کی سوسائٹی کی ضرورت ہے جسے آئینہ قبول آتا ہی نہ ہو، بشرط صاحب اصل میں اسی پیشے کے آدمی تھے اور اس کی اخلاقیات کو سختی سے بہتے، جس میں آدمی کے دشمن پر نظر کیا جاتا ہے نہ کہ اپنے دشمن پر چنانچہ وہ غالب کو بہت پسند کرتے۔ ایک بار وینس میں نے پوچھا، تمہیں نے آپ کی زبان سے کبھی اکبر الہ آبادی کا کوئی مصرع نہیں سنا۔ تو نے جب تک میں فرسٹ کلاس آدمی کو پسند کرتا ہوں، فرسٹ کلاس آدمی کے پاس کوئی تعصب، کوئی چر پاٹ نہیں ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کی شہر وانی کے استری میں بائیں جانب ڈپ لگا ہوا چور پاٹ تھا جہاں سے اکثر ایک قلابی بوتل اترتا تھا۔ غالب کے فزل میں اس قسم کا کوئی بھی چر پاٹ نہ تھا۔ اس پر میں نے پوچھا تو فرما آپ (HYPOCRITE) سے اس قدر کچھ خطا رہتے ہیں تو بولے تو نہیں جانتا ہے، ہر کوٹ اسٹیک کے ایکٹر کو کہتے ہیں جو زندگی میں اپنا بول نہیں بلکہ دوسروں کا بول ادا کرتا رہتا ہے۔ اس سے نہ صفت اس کی بلکہ دوسروں کی بھی ایچ اے اخلاقی حرمت ماری جاتی ہے کیونکہ اس کا صوبہ دوسروں کو لگتا رہتا ہے اور ان کی نفسی جرات ہے ذکر کرنا۔ چنانچہ میرے سب اسی کا مدلل تھا۔

حضرات! وہ آپ لوگوں کے دماغ میں جالتے یعنی اچھے آدمیوں کے دماغ میں جالتے جو اپنے پیشے میں ہرچیز دماغی تھی، یعنی وہ فوٹو یا ٹریوں کا طبع کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنی نیت سے بالکل متدست ہیں، کیونکہ وہ اپنے پیشے کو نہ چھپانے پر مجبور ہیں انہیں کیس سے مالی کی آواز سنائی دیتی ہے، بشرط صاحب حقیقت تک پہنچنے اور سوسائٹی سے اس کے مرض کو خارج کرنے کا ہر راستہ اختیار کرتے اس پر ان کے بعض دوستوں سے بڑی بحث رہتی۔ وہ کہتے منظور تم مسئلے کو کیوں اخلاقی سرے سے بھٹکتے ہو۔ کیوں نہیں سیاستی، اقتصادی سرے سے بھٹکتے ہو، کیوں نہیں طبقات، میٹروپولیٹن اور ریفو اور انقلاب کی شطرنج میں سوچتے ہو؟ اس کے جواب میں بشرط صاحب کہتے "تم لوگ بعض اوقات فوری مقاصد پر اتنا زور دیتے ہو کہ دیکھو انصاف، ایسی نظروں سے احوال ہر وقت ہے، بعض اوقات نظام پر اتنا زور دیتے ہو کہ آدمی گم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات دوستوں پر اتنا زور دیتے ہو کہ مقصد کو دیکھتے ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم لوگ مجھے سکھانے کے بجائے میرے آرٹ کی اسپرٹ کو دیکھ سکو، اگر ایک دھڑلے سے لیے فوٹو، فوٹو کے فرد جو خود مل مقصد سے فوٹو اہم ہے اور میں اپنے افسانوں میں وہ سب جیش کرتا ہوں جو کچھ کہنا ان کہتے ہیں نہ کہ وہ سب ناہید جو کہ انھیں کرنا چاہیے تو دوسری طرف مجھ میں ایک اخلاقی حس (SENSE) بھی ہے جو ان کے اعمال کے نالے ہانے میں نیکی کے دھانے کو دھندھریاں نکالتی ہے، یہی میرے آرٹ کا وہ اخلاقی پہلو ہے جو کہ تمنا چاہیے میں پائی جاتا ہے۔"

حضرات! بشرط صاحب نے اپنے آرٹ میں 'جے' کو بونے سے کھوایا ملا دیا ہے کہ ان کا پروڈیگٹا یا ایجیٹیشن آرٹ بن گیا

ہے۔ ذکاوت کا آئینہ پرور ٹیٹا یا لڑکی پیش برکر رہ گیا ہے۔ منٹو صاحب ایک مرمٹ اور مٹھ دو فوں میں ہیں جیسا کہ دنیا کے تمام بڑے فنکار گزرتے ہیں۔ بد نصیب تاجیک کلچر میں نے اپنی ذرا غفوری اور تسخ غفوری کے میں ہیں کیا کہ نہیں دیا، جتنی کہ غم پر ہی دیا۔ تاج سے نہیں بلکہ صورتوں سے مل گیا ہوا ہے۔ اور یہ مل اس کے کلچر پر اس کی تمام صورتوں میں اخلاق پہنچ رہی ہے کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ سیاست کا پہلو اس سے رنگ نہیں لگتا، کیونکہ دنیا نامکون ہے۔ منٹو صاحب اسی گونڈا اور ٹریڈیشن کے آدمی تھے۔ وہ بالوک، گول، زولا، موہیاں، ٹاسٹائی، رچھوت، گورکھ اور کیم چند کی روایت کے آدمی تھے، اگرچہ اس کے وہ روایت پرست نہ تھے۔

حضرات انسانی مسائل کو دیکھنے کے ہیں دو طریقے ہیں، یا تو انہیں سیاسیات اور اقتصادیات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے یا پھر اخلاقیات کی روشنی میں، ہمارے اوپان دونوں طریق کار کی اثر آفرینی اور زور دہی پر بحث تو حق کر سکتے ہیں۔ لیکن جو بحث میں لائے گی نہیں ہے وہ یہ کہ ان میں سے کوئی بھی طریق کار واحد طور پر کسی فن کار کے آرٹ کو بلند نہیں کر سکتا ہے۔ یہاں غفلت و اصرار بہت ہی اہم ہے، اس کے لیے کچھ اور چیزیں بھی چاہئیں جن پر ہمارے ناقدین باور دہنی ڈالتے رہتے ہیں۔ آرٹ وہی بلند ہوگا جو زندہ ہوگا، مذکر نفس اور جامد۔ منٹو صاحب کے آرٹ میں وہ جان موجود ہے جو کمال کی ایک داخلی وحدت اور سلیست میں ڈھانپنے اور اپنی یا شعرات کو تو اس سے مخاطب کرنے سے زیادہ ہوتی ہے، اس لحاظ سے منٹو صاحب ایک بڑے فن کار تھے جو کہ ان کے ہم عصر فنانسٹ نگار نہیں ہیں۔ خواہ وہ اردو میں لکھتے ہوں، ہندی میں لکھتے ہوں یا انگریزی میں، منٹو صاحب کو موہیاں کے ساتھی ملنا ہوگا۔ لیکن یہ بات احمقوی رہ جائے گی اگر اس میں غلاب مرتضیٰ میں ان کی انسان نگاری کی کچھ تنقید نہ شامل کریں گے۔ منٹو صاحب کی تنقید تجارتی کلچر پر (INFERENTIAL) ہے۔ ذکر مبالغہ یا براہ راست، وہ آدمی پر زیادہ اور اس کے لگے ہیں جو تجربے اس پر کم تر رہتے ہیں۔ یہاں کم کا لفظ بھی کافی اہم ہے۔ ان کی زیادہ تر توجہ اسی بات پر رہتی ہے کہ دیکھو اس شخص کو گام اس اوپان، اس ٹھنڈا اور بھڑکے کو یہ تجارتی کلچر کے کوٹھ میں چسپ کر بھی انسان ہے، اس میں نیکی کا جوہر — ہمدردی اور قربانی کا جذبہ زندہ ہے، منٹو کا یہ دیکھنا کہ ان کی انسان دوستی کا نشان ہے وہاں تک ہے۔ اس لیے نہیں کہ ایسا نہیں ہوتا ہے ایسا تو اکثر ہی ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ اس سے آدمی کو کوٹھ سے نکلنے میں مدد نہیں ملتی ہے۔ یوں تو مرموم کو نہ تو آنت سے دھپسی ہے (معلوم نہیں یہ کون سا فلسفی ہے) اور نہ کانٹ سے اور نہ کارل مارکس سے اور نہ فوئیٹکے سے کیونکہ ان کے اس دیکھنا کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بزرگ کے جینا میں (CHINAMAN) کی طرح وہ بھی اسی کو ٹھیک سمجھتے تھے کہ انسان میں اخلاقی حسی (SENSE) فطری ہوتی ہے، اب یہ بات دوسری ہے کہ مرموم اس (METAPHYSICS) کو ٹھنڈا دیا جاتے جہاں اس کی توجہ وہ دنیا میں بھی نہ کرتا مرموم کی کمائیوں میں چھل رہا نیست ہے۔ ان کی اسی نرال اور سے متعلق ہوتی ہے وہ ہر کام غیر متعلق کرتے تھے۔ لیکن وہ اپنی اس ٹھانائیت میں اس قدر زیادہ چسپ لگے تھے کہ وہ محض ذہانت سے زبان اور اکتسابی ذہانت سے کم کام لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی ہمارے یہاں پڑے لکھے اور خامانہ لوگوں میں کم ہی فرق ہے، کیونکہ اگر ایک علم سے بے بہرہ ہے تو دوسرا انسانی حیثیت سے علم کے تخلیقی جوہر اور تطبیق سے بے بہرہ ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ

علم لایکا کی پہلا ہمارے بادل ہی ہے کہ ہے۔ کیونکہ میں اپنے ملک کی ہیئت کو بھی دیکھنا ہوگا۔ ہمارے یہاں مسلوں سے کتاب و لسان کے عمل سے ملنے دہی ہے۔ ہم بقراط، ارسطو اور اقلید کو اس زمانے میں بھی پڑھتے رہے ہیں جبکہ ان کی کتابوں پر غور و نظر کیا گیا تھا۔ یہاں خاصا یہیں کچھ دنوں تک سوئی ہوئی کتاب پڑھنے والے چشمہ لگائے والے دوسروں کے قول و قول پیش کرنے والے، بعض علماء کو براہ راست کرنا پڑے گا۔ کیونکہ انہی کی غلط باتوں سے جوں صحیح باتوں کا علم ہوگا۔ لیکن مرحوم اس قسم کے علم کی سماجی اور نفسیاتی باریکدہ میں نہ باتے، وہ جہاں کہیں کسی آدمی کو دوسرے کا قول پیش کرتے تھے اسے ذکر کرتے۔ غلطی ہے یہ سب اس وجہ سے، ہاں ہر کچھ لوگ انہیں غلط طور سے پڑھنے سے پہلے چند دوسروں کے حکمران کا نام لے لیا کرتے تھے چنانچہ ایک بار کسی شخص نے فریڈ کے نام سے بسم اللہ کہہ کر یہ لکھ دیا کہ غوث کی عدالت مزے دار ہے۔ اس پر وہ سخت خفا ہوئے، بولے: "جیک تو کہتا تھا، یہ غوث کی عدالت کتنی کرکری ہے، وہ تو مرکا بھوت بھگارتی ہے بھلا وہ مزے دار کیا ہوگی، لیکن میں نے ان کے اس وقتی و عمل پر زیادہ توجہ نہ دی کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان میں دوسروں کی بات کو رد کر دینے کی بھی عدالت ہے۔ یہ ج قویہ ہے کہ ان کی عدالت، میری مراد ان کے غرضت کے واسطے ہے، نہ تو مزے دار ہے اور نہ کرکری بلکہ وہی ہے جو ان کی ایک کسان کی شرک کے کہاتے ہیں ہے۔" عدالت اور مردوں میں ہی ان کی ایک نقطہ نہاتے ہیں۔ لیکن ایسا لگوں ہے: "غیر صاحب پرچہ تھے میں کو اس کائنات میں ایک روح کبھی کبھی گھائی چھوڑ دی جاتی ہے، کیا اس تصور پر کہ اس نے دوسری روح کو اس نکتے پر پہنچے ہیں مدد کی تھی؟ لیکن نا انصافی کے اس زخم کے باوجود اس کی ماسٹر دوسرے نہیں داتی ہے وہ جتنی دیتی ہے تیسرے بھرتے، چوتھے دوسرے کے برتن کو اور نہ جانے کہ وہ: "غیر صاحب لے اپنی زندگی میں میں ہی ایک لیرک (LYRIC) کہتی ہے۔ اس نے نہیں کہاں میں لیریزم کہی سے تم ہے یا کہ ان کے مذہب کا کل اور تباہیہا کہ بعض عقائد کے کہنے کا انداز ہے بلکہ اس لیے کہ ان کے سینے میں جہت نہی گویاں پرست نہیں جس سے ان میں انتقام کا جذبہ ابھرا یا تھا۔ وہ کوئی سیاسی آدمی نہ تھے۔ لیکن جب اپنی گوشہ نشینی کے باوجود دوسروں کی سیاست سے مجروح ہو جاتے تو وہ کریاں بھارت کر یا نظر آتے۔ پہلی دفعہ جب انہیں جیل لیا گیا تو انہیں زخمی کیا گیا تو انہوں نے دو کمانیاں لکھیں "تیا قانون" اسی کا وہ عمل تھا۔ دوسری دفعہ جب شمس میں انہیں خود اپنے ظہر میں زخمی کیا گیا تو وہ بھی بہت زیادہ زخمی ہو گئے تھے۔ ایک دن بہت ہی رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا: "کیا آدمی کو اس وقت تک بھڑکایا جاسکتا ہے جب تک کہ اس میں جھٹکے کا مادہ نہ ہو؟" میں نے کہا: "استاد نا ممکن۔" اس پر انہوں نے پوچھا: "تو چھاپہ بتاؤ یہ مادہ کیونکر نکالے گا؟" میں نے کہا: "ایک طرف سے بند کر دینے میں اور دوسری طرف سے کھول دینے میں۔" انہوں نے غصہ پہنایا تو دوسرے میں کہا: "قریب کا پتھر نہیں بلکہ گھوڑے۔" تقریباً ایک سال تک وہ اسی نرید کر پڑتے رہے کہ ایک گولیاں کے سینے میں پھر پھر سے ہوتی۔ ایک دن بیٹھے بٹائے کسی ساوہ روح نے ان سے جیسا م کی طرف سے کہانی کہنے کی پیش کر دی، ناظران سے وہ اپنی کہانی کا برابر پیسے دیتے اور کبھی کبھار ایڈوانس بھی لے لیتے لیکن معلوم نہیں اس پیشکش میں کیا تھا کہ وہ سنت ہو کھلا گئے۔ پوچھنے لگے: "آخر اسے اس بات کی بہت کیونکر ہوتی؟" میں نے کہا: "دیکھیے مجھ سے جمال عارفانہ تو برتنے نہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہماری روح کی محافظت کے لیے جو حصہ دیکھنا چاہا ہے اس میں نفس و طرح اور نفس و تصویریں

کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ "حضرت امیرلسٹ تو وہ تھے ہی، اس پوائنٹ (POINT) پر باطل جیت ہو گئے۔ پہلے تو یہ کہے کہ شاید میں نے ان پر کوئی حملہ کیا ہے، لیکن انھوں نے خود نوکر سے کام لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ میں نے ایک معمولی مشاہدے کی بات کہی تھی، چنانچہ انھوں نے وہ جو وہ خطوط لکھا یا سام کو لکھے سب اسی کا رد عمل تھا۔ یقیناً بالی ڈو کی ایکٹریس کو طلب کرنا کوئی پسندیدہ بات نہ تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی یہ جھجھلاہٹ کس چیز کا نتیجہ تھی، وہ سوسائٹی میں جانٹر پتوں کو پسند کرتے نہ کہ فطری پتوں کو جو کہ اس وقت جرمنی اور جاپان میں شہل رہے ہیں۔ وہ جس قدر کہ یکٹیکسٹ اور ڈیموکریٹ جمہوریت پسند تھے اتنے ہی کچے مورسٹ تھے۔ "یہ کہنے کے بعد عجیب کترے نے اپنی انگلیوں کے درمیان سے ایک دفتر نکالا اور دعا میں لہرا کر بولہ "حضرات! یہ میری آخری کارستانی ہے، اس نے یہ دفتر مرحوم کے عجیب کفن سے اڑا کر لیا ہے۔ نیچے وہ اس میں کچے تحریر کرتے ہیں۔ جس آج بہت افسردہ ہوں۔ پہلے مجھے ترقی پسند تسلیم کیا جاتا تھا بعد میں یکدم مجھے رجعت پسند بنا دیا گیا ہے۔ ادب فخری دینے والے سورج رہے ہیں اور پھر یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہو رہے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں اور ختروں پر اپنا فخری سینے والی سرکار مجھے ترقی پسند یقین کرتی ہے۔ یعنی ایک سرخا ایک کیرلسٹ، کبھی کبھی جھجھلا کر تجربہ بخش نگاری کا نام لگا دیتی ہے اور دفتر چلا دیتی ہے۔ دوسری طرف یہ سرکار اپنی مطبوعات میں اشتہار دیتی ہے کہ سہولت حسن منظر ہمارے ملک کا بہت بڑا الرب اور انسانہ نگار ہے۔ اس کا قلم گزشتہ ہنگامی دور میں بھی وہاں وہاں رہا۔ میرا افسردہ دل روزنامے کے متلون مزاج سرکار خوش ہو کر ایک تنہ میرے کفن سے ٹانگ دے گی جو میرے داغ عشق کی بہت بڑی ترقی ہو گی نہ (عجیب کفن)۔

"حضرت! عجیب کترے نے مجھے کہ عجیب میں رکھنے سے کہا، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم لوگ مرحوم کی افسردگی کے دونوں اسباب کو شامیں؟

مناز حسین

میرا دوست، میرا دشمن!

ادنی پیر کی چوٹی بیڑیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ جیسی کہی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملنے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی، لیکن یہاں تو وہ نیا آدمی غرتھا جس سے میں پہلے بار ملنے باہر تھی میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاید سے کہا، چلو! پس میں شاید منٹو گھر پر نہ ہوں۔ مگر شاید میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

”وہ شام کو گھر پر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔“

یہ بھیجے سے پرسودے ایک تو منٹو، اور وہ بھی جیتا تھا منٹو۔ مگر میں نے ہی کل کر لیا۔ اسامی کیا۔ مجھے کھا تو نہیں جاتے گا۔ چنے دو جو اس کی زبان کی لوگ پر ڈنک ہے۔ میں بجلہ تو ہوں نہیں جو چورنگ اور کی تو جیتے جاتوں گی۔ چچا جاتی گروں کو بیڑیوں سے لے کے ہم منزل پر پہنچے۔ ٹیسٹ کا اندازہ ہم ہوا تھا۔ ڈراٹنگ روم ٹاکہ میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سینہ اور صاف چنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے لی ہوئی ایک لدی چندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک کوٹھے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

”آئیے آئیے۔“ بڑی خود مریشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا، غلطی سے کرسی پر اکڑوں بیٹھا کہتا تھا اور بہت غصہ نظر آتا تھا۔ لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھینچ کر اس کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا۔ اور بعض وقت جب منٹو ریں رنگ کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہرا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر کھنڈ کا کرتہ پہنا ہوا اور جی ہر کٹ صوری تھی۔

”آدمے میں سمجھتا تھا آپ نہایت کلانی و بلی، سوگی مرلی سی ہوں گی۔“ اس نے دعوت نکال کر بٹھتے ہوئے کہا۔
”آدمے میں سمجھتی تھی آپ نہایت دینگ قسم کے گھیر چکے آتے ہوئے پہچانی ہوں گے۔“ میں نے سوہا رسیدتہ چلو کہیں یہ ایک دم نہ پاپٹے پر سے لے۔

اور دوسرے طرح دونوں پوری تندہی سے جٹ کر مٹ کرنے لگے کہ مجھے اتنے مجھ سے ایک دوسرے سے ناواقف ہو کر ہم نے بڑا گھانا اُٹھا ہوا آدمے پر اکرنا۔ جہاں سے بات، اُجھگتی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا، لہذا دوسری ملاقات کے لیے اُٹھا رکھی۔ کئی گھنٹے ہوا سے چڑھے شیشوں کی طرح گفت و سوغات پر چلے کرتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح غلطی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سننے سے پہلے ہی ہول اُٹھتا ہے اور جو رہا سا تکلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں نے بحث اور بحث نے باقاعدہ لوگ جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گفتگوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک

دوسرے کو نہایت ادنیٰ قسم کے غفلتوں میں اتنی جھکی اندھ کی بحث کر ڈالا۔

گھساہ کے پنج میں میں نے ایک بار کلک سے ہرگز خود سے دیکھا۔ مونے مونے شیشیوں کے پیچھے مکتی جوتی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی انگلیوں پر عین دیکھ کر مجھے بے ساختہ طور کے پرانا یاد آئے۔ مور کے پر اسی انگوٹھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا مگر جب بھی میں نے ان انگوٹھوں کو دیکھا مجھے مور کے پر یاد آئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ اسی میں جیسا غصہ شگفتگی چلے آئے۔ مور کی ہونٹ کی یاغولی تھی۔ ان انگوٹھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انھیں تو میں نے کیس دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قنبر لگاتے، نہ خند کی سے مسکراتے، ہنر کے نشور سلاتے اور پھر ترانے کے عالم میں پھرتے، وہی نازک نازک ہاتھ پر ہر ٹوکرا، بال پکے زرد وندہ گال اور کچھ بے شک سے صاف۔ پیچھے چتے اچانک غصہ کو اچھو لگا اور وہ کھانسنے لگا میرا تھا ٹھنکا۔ یہ کھانسی تو جانی پہچانی سی تھی۔ اسے تو میں نے پہچن سے نہ سنا تھا مجھے کوفت ہونے کی نہ جانے کس بات پر میں نے کہا۔
”یہ باطل غلط“ اور ہم ہا جاہدہ لا پڑے۔

”آپ کی کبھی کد ہی ہیں؟“

”صاف ہے۔“

”دعا نڈل ہے جسے بس؟“

”آپ مجھے بس کیوں کہہ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بس پر نہیں، عورتا میں عورتوں کو بس کم کہتا ہوں۔ میں اپنی بس کو بھی بس نہیں کہتا۔“

”تو پھر مجھے پڑانے کو کہہ رہے ہیں؟“

”نہیں تو وہ کیسے جانا آپ نے؟“

”آپ پیر کو میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلاتے پڑاتے اور اسے پیٹتے رہے یا پھر پڑھاتے رہے؟“ منتر زور سے ہنسا۔

”تب تو میں خود آپ کو بس ہی کہوں گا؟“

”تو اتنا یاد رکھیے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا علاج

کیوں نہیں کرتے؟“

”علاج؟ ٹھیک کر دے ہوتے ہیں۔ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مزاج اچھے تھیں ٹی۔ بی ہے صحت ظاہر

ہے کہ میں نے مکران کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا۔ اور اب تو میں ڈاکٹروں کو حق سمجھتا ہوں۔ ان ہے تو سرخزم

اور باد کو گرنے والے زیادہ مطمئن ہوتے ہیں؟“

”یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔“

”کون بزرگ؟“

”میرے بھائی عظیم بیگ، فوجی ٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر پر عظیم بیگ کے حق پر بحث کونہ رہے۔ آئے تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیا زہی گئے۔ شاید جو چاری پھڑپیں ایک خداک بیٹھے دیکھ رہے تھے جنوک سے تنگ آچکے تھے۔ ملا پہنچے پہنچتے ایک کی جانے کا لڑکا کھا کھا ہی لیا جائے۔ منٹو نے مجھ سے باتیں اوپر چپے نکالنے کو کہا اور خود برٹل سے دوٹی لینے چلا گیا۔

”خدا اُس برنی سے آچار نکال بیٹھے۔ منٹو نے بڑی سے میز پر کھانا لگا دیا اور کئی پٹا لٹوں بیٹھ گیا وہی میز جو دم بھر پہلے ادنی کارکناریوں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی اور نیز کسی سے پہلے آپ کئے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

کھانے کے چرس گرامر مباحث چلا رہا۔ کھوم پھر کر ملاقات کے نیچے دو میز نے گستاخوں و نونو میری دھستی دگ بنا ہوا تھا۔ میں نے بہت لٹا لٹا پا دامر وہ ڈھائی سے اڑا رہا اور اُس کا ایک ایک تار گھسیٹ ڈالا اُسے بڑا حد تک لگا یہ سن کر کہ مجھے ملاقات کیلئے پر ہنسوس ہے۔ خوب بلی کٹی لٹنا ڈالیں اور مجھے نہایت بڑی اور کم نظر کوہ ڈالا۔ میں ملاقات کو اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منٹو مقرر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ملاقات سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی نہایت کھل کر۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بیوردہ سے بیوردہ بات و طرح سے اس معنویت اور بھولسی سے کہہ جاتا ہے کہ خدا جھجک عسوس نہیں ہوتی۔ یادہ صحت دیتا ہی نہیں۔ اُس کی باتوں پر ہنسوس آجاتی ہے گھن یا غصہ نہیں آتا۔

پہلے وقت اُس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر پر ہم بیٹھے رہے اور منٹو کو صفیہ کو روانے کوئی بار ستایا۔

”صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔“

”آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“

”بہت یاد رہی ہے۔ تو اُسے بلا کیمل نہیں لیتے۔“ میں نے کہا۔

”اے۔۔۔ کیا کبھی اُس کے بغیر سو نہیں سکتا۔“ وہ اپنی مصیبت پر اترنے لگا۔

”غیر تو سولی پر ہی آجاتی ہے۔“ میں نے بات ٹالی اور وہ ہنس پڑا۔

”آپ کو صفیہ سے بہت محبت ہے؟“ میں نے دائرہ داری کے انداز میں پوچھا۔

”محبت؟“ وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اُسے گالی دی ہو۔ مجھے اُس سے قطعی محبت نہیں۔ اُس نے کڑا مزہ بنا کر بڑی بڑی باتیں گھڑائیں ہیں محبت کا ٹاکی نہیں۔“

”اے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟“ میں نے مسنوی حیرت سے کہا

”نہیں۔“

”اے آپ کے کبھی گھسوتے بھی نکلے۔ غمرو بھی نہیں ہوئی۔ لڑکا کال کالسی تو ضرور ہوئی ہوگی۔“ وہ ہنس پڑا۔

”محبت سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ محبت تو ایک بڑی ہی بڑی چیز ہے محبت ماں سے بھی ہوتی ہے، بہن اور بیٹی سے

بھی..... چری سے بھی محبت ہوتی ہے سچیلوں اور فوٹ بخوتے سے بھی محبت ہوتی ہے میرے ایک دوست کو بھی کیا سے محبت ہے، اس لمحے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔ وہ بیٹے کے خیال پر ایک کرکسی پر اونچا ہو گیا۔ خدا کی قسم اتنا سا چڑھتا پلٹا تھا۔ بڑا اثر تھا۔ کشتوں پلٹتا تھا تو فرش کی دھڑیوں میں سے مٹی نکال کر کھایا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا سنا تھا۔ تمام باپوں کی طرح غصے اپنے بیٹے کے عیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔

”آپ نہیں سمجھے پھر سات دن کا تھا کہ میں اسے اپنے پاس سنانے لگا۔ میں اسے غور سے لے کر سنانا۔ تین بیٹے کا بھی نہیں تھا کہ غصا، اگر کہنے لگا۔ بس صلیب کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی۔ رات کو بس ٹی وی سوائے رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلا دیتا۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلانے سے پہلے لڑکی کھون یا اسپرٹ سے صاف کر دینا چاہیے۔ نہیں تو بچے کے منہ میں دھنسنے لگتا ہے۔ وہ بڑی سفیدی سے بولا اور میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ کیا سودا ہے جو بچے پانے میں مشاقی ہے۔

”مگر وہ مر گیا۔“ غصے نے مصنوعی مسرت چہرہ پر لگا کر کہا۔ ”اچھا ہوا جی وہ مر گیا۔ مجھے تو اس نے آیا بنا ڈالا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اس کے پڑتے دعوت دیتا۔ کتا ہو کر رہ جاتا۔ مجھ سے کوئی کام نہ ہوتا ہوتا۔ بچہ راجحیت سے مجھے اس سے عشق تھا۔“

”پہلے پتے اس نے پھر کہا کہ سفید آنے والی ہے بس ہی غرض ہر جگہ گا آپ کا اس سے لڑ کر۔“

اور واقعی سفید سے لے کر ساری غرض ہو گیا۔ غصے میں جاری اتنی گھٹ گئی کہ سرخ و زرد و سفید بائیں بھی ہونے لگیں جو موت اور تپ ہی کہتی ہیں جو مردوں کے کالوں کے لیے نہیں ہوتی۔

مجھے اور سفید کو کوئی مرحلے کے کھڑے نہیں کرتے۔ دیکھ کر منہ میں گیا اور غصے دینے لگا۔ اس نے کچھلے کرے کی چوٹی دیوار سے کان لگا کر جاری ساری سرگوشیاں سن لی تھیں۔ وہ غریب بچوں کی طرح بولا۔

تو بہرے سے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ غریب بھی اتنی گندی گندی بائیں کرتی ہیں۔

سفید کے شرم سے کان لال ہو گئے۔

اور آپ سے تو محنت میں مجھے قطعی امید نہ تھی کہ میں غصے کی جالی میں غرق کی طرح بائیں کریں گی۔ کب شادی ہوئی شادی کی رات کسی گندی۔ بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا۔ تو بہرے سے۔ وہ چڑھنے لگا۔

میں نے فوراً ناکام لگا۔ ”تو بہرے منہ صاب میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی۔ اسے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ۱۰ میں گندی کیا ہے۔ بچہ کی پیدائش دینا کا حسیں ترین علاج ہے اور کانا چھوٹی ہی تو ہمارا ٹریفک اسکول ہے کیا کہتے ہیں آپ کیا کالی میں مجھے بچے دینا سکھایا گیا ہے۔ وہاں کے بوڑھے پڑوسی میری آپ کی طرح ناک بھون پڑھا کر تو بہرے کہتے رہے۔ مجھے کی عمر توں ہی سے تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں۔

یہ سفید صحت جالی ہے۔ ادب و ادب کچھ نہیں سمجھتی ہر بات پر غصہ ہوتا کرتی ہے۔ آپ کی عمر یوں سے سخت

خفا ہے۔ آپ کوئی نہیں گھبراتا اس سے گھنٹوں باتیں کر کے۔ کہ قورے میں کتنی بلدی ہے اور کی دال کے دی بڑے.....
اے منو صاحب قورے میں بلدی کہاں پڑتی ہے۔ حقیقہ لئے سمیت زور ہو کر کہا۔

اور منو ٹو پڑا۔ وہ ہنسنے لگا کہ بلدی ہر کھانے میں پڑتی جاوے اور جو نہیں پڑتی تو یہ سراسر نظم اور نا انصافی ہے یہ ایک راجپوت دوست تھا وہ اُنکی اور بلدی کی پرکھاؤں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ لیا پہلو ان تھا۔ اور ہم شعر سننے کے آپ کا دوست تھی اور بلدی چھوڑ کر کچھ چلتا تھا۔ ہم کبھی شرط پر بلدی ڈالنے کو یا کہ رہیں اور منو کو قاتل ہونا پڑا۔

میں اور منو اگر پانچ منٹ کے ارادہ سے بھی مٹے تو پانچ گھنٹے کا پورا گرام ہوتا۔ منو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے داغ میں چھاڑ دے دی جا رہی ہے۔ اور بعض اوقات پیشین گوئیوں اور اُنکی داد ہو جاتی کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے شرت کی یونیاں اُلگھ گئی ہیں اور داغی سوچنے اور کھنے کی قوت پر جھانڈو پھر گئی۔ گرد و نون بننے جاتے، داغ بھے جاتے، بد مزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا حکم تھا۔ مگر منو باطل روایاں ہو جاتا آنکھیں مود چھکوں کی طرح تن کر پھول جاتیں۔ ننھنے پھڑکنے لگتے، منہ کڑا کیلا ہو جاتا اور وہ جھنجھو کر اپنی حمایت میں شاہد کو دیکھتا اور جنگ، ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھر پر صورت اختیار کر لیتی۔ منو جتنا کہتا جاتا۔ شاہد مجھ سے لڑتے کہ تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منو آئی خفا ہو کر گیا ہے اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری بہت ہے کہ اس کے ہاں جاؤں، وہ بدتمیزی زور سے دیکھ کر کہہ بیٹھے گا تو میری اس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی۔

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منو کو کوڑی بات کہ دی۔ ممکن ہے وہ منو جانے اور ہماری اور مصیبت کی دوستی بھی ختم ہو جائے جواب منو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ منو کی خود دہری دعوت کی سرحدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں پر رعب بٹانے کا بڑا شائق تھا۔ اور اگر ان دوستوں کے سامنے جی کو وہ مرعوب کر چکا ہو کوئی اُس کا مذاق بنادے تو وہ بڑی طرح چڑھتا یا کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں تو بچے کے ہیں ایک دوسرے کو کدھنی سکتے ہیں مگر تمام لوگوں کے سامنے ایک دوسرے پر چڑھیں نہ کرنی چاہئیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا۔

لیکن صبح رات ہوئی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس تند جوش سے مٹا جیسے کچھ ہوا ہی نہ پہلو ویسے ہی ٹھنک ل کہ باتیں عورتیں۔ تھوڑی دیر میں ایک دوسرے سے بڑے اور غصہ سے زیادہ نرمی سے بولتے۔ ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے۔ مگر یہ بلدی ہی اس شخص سے دلی لگتا جاتا اور اُس کا بھی۔ اور پھر پٹنے لگتی دونوں طرف سے آتش بازی۔ اور گروں کی سی تندہی ابائی۔ کبھی لوگ ہم دونوں کو اُنجا کڑہا بیٹھے لگتے اور ہم پھر مل کر ایک دوسرے سے مل جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی دلچسپی کے لیے نہ کہ اُن کے لیے۔ غیر یہی کہ گفت پیدا کرتے۔ منو کی یہی رائے تھی کہ گھر پر چاہے جتنی اُمی سیدھی بحث کریں مگر محفل میں نہیں مورچہ بنا کر جانا چاہیے اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہو گا کہ لوگوں کے پھٹکے پھڑا دے گا۔ گرجے ٹھنکا مورچہ سے اپنی دغا بازی کا احساس نہ رہتا اور مورچہ پھڑوں کے چھٹنے کی طرح پھٹتا نہ لگتا۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہوسکا کہ منو کی کوسبتا ہے یا بیک کر جیتا ہے۔ میں نے اُس کی چال میں لاکھڑا ہٹ یا زباں میں گھنٹ

نہ پائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوتا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پتے ہو تو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنا تھا کہ وہ بالکل نشر میں نہیں اور جان کر جاتا تھا۔

”میں آپ سے بچ کر کتا ہوں حسرت بہن میں بالکل نشر میں نہیں اور میں آج پتہ چھوڑ سکتا ہوں میں جب چاہوں پتہ چھوڑ دوں آپ شرط لگائیے۔“

”میں شرط نہیں لگاؤں گی کیونکہ آپ بچا نہیں چھوڑ سکتے..... اور آپ نشر میں ہیں۔“

کیسا کیسا غٹو ثبوت دیتا کہ وہ نشر میں نہیں اور اس وقت پتہ چھوڑ سکتا ہے۔ صرف شرط لگانے کی وجہ سے، ایک دن تلک اگر مجھے شرط لگانا پڑی اور غٹو شرط ہار گیا۔ میں جیت گئی۔ مگر کیا وہ شرط تو تلک غلطی میں کی کوئی رقم مقرر نہ ہوتی تھی۔ اس کے بعد جب غٹو کو بہت چڑھتی اور وہ شرط لگاتے ہی ہار جاتا اور سوائے شرط لگانے کے کوئی غلطی نظر نہ آتی تو بار کر مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

غٹو کو خود ستان کی حالت تھی۔ مگر تو اچھے سے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ دیا کرتا تھا۔ اور اس وقت میرے اور اپنے سوا دنیا میں کسی کو ادیب نہ ملتا۔ خاص طور پر کرشن چندر اور دیو نند ستیا راہی کے خلاف ہو جاتا۔ اگر ان کی تعریف کر دو تو شک اُٹھتا۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانی جائے اور وہ تنقید نگاروں کو کبھی کبھی شائے لگتا۔ ایک سرے سے ان کے درجہ کو ہی ہم قاتل محبت خاص طور پر ادب کے بیٹے۔

”ہم کو اس کرتے ہیں یہ لوگ۔“ وہ مل کر کہتا۔ جو کہتے جاتیں بس اس کا اٹھا کرتے جاؤ۔ میں لوگ جو غرض کرتے ہیں چھپ چھپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان سے کچھ لکھنے کے بجائے نطفہ اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس نطفہ کی یاد پر نام ہو کر اول فول کہتے ہیں۔ وہ کہیں اتنا پڑ جاتا کہ میں اسے تسلی دینے کو کہتی جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اول فول لکھتے ہیں تو آپ ان کو جواب کیوں دینے لگتے ہیں۔ اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ بیسے گردائے عام کو تو مطعون نہ کیجیے۔ گردہ بھتا مار جاتا۔

ایک دن بڑی بنجیدہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے۔

”مقدمہ داتا کریں گے۔“

میں نے کہا کرت۔

کہنے لگے۔ ”ہم، معنی میں ادب آپ۔ اس موقع دے میری ادب آپ کی کہانی ایک جگہ میں یہ کچھ کہ چاہی ہے کہ یہ فیش ہے۔ ایسے ادب سے ملک کو بچانا چاہیے اب اس گنجنت سے بچھو کر کیسی اٹلی بات کر رہا ہے۔ ایک تو وہ اسے کتاب میں چھاپ کر منتشر کر رہا ہے، دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے، اس نے ہماری اجازت کے بغیر یوں کہانیاں چھاپی ہیں اسے فوش لگا رہا ہوں کہ ہر جگہ دے۔“ پھر نہ جانے بھول جہاں گئے۔

منٹو پرشی ٹیبلو سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شبی گھاراکو آتا تھا۔ رفیق غزوی سے کچھ عجب قسم کی محبت تھی جو مجھ میں نہ آتی۔ جب اس کا تذکرہ کیا ہی کہنا بڑا مدعا شائع ہے۔ ایک ایک کر کے چار برسوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کا کوئی دھڑی اڑی نہیں جس کی اس نے اپنے جتنے پر نام نہ محسوس ہی ہوئے۔

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں۔ اُس کے مشقوں کے قصے تفصیلاً سنایا کرتا۔ ایک دن مجھے اس سے ملانے کو کہا۔ میں نے کہا کیا کروں گی ٹی کر، آپ تو کہتے ہیں لنگا ہے وہ۔ کہنے لگے اسے جب ہی تو مل رہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لنگا اور بد معاش بُرا آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے۔

میں نے کہا، بلطو صاحب لنگا، شریف، بد معاش یہ آخر کیسا آدمی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھے بتانا دین اور تجربہ کار سمجھتے ہیں شاید وہی نہیں؟
 ”آپ جانتی ہیں؟“ مشق نے بڑا مان کر کہا۔ ”جی تو آپ کو رفیق سے ملنا چاہتا ہوں — بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی حرکت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی۔“
 ”میں بھی تو حرکت ہوں۔“ میں نے فکر مند بن کر کہا۔ اور وہ کھسیا نہ ہو گیا۔

”میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔“
 ”مگر آپ کی بہن بھی تو حرکت جو سکتی ہے۔ مشق نے قہر لگایا۔
 ”ہر سکتی ہے ایہ خوب کہا۔ مگر بلطو کو ضد ہو رہی تھی۔ ”آپ کو اس سے ملنا ہے گا۔ دیکھیے تو میں۔“
 ”تو میں اُسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔“ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیے تھے کہ میں جھاگ آئی کہ کیسے کجنت پر عاشق نہ ہونا پڑے؟

اور رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ مشق کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دنیا کے قانون جیب کرنے کے رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مذہب انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بد معاش ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت ایمان دار اور شریف بھی۔ یہ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی یہ مشق کا میدان ہے وہ دنیا کے حکمرانی گھر سے پہنچ چکی ہوتی خلافت میں سے ہوتی تھی کہ نکال دیا ہے۔ گھر دیکھنے کا اسے شوق ہے کہ وہ دنیا کے ستارے داروں پر اسے جھروں نہیں۔ اُسی کی عقل اور فہم پر جھروں نہیں۔ وہ ان کی شریف اور پاکیزہ بیویوں کے دل کچھ دیر کھڑا ہے اور کوشش میں رہتے حال ہنسی کے دل کے تکتے سے اُس کا سنا کر دیتا ہے۔ علم میں ڈوبی ہوئی میٹھ پسند دوس سے میل اور پسینے میں مٹاتی ہوئی گھاسی زیادہ خوشنود اور معلوم ہوتی ہے۔ ”لو میں حلاکتِ جسم ہی جسم ہے۔“ ختم ہے دیکھیے تو جسم کے اندر جو بھی ہے۔ میٹھ پرست طبقہ کی جھٹے ہوئے دُور حکم طرح پٹکیوں دار روح اور کچلے ہوئے طبقہ کی تصنع سے ڈھکا میلنت۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اتنے طبعی طور پر جسمانی سوال بھی نہیں کر سکتے۔ مشق کے ذہن میں ضرور دو طبقوں کے فرق کا خیال تھا اور وہ اُس جنت کو جس کی دنیا ہوا جا کر ہے، زمین پر پہنچنے میں بڑی ہلاکت محسوس کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے بد معاش دوستوں کے کارنامے غریب سنایا کرتا۔ ایک دن میں نے جلدیے کو کہہ دیا ہے لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصل میں نہ بیوقوفوں نہ بلیوں کے ان کا تعلق رہا اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی حرکت کی آہستہ دہری کی بد معاش طرح سے سمجھ نہیں سکتے۔

لگا کر یہ لوگ واقعی بد معاشیاں کہتے ہیں اتنی ہی جلد اس سے بھی زیادہ۔

”سب جھوٹ پا میں دھاندلی کرنے لگی۔“

”اہرے آپ کو یقینی کیوں نہیں آتا۔ ہمارا میں جو چاہے جاسکتا ہے۔“

”گھران لوگوں کی اتنی بہت نہیں جو طور انھوں کے کوشوں پر جاسکیں۔ بہت کہتے ہوں گے گا ناٹھی کہ بچے کہتے ہوں گے۔“

”مگر میں خود گیا ہوں دہڑی کے کوشے پر۔“

”گناہ سننے۔ میں نے چٹایا۔“

”بھی نہیں، اپنے دام وصول کرنے اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے۔“ پھر صی میں نے کہا۔

”میں نہیں یقین کرتی۔“

”وہ کیوں؟ وہ اٹھ کر بالکل میرے سامنے تائیں پر کڑور ڈیرہ گیا۔“

”بس میری مرضی۔ آپ میرے اوپر رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔“

”جیسی خدا کی قسم میں کتابوں میں گیا ہوں۔“

”خدا پر آپ کو یقین نہیں بیکار اسے نہ کھیٹے۔“

”اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک بار نہیں جگہ.....“

”مرحوم بچے کو اب آپ جھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

اور دشواری میں پسک مار کر بیٹھ گیا کہ آج تو منکر دھوں لگا کر میں دہڑی باز ہوں۔ صفیہ کی گواہی دلواری میں نے دوشٹے میں صفیہ کو چپ کر دیا کہ ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں کہ دہڑی کے یہاں جا رہے ہیں۔ اور اگ گئے بھی ہوں تو سلام کر کے چلے آئے ہوں گے۔

صفیہ چپ سی ہو گئی۔ اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آگئے یا..... وہ جب لوگوں میں رہ گئی۔

منظر نے جوش میں کچھ زیادہ تیزی سے پل ڈالی اور ہر ہی طرح لڑنے لگا کہ آج منور کچھ چھوڑوں لگا کہ میں پتلا دہڑی باز ہوں اور میں نے کہہ دیا آج اور میری کوئی اُدھر ہر جیسے میں مان کے دوں گی نہیں۔

ایک نوشر دوسرے منظر کے منظر کی جتنی تخی۔ اگر بس چلتا تو میرا منہ لڑچ لیتا۔

صفیہ نے بسور کر کہا بس مان جاؤ۔ شاہد نے کہا بس اب مگر ملو۔ مگر منظر نے شاہد کی ٹانگہ یعنی شروں کی مار کر دیا کہ بغیر قائل ہوتے جاتے نہیں دوں گا۔ خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

بڑی سنجیدگی سے منظر نے شاہد سے کہا پلو دہڑی کے یہاں ابھی اسی وقت آج میں قائل نہ کروں تو میں نے ان کا

دور و در نہیں گھور کا دور و در چاہا۔ مگر میں نے ادھر چٹایا۔

آپ جابیش واریں گے نہیں یونہی بالکل برج پر گھوم کر آجائیں گے اور ہم یقین نہیں کریں گے کیا فائدہ؟

اب تو منٹو کے سر میں کئی تواریخیں تھیں جاکر شاید ہی بچی ہو غصہ ضبط کے پونچھا۔
”پھر کیسے یقین دلایا جائے؟“

میں نے کہا۔ ”میں مہنی چلے اور منٹو کو بھی ساتھ لے پیلیے۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔ سفید بگڑی، تمھارا تو ماخ خراب ہوا ہے تم ہی جاؤ۔“
”جائے گی کیسے نہیں؟“ منٹو غز آیا۔

”چلو چلو.....“ منٹو کو مہقا ٹھکھاری اور جاموں چلے۔ وہاں سے ہم دونوں تو نکل آئے۔ منٹو کو منٹو نے نہ جانے
کیسے تاباں کیا۔ دوسری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے قرب لگتے لگتے اور پھر چپکے سے کہا ”کراہ تو ان جاؤ۔“
میں نے کہا ”تعلی نہیں۔“

مجھے شیش معلوم منٹو کو گھر پر تھا یا جو کچھ اُس نے دھڑکی کے بارے میں کھانا وہ اُس کے اپنے اصول اور یقین کی بنا پر ہے۔
کیونکہ اگر وہ دھڑکی کے کٹھے پر لگی بھی ہو گا تو وہاں دھڑکی سے زیادہ اُس نے ایک صورت کا دل دیکھا ہو گا جو یاد ہو دیکھ سوری کا کھڑا
ہے مگر زندگی کی قصوں کو یاد رکھتی ہے۔ اچھے اور بُرے کو نا پسنے کے جو یہاں عام طور پر بنا دیے گئے ہیں وہ انھیں تو بھروسہ دے
دینا ہی بنائی ہوئی تول سے اُن کا اندازہ لگایا تھا، خوشیاں جیسے ڈیسٹ اور نئے انسان کی رگ جیسے ہی بھڑک سکتی ہے۔ گوئی ناقد
جیسا رقیق انسان بھی دھڑکاؤں پر بازی لے جا سکتا ہے۔ بلند و بالا دیوانہ بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں۔ قوی ہذا کار بدکار بھی ہو سکتے
ہیں اور شاہ سے زنا کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے۔

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ دور دراز مضمون معلوم سہو قی۔ ایک سو دو کسی بات پر ایسا جھگڑا کہ انھوں میں
خون اُتر آیا رانت میں کہہ لو۔

”آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہنا کہ رانت کھٹے ہو جاتے۔“

”تو کارا مان نکال لیجیے عورت کی ضرورت نہیں۔“ میں نے پڑایا۔

”آپ جانتے ہیں دیکھیے کوئی مرد ہوتا تو بتاتے۔“

”بتا بھی دیکھیے۔ ایسے کون کون سے تیر نکشیں میں باقی وہ گئے ہیں نکال بھی دیکھیے۔“

”آپ جھینپ جائیں گی۔“

”قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی۔“

”تو آپ عورت نہیں۔“

”کیون کیا عورت کے لیے جھینپنا اشد ضروری ہے۔ چاہے جھینپ آئے بان آئے بڑا فسوس ہے غصہ صاحب آپ

بھی عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ اصول بناتے ہیں جن کو جتنی جتنی آپ عام لوگوں کی سطح سے بلند ہیں۔ میں نے مسکرایا۔
”تعلی نہیں.....“ میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا۔“

” تو پھر کہنے نہ وہ جھینپا دینے والی بات “

” نہیں اب غصہ اُتر گیا “ وہ ہنس کر بولا۔

” اچھا دوستی ہی میں کسی بتائیے وہ کونسی خطرناک بات تھی “

” کچھ نہیں..... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید کوئی مٹائی سن گئی دے دیتا “

” بس “ میں نے ناامید ہو کر کہا۔

” یا شاید کس کے بھانپنا تھا “ نام ہو کر بولا

” مجھ پر کچھ اثر نہ رہا میں نے ایسی ٹیم ٹیم کالیاں سنیں کہ مد نہیں اور میرے تپڑ بھی خاصے ذوق کے پڑ چکے ہیں مگر پہلی دفعہ

آپ نے عورت مجھ کو رعایت کی۔ میرے بھائی تو مگے چکے ہیں کئی بار۔ اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گئی سے پریشانی ہو کر میں نے سوچا جا کر منٹو کے یہاں آرام کروں پھر واپس ملا دوں۔ دو روزہ جب معمول کھلا ہوا تھا جا کر دیکھا تو مصفیٰ نہ پھلائے لیٹی ہے۔ منٹو اتار میں جھاڑو لیے شاسٹ پٹنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے۔ سادہ رنگ پرکتے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

” یہ کیا کر رہے ہیں “ میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا۔

” کوئی کھیل رہا ہوں “ منٹو نے لڑی لڑی مورچہ جیسی پتلیاں گھما کر جواب دیا۔

” یہ بھیجیے! ہم نے سوچا تھا زرا آپ کے یہاں آرام کریں گے تو آپ لگ روٹھے بیٹھے ہیں۔ میں نے واپس جانے کی

دھمکی دی سی۔

” اسے! صغیر! ٹھنڈیٹی۔ آؤ آؤ “

” کاجے کا جھگڑا تھا “ میں نے پوچھا۔

” کچھ نہیں میں نے کہا کھانا پکانا گزشتہ دفتر مردوں کا کام نہیں۔ بس بیسے نم سے اُچھتے ہیں مجھ سے ہی اُلجھ پڑے کیوں

نہیں مردوں کا کام میں رہی جھاڑو دے سکتا ہوں میں نے بہت روکا تو اور روئے، کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طلاق لے لے صغیر نے ہنس کر کہا۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لیے میں نے ہی کرکھانا شروع کیا۔ بسج ہی بسج میری سپلائی کے بھنگی نے صحن صاف کرنے

کے بہانے وصول ملحق میں جھونکی اب آپ ارمان نکال بھیجیے۔ گری کے مارے جان نکل رہی ہے “

جلدی سے جھاڑو چھوڑ منٹو برٹلی سے برت لانے چلا گیا۔ صغیر ہنڈیا بھگارتے چل گئی۔ برت لاکر منٹو نے تو لیدر وار

پر مارا رک تو لڑی اور پٹلی میں بھر کر سامنے رکھ دی اور کڑی بیڑی لگا۔

” اور سنائیے “ اس نے حسبِ عادت کہا۔ ہاتھ ہی کے بھگارتے مجھے نذر سے بکائی آئی۔

آؤور یہ متفقہ کیا مودہ ہمارے ہے۔ میں نے تاک بند کر کے کہا۔ غٹو نے چونک کر مجھے دیکھا سر سے پیر تک بڑی بڑی پتلیاں لکھائیں اور چوٹ تک مار کر جھپٹا۔ ہاں ہی خانے میں متفقہ چھتی رہی اور اس نے پیر لوٹا ہائی پتلیوں میں جھونک دی۔ وہاں آکر وہ سما سمار سان سے کرسی پر چڑھ گیا اور پھر کچھ جھینپ کر بیٹھ دیا۔

میں پیر توڑوں کی طرح دھکیلتی رہی۔

صفیر بڑا بڑا آئی تو اسے زور سے ٹکاٹا پھر بڑے شرمیلے انداز سے بولا۔

”آپ کے ریٹ میں بچے ہے؟“ جیسے کچھ میرے نہیں خود ان کے ریٹ میں ہوتے ہیں نے فوراً آڑ لیا۔ جب صفیر کے ریٹ میں بچے تھا تو اسے بھی بگڑا دے اڑکاٹی آئی تھی۔“

”غٹو صاحب خدا کے لیے دانیوں جیسی باتیں نہ کرو۔“ میں نے پڑ کر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

اُسے واہ۔ اس میں کیا بُرائی ہے۔ اسے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی میں ابھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ پلک کے نیچے گیا اور کڑتے کدے اس میں پکوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا۔ کیریاں چیل کر بڑی انفاست سے تنک راج ٹکا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر کھسکا تاربا۔

”صفیر اسے صفیر۔“ وہ چلا یا۔ صفیر دھوئیں سے اُٹی نکلیں پھل سے پختی ہوئی آئی۔ کیا ہے غٹو صاحب کتا پتا ہے جو۔“

”اُسے یہ قوت۔ ان کا پیر بھاری ہے۔“ اُس نے صفیر کی کمر میں ہاتھ ڈالی کر کہا۔

”اُم گندگی کی انتہا ہے۔ جی تو آپ کو کوک فٹس نگار کھتے ہیں۔“ میرے اس بگڑنے پر غٹو غوب خوب چمکا۔ اور بڑی بڑا صبر سے مجھے معذور دینے لگا۔

”تیس پیر توڑوں کے تیل کی امش سے گھر وچے نہیں پڑیں گے۔“

”نہار مرز صاحب کامرہ کھانے سے اب کیا نیاں نہیں آتیں۔“

”کھو پرہ کھانے سے بچے گورا ہو گا اور آسانی سے ہو گا۔“

”ہلے میں بوت نہ چاہیے گا۔ نئے سوچ جاتے ہیں۔ کیوں صفیر؟“

”ہٹو غٹو صاحب کیسی باتیں کرتے ہو۔“ صفیر کہہ کر وہ گئی۔

اور جب سنا پیدا ہوئی تو صفیر میرے پاس بیٹھی کاکھتی رہی۔ مگر کئی کوڑکے کر غٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا وہ دیر تک مجھے اُس کی چھوٹی چھوٹی شورتیں بتاتا رہا۔ صفیر کا دل پھسل گیا اور سال کے اندھا اندھ غٹو کی بڑی بیٹھی پیدا ہو گئی۔ پوتا سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں فراموشی تو غٹو نے مکان بدل دیا تھا۔ ٹھونڈو ٹھونڈا کر کے مکان بچھی تو دیکھا ڈرا انگس روم میں انگنی پر بڑے بڑے چمڑے لٹکے رکھے ہیں۔ نیا مکانی بہت چھوٹا اور بغیر چراگ تھا۔ غٹو نے اس لیے بدل لیا کہ اُس کا فرش گندہ تھا کچا غٹو کی چلتی تو پانس لگ جاتی اور مٹی پاٹ جاتی۔ یہاں نکست مزے سے فرش پر کھیل کے گی۔ حالانکہ نکست چند ہفتوں کی تھی۔

”مجھے بچے سخت ناپسند ہیں۔“ غٹو جیندگی سے کتنا۔ جان کو چھٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لیے ڈر لگتا ہے۔ ہر

وقت انھیں کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ تو وہ دودھ کی بوتل دھو کر نلکے چھٹا میری بیٹی بیٹی سے بڑی چاری تھی کھنڈر اس کے ساتھ گزریں اور چند ٹکڑیوں کی باتیں کیا کرتا۔ فرمائش پر کھڑکی سے بائیں ٹال کر اس کے لیے اٹھیاں ڈوکر نیچے سے گزرتے کے دامن میں سمیٹ لاتا۔ سیما کو پاٹ پر بٹھا کر شیشی کھینچ کرتا۔ اور بچوں کا بہت شاک تھا کہ وہ ان کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم طائر میں رہتے تھے۔ رات کے کوئی ساٹھ بارہ برس گئے کہ وہاں سے بروٹھک ہوئی معلوم ہوا سقیہ سانس پھولی ہوئی کسی کھڑکی میں۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ ہوئی میں نے منہ کیا کہ اس حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیے مگر وہ کہاں جھنکتے ہیں۔ منظر میں ندائی اور خود شیدا نور کے آگے۔

”مستیہ کون ہوتی ہے منہ کرنے والی“ ہاتھ میں بوتل اور گلاس لیے تینوں دوڑے۔ شاد ہنسنے پھرتی کو سیک کہ اٹھے ہمارا بہت جھوٹے ہیں ہر ٹی سب بند ہو چکے ہیں، ریل کا وقت گزر گیا۔ کچھ دل جانتے تو خود پکارا کہا میں پس آنا دل سے وہ خود پھرتی تھا میں جا کر پکارا میں گئے۔

مستیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قلعی نہ بھایا۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ ہرچی خانے پر چڑھائی کر دی۔ منظر آنا گوندھنے کے ندائی ایکٹھی پر ٹوٹ پڑے اور خود شیدا نور کو آؤ چھیلے کونے دینے گئے جو چھیلنے سے زیادہ کچے کھالے پر پھرتے اور پھرتی کی بھی ہرچی خانے میں آگئی۔ لوگ پھسکا کر وہیں بیٹھ گئے اور کچے کچے پرانے پکاتے گئے کھاتے گئے۔ منظر نے آنا بہت اچھا گوندھا اور پڑے سیتھے سے روٹی پکانی اور پھر جھوٹ سے پودینے کی پٹنی میں ڈالی کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو رہے جاتے اگرز بردستی برآمدے تک نہ گھسیٹا ہوا۔

یہ زندگی تھی جو منظر کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ متحول آمدنی ہر پینا پانا جو، قصہ ہوں اور بے ٹکریاں ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منظر پر مقررہ جلا دیا۔ منظر کی درخت آوندو بنائی۔ لاہور میں بھی قطعٹ آگیا۔ خوب دوستیں آڈریس۔ اسی ہانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ ڈری کے قوتے خریدنے میں دونوں ساتھ گئے۔ منظر کے پیر بہت نادار اور سفید تھے۔ پیسے کول کے پھول۔ ندی کیے بڑے بہت چھنے گئے۔

تیسرے پیر جسے بعد سے ہیں۔ میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت چھنے نہیں نے کہا۔

آدھ میرے پیر اتنے زمانہ نہیں کر لے آئے ان سے شرم آتی ہے۔ مگر ہم نے کئی جوڑے جوڑے خریدے۔

”آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں۔ میں نے کہا۔

”بکواس ہیں میرے پیر۔ لائے بدل میں۔

”بدلا ہی ہے تو لایئے سر بدل میں۔ میں نے رائے دی۔

”بھدا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ منظر نے چمک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر کتنی ہی جھڑپیں ہوئیں مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

”جنت کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنے ذریعہ جنت سے جنت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچویں ہوی سے محبت ہے۔“
 تیر مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نورانی کو ایک دوسرے سے جو جاتا ہے۔“
 ”ہاں..... میں سمجھ گیا۔ مشور نے دور دہائی کے دھندھکوں میں کچھ ٹوٹی کر سچے ہوئے خود سے کہا۔ ظہیر میں ایک چہرہ ہی تھی۔“
 ”پھر تو میں نے داستانیں لکھنے والوں کی طرح ہنکارہ دیا۔“
 ”پھر کچھ نہیں۔“ وہ ایک دم بچاؤ کے لیے تھ گیا۔
 ”آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شراب سے ہیں۔“
 ”کون گرا شراب ہے۔“ مشور نے واقعی شراب کا کہا..... بڑی شکل سے اس نے بتایا۔

تیس جب وہ موشی ہانکنے کے لیے اپنی گڑھی، انور اٹھاتی تھی تو اس کی سفید کٹنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ بڑا تھا۔ اور
 ایک کپلے کر پڑا ہوا پر ہکا بھٹکا تھا۔ اور اس کے جسم کے کچھ اعضاء دکھائی دے جاتے تھے۔
 ”کٹنی؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔“

”ہاں..... میں نے سوائے کٹنی کے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی اس کے
 جسم کا کوئی حصہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کے جسم کی ہر جھلک پر میری آنکھیں کٹنی کی جھلک دیکھنے کے لیے ہنسی تھیں۔“
 ”پھر کیا ہوا؟“

”پھر ایک دن میں کپل پر لیا تھا وہ مجھ سے تھوڑی دُور کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ مجھے دکھائی
 دیا کہ اس کے جسم کو کبھی نہ دیکھا۔ اور اب کچھ بھی نہیں۔ میں مجھے خود ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھائی دے گی نہیں ہانے نہیں دوں گا۔
 وہ خاموشی برتنی لگ کر میں بھی ضد پرا ڈ گیا۔ اور آخر کو کٹنی کو دکھانے کے بعد اس نے منہ کی کھول کر تھیں میرے سامنے کر دی اور خود شرم
 گھٹنوں میں منہ دے لیا۔“

”کیا تھا اس کی تھیں پر؟“ میں نے بے مبری سے پوچھا۔
 ”تھیں کی ٹولی! اس کی گلابی تھیں پر روت کے ٹکڑے کی طرح پڑی تھیں جھلا رہی تھی۔“
 ”پھر آپ نے کیا کیا؟“

”میں دیکھتا رہ گیا۔“ وہ چہرہ سوج میں ڈوب گیا۔
 ”پھر؟“

”پھر وہ آخر کب جھاگ گئی۔ تھوڑی دُور سے چلنے آئی اور وہ مصری کی ٹولی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ
 مصری کی ٹولی بہت دُور تک میری تھیں کی جانب چل رہی رہی۔ پھر میں نے اسے دُور میں نکال دیا اور کچھ دن بعد چہرہ نکال
 کھا لیں۔“

”اور لڑکی۔“

”کونسی لڑکی؟ وہ جو نکلا۔“

”وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تھادی۔“

”اُسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔“

”دکس قد، چُپس چُپسا ہے آپ کا عشق! میں نے ناامیدی سے چڑ کر کہا۔ مجھے تو بڑے کسی شعلہ ہلال قسم کے عشق کی اُپہنگی۔“
”قطعاً چُپس چُپسا نہیں۔“ منشر ڈھپڑا۔

”بالکل ردی..... تھوڑے سیٹ۔ مگر کھلا عشق۔ مصری کی ڈلی کے کرچے آئے۔ بڑا تیرا را۔“

”تھوڑا لکڑتا۔ اس کے ساتھ سو جاتا۔ ایک حرا می پلا اس کی گردن چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مرداگی کی ڈینگیں مارتا۔“

وہ بگڑا۔

ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ مصری کی ڈلی کو لکڑا کو کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چُرنے کی چیز ہے۔“

یہ وہی منشر تھا۔ غمخشا نگار۔ گندہ درس۔

جس نے لڑکھی تھی۔

جس نے کُشترا کو شُست کھا تھا۔

لیکن مرزا غالب میں جو دھوسِ یلیم مرزا غالب کی مجبورِ ہریانہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا مگر منشر کے خیالوں کی لاکِ ضرور ہے۔ جسے وہ باقہ نہیں لگا تھا جاتا۔ جس کی کلائی کی جھلک دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی میٹھ سکتا ہے۔ یہ تھوڑا تھوڑا جو منشر کی مختلف گمانوں میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ نیا قانون لکھتا ہے اور دوسری طرف کہتا..... دونوں ہیں وہ خود کو فریق کے کھتا ہے۔ لوگوں کو ایک غمخشا نگار اور دہ جاتا ہے اور دھندلکار کو وہ بھول جاتے ہیں۔ قصداً یا سہواً؟..... ایک ہی بات ہے!

ملک میں فساد شروع ہو گئے۔ میں رے کے بعد اُس کو ٹھنی کے وہاں اُس کو ٹھنی میں کیے جانے لگے۔ منشر اُس وقت فلسطین میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اُس کی زندگی کا سہارا تھی اُسے قلعی تھی کہ اس کی نظم اُٹھو دلی کا سیلاب نہ ہوئی۔ نہ ہلے کیوں وہ فلسطین چھوڑ کر آشوک کمار کے ساتھ یہودی لائیکز چلا گیا۔ اُسے آشوک کمار بہت پسند تھا۔ مگر جی نے نہ جانے اُسے کیا کر دیا تھا کہ وہ ایک دم اُس کے خلاف ہو گیا۔

بکواس ہے مگر جی۔ فراڈ ہے نہ کتا وہ ٹھنی سے کہتا۔

بہتی لائیکز میں جا کر اُس نے مجھے بھی کہنی میں ایک سال کے لیے سینئر لٹریٹ میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔ اب ہم دونوں لی کر کافی نکلیں گے۔ تھلک پرچ جائے گا۔ میری ادھاپ کی کلائی آشوک کمار میرو۔ بس پھر دیکھیے گا۔“

ایک کافی مشور کی زیر غور تھی۔ اشوک کو وہ پسند تھی۔ اُس سے پہلے اُسے مجبور کی کافی پسند تھی پھر دل سے اُتر گئی اور مشور کی کافی پسند آئی میرے آنے کے بعد اُسے میری کافی ہندی پسند آگئی۔ خیر مشور کو تا گوارہ گذار باد اب اشوک کا رنے مجھ سے مشور کی کافی پر کام کرنے کو کہا اور مشور کو میری کافی پر توجہ کہ مشور مجھ سے ہندی میں مشور سے شاکی ہوئے تھے۔ اور کمال اور ہندی مٹھل کی کافی لے کر گئے اور اشوک کا کہ وہ پسند آگئی اور ہم دونوں کی کافی کشانی میں پڑ گئی۔ اب صورتِ عزت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کافی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و قطار کی میں نہیں۔ گو ہم سے کر دیا گیا تھا کہ ہمیں سے جیشور۔ مخدوہ ملتی رہے گی کیونکہ کھڑکھٹ جو چکا ہے لیکن کافی ہماری نہیں بنے گی۔ لہذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کافی ہندی کو نمونے کی طرت ملک گئیں اور خیر اشوک کمار کے دوسرے درجہ کی اسپر یوں کی قطار میں ہندی بنائی جانے لگی۔ مگر مشور کی کافی وہ گئی ان مشوروں پر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کافی کی اور میری کیا کرتا کبھی انجام کو آغاز بنا کر کھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز پر ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کافی کی کوئی کلی اشوک کا کہ پسند نہ آئی۔ مگر مشور ہی کہتا۔

”آپ انگلی کو نیچے دیکھیں، میں کہتا ہوں۔ وہ میری کافی میں مشور پر کام کرے گا۔“
 ”آپ کی کافی میں اُس کا دل رو مشنگ نہیں باپ کا ہے۔ وہ کبھی نہیں کرے گا۔ اور مشور سے پھر رونا پورے گئی۔ مگر ادنیٰ زبانی سے یہاں اپنی فکر پڑی تھی۔ اور وہی تیرا کہ ہندی اور ملتی ہی گئیں۔ مشور کی کافی وہ گئی۔ مشور کو اس کی امید تھی اور اُسے بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا بے قدری میں جھیل سکتا تھا۔ اور ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بیوی بچے اُسے پاکستان لانے کے مشور لے رہے تھے کہ وہ پاکستان میں جیسے مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوششیں مل گئیں۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔ بہت جلد ترقی کی کیا میں گے۔ میرے جواب پر مشور نے وہ قسمیں دے لیں اور جھگڑے میرے اس سے برے گریوں کی خیرہ اصول پر بحث نہیں ہوئی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا مشور تھا نزل ہے۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بدلنے کے لیے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کافی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اُس سے نفرت سی ہو گئی۔
 اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اور بڑے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی تنگ محسوس ہوئی۔

پھر جب اُس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت نئے مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوبصورت قیمتی ماحول سے آرام ہے۔ ہمیں اُس نے پھر بلا دیا تھا۔ ہندی ختم ہو گئی تھی اور ہم نے تھوڑا شروا کر دی تھی۔ بڑے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے اُس کے ہر وہ خط آئے۔ اُس نے بلایا تھا، ایک سینما الاٹ کروانے کی امید لائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا کہ اُس کی محبت کا پہلے ہی تقصیر تھا۔ مگر اب تو اور بھی ان جاننا پڑا۔ مگر میں نے اُس کے خط چھوڑ دیئے اس بات سے بڑھ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے اُسے ہانے سے نہیں دھکا پھروا مجھے اپنے رشتے پر کیوں گیسٹ رہا ہے۔
 پھر شش مشور بہت خوش ہے۔

مکان چھن گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ خوش کا ایک خط آیا۔ کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلواوے۔

پھر معلوم ہوا خوش پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔ تاہم یہ بات تو رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا۔ بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ چھپا ہوا جیل ہو گئی۔ اب وہاں دوست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جیسے ہوئے نہ ٹھیکیں جو میں نہ رہو میو شہ پاس ہو۔ پھر معلوم ہوا کہ وہاں جیل نکلا اور بالکل غلطیوں یا دوست پر چھا آئے ہیں۔

مگر ایک دن خوش کا خط آیا۔ بالکل ہوش و حواس میں کھٹا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر کوئی سے کہہ کر یہی بلواوے تو بہت اچھا ہوگا۔ اس کے بعد عرصہ تک کوئی خبر نہ رہی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو مگر بالکل خانے سے آگے جو قدم بڑھا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آئے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑی خبریں نہیں کہیں آدب کیا۔ جس طرح اپنے نگاہوں سے اپنے پرانے ہر ایک سے پیار لگاتے بیٹھے ہیں۔ اخبار دے دے دیکھا کہ سامنے مضمون لکھا تھا میں نے تو لکھی میری دوست سب کا ہے تے ہیں۔

خوش کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے آپ لکھتے تو کہا تھا اور بے ساختہ میری خوش زبان سے نکل گیا اب تو میرے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی۔

اب آج خوش کے رہنے کے بعد میں کہہ رہی ہوں خوش ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور خوش کے درمیان بہت کچھ چھٹا تھا آج صحت ایک کسک زدہ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس بات کی کسک ہے یا کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ چپکا اور میں زندہ ہوں؟ یہ میرے سینے پر پھر قرض جیسا ہو جھک رہی ہے۔ مجھے تو خوش کا کوئی قرضہ یاد نہیں۔ اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا میں نے انکس نے مجھے پس کا تھا۔ مگر ہمیں تو کھڑی بجائیں کہ وہ توڑا دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کہہ لیتیں۔ میرے والے زخم لگا جاتے ہیں بوند لگتا ہے نہ ہستا ہے خاموش ملتا رہتا ہے۔

آج مجھے عجیبے طریقے پر آ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ایک بار سر پر کمر بند کر کے جی باتیں کر لیں۔ جیسے برسوں ہوئے انٹرنیٹ پر میں کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تعین صرف رات اور چلوٹھی کے بچے کی باتیں، یہ ہیں موت کی باتیں۔ اسی لیے ملتی ہیں اور میرا قلم خشک ہو جاتا ہے نہ جلتے ان چند سالوں میں ان پر کیا گزری ہے۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے خوش کا ہوش کر دیا تب بھی تمہاری بہت اس طوفانی ہستی کا سہارا بنائیں جن کو تمہاری ہی یاد تھا۔ یاد تھا کہ کتنی بڑا تھا۔ کیا۔ یاد ہے جو برس کا ہو چکا تھا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کبھی نہ گیا یا تم اب بھی اپنے خوش صاحب کی سفید رہیں۔ پاس ٹوٹوس کے مذہب لوگ اور شہد صاحب اُصولی بددی پرانک جوں پر جاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں۔ ان خاموش نگاہوں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جو بے پروائی اور دل بردانی سے تمہارے اندر گڑھ ڈال رہی تھیں۔ دم تو گھٹ جاتا تھا کیا اس نے قلم کی پیاد بھری گور میں دم توڑا یا وہ تمہارا دھیرے خاندان میں لکھا ہی سدا ہوا کیا بچیاں اپنے باپ

کو پاگل مغلش شرمناک بھرتی تھیں۔ اُس نے تھیں تنگ دستی اور مذمت کے سوا کیا کر سکتی تھیں دیا۔ کچھ کچھ بھی تو نہیں معلوم نہ جانے کیوں اُس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا وہ حصہ سبھی ملے نہیں ہے۔ وہ اپنی شکلوں کو اپنی کھڑی پر محمول کرتا رہا اُس نے انہیں جیب کی طرح چھپا دیا۔ اُسے غور تھا کہ چاہے تو وہ دم بھر میں دکھوں کا کریمینک دے بھی تو اُسے کلین نہ آتا تھا کہ وہ فاقہ بھی کر سکتا ہے اور اُس کا قلم بیکس سے گھسٹا رہتا ہے۔

تم عاجز تو نہیں آگئیں اور میں سے! اپنی خود گھسٹتے ہیں اور انہوں کو دل میں گھسٹتے ہیں!..... اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ تو میں یہ اور بول ہی کی عادت نہیں ہمارے ورث کے ہاتھوں کوڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامزدی کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ارب بول یا کلرک! ان کی یہ زندگی ہے اور کم و بیش یہی انجام جو زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور اُٹھ سکتے رہتے ہیں۔

نہ جاننے والے کہوں گے کہ اس کے غم کو اس جوں مرگ میں میلا بھی ہا تو ہے۔ میرے اس پر ہی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ہیں! جو مرگت پر ادلی دیکھ سکتا ہے۔ وہ دُنیا جس نے اُسے سہنے دیا میری ہی تو دُنیا ہے۔ مرنے سے مرے دیا اور کل اپنی کچھ بھی مر جانے کی اجازت ہوگی۔ ہم پھر لوگ قائم کریں گے میرے بچوں کا بوجھ ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جیسے کریں گے جسے بچہ کریں گے اور اُنی مجلسوں میں وہ ہم انفرمٹی کی وجہ سے کوئی نہ آ سکے گا۔ وقت گزر جائے گا۔ سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہٹا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بشمول جائز بن جائے گا۔

صحت چٹائی

منشو — میرا دشمن

منشو میرا دشمن کہا جاتا تھا۔ ہم میں خاص چیچک پیش رفتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے ہم نے ایک دوسرے کو سخت چوڑیں پہنچائیں۔ کتب پبلیشرز سے شائع ہونے والے نئے ادب کے سٹارز کے سلسلے میں سداوت جس منشو کا جوڑ کچھ کوشی چند نے کھلا اُس میں اس نے چیچک کا ذکر بھی کر دیا اور ہماری یہ دشمنی دو تہی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے ہاں کیا ہے کہ اگر میں نے منشو کے بارے میں سمجھو نہ کھانا تو وہ مجھے بھی نہ بخشنے گا۔ لیکن آج جب منشو اس دنیا میں نہیں ہے جس سچ تھا، ہوں کہ کیا ہم واقعی دشمن تھے ؟ اور پندرہ بیس برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو بآپس کہ اگر ہمارے عقائد کی ابتدا اسی دشمنی سے نہ ہوتی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے۔

غٹو کی اور سری اُنٹوں میں زمین آسمان کا فرق تھا — وہ لوہنگ ہی سے دھڑا اُٹھ کر کہا کہ وہ کانوں کے اُپر چڑھ جاتا تھا جس نے والی چمے کی ٹھنوں میں شال ہوتا تھا اور اس کا خوب بھی تلاش ہی کے دیکھتا تھا۔ اور میں نے بھی تاش کر دیا تھا نہیں دیکھا وہ بندہ بلا نوش تھا اور میں نے خوب تو دھڑ دھڑا کر دیا تھا۔ لیکن یہی پہلا بار تھا کہ وہ میں پر ایسا جب سے تھیں برس کا تھا۔ اُس نے کٹھن گھونٹیاں جو پر ہوا کشی ہو یا خداس روڈ — اس بار تک خوب میری قہقہے میں نے اُدھر بھی تک کڑی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ اس نے چھپن ہی سے اسی ٹھنوں کے غلاف سخت نفرت میرے دل میں بھڑی تھی۔ والد محترم نے ان تینوں میدانوں میں چکارا ہائے نمایاں سرعام دیے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی آنکھ وہ قسبیں اس سلسلے میں کچھ بھی کیے بیڑاؤں پر خیر سے سر ہند کر سکتی ہیں۔ ان کے خدیں کا زنا ہوں کی وجہ سے گھر کی بیویں حالت ہو گئی اور میں نے میں مصرت میں چھپن کے دی کاٹے۔ اُس نے خون کو کچھ ایسا بخند کر دیا کہ جب میں سگریٹ یا قہر کو دیکھا مایوب نہیں ہوتا۔ کبھی ٹھنل کیلئے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ پتا ہی جب ایک اُدھر پیک چڑھا جیتے تھے تو اُن افراد گاتے تھے کڑی نہ رکھ کھنی کسے۔ اور وہ مال میں جیتے تھے اور انھوں نے کبھی مستقل کی ٹکڑیوں کی۔ وہ قتل کے طور پر میں نے لوہنگ میں میں زندگی کا سا رفاکار تیار کر لیا تھا — اور منشو کو میرے اس زہر حاصلیت۔ پلاننگ۔ کفایت شعاری اور ٹھہراؤ سے نفرت تھی۔ (پس اس نفرت کا اظہار اُس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا۔

..... مجھے منشو نے غلت انداز میں کام کرنے کے لیے بھی بلا تھا۔ میرے بڑے بچے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے ہم دھڑیر میں آئے سانسے نیچے گراٹ روڈ کو رہا ہے تھے۔ منشو نے ٹھوڑی سی پی ٹی گلی تھی۔ اچانک اُس نے انگریزی میں کہا (I LIKE YOU THOUGH. I HATE YOU)

..... ڈیڑھ سال بعد ہم پاکستان کی کینٹین میں بیٹھے تھے۔ پہنچ کا وقت تھا۔ منٹوں کی بیز چسب دستور راجہ مدی ملتان، اور چچا وغیرہ دو ایک دوست تھے۔ میں بلا برکیز پر اپنی یونٹ کے دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیسے ہندوؤں کے ہوا کہ ہم سنیہ کا نام پکال کر یا۔ یعنی ٹوٹے کی کھوپڑی کو ٹوٹنے کی رسم کا ذکر چلا تو منٹوں نے دانت میں کرکٹا۔ ”اشک جب مرے گا تو اس کی پال کی گویا میں کہیں گا۔“

..... نہیں کے۔ ای ایم۔ ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ٹائفلوں نے وہی لاٹھری سے رات بھر راجہ مدی ملتان کے منے سے آیا اور اس نے کہا۔ ”خوشگستا ہے کہ سالہا اس طرح میسر نہ جوڑا تو چار نہ پڑا۔“

جب گر لٹھروں کو جاتے ہوئے خوشی نے مجھ سے کہا تھا، میں تھیں پسند کرتا ہوں، لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے تو میں نے جواب میں کہا کہ کسی حال میں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے بعض جواب کے لیے جواب دیا تھا۔ درہ منٹو سے مجھے دراصل کبھی نفرت نہیں رہی۔ ریا منٹو تو اس نفرت کے باوجود جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا تھا اور اس تضاد کے باوجود جو باری طبیعتوں میں تھا میں ابھی طرح جانتا ہوں کہ وہ دونوں گھر سے دوست ہوتے اگر میں نے اپنے چکر پڑنے میں خوشگوستا کیجئے، پنا جاتے، پنا پڑے اس کے نفرت ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاید ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہے خوشگوستا ایک کہانی خوشگوستا ایک ”سلسلے میں بھی تھی میں اور راجہ مدی ملتان میں اس زمانے میں ساتھ ساتھ کھانا کھا کر سارے تھے۔ وہ کہانی کہتے تو مجھے اگر سنا ناں بھوتے اور میں کہتا تو انھیں جانتا ناں۔ دونوں کو ہمدردوں کے فاصلوں پر تبادلہ خیالات کرتے اور سب کا فروغ میں ہوتا ہے، ہمدردی راتیں خاصی تیز اور مکی ہوتیں۔ یہی تھی تھ خوشگوستا کے بارے میں میری رائے پر بھی۔

میں نے اس وقت تک خوشگوستا کوئی چیز نہ لکھی تھی، نہ اسے دیکھا تھا، نہ گزشتہ اسیر کے ہم سے میری کو ایک ترجمہ خوشگوستا کے سے شائع ہوا تھا اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ دوسری افسانوں کے ترجمہ نقل میں بدلے کسی ناشر کی تلاش میں لاہور ہوا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے۔ یہ میں نہیں جانتا، بہر حال خوشگوستا کی اشاعت سے پہلے خوشگوستا کے بارے میں میں ہی دوا ایک باتیں میں جانتا تھا اور چونکہ کھانا میں نے کرشن، منٹو اور مدی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، مگر میں ابھی میں منٹو سے بڑا اور مدی اس وقت تک میرے کچھ شہسوار نہ تھے، ڈپٹی، کونسل انھیں وغیرہ کیجئے جا چکے تھے اور مشریم کو میں طبعاً دیکھنے والے سے کھڑا تھا تھا، اس لیے میری نظر وہیں خوشگوستا کوئی خاص وقت نہ تھی۔ خلاصہ یہ کہ خوشگوستا پڑھنے وقت میں میں پہلے ہی سے مصنف کے نفرت تھا۔ خوشگوستا مجھے بہت اچھا لگتی نہیں لگا۔ مالا لکہ منٹو کی کتابوں میں اسے خاصا اور ماسل ہے اور غیری خیال کہ منٹو نے موت دہی طرح نبھایا ہے تو میں مجھے اعتراض تھا کہ خوشگوستا حقیقتی کہ وہ نہیں بلکہ مصنف کے دل کی اختراع ہے میرے ایک دوست اس زمانے میں بقاعدہ اس کی کی میر کرتے تھے اعلان کی مداخلت سے مجھے اس کے آداب و قواعد سے خاصی واقفیت تھی۔ سچے طبقے کی طرف انھوں نے کدو پسی کہ خوشگوستا کا تا ہے، وہاں لکھا، اسی سے پہلے ہی جہاں کی طور پر شہادت بر جاتے ہیں، یہ بات میں یقینی طور پر جانتا تھا، اسی لیے میرا خیال تھا

کڑھیا کا کارڈ نہر تھیتی ہے۔ بیدی نے جب خوشیا کے بارے میں میری تو اس وقت غیر شعوری طور پر یہ باتیں میرے ذہن میں نہیں۔ یوں بھی پھلکڑھنے کے دن تھے کسی چیز پر اتنی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی جو میں آج تک دیتے تھے۔ اس لیے میں نے کہا۔ تو کو کوئی کمانی ہے۔"

میں نے یہ بات کہی اور منہ لگایا۔ لیکن بیدی نہیں بھولا۔ اور جب کچھ عرصے بعد بیدی دہلی گیا اور وہاں منٹو نے اچھوتوں کے وقت آل انڈیا ریڈیو کی میں آگیا تھا، اپنی عادت کے مطابق اُسے پریشان کیا تو نہ جلتے کیسے اور نہ جلتے کس مسئلے میں بیدی نے خوشیا کے بارے میں میری رائے کا ذکر کر دیا۔

وئی سے واپس آکر بیدی نے منٹو سے اپنی ملاقات کا حال سنایا اور کہا کہ میں نے خطر تک کھاری بات پہنچا دی ہے۔ چونکہ مجھے کبھی یہ خیال ہی نہ تھا کہ منٹو اور میں کبھی ایک دوسرے کا راستہ کاٹیں گے، اس لیے میں نے اس اطلاع کو سنا ان سنا کر دیا۔ لیکن منٹو نے میں جب کرشن چندر کے بارے میں دہلی ریڈیو پر پیش کیا اور وہاں جلتے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلے اس بات کا احساس ہوا کہ میرا وہ دیا کہ کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دوستوں نے میری ملازمت پر اس سے خوشی کا اظہار کیا کہ ب منٹو کا بھائی جلتے کا۔ یعنی اگرچہ میں اور منٹو کبھی آمنے سامنے نہ ہوئے تھے۔ لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حلیت مان لیا تھا۔

دہلی میں اپنا نوکری پر آنے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتا چل گیا اور چونکہ میں ایک بڑی تکلیف دہ اور کشش پوری زندگی سے نکلتا ہوا تھا، اس لیے اس خیال سے میری روح کا ناپ گئی کہ مجھے کبھی اس سے متاثر نہ کر پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقع ملے ہی منٹو کو بھانڈوں لگا کر لوگ محض تماشا دیکھتا چاہتے ہیں اس لیے ہم کیوں تماشہ نہیں دیکھیں ایک تو یہ کہ بڑے لوگوں میں وقت ختم کا طوٹا ہوا تھا، دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے بچا دکھانے کے لیے اُچار کا کسے پہنچا تھا اس لیے میری کششیں بار آور نہیں ہرگز۔ — ریڈیو کا دفتر ان دنوں علی پور روڈ کی ایک بڑی کوٹھی میں تھا۔ جیسے کہ اسے اسٹیشن ٹی ٹی ٹی کے دفتر پر ملازم تھا۔ ٹی ٹی ٹی کے پاس تھے جھوٹے کوہلیں سے جو تماشہ دیکھنے کے باقاعدہ رہے ہوں گے، ایک میں ڈانڈ، دوسرے میں کرشن اور دوسرے میں منٹو بیٹھے تھے۔ یہ کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے چاہیے یہاں سے میں کرشن کے کمرے میں چلتا تھا کہ کرشن ٹی ٹی ٹی میں جو طرح کے دوسری طرف ایک کوٹھی میں واقع تھا، گیا تھا اور میں کوٹھی پر گھبراہٹ سے تماشہ دیکھتا تھا اور وہاں ہر بات کو کہے اس نے خوشیا کی بات پھلری۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ جیسے میری کمانی خوشیا پسند نہیں آتی وہ بولا۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن منٹو یوں چھوڑنے والا نہیں تھا تبھی اس میں کیا پسند نہیں آیا؟ اُس نے پوچھا۔ میں نے اُسے بھایا کہ میں یہاں ہندی صلاح کار کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میرا اتحاد اپنی مقابلہ نہیں۔ نہ ہرے سے کام کرو۔ اور مجھے کام کرنے اور منہ لگنا بھٹ مانتے میں مت پڑو۔ لوگ تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم کیوں تماشہ نہیں۔

لیکن منٹو نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی۔ اُس نے ہاتھ کی جنبش سے جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے وہی سوال دہرایا اور شاید کوئی سخت بات بھی کہی مگر راز میں نے کہا۔ کمانی وہاں بھی ہے، لیکن حقیقت نہیں۔"

”کہیں حقیقی نہیں؟“

تب میں نے اپنا اعتراض بتایا۔ تمیں ایک خیال سوجھا اور تم نے اپنے آپ کو قتل کے دوپ میں دھک کر ڈی صورت میں اپنے ذہن کو قلمبند کر دیا۔ حقیقی دنیا میں خوشیاں واقعی دلال ہوتا، کائنات اس کے سامنے یوں برہنہ ہوجاتی تو وہ اسے وہیں دیوچھینا — تم نے جو کہ کھادہ ایکسٹریکٹ کھا کھا سوجھ سکتا ہے، لیکن ٹھنڈ دلال نہیں؟

پھر اسی طرح کی بات بڑے زوروں سے میں نے کہی۔ منٹو کو بھر کو چپ رہا۔ پھر تھلا کر بولا: ”ہاں ہاں میں وہ دلال ہوں منٹو وہ دلال ہے، تمیں انسانہ فریسی کا علم بھی ہے۔ تم خود کیا گھنٹے ہو؟“

لیکن اس وقت کاشی چند گلیا یا بجے اڈو اتنی (راشیشی ڈائریکٹر) نے بلایا یا جانے کیا بتو، بہر حال وہ قلعہ میں ختم ہو گیا۔

..... لیکن وہ قسم کبھی ختم نہیں ہوا۔ جاتی میں جو چٹش اس کے بعد ہی سو رہی، منٹو میرے اس اعتراض کو کبھی نہ قبول سکا۔ گذشتہ سال نقوش کے کسی خاص نمبر میں اڈو ایروں کا ایک پیچوریم شائع ہوا تھا اس وقت جب اڈو میں کوئی نیا انسان گھسے ہوئے اور میرے پورا انسانے اڈو میں پچھے بھی وہ ایک طرح سے ہندی سے رکھو ہوئے ہیں، اچھے آٹھ برس ہونے لگے ہیں اور میرے احباب اور اڈو کے ناظر تک مجھے قبول گئے ہیں، منٹو کو میں یاد رہا خوشیاں کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب کا ذکر کرنا وہ اس پیچوریم میں بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد اگرچہ میں نے اپنی کوشش کی کہ منٹو سے میری چٹش نہ ہو، میں اپنی میزبانی آشکار و سوری منزل میں لے گیا، لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ میں جب بھی بچے آتا، دوستوں میں جانا، منٹو سخت عقاربند کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کرتا۔

اُن دنوں کی بڑی صاف تصویر دماغ کے پردے پر نقش ہے، منٹو ڈیڑھ لاکھ لے ڈھائے گھنٹے پر ماور تھا، کوشش چند ڈھائے کا انچار تھا، میں ہندی صلاح کار تھا اور چونکہ اس نظام میں ہندی کو اہم زبان نہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرحت کے وقت میں ایک آدھ ڈھائے بھی لکھ دیا کرتا تھا۔

منٹو کا ڈھائے یہ تھا کہ وہ اڈو کا لائپ رائٹر بن کر بیٹھ جاتا اور کوشش سے پوچھتا، بولو بھی کس موضوع پر ڈھائے لکھا جائے؟ موضوع منتہی فرما لائپ کرنا شروع کر دیتا، شام تک سووہ کوشش کو شے دیتا۔ منٹو کی اس بات کا مذہم تھا اور اس کا مطلق و قطعی کیا کرتا تھا کہ وہ جس چیز پر جائے ڈھائے لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو کے ڈھائے آرٹسٹ — غلام محمد، دھیر جواپ، علم ویکٹر ہیں، تبلیغ محمد و غیرہ اسے غوا لکھ رہے تھے۔ منٹو گھنٹے گھنٹے انھیں ڈھائے سنایا بھی کرتا تھا اور میں کہ منٹو صاحب، آپ ڈھائے کے بارے میں کتے ہوئے منٹو کے خیر پر جائے اڑایا کرتے تھے۔ جاتو یہ اور صورت صاحب منٹو کا بیٹنے چلائے کا رشتہ تھا۔ اور اڈو اتنی اس سے اس لیے دیتے تھے کہ منٹو کو کوئی دشتے دار ملے، اطلاعات اور ہارڈ اسٹاک کے سیکڑی تھے۔ ریڈیو راشیشی پر ہر وقت، منٹو صاحب، منٹو صاحب، ہوتی رہتی اور ہر مسئلے میں منٹو کے دے حکم کا دور رکھتی تھی، منٹو خوشامدیوں یا دوستوں میں لکھواتا۔ لیکن کے وقت کبھی اس

کے اور کبھی کرشن کے کمرے میں غلط جہتی میں بیٹھ کر کبھی آنکھڑا ہوتا۔ غلطی جیسے بات نہ کرنے دیتا میرے بارے میں کہانی نہ کرانی تھی۔ کمزور
رہا اور کھنڈر پاس کرنا اور اندر گھر میرے محلے میں لوگ اُس کا ساتھ نہ دیتے۔ مگر مجھے بڑی کوفت تھی۔

آخر ایک دن میں نے کرشن سے کہا: ”کیسوی جانی، تم غم کو کبھا دو۔ وہ مجھے خود غم و تنگ کرتا ہے۔ میں طرح دے جاتا ہوں۔“
”تم بھی اُسے تنگ کرو۔“ کرشن نے کہا۔ ”میرے بھلنے سے وہ کیا کہے گا۔“

اور اُس دن میں دفتر گیا تو میں نے طے کر لیا کہ میں غم کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اُس کی کافی دھواں شائع ہوئی تھی۔ کہاں مجھے
بے حد پسند تھی۔ غم نے ایک نازک اور غمناک پریشانی نہایت اور نفاس سے افسانہ لکھا تھا۔ لیکن میں تو شہرت پر تل رہا تھا اور ہر طرح میں داس
وہاں میں غم کی امانیت کے بریل کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اس لیے میں نے اپنا غم اعلیٰ طے کر لیا۔ آخر پچھ کر میں غم کو لکھ کر دے میں گیا وہ ابھی اگر
بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا: ”میں نے تمہاری کہانی دھواں پڑھ میں۔“

”کیسی لگی؟“

”ابھی ہے۔ اب تم چھٹی پڑھو۔“

غم کو میری کوشش رہا۔ پھر اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا: ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دہرا دی۔ ”میں اب تم چھٹی پڑھو۔“

اُس وقت محنت نے کام نہ لکھا تھا۔ غم پڑ گیا وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانہ لکھتے ہو۔ لیکن کچھ دن پہلے وہ اس
بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا۔ اس لیے اُس نے کہا: ”تم کیا جھک رہے ہو؟ میں نے تمہارے ڈرامے
پڑھے ہیں۔“

اُس وقت میرا مجموعہ اپنی چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چرکہ لانے کا فن مجھے خوب آتا ہے۔ اس لیے
طرح دے کر میں نے کہا: ”میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں۔“ اس لیے میرے ذہن کی بات سمجھ ڈال، لیکن تم جو ڈراموں کے بلا شاعر کہلاتے
ہو، جیسی جھک رہے ہو، وہ میں بھی طرح جانتا ہوں۔ کروٹ میں تم نے آہم کے افسانہ ”زین کی کہانی“ پر کمالی ہے۔ ”روح کا تانک
پلے کا پلہ“ اور ”جگر دیا ہے۔“ اُس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا، اور حالانکہ میں دیا میں اچھے تانک نہیں لکھتا۔ لیکن
طبع مزاد تو لکھتا ہوں۔ میری ابھی بڑی چیز میری اپنی ہے۔ کس دوسرے کی پڑائی تو نہیں۔“

غم بھلا تھا، لیکن میں وہاں نہیں ڈکا۔ کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ غم ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا۔ لیکن ڈرامہ لکھنا تو فوہ رہا
اس کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھنا تک مشکل ہو گیا۔ دوسرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا۔ اُس نے پھر غم سے افسانے فی کرے کے
بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں پھر طرح سے کر لیا اور اسٹوڈیو چلا گیا۔ غم نے سٹوڈیو میں میرا پچھایا لیکن میں پھر ٹال گیا۔

اسی شام دشوار عادل اپنے دوست اور سنوٹی مسٹر دن میں جگہ کے ساتھ غم سے ملنے گیا۔ اس نے اگر تا بہ غم نے
انہیں اپنے افسانوں کا نمبر دیا اور مجھے بے شمار گالیاں دیں کہ ”شک سالہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے اُس کا افسانے کے فن کی بجائے
بھی علم نہیں۔“ اور بدھت میں اُس نے افسانہ کے فن پر غم منوں لکھا تھا وہ کیا کہو اس ہے وغیرہ وغیرہ۔

تین دن تک منظر مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں انہیں اپنی کمرے میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ سب سنتا رہا، کچھ گستاخاں بھی کرتے تھے۔ اور منظر کیا کرتا ہے، وہ مجھے مانتی رہتی تھی، بتاتا نہ جھوٹے تھے، لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا ہی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا اور افسوس کرتا رہا کہ بادل غور سے مجھے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، جس کی دوستوں کو توقع تھی۔

میں منظر کے افسانے پسند کرتا تھا۔ خوشیا کے بعد میں نے غلوکے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے۔ 'نیا قانون'، 'منظر'، 'منظر'، 'ڈوراک'، 'نوحہ کی حرارت'، 'جنگ'، 'منظر ڈی کوکسٹا' مجھے بہت پسند آئے تھے۔ لیکن جب تک میں دلی میں رہا میں نے کبھی منظر کے سلسلے اس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی۔ چونکہ منظر کی نظر کافی تیز تھی، اس لیے خوشامد کرنے پر وہ اگرچہ وقتی طور پر خوش ہوتا تھا، لیکن خوشامدی کے لیے اس کے دل میں کوئی عزت نہیں رہتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھے دلی جاکر منظر کے مقابل لاکھڑا کیا۔ لیکن جب بھی ہم میں جھگڑا ہوا، اس نے ہمیشہ منظر کی طرف دلی کی طرف اشارہ کیا۔ افسانہ اور منظر، لیکن کرشن چندر کے لیے اس کے دل میں عزت نہ تھی۔ وہ ہمیشہ گالیاں دیتا تھا۔ چار عکاسان دونوں غلو کو بروقت خوشامدی لوگ گھر سے رہتے تھے، اس لیے میری اس سختی تعریف کو بھی منظر خوشامد پر غور کرے، یہ میری ان کو منظور نہ تھا۔ میں دلاستہ منظر کے اچھے افسانوں کا ذکر کرچو ہوتا تھا اور اس کے کردار افسانوں کی تعریف بڑے زور سے کرتا۔ سوشلزم کے خاص جتنی بھی کرتی تھی۔

ان دنوں حیدر آباد لکھاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، جھست اور دنگل اس کے علمبردار تھے۔ کرشن چندر کئی کرناہیں تھے لیکن انھوں نے بھی اپنی کامیابیوں کا ایک ٹاپر لایا تھا۔ جس میں وہ دنگل، انگریزی اور ترقی پسندانہ نظریوں سے بھر پور تھی۔ حیدر آبادی تھے، میرا کہنا تھا کہ ان دونوں کی جھست فوڈی دنگل اور بوری کے علاوہ کچھ دوسروں میں انہوں نے جو اتنے ہی اچھے ہیں، لیکن نہ جانے کیوں اس وقت ترقی پسندوں کو حیدر آبادی اور لکھنؤ اور بے کے طور افسانوں کے چرباؤ میں تقسیم یا تو انہوں نے کامیابی سے بھر پوری واحد موضوع سمجھتا تھا جب میں کرشن سے کہتا کہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چونکہ تم سب کچھ نہیں سکتے، اس لیے یہ تقسیم غلط اور جھست دان دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ احمد ہوتا ہے۔ ایک دلی منظر نے بھی کھڑی سی بیڑا لگی، انہوں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا کہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تحریر کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا۔ لیکن دونوں نے ایک ہی موضوع — یعنی نوکروں کے سامنے مالکوں کی جھسی بے پروائی — پر افسانے لکھے۔ منظر نے 'بلاؤ' اور میں نے 'بال' دونوں افسانے ساتی کر لی کے ایک ہی نمبر میں (غالباً کسی سالانہ میں) چھپے۔ ابال کر دوستوں نے بہت پسند کیا کہ کرشن نے اس وقت تک کے میرے افسانوں میں بہترین مانا۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا اور وہ کافی پسند کیا گیا۔ بلاؤ اور بال اس وقت کے میرے اور منظر کے ٹرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ حیدر آبادی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جھسی بے پروائی کا اثر دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے لیکن جہاں بلاؤ کے انجام کی حقیقت کو ہی حقیقت ہے۔ وہاں ابال کے انجام میں نوکر کی بیڑا لگی کے ساتھ سماجی ٹریڈی بھی نہیں ہے اور افسانہ سماجی حقیقت (SOCIAL REALISM) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو۔ حقیقت جیسی ہی ہے اس کا خاکہ کچھ بڑے وقت ہی اپنے قلم کو محدود کرنا چاہیے یا اس حقیقت کے پس منظر میں سماجی جائزہ لینا چاہیے۔ یہ بحث طویل ہے اور میں برائے ذہنی کے لیے اس موضوع پر حیرت کر رہی ہوں گے بہر حال

نٹو کے ساتھ ہونے والی چٹک میں میں نے پہلی ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اس کی بڑی تعریف ہوئی، لیکن پھر میں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ ویسے افسانے لکھنا میں کچھ محبوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے دلچسپ اور قسم کے آدمی تھے، لیکن نٹو کو جیسا کہ میں نے دیکھا، بیزخیال ہے کہ باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ ادبیات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو، جن حالات میں اچانک ایک دن منٹو دہلی سے ٹائپ ہو گیا، تقریباً انہیں حالات میں وہ بیسی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اُس کے فرار کا باعث میں تھا اور بیسی سے منیر افریدی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نٹو خود بھی اُس فرار کا باعث تھا۔ کیونکہ طوائف میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا، غرض دیتا تھا اور جب دوسرے اُس کے حلوں کی اس پر آواز دے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ بیسی سے بھاگنے کے بارے میں منیر افریدی کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:

”میں نے بت غور کیا، کچھ کہیں نہ پایا، آخر میں نے اپنے آپ سے کہا منٹو بھائی —
 آگلی راستہ نہیں ملے گا۔ کارٹر ٹروٹ کو — اور باجو کی لگی سے چلے جاؤ —
 اور میں باجو کی لگی سے پاکستان چلا آیا۔“

دہلی سے اچانک نٹو غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ افواہ اڑی تھی کہ اسے نظم میں نوکری مل گئی ہے، لیکن دو سال بعد اُس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا۔ باجو کی لگی سے — آگلی راستہ نہ ٹھہر رہا — بالکل ویسے ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بیسی چھوڑ گیا۔

میرے والد زندگی بھر لڑتے رہے۔ کوڑی نہ کہ کھس کے پینے کے ساتھ ساتھ جو دوسرا نمونہ لنگیا کرتے تھے وہ تھا ”سرقا تم جنگ دائم“۔ اور وہ اپنے لاؤن کو بھی ہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا کوئی بیٹا شر کا سب سے بڑا لڑکا ہو گا، اس لیے وہ سب کو لالے کے طریقے بتا دیتے تھے۔ سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ آدمی پٹ سکتا ہے وہی پیٹ بھی سکتا ہے۔ پٹنے سے پٹنا شکل ہے۔ چڑ، لیکن پٹنے والے کو نہ چھوڑو۔ میری صحت تو لو لگیں ہی سے خراب تھی۔ اپنے والد یا بھائیوں کی طرح قریش کیا لاتا، لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہو گئی اور کشمکش حیات میں جہاں جہاں بھی موکر پڑا ہے، میں نے پٹ کر آخر پٹنے والے کو پیٹ دیا ہے۔

نٹو سے میرا وہ بارہ سال بھر چڑا۔ ایک بار دہلی میں اور دوسری بار بیسی میں۔ دہلی میں میں نے اُسے راک دے دی، لیکن بیسی میں ہماری چوڑی بار ہوئی۔

نوسواٹ کے سلسلے میں ہم میں جو شٹک ہوئی اس کے بعد میرے اور اُس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ چونکہ نٹو دہلی میں تھا اور کہیں کوئی مجھے کچھ نہ کہتا تھا، لیکن ہر بار نٹو کے لیے ڈسوال بن جاتا تھا، اس لیے میرا دارا و چھا پڑتا تھا، لیکن اس

فدا میں اپنے زعم میں منور راشد سے بھی بگڑا بیٹھا۔ راشد ان کو نظم کہانی کہے جاتے تھے اور منظر کو نا و نظم سے چھٹتی انہیں دونوں راشد کی نظموں کا مجموعہ اور ان کے نام سے شائع ہوا، جس پر کرشن چندر نے دیرینہ کھانا منظر نے دونوں کا مذاق اڑایا۔ اس نے شعلی رنگین کے عنوان سے ایک ڈرامہ میں کھانا منظر کی نظموں سے انھانے کر ان کا مذاق اڑایا۔ ڈرامہ آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ دو مکالمے دیکھیے:-

سعید: دشنام کرشن، آپ نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں؟
حشر شن: ٹھنڈے ہاتھ.....؟

سعید: شہر و مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو۔۔۔ اب بتاؤ کیا تم نے کسی اپنی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں۔۔۔ ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح ٹھک ہوں۔۔۔ کسی اپنی عورت کے ہاتھ جو تمھاری زندگی میں یوں داخل ہوں جیسے رات کے مسلمان اندھیرے میں کوئی جگڑے جھنگل آنکھ کھول کر رات کے طور پر اپنی نوم سے لائیں ہانڈے۔۔۔ نہیں۔۔۔ چاند کی ٹلی جوتا ہوا، اور آگ سے۔۔۔ تمہیں آج ہو گیا کیا ہے سعید؟ ٹھنڈی عورت تمھاری زندگی میں کب داخل ہو گی؟

کچھ دن منظر آزاد شاعری کا راشد کی نادر تشبیہوں کا، اپنی عورت کا، راستہ کی رات کا مذاق اڑاتا رہا، پھر اس نے کوئی دوسرا موضوع ڈھونڈ لیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن راشد سے نہیں جھوٹے۔

اس کے بعد ایک دن منظر نے کوئی ڈرامہ لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لیے دیا۔ راشد ٹاپ شدہ مسودہ اپنے کمرے میں لٹکے اور کچھ دن بعد واپس آکر انہوں نے مسودہ واپس کیا۔
"کیسا ہے؟" منظر نے پوچھا۔

"تمہاریت اچھا ٹاپ ہوا ہے۔" راشد نے اس استعزائیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو ان کی اپنی چیز تھی۔
اور منظر بقول خود کہا اب ہو گیا، اس کے بعد منظر مفتوں راشد اور ان کی نظموں کو کوستارہا۔ اپنے کسی دوست سے اچھے راشد کی نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

ہندی صلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ منظر اور راشد میں چلنے لگتی تھی راشد میرے بڑوسی بھی تھے اس لیے منظر مجھے زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا تاہم مجھے پریشان کرنے میں منظر نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر غالباً ۱۹۵۷ء کے اوائل میں ۱۹۵۷ء کے شروع میں ادھیک سن بھرہوا نہیں، اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے پڑگام ڈاؤن کر پڑ گام انگریز ہو گئے۔ راشد نے چارج سنبھالے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیر ماضی میں اس کا تبادلہ کھنڈ کا دیہات دراصل یہ تھی کہ راشد کو پھر ڈاؤن کی ریڈیو شیشن پر پڑگام اسٹیشن میں کرشن سب سے قابل تھا۔ اور باقی بخت پڑگام اسٹیشن تھے اپنا شیدل بدلنے میں کرشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس کا کہنا مانتے تھے یہ پڑگام ڈاؤن کرشن کی میسجوں یا قریب میں کرشن سے مدد لیتے تھے اس لیے اس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے، اور بہت سی باتیں کرشن براہ راست ڈاؤن کرشن سے منظور کر لیتا تھا۔ راشد

کی نصرت میں آخریت کو کافی دخل ہے۔ انھیں یہ منظور تھا کہ کرشن کی کو نفاذ نادر جلتے اس لیے انھوں نے اس کو کھنڈ بھی دیا۔ لیکن کرشن کی تبدیلی جن حالات میں ہوئی وہ آئندہ نے ان کی فکر حاضری میں ان کے خلاف کچھ ان بات لگائے اور جو نگہ جاری صاحب ملک راخذ کی راہ راست و سلفی تھی اس لیے لیا جتا کہ لادیا اس سے مجھے رنجی ہوا اور میں نے راخذ سے اپنے اس نفس کا اظہار بھی کیا۔ راخذ اس پر کہتے تھے کہ میں ان کی تائید کروں گا، لیکن جب میں نے کرشن کی طرف اشاری کی تو باوجود اس کے کہ ہم بارہ کے گھروں میں رہتے تھے اور میری بیوی اور بچے راخذ میں بہت اچھے تعلقات تھے، مگر وہ کاغذ چھٹا تھا، راخذ مجھ سے بدخلق ہو گئے۔

راخذ پر دو گرام لارڈ کیکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو منٹو نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام لارڈ کیکٹر سرنیدر چوٹی کا کوٹا نظر لیا۔ اس کے جنموں پر منٹو نے ایک ڈرھیا ٹوٹ اس سے پرزنت کیا اور لوں اسے اپنی طرف بلایا۔ اذنی کو کھینچے سے خوش تھے اس لیے انھوں نے مجھ سے پروگرام اسسٹنٹ کے لئے ملک کرشن کی جگہ سمجھانے کے لیے کہا۔ منٹو کا ڈرھیا ٹوٹ پر تھا میں نے پروگرام اس بھی کیا۔ مجھے کئی طرح وارے کہ منٹو اس کی دوسروں میں شوٹو بھی آتا رہا مگر وہ خود خاوی اپنے کھاسوں میں کھپ جاتا تھا۔

اس دوران میں کھنڈ سے ہندی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے پہنچا۔ نذرت بد صورت، دبا دھکا، سچلی ناک والا نوجوان تھا۔ اذنی نے صبح اسے اور مجھ سے کہنے میں بلایا اور اس سے کہا کہ وہ کچھ دی ملک مجھ سے کام لیکر کرشن کے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس دن کام ٹھانے لگا لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اس کھنڈی بی۔ نے پروگرام اسسٹنٹ کو بھجوا کر وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو کہتا بھی بہت کچھ تھا کام لیکن کی بات بھی اسے اچھی نہ لگتی تھی اس نے راخذ سے پوچھا تو راخذ نے کہا اس سے یہی کہا کہ ڈراما ٹیپا رٹنگ کی سب ذمہ داری تمہاری ہے، راخذت تو رٹنگ ہے۔ کوئی کئی نواں جو چاہے وہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہوگا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر بیٹھا کام کر رہا تھا کہ منٹو اس کھنڈی بی۔ نے کے ساتھ آنا۔ میرا دھیان سرور سے میں لگا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ آپ کی کرسی ہے۔ ساتھ ہی اس نے میرے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ دوسرا جلیجے۔

میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ بی۔ نے کہا کہ انھوں میں تعظم تھا اور منٹو کی انھوں میں ناخامد چمک مجھے معلوم کھنڈ میں ورنہ لگی۔ میں نے کہا میں اور اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو تو میں آجائیے گا۔

اور میں چلا گیا میری انھوں کے آگے غصہ کے مارے اندر صبر اچھا لگایا۔ راخذ سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ کھنڈی بی۔ نے ان سے بل چکا ہے۔ یہ بھی چڑھ چلا گیا کہ وہ چاہتے ہیں ان کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل انھیں یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ اذنی نے بغیر ان سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہ دیا۔ میں اس کا خائف بھی نہ تھا کیونکہ ایک بار جب جگل صاحب نے مجھے بی۔ اسے کی جگہ آفر کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک بار جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اٹھنے سے ہی منٹو کے سامنے اس کی انیمت پر مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اذنی کے پاس جاؤں کیونکہ انھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ اذنی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی ناخامد چمک میرے دل میں دھڑک گئی اور کوئی جلی گئی۔ اسی غصہ میں ایک

کے لیے خیال کیا کہ مستغفادے دلوں پر خود ہی اس پر ہنسی آگئی۔ جملہ ایہنا اور اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ غشو کی آنکھوں کی چمک پھر سامنے آگئی۔ خدا کا وہ ہے اگر منظر اس کھنوری پی کے لیے کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں وہ سب نہ کرتا جو میں نے کیا اور منظر کو مدلی نہ چھوڑتی پڑتی۔

اُس وقت کہے میں جا کر منظر کو کام کرنا میرے لیے غیر مشکل ہو گیا۔ بار بار اپنی جنگ کا خیال آنے لگا۔ شاید پرفستہ آتا، اُس کھنوری پی کے پرفستہ آتا، لیکن سب سے زیادہ فستہ آتا منظر اس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اُس جیت چل گیا تھا کہ میری جنگ کو کھنے والا ذوق پی کے ہے، اندر شاید منظر ہے اور میں نے طے کر لیا کہ منظر اس سازش کا مزہ چکھاؤں گا میرے فستہ کی ایک سویرے بھی غشی کھیتنے والی میں نے کرشن کی جنگ کا کام کیا اُس میں منظر ہی کا اندام پر روٹوس کیا اور حتی الامکان اس کو کشش کی کمر میں اُس میں ایک لفظ نہ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھوڑوٹوس جو کچھ پہلے کا فستہ اور کچھ تازہ جنگ کا لکھاؤ، کام تمام چھند کر میں اس کنیا میں نے پڑ لگا، تبھی لیں پر شری دیکھ کر میٹھ گیا۔

جانبے ابدال میں سے کھن نے ہر شئی چا کر کے اُس طرح میں تعلیم پائی تھی یا جانے ہمارا نام تو ان کی سے وابستہ تھا یا ابھی سے والد خرم سے اس مرضی کے کارنامے میں میں کر میں نے اسی کی طرح سوچنا سیکھ لیا تھا۔ بہر حال سیش جب مجھ پر مصیبت آئی میری کجی اور سوچ کی تو میں اور بھی خری سے کام کرنے لگیں اور تو میں کرنے والے کو اگر وہ میرے برابر کا ہے یا مجھ سے اونچا ہے میں نے کبھی مٹا نہیں کیا (اور یہ بات کتنی بھی بری کیوں نہ ہو) اُس سے خود اہتمام لیا اور نہ صرف ہر مصیبت سے نکلا ہوں، بلکہ ایک دم آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچنے پر مجھے محسوس ہوا کہ کھنوری پر دو گرام اسسٹنٹ نہایت حق آوی ہے یہ شیکسپیر کو منظر نے جسے جڑ کا یا لیکن جو منظر کے کہنے میں آگیا، اُس کی حماقت میں کیا شک ہے۔ اُس وقت بندی میں میرا کافی نام تھا۔ اُس کے لیے سراسر نام دینا جو اسی بات نہیں۔ وہ کجی اور جزو تو مجھے الگ نے جا کر بات کر لیا اور یوں ٹھکانا بھی میں مجھ سے کچھ دیکھا۔ سوچا کہ اس حق ہی کو آدھار بنا دیتے اور کچھ دیر بعد میں نیچے گیا۔ کھنوری پی کے لیے سینہ تانے پہلی ناک بڑھانے، تھنھے ٹھٹھانے، کھنور کا اپنے تھنھے کنارہ ہٹا کر کھینچنا صاحب دجس وقت کھنور کے شیشی ٹوڑ کر ٹھٹھے، اُس سے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اُس نے وہاں کا کام آئے گا یا لا، سرانجام دیے ہیں اور منظر اپنی عادت کے خلاف، چپ چاپ پاؤں کو کسی پر کے کھینچنے بانوں میں دبائے جمدتی گوش اُس کی ہی ترانیاں سن رہا تھا میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کسی خود سری حق نہیں کر بیٹھا۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد منظر کو چوڑھ صاحب کا چروسی جا کر کہے گیا تو میں نے اُن کھنوری حضرت سے کہا۔ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں، اس شیشی پر ہندی کے ایک ہر گرام اسسٹنٹ کی بڑی ضرورت تھی۔ اور میں نے اُسے شام کو گھر پر پائے کے لیے مدعو کر دیا۔

میں ان دنوں نہیں خبردار میں رہتا تھا۔ وہاں خود ایک ہی چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے۔ برسات کی شام تھی چمک پڑا کر میں اُس کھنوری حق کو بچ پرے گیا۔ بادل گھر سے جوئے تھے اور بڑی بلی چھوڑا پڑ رہی تھی وہ نکلا تا اپنی تعریفیں کرتا رہا کہ اس

مرح اس نے ڈرامے کھے، کس طرح چب صاحب نے کہا کہ ویسا سکرپٹ (SCRIPT) ہندی میں کوئی نہیں اور کس طرح انھوں نے اس کی سفارش کر کے اسے پروگرام اسٹنٹ بنا دیا میں نے بھی اسے خوب چنگ پر چڑھایا، اس کی شخصیت کی تعریف کی اسے سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اس نے اپنا سکرپٹ جاری کر دیا تو سب اس سے نفرت کھائیں گے۔ نہیں آرٹسٹ تو اچھے سے ہجے کو بد صورت کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ پی۔ اے کا ۷۴ ہے کہ جو ڈرامے براڈ کاسٹ ہوں انھیں اچھی طرح پڑھے۔ ویٹ (VETU) کرے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک بھی چیز پڑھے اور ویٹ کیے بغیر براڈ کاسٹ نہ ہونے کا۔ اب جب آپ آگئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ تو اس آئندہ ڈرامے آپ کی سولت کے لیے ہندی رسم الخط ہی میں لکھوں گا باقی تو اردو سوادے ہی آئیں گے، وہ آپ مجھ سے میں کرویت کیلکھیے۔ اور یوں اچھی طرح دیکھ کر براڈ کاسٹ کیجیے، کیونکہ خراب ڈرامے براڈ کاسٹ ہر تو ذمہ داری آپ کی ہوگی اور سٹنگ میں ٹائمنٹ آپ ہی کر لے گی۔ اس پر اس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور بھلایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا۔

اب شیڈیول تو تین مہینے پہلے بنانا تھا اور وہ کرشی بنا کر گیا تھا۔ میں جیسے دوسرے جیسے ڈرامہ لکھتا تھا اور منٹو کے دو تین ڈرامے ہر مہینہ مرتے تھے۔ انڈیا ڈرامہ منٹو کا تھا۔ تمام تھا جہاں تک کچھ یاد ہے، انڈیا، اپلاٹ، دھڑو مجھے سب جھول گیا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ڈرامہ بھی منٹو کے ان دنوں کھے۔ بیشتر ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا جوتا تھا۔ دوسرے ہی دن اس لکھنوی میری لے لے اس کا مسودہ نکالا اور مجھے بھویا میں اسے سٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اسے سنالے لنگ اسس کو زبان وغیرہ یاد دلاؤ وغیرہ کی خاک مجھ دیتی۔ ڈرامہ سناتے سناتے میں کہتا۔ کیوں صاحب اس لفظ کی جگہ یہ لفظ ہو تو کیسا ہے؟ اور وہ کہتا۔ "ہاں ہاں، یہ بہتر ہے۔" اسی طرح میں لال غیل کی مدد سے الفاظ اور مواد سے بدلتا چلا گیا۔ دو چار جگہ میں نے گول نشان لگا دیے۔ میں نے ان حضرات سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کر کے میں جہاں گیا ہوں۔ میں ان کو نہیں بدلتا یہ وہ خود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام ذمہ داری ان کی ہو جائے گی۔ ڈرامہ کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اس کی جگہ تین اختتام تحریر کر دیے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ اس لکھنوی پی۔ اے نے راشد پر پڑا رعب ڈالا کہ اس نے غٹ کا ڈرامہ پڑھا ہے۔ بڑا انجام ہے۔ اس نے بڑی محنت سے ورٹ کیا ہے۔ راشد مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو براڈ کاسٹ ہو۔ راشد تو منٹو سے پہلے ہی جیل بیٹھے تھے، ان کو اپنا پانا بدلا نہ نکالنے کا موقع ہوا تھا اور انھوں نے وہ چند الفاظ بھی جن پر میں نے لال غیل سے گول دائرے بنا دیے تھے، بدل دیے۔

جب غٹ کو معلوم ہوا کہ اس کا ڈرامہ ویٹ ہوا ہے تو اس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈرامہ کر کے کرے میں گیا اور اس نے راشد اور اس لکھنوی پی۔ اے کو بے نقط سنائیں اور کہا کہ ڈرامہ ہوگا تو پتا ایک خط لکھے ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا۔ میں اور تو بی لالاک ڈاکٹر زئی انارڈنسر کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ انڈیائی کے کمرے کا درخشاں میری آنکھوں کے سامنے پڑتا تھا۔ نیچے انڈیائی کے کمرے میں غٹ کچھ اتنے زور سے پتھر ہاتھ کر رہا تھا کہ وہ درخشاں کے پاس چلا گیا اور جھک کر خدا کا

نظارہ کرنے لگا۔ شاید کہہ رہے تھے کہ انھوں نے خود ڈرامہ لکھا ہے اور جو کچھ انھیں بندھنوں کے ساتھ جو گاؤں نہیں ہوگا اور ڈیوی ایٹن (DEVIATION) یعنی جدول کے انحراف کی قدر داری ان کی نہیں ہوگی جب ہم باہر والوں کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں تو اپنے کارکنوں کی کمر نہیں کر سکتے۔ اور منٹو پنجرے میں بندھنے کی طرح تھلا رہا تھا اور تقریباً ڈاڑھے ہوئے کہ رہا تھا کہ ڈرامہ جو گاؤں ہی روپ میں ہوگا اور نہ میں ہوگا۔

مجھے منٹو کی اس تھلاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرت ہوئی۔ منٹو نے مجھے جتنی گامیاں دی تھیں میری ترقی کے راستے میں جو کارٹیں نکالی تھیں، اُن کو کھانا چب دانا میرے ہاتھ پہنچے ہوئے جو چاہیں روپے بھجوتے بلکہ لکڑی لے گئے تھے اور اُن پر سے مجھے بنایا تھا اور جتنا بھی مجھے مست لایا تھا، اُس سب کا بدلہ ان چند لڑکوں کی اس کی تھلاہٹ میں مجھے مل گیا۔ سناڑی ٹھٹھک ٹھٹھک، لوہاروی اکوٹھٹ۔ میں نے من ہی من میں چٹائی کا ٹھادہ دھرایا اور اس اپنے کمرے کی طرف بھرا۔

مجھے یاد نہیں، اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً انھوں نے شاید پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ڈائریکٹر کے کام میں غفلت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے منور میں وہاں آکر گری بیٹھ گیا اور انگلیں زیر پسیو کر لینا ان کی سامان لی۔

لیکن اُس مسرت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تعلیف اور اداسی کا احساس دل و دماغ پر طاری ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے غموں کی تھلاہٹ، اُس کے فوکیس میں تصور پڑی ہوئی شکلیں، اُس کی باہر کو نکل ہوئی آنکھیں — سب کچھ گھوم گیا — اور اس تھلاہٹ کا باعث میں تھا — میں جو درحقیقت اُسے چاہتا تھا، اُس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اُس کے انسانوں کا اُس کے نام غناؤں چاہنے والوں سے کہیں زیادہ تھاج تھا — میں جس نے وہ ایک مہینہ پہلے اپنے ڈراموں کا دوراں جو مچ رہا تھے، اُس کے نام منورین کیا تھا۔

پھر وہ کہ ایک شخص میرے پاس پڑا ہے۔ منٹو کے نام کیا ہوا تھا میرے سامنے ہے۔

منٹو کے سامنے

جو مجھے کبھی بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا

میرے اُس وقت کے جذبات کی کتنی صحیح تصویر یہ آتشاں پیش کرتا ہے۔

دوسرے دن میٹنگس میں ڈرامہ کا قطعہ پیش ہوا۔ گھنٹی بجی۔ اے نے شاید کے کئی پروڈکس کی تقریری تعقید پیش کی، ڈال ڈیرا ریڈیو دہلی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تعقید میٹنگ میں ہو۔ لیکن جو مکڈووی ریشن کا سوال تھا، اگر ڈرامہ نہ ہو تو اُس کی جگہ دوسرا ڈرامہ ملنے کی بات تھی اس لیے شاید نے میٹنگس میں وہ بات اٹھائی۔ گھنٹی بجی۔ اے نے پہلے ہی سے وہ تعقید تیار کر رکھی تھی، سو اُس نے اُس دوی بہر حال منٹو کی تعقید ہوا اور وہی میری میٹنگس میں، یہ کہیں نہ ہوا تھا، شش اس طرح اپنی تعقید سننے کا عادی نہیں تھا کہ گھنٹی بجی اُس نے کچھ کہہ رہے تھے اُس نے جو تو تیز باتیں کہیں اور تیز باتیں کہتے وقت منٹو کچھ سوچتا تھا، مجھے پھر قطعہ آگیا اور میں نے کہا کہ ڈرامہ میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ان صاحب نے بالکل ٹھیک تعقید کی ہے — اور چونکہ سب قطعہ دیر میں

لے لی تھی اس لیے میں نے بڑی صفائی سے اس ٹولے کی کڑھیاں اُجاگر کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں، غٹھنے کیا کیا، لیکن غٹھنے میں اُس نے بڑی کمالیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی تھی کہ غلب تھا کہ کلینک کے غٹھ میں میں کچھ نہیں جانتا اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر کھوکھو کر دکھا سکتے ہو؟

میں نے اور بھی تیز غٹھ میں کہا کہ میں نہیں دس برس تک ٹولہ کھٹا سکتا ہوں، تم اپنی میرے کمرے میں آؤ تو تمہیں بتاؤں گا ٹولہ کیسے کھٹا جاتا ہے اور یہ ٹولہ بھی بہترین کر دکھا دوں گا۔

ہاتے بڑھ جاتی، لیکن غٹھ میں کراؤ واقعی صاحب اپنے کمرے سے لگنے لے چکا کہ ٹولہ تمہیں شہدہ حالت میں ہر گاہ اور ہر گاہ اپنے آڈیٹس کا سوال ہے اس لیے جدول سے غٹھ نہیں ہو گا۔

منظر میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رُکا۔ اُس نے ٹائپسٹرائٹر اٹھایا اور چلا گیا۔ دوسرے دن میں وہ دفتر نہیں آیا۔ دوسرے کو خورشید صاحب دس گھنٹے کی انڈیا میٹنگ اپنے براؤز کا اسٹنگ اکاؤنٹ لایا کہ منٹو کا ڈرامہ اگر براؤز کا اسٹنگ کرنا مقصود ہے تو منٹو کے کھچے چرے مسودے کے مطابق کیا جائے وہ نہ درود کر دیا جائے۔

(ٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ٹولہ خورشید صاحب نے دنگا یا تھا اور میرا غٹھوں نے یہ پیغام بھیجا تھا۔) راشد پر گندہ ٹپلے ہوئے تھے کہ وہ جدول سے غٹھ نہیں ہونے دیں گے اور ڈرامہ بھی شہدہ حالت میں کریں گے اس لیے خورشید صاحب کے ذریعے اُسے کینسل کر دیا تھا۔

تیسرے دن بھی منٹو دفتر میں نہیں آیا ٹولہ اُس نے دنگا لیا۔ چٹھے یا پانچویں یا غالباً ساتویں دن مُشا کہ وہ پہنچ چکا گیا ہے اور اسے غٹھ کلینک میں پانچ سو کی جگہ ملی گئی ہے۔

گراؤٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے غٹھنے بتایا کہ نوکری دوکری اُسے کچھ نہیں ملی تھی اور بیٹی میں اُسے خامی تکلیف ہوئی۔ بوری کو وہ دہلی ہی میں چھوڑ کر آیا تھا بعد میں خستہاں میں اُسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غالباً اُس کا دوست نذر جاکر اُس کی غٹھ کو بیٹی لے آیا۔

”وہ قصداً لال کیا بڑا مسودہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔“ اچانک منٹو نے کہا یعنی جس طرح مجھے راشد پر غٹھ تھا، وہ اُس کھنوری بی بی سے پر جگہ منٹو پر غٹھ تھا، اسی طرح غٹھ کو بھی اُن دونوں کے بجائے مجھے پر غٹھ تھا، اُس کا ٹولہ میں نے کاٹا ہے یہ بات وہ جان گیا تھا۔

”اب تمہارے کیا ادا سے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

منٹو چپ رہا۔

”وکیسو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر میں اسی طرح لاٹا ہے تو مجھے غٹھ کی نوکری منٹو نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو یا آٹھ آٹھ سے ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور چھ سو بھی تو کیا کاٹو؟“

نہیں بنیں۔ ویسا کہ نہیں ہو گا۔ اور اس نے انگریزی میں غورو پر لکھتے ہوئے کہا۔

اُس دن گھر واپس آکر میں نے صفیہ بھائی سے کہا۔ دیکھیے، منٹو نے مجھے بتائی ہوا ہے میں انہیں رہا تھا۔ دوبارہ تکرار دینے پر چلا آیا ہوں۔ منٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہاں دار کا مسرہ منٹو نے جوئے ہے اور وہی کہ اس واقعہ کو نہیں بخولا، ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لیے تماشا بنے ہیں۔ اب اس نے مجھے بتائی ہوا ہے تو آپ اسے کھانا دیکھ کر مجھے یہاں تنگ نہ کرے، کیونکہ وہ تنگ کرے گا تو میں بھی تنگ کروں گا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے۔

غورو صفیہ بھائی نے مجھے یقین دلایا کہ دوسری کوئی بات نہیں ہوگی۔ اور میں نے کچھ کاغذ کیٹ پر دستخط نہیں کیے لیکن ہاں کر دی۔ لیکن جب بعد میں میں نے سچا تو میں نے لے لیا کہ میں بھی اعلان اس بات کا موقع ہی نہ آنے لگا کہ منٹو سے میری ملائی میں اور بیٹی میں جتنے میرے واقف کار تھے ان سے مل کر میں نے گلستاں، اُس کے کرتا و عورتا ششدر کر دی اور وہاں کے طریق کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی میں خاص طور پر ان لوگوں سے ملا جو منٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے مجھے یقین پوارا ہم باتوں کا پتہ چلا۔

- ۱۔ گلستان کا پاس کمری نماؤ قدیم کے ساوہ پندہاں دار داخل حیا ہے جو غلاموں کو کڑے مار مارکوں سے کام لیتے تھے۔
- ۲۔ گلستان میں منٹو کا ایک چھتر راج ہے۔
- ۳۔ جب سال بھر پہلے شاہد لطیف نے میرا نام تحریر کیا تھا تو منٹو نے گلستان میں میرے آنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک پڑا خطرناک دہلی ہے۔

۴۔ گلستان میں ایک ہی منظر کو سب دیکھ کر فرس لکھتے ہیں۔ منٹو سب کے مکالمے پڑھتے ہیں اور سب کو دیکھ کر فکرتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے شاہد لطیف اور مشتاق گلستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا جبکہ شاہد لطیف ہی منٹو گلستان میں لے گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منٹو نے منٹو کا کہنا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح اتنا بے ضرر ہو گیا کہ غوراس نے ہی مجھے ڈان بھاریا جیتھت ہے۔ چہ کو جب منٹو نے مجھے گلستان میں کام کرنے کے لیے خط لکھا تھا تو غوراس نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پھر میں نے جاننے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تارو مار کا خط لکھا تو کوئی اور نہ کہ منٹو اس کا براہ کھین دے گی تو چونکہ کوئی ٹریننگ لینے کو بھی جاری تھی، لہذا میں بھی تیار ہو گیا۔ خیال تھا کہ اگر کچھ نہ سمجھتی تھی تو میری ہر جتنے گی۔ لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ اگر منٹو نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اُس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا، اس میں مجھے بڑی ہی منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑی۔ لیکن اس میں ہلکی دھج میں فرق نہیں پڑا چونکہ اس وقتے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے اور خاصہ دلچسپ ہے۔ اس لیے میں اس کا ذکر نہ ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لیے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو دہلی نے سے پہلے منٹو سے ملا تھا۔ اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے وہ مجھے اچھا لگا تھا۔

گورا چارنگ، پتلا بھیر برہم، فراخ پیشانی ستوال، ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور چونٹوں پر احتیاطاً مینہ سکا ہوا ہٹ — منٹو کی یہ پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دور میں میں سنسنیاتی قانون اور شاید سنسنی کو سٹا، پھر چمکا تھا اور اسے افسانے کے بعد اچھے لگے تھے اور منٹو نے میرے دل میں ایک حیرت کے بجائے ایک ذہنی افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنائی تھی لیکن وہ دل میں میرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لیے جو پارٹ کو مل گئے تھے ان سے نجات نہیں ملی۔ میں ایک دوسرے کا حریف بننا تھا اور ہم باہم حریف ہو کر رہے۔

لیکن جب منٹو اچانک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کوئی کھسکو تبدیل ہو گیا تھا، اختراعات میں کوئی تبدیلی جواب دہوار تھا۔ چڑھا، میرا جی اور ہر ہمدی علی خاں، واقف کی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور واضح طور پر لکھنے کا وہی آدھی جتنے تھے اس لیے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق کر دیتی تھی۔ یہ شیک ہے کہ منٹو کے بدلے پر کبھی بھی جھپٹ نہ پائی، خاص جھپٹش بھی کرتی تھی، لیکن اچھے سے اچھا کھنسنے میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا۔ منٹو کے ہمراہ جانے کے بعد اس کی اور اس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اسے ڈھیلہ کر دیا۔ منٹو کے ہمراہ جانے کے سال نو فروری سال بعد — شیک میں مجھے یاد نہیں اس کا افسانہ 'بڑا شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہوتے ہی اس کے غصے ایک شور برپا ہو گیا۔ چند ہفتے بعد اس نے اس کے بارے میں میری ہی رائے مان لی۔ میں نے بڑی غائب تعریف کی۔ مجھے بڑے کشٹ سے غرض نہ تھی۔ میں اس افسانے کی تکنیک پر ہوا تھا۔ ایک بڑی نازک سی تقسیم کو منٹو نے جس چابکدستی سے یوں سمجھا ہے، وہ نہ صرف قابلِ دود ہے بلکہ قابلِ تعریف بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سنایا تھا، جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار پتال پتال بھی شامل ہیں اور پتال پتال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہر ہفتے افسانہ نگار کو براہِ شور ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو جاننے کے لیے وہ 'نور پتال' سے تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اس کے چار افسانہ ازبیدی کا قانون ہے۔ افسانہ نگار کے علاوہ کئی دوسرے افسانہ نگار ادب میں اس کی فکر کا مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ لاہور میں ہیثیت ہی نہیں کشٹ کا بھی کمال ہے۔ برہماں مجھے خیال ہوتا ہے کہ بڑے بارے میں جو منٹو میں بھی دھریا تھا وہ کھانا، اس نے منٹو سے اس کا ذکر کیا یا اس کا نام نہ انھیں بھی دیا کیونکہ جب میں پہنچا تھا تو منٹو نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد میرے بارے میں منٹو کا رخ کچھ ڈھیلہ ہو گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ٹائر کرکٹر تین یوں ملتا ہے تو ایک نظم بنانے آئے اور ایک نئے مکالمہ نویس کو رکھنے کی بات پہلی تو منٹو ہی نے یہ نام تجویز کیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ غیر شعوری طور پر جس کا مجھے احساس تھا اور جس کی تصدیق پہنچتی میں ہوتی۔ منٹو اگر شرب نہ پیتے ہوتا اور دہلی کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ادارہ کے اس مسودے کا ذکر نہ کرتا جس میں نے کانٹہ چھانٹ دیا تھا تو میں اسی غرض فہمی میں مبتلا رہتا کیونکہ میری طرف سے منٹو کے دل میں جو حکومت تھی وہ دخل لگتی ہے۔ منٹو ڈھیلہ پڑ گیا تھا لیکن وہ اس واقعہ کو زمرہ میں نہ کر سکا تھا۔ سال بھر پہلے ملتان میں اس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی اس وقت میں وہاں جاتا تو اگر میرا یا شاہر کا یا میرا یا سنسنی کا لٹ بے جاتا تو منٹو کو شکایت ہوتی اس لیے اس نے میری مخالفت کی جس وقت اس نے مجھے بلایا اس وقت

شاہد طیف اور ستوشی سلطان چھوڑ چکے تھے اور منظر کربئی کی ناگ کا بال بنا ہوا تھا۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ منظر غدار سے نکالوں گے پر سچے آثار سے گا۔ تم تنخواہ منروا بھی یاد آگے۔ لیکن تھلری جان منق میں آجائے گی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اس کے ڈر سے کجاوہ جیاں اڑائیں تھیں اس کا انتظام لینے کی ترکیب اس نے یوں نکالی تھی۔ اور چونکہ میں ہاں کر چکا تھا اور دلی میں مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے علم کی لڑکی کر لی ہے اس لیے میں وہاں قور گیا لیکن میں نے غلستان میں اپنا لانا خود عمل طے کر لیا۔

میں نے اس وقت تک کنٹرکٹ پر دستخط نہ کیے جب تک غلستان میں مجھے ایک کمرہ اور ایک بڑا کمرہ نہیں مل گئی۔ وہ پہلی احتیاط تھی کہ منظر میں اور مجھ میں جھگڑنے کی فورت نہ آئے۔ اور یہ بے نیس ہو گیا کہ صرف میں ہی تنہا ہوں گے سب سے مکملے کھسوں گا اور میں ہی ڈاکو کا ڈاکو کیٹھن کروں گا۔

میرا پہلا نظم منروا تھا اور دوسرا سفر مجھے جڑا لے ڈاکو کیٹھن کیا۔ رصوف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے ہی صوف میں لے گئے اور یوں غلستان کا ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منظر کو اس بات کا قلع منروا دیا کہ میں نے اس کی چال کاٹ دی لیکن میں نے اپنی حالت کو جانتے ہوئے نہت جھگڑنے کے بدلے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود منظر مجھے ایک چٹ پنہا نے من کا سیاب ہو گیا۔ میرا پہلا نظم منروا تنخواہ باکس میں پر کا سیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے شکستہ کے بہترین ڈاکو بچے گئے تھے اور مجھے ایک مندر میں لی تھی۔ میرا دوسرا نظم سفر باکس میں آفس پر بھی کا سیاب رہا۔ اور ظاہر ہے کہ میرا گریڈ بھی بڑھ گیا۔ جب اشوک کار نے اپنا ایک علم پر ڈاکو اس کرنے کی خواہش ظاہر کی اور کربئی مان گئے۔ منظر کے دونوں نظم تخلیق کر رہے تھے اور ان اشوک کار نے اور شکار تی وودو سلا لینے کے باوجود نام کام رہے تھے اس لیے اشوک کار میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھ سے ایک کمائی کھنے کی فرمائش کی۔ میں نے ان کو دو تین پلاٹ جو میرے فوس میں تھے، منائے۔ اشوک نے ایک پسند کیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک خاکہ سا لکھ ڈاؤں۔ لیکن میں نے کہا کہ کھنے سے پہلے ایک شرط واضح کرونا چاہتا ہوں کہ میں کمائی کھنے کا دو تیرا دو تیر چٹکی لوں گا۔ میں اس وقت پر نے سات سو کے قریب تنخواہ پا رہا تھا۔ لیکن میرا کہنا تھا کہ میں مکالمہ فوس کی حیثیت سے ملازم ہوں۔ کمائی فوس کی حیثیت سے نہیں۔ کمائی کھوں گا تو اس کا دوسرا ہوں گا اور ڈاکو یا گ لڑکی کے کمائے بھی لکھوں گا۔ اگر یہ اشوک کار کربئی کا سلا تھا لیکن اپنی فوس سلاے بنوئی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ اشوک نے کہا کہ آپ کو کربئی سے کچھ لینے کی کربئی مجھ سے خوش نہ تھے۔ میں نے انکار کر دیا تب اشوک نے کہا کہ میں سیر چنی لال سے کہوں گا۔ آپ بات کر لیجیے گا۔ لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ منروا لکھ ڈا لے۔

منظر کو یہ خبر مل گئی کہ اشوک میرے پاس پہنچا ہے اور میں منروا منروا پیر نامک۔ ہا ہوں تو اس نے آجاکو ساتھ بلایا۔ آجاکو اشوک کو اپنے ٹیبلٹ پر سے گئے۔ شرواب آجاکو کے ہاں اعلیٰ قسم کی رہتی تھی۔ اشوک کو انھوں نے اس وقت تک ڈالنے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ منظر نے علم کی کمائی کئے گا اور دوسرے دن اس کا صورت ہو جائے گا۔ چونکہ کمائی کوئی تیار نہ تھی اور صورت ہو گیا تھا اس لیے آٹھ دن کے عمل کے سلسلے میں کیا کیا دقیق پیش آئیں یہ

ایک انگ لمبی کمانی ہے، لیکن جو کچھ منٹوں پر جانتے ہوئے کو میں نے ایک سے معاوضہ لگا تھا، بغیر معاوضہ لیے انسان کو دینا منکر کر دیا۔ اور بات ہے کہ جب آدمی غم کی تواس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کمانی کی مدد میں کچھ معاوضہ لے لیا، اور ابھی خاصی سازش کر کے میرا پتہ کاٹ دیا اس لیے مجھے بہت ہراس لگا۔ خصوصاً اس وقت جب میں انسان کا خاکہ لکھ کر اشوک کے آئے گا منتظر کرتا رہا۔ — صحت ہو گیا۔ مگر مجھ سے خوش نہ تھے اس لیے سو اس کے کو میں زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا، اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد میں نے غصے بدل لینے کی ترکیب نکال لی۔ آٹھ دن کا ڈانڈ کرکھڑا کرنا کمانی کا پٹھیر تو آرام دہ پانی مقوی بن گیا، اگرچہ ڈانڈ کھینچنے تو اشوک ہی کر رہا تھا، لیکن چونکہ پانی بڑا قابل اثر تھا اس لیے اس کی پلٹی قحی میں نے پانی کو ساتھ لایا اور آٹھ دن میں چھت طوطا رام کا ایک مزا حیدر دل لے لیا جب کمانی شروع ہوئی تھی تو یہ ایک منافع کا بدل تھا، لیکن میں نے اس خبری سے اپنا پارٹ کیا اور بغیر دی ٹیک (RETAKA) کے کیا اشوک کو صحت پسند آیا اور اس نے طے کیا کہ یہ بدل چھٹا کار سے غم میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ وہ چھت طوطا رام جو کچھ ہندی بولتا تھا، اس لیے چھت کے سب ڈانڈ میں لکھتا تھا غصہ ایک لاش لکھتا تو میں چار کر دیتا، منٹو ایک سین لکھتا تو میں اس کے دو دینا رہا مجھے سیٹھی ایک لکھتا تو پسند ہے لیکن غم ایک لکھتا تو غم نامک کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن غصہ کر پریشان کرنے کے لیے وہ مضحکہ خیز بدل میں کرتا رہا اور غصہ اتنا پریشان ہوا کہ ایک دن سیٹھ پرہا تھا پانی نمک کی نوبت آگئی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ غصہ میں سما لگ ہوئے اور اگرچہ اشوک اور آچا غصہ کے دوست تھے اور غصہ ان کے ساتھ بھی ملا کر نہیں چلا گیا، اچھے اشوک نے کمرجی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا، لیکن غصہ وہاں ایک لمبی کمانی کے دوے سا جب میں کچھ گئی سے الٹا بار آتے ہوئے اشوک سے ملا اور میں نے پوچھا کہ غصہ کیوں چلا گیا تو اس نے کہا کہ اس نے کمانی نکھیں چلی، لیکن ہم نے کمال اور جوتا کی کمانی نکھلی تھی، غصہ کے لیے یہ چلا گیا ماہ کہ ہم نے کہا کہ اس کے بعد تھاری وہاں کمانی بنائیں گے لیکن اس نے نہیں سنا۔ وہ حقیقت ساوٹر رکاوٹ و آچا (جو منٹو کا دوست تھا) اور ڈیوئی ملا کر کے ایک دھچکا میں فرقی تھا اور غصہ ایسے آڑ میں میں گھریں گیا جیسے کچھ اس نے غصہ میں چھت سے رہ کر دیا تھا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ آگلی راستہ بند ہے، کارڈ نہیں چلے گی تو وہ باہر کی گلی سے پاکستان چلا گیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ کھیدی پر اس میں پرستاروں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چٹیاں اشوک اور دھچکا کوئی تھیں، لیکن منٹو ٹوڑو گنگا نا اور دھچکا جو نا آسان نہیں اس کا اثر نہ شاید طبیعت نے یہاں تیرا تیرا نے غصہ کے بدل ہونے کی تھی وہ جی جی کہ پہلی کمانی غصہ راہی کی تھی گئی اور دوسری کمانی کمال اترو کی کہ جس دن کمال اترو کی کمانی کا پتہ چلا۔ غصہ نے پہلی چھت نے کاغذ کر لیا۔

لیکن منٹو کی اس دن چھت ریت اور پاری صاحب کی دن چھت ریت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، پاری صاحب کی دلچسپ ریت میں غالباً بڑی کاغذ تھا، جبکہ غصہ کی ریت میں اس کی زبردست اکثریت کے باعث قحی، اور اس کی اسی اکثریت میں اس کی ملکیت کا راز مفسر ہے، غصہ کو غصہ کرنے سے عاجز نہیں تھا، کمرجی کے پاس منٹو کو ان کی خوشنودی کے لیے غصہ کو غصہ کے اشیاء

مناحقہ میں لے دیکھا ہے، اہلکار میں چھتا ہوں، مگر تجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھا جنس کے لئے یہ جہاں ہے۔ اس سے مگر کی
 کا خلعت کم نہیں ہوتی، اپنے من میں بھی کوئی آسانی نہیں لیکن غالب کو چھتا ان کے بس کی بات نہیں اور پھر جنگالی کے تاقے جنگال کا
 چھوٹے سے چھوٹا شاعر ان کے نزدیک غالب سے بڑا ہے، اشوک اور دودھیا کی عقل میں چھتا کو سوتیلا دیکھنے سنانے دیکھا ہے، اسی پڑھ
 ایکڑوں اور میرزا کی ٹائریکٹوں کی عقلوں میں چھتا کی مگر اس کے تاقے سنا ہے (جسے شعر کو اس اور دودھ سے بڑی جی کا نام چھتا ہے،
 لیکن اس میں سے کسی بھی کام میں اس کی آکاؤں میں سے بھی، مگر کھول توں کہ وہ ان کا پنے سے کہیں کمتر چھتا، ہاں دودھ سے بڑے سب لوگ
 نواہ منور کو منگی کہتے ہوں، شہزادی کہتے ہوں لیکن اول وجہ کا ٹاٹلاگ رائے کہتے تھے۔ کال انڈیا ریڈیو کی اس پیشکش میں جہاں راشد نے
 رائے سے اس شخص پر پی۔ اے نے اس کے ڈرائے کی حقیقت کی اور اپنی ٹاکرز کے سٹوڈنٹس میں جہاں اشوک اور دودھ چا اس کے بڑی دوستوں،
 لے اس کی کافی کے مقابلے میں غیر اچری اور کال امرودی کی کیا کیا ہے، منور کی انیت کو زبردست ٹھیس پہنچی اور جب اس
 کی انیت کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اس کے لیے شعر ناہنکل ہو گیا۔ کوئی مٹی کھال دلا ابن اوقت حضرت جبرائیل کو جب برداشت کرنا
 جبرائیل وہیں ہمارا تھا، لیکن منور کی انیت کے لیے وہ جنگ ناٹولی برداشت تھی، اور جگر پٹ کر پیٹ دینے کے من میں وہ اہم
 نہیں تھا، اس لیے دونوں بارید میں چھتا کو چھاک گیا۔ دونوں بار اُسے سخت تکلیف ہوئی۔ دوسری بار تو اس کی جان پر آئی، لیکن
 تکلیف کے خوف سے اپنی انیت کو ٹھیس لکھنے دینا اس نے منظور کیا۔

یاد رہی ہو، پیشنگ جہاں دال ایفادہ کی منور پڑھ چلی پیش رہا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا عقل میں کوئی دوسرا آدمی لوگوں کی توجہ
 مبذول کرنے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کوتاہی کے کھسک جاتا تھا۔ یوں تو فلستان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں جب میں
 نے کانٹرکٹ پر دستخط کیے تھے اور میری شرطیں مگر تھی نے ابھی منظوری کی تھیں اور میں مگر جی کو غالب کے بجائے ملازمتی دورا کے
 محبت سنا یا کرتا تھا، میں نے غزلی انیت کے اس پسند کو دیکھا تھا، لیکن ایک خاص واقعہ ہے جس سے مجھے بخوبی نہیں سکا۔

۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء کے اوائل کو دگر ہے۔ شیک بیش مجھے یاد نہیں۔ یہی میں امریکہ رہا فلستان کا، مجھے یاد نہیں، ایک
 مشورہ کرنا تھا، میں نے اس ایکٹر کا صرف ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ مرزا ساکل برس میں شمال ہوتا ہے اور اس پر کہیں کرنا ہے
 کہ دیکھنے والے ہنس کے اسے لٹا دیتے ہو جاتے ہیں، بہر حال یہی میں وہ ایک دو سٹوڈنٹس گیا اسے بہانہ تھی الال نے اُسے
 فلستان میں بھی دیکھا۔ شام کو فلستان کی گینٹیں میں جو کھلے میں رہتی تھی اور محبت کے باوجود غریبوں سے کھلی تھی، مگر وہی گینٹیں
 اور شہر مگر تھی، گیتان مگر تھی، اشوک، دودھ، چھتا، بہن، نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے۔ چو کھاس ایکٹر کو ہمارے ہاں آنے سے پہلے
 فلم پیڈل مگر تھی، ایمری میں جاتا تھا، اس سے اُسے رہ رہتی۔ بڑے مگر تھے، باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے، منور
 حسب معمول باز (BOSS) کے ساتھ بیٹھا بقول مشیام اپنی بڑی سخی ان پر ضائع کرنا۔ لیکن نیپالی برسوں وغیرہ کے ساتھ بیٹھا
 تھا، آخر ایک صاحب اپنی بیوی کے ساتھ کثرت لائے۔ ابو تو سامنے — جیسے کسی نے دونوں جہوں کو کھینچے میں کس کر چھتا گویا
 ہو، بالکل ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا، ان کی بیوی بڑی حسین تھی، ظاہر ہے کہ وہ یہی ان کا کشش نے اُس خود کو اس ملک کے
 پہلوں لا بھلا تھا، بہر حال اس کے آگے آگے دے بہانہ تھی لال اور مگر تھی آئے گینٹیں میں ایک بڑی بیڑ لگی تھی اور اس کے ساتھ

چھوٹی چھوٹی میز پر لگی تھیں۔ بڑی میز مٹاؤں اور کرسیوں کے بائیں کے لیے تھی اور چھوٹی میزوں پر دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھا۔ ایک نشوونما، شوکارا، شوکارا کے ساتھ جی میز پر بیٹھا ہوا۔ لیکن ایک تو اس کی کمر کے ساتھ آئے والے لوگ زیادہ تھے، دوسرے والے باند کے ساتھ بھی چند مکان تھے۔ شوکارا اور گائی کوئی ایکوں میں سے تھے۔ کمری نے وہاں اور شوکارا اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں۔ وہاں آکر چھوٹی میز پر بیٹھ کر کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے شوکارا کو بھی پاس بیٹھا۔ چاہا لیکن غور نہیں بیٹھا۔ اس امر غریبی میں جب مکان بیکر رہے تھے، شوکارا چپ چاپ کھسک گیا۔ میں یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا "کیوں؟"

"چل رہی ہیں۔"

"کیوں؟"

"سب بکواس ہے۔"

"بیٹھو۔ میں نے کہا تھا اس بکواس کے نظار میں ٹیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آؤ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھے بیٹھے ہیں۔ لیکن منٹو نہیں رکھا، خاموشی سے کھینچیں سے نکل گیا۔"

"مجھے نہ دیتے" میں نشوونما نے شام پر جو سیکھ لکھا ہے، اس میں منٹو کی امانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے۔ سلاخوں میں شام آیا تو اس کو لینے والے اسٹن تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی امانیت کو بار بار دیکھیں گئی تھی۔ منٹو لکھتا ہے:

"شام نے مجھے سے کہا — میرے ساتھ رہو، لیکن اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پرالگ کر دیا۔ اس سے وعدہ کر کے کرات کو میں اس سے غلطی ہو مل میں طوں گا، چلا گیا۔"

لیکن جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے، منٹو کے چلے جانے کی وجہ یہاں جو اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کردہ اس کے ساتھ رہے، اور کچھ نہ تھی، اس کی اتنا تھی، اس کی اس اطمینان اور گھٹن کو میں نے اس امر کی (یا انگریزی) ایک منٹو کی آخر بھی محسوس کیا۔ کبھی جب منٹو کو آٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ ایک سخت اٹاس ہو گیا اور پھر وہاں بیٹھا اس کے لیے شکل برکھا — منٹو، شام سے ملنے لکھتی تھی گیا، لیکن اس ملاقات کا شعر بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ تھا اور منٹو اور میں چکر دیاں لگے۔ بہت ہی میں جب وہ شام سے ملا تھا تو شام نہیں منٹو لوگوں کی توجہ کو لکھتا تھا، کیونکہ ایکٹوں، ٹکڑاؤں، کیکٹوں میں وہ اپنی کامیابی، امید، گوئی اور بددلی سے منٹو والوں کی توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھتا تھا۔ لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں منٹو نے آؤٹسٹے نہیں تھے، عام لوگ تھے، جن میں سے شام کو سب جانتے تھے۔ اور منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ ہیں۔ "ایک ملاقات پر منٹو لکھتے تھے اور میں بھی طرح جانتا ہوں۔ اس بات سے منٹو کو، جو اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا تھا، اتنی کوفت ہوئی ہوئی

غرض طرح پریشان چاہتا تھا، لیکن پریشان نہیں، چنانچہ اس نے انہیں اس طرح مذاق کرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی جس اس میں معتقد تھی۔ وہ بہت ذکی نہیں تھا اپنے مضامین میں بار بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن دوسرے بھی ذکی نہیں ہو سکتے ہیں، دوسروں کو بھی بات چہ نہیں سکتی ہے، اسے وہ آدھے درجہ کا فسانہ نگار اور ہر نفسیات ہونے کے باوجود جانتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا، لیکن فسانہ کی یہ عام خامی ہے۔ اس شانسی گئی بارش سے اندھے ہوئے، لیکن اپنے افسانوں میں انہوں نے اس کے خلاف کیا، بات کو کہنے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے، لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ اتنی سی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ انہیں دیر بے دریغ اور کھلی چیزوں پر نہ خراب کر لیا ہے، ہوائی تلے نہ تلنے چاہئیں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہیے۔ منظر قرطاس پر زندگی کی دلی پہچان حقیقتوں کو تنظیم فن کار کی پیکاری سے قلم بند کرنے والا زندگی بھر میں حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا کہ بے حد پریشان رہا تاچ میں یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ لیکن اس دنوں حقیقت نگار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا۔

میں جن دنوں دہلی گیا، غٹھ کی ایک کافی کا لڑا پر چاہتا تھا۔ اس کا نام تھا ترقی پسند۔ ہر چاہ اس کا یوں تھا کہ غٹھ نے وہ دو نذر ستیا، اتنی اور تیدی ہی پر لکھی تھی جو کہ تیدی میرے بست نزدیک تھا اس لیے پہلی فرصت میں میں نے غٹھ کی وہ کافی پڑھا، اہل کمائی میں جو قصہ درج تھا وہ مجھے معلوم تھا، کیونکہ مجھے بتا چکا تھا، بات یہ تھی کہ لوگ گیت گھٹتے گھٹتے ستیا اتنی ایک دم افسانے گھٹتے لگا تھا۔ نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سنانے کا مرض ہوتا ہے۔ ستیا اتنی کو بھی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی فہمیت کچھ زیادہ ہو۔ یہ حال وہ اپنے گھٹتے سمیت راجندر سنگھ تیدی کے ہاں همان ہو گئے اور صبح شام اسے افسانے سناتے گئے۔ تیدی اس وقت پست آفس میں کلرک تھا اور ہر چھ ماہی میں رہتا تھا۔ دو کمرے اس کے پاس تھے، بلکہ زیادہ نہیں تھی، پر ستیا اتنی کی موجودگی میں خلوت کا ستر آجائیں ہی شکل۔ تیدی شام کا تھکا ہارا آتا تو ستیا اتنی ایک افسانہ سنانے کے لیے تیار رہتے، نہیں مگر صوف رائے پتھر لکھ کر چاہتے تھے اس میں رات کو دیر ہو جاتی۔ صبح اٹھتا تو اسے صبح شہرہ افسانہ سننا پڑتا۔ میز پر ستیا اتنی وہاں رہے اور تیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔ غٹھ کی کافی ترقی پسند کا پادشہ یہ ہے۔ صوف آخر میں غٹھ نے ذرا افسانوی پرچہ دیا ہے کہ برادھی (ترقی پسند میں ستیا اتنی کا بدلہ) اپنے میزان سے کچھ ایسا پیتا ہے اور اس کے وقت کا ہر ٹکڑا اس طرح سے پیتا ہے کہ وہ غریب اپنی بیوی سے بیدار کرنے کے لیے چھوٹا خانہ ہی بہتر خیال کرتا ہے۔

کافی اچھی ہے۔ اس میں ٹکڑا دو ہی ہے لیکن منظر اس سے کہیں زیادہ اچھا افسانے گھٹتے ہیں مجھے کافی پڑھنے میں دلچسپ لگی لیکن چونکہ تیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ تیدی کے گھٹے سے سننا پڑا، غٹھ نے جھنڈ کر دیا، اس لیے مجھے لڑا لگا۔ میرے خیال میں اسے گھٹنے کا قی تیدی کو تھا۔ باہر غٹھ کو تیدی سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ دیکھو، میں اس واقعہ پر افسانہ لکھ رہا ہوں، تمہیں لکھنا ہوتا ہے، تمہیں دہن میں اسے نہیں چڑھ سکتا۔ لیکن منظر نے افسانہ نگار کو بتا دیا کہ اس خیال یا قوس سے غٹھ کو دیا۔ یہی نہ سمجھا کہ اس ذاتی واقعہ کو گھٹے سے دو دوستوں میں شکر لکھنے کی دیر لکھی ہو سکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوار نہ لکھی ہوئی بلکہ انہوں نے غٹھ کے خلاف ایک حشر کو عائد قائم کر لیا اور جس طرح غٹھ نے اپنی کافی

اور تب کسی نے (منٹو کو بتاتے ہوئے) کہا: "اے یاد، ستیا رتی کیا کہا کہ دیسا انسانہ کھئے گا، وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔"
 بیدی کا تو نہیں: "تیسرے نے کہا: لکھا تو ستیا رتی ہی کا ہے، بیدی نے اس میں پتے لگائے ہیں اور کہانی دوا نقشہ ہو کر نکلی ہے۔"
 "ہم نے شنائیغ کا بھی ہاتھ ہے....."
 اور اس وقت منٹو نے پاؤں پیچھے کیے اور سب کی آنکھوں کو جیسے اپنی آنکھوں کی کڑنگی میں ڈال دیا، اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں جیسے گڑھوں سے نکالتے ہوئے کہا: "بیدی اور فیض کیا، اُس میں تاثیر کا ہاتھ ہے، تبسم کا ہاتھ ہے۔ سنت سنگھ ستھیوں اور موزن سنگھ کا ہاتھ ہے، خوازا میں اسٹی ٹیوشن....."
 تب مجھے نہ جانے کیا سوچا، منٹو کو بات ختم کرنے کا موقع دینے بغیر میں نے کہا: "تا پنے بارے میں یاد سب کو غلط فہمی ہوتی ہے وہ شام حال پھر تھانہ، گدو گشتال کا ایٹم بڑا دھمکی اپنے آپ کو اسٹی ٹیوشن سمجھا کر آتا تھا....."
 میں نے شام حال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے نہ تو کا قہقہہ دیا، لیکن اس سے پہلے کہ میں بات کرتا یا قہقہہ غاموش ہوتا، منٹو سمجھلا کر اٹھا اور اس نے غصے سے پائل پر دو تین غلغلہ کیوں کے ڈھیلے میں ہی طوط پھینک دیئے۔
 کئی دھراؤ قہہ ہوتا، منٹو مجھے کالی دیکھ کر میٹھی طرح ایک پتھر اس کے منہ پر بھارتیہ کیس لٹنے کی طرح غان کرتے گا، لیکن کبھی اسے غان غان میں بڑھ جاتا ہے، گال دیتا ہے، یا اٹھ اٹھاتا ہے، دھاس دیتی پٹ پٹا ہے۔ منٹو نے گالیاں دیں تو وہ کبھی اندر سے نہیں بے کرشن نہیں ہوتا۔ اس نے منٹو کا ہاتھ نکالتے ہوئے کہا: "کیا کہتے ہو؟ اور دوسرے نے منٹو نے پسے اور تباہ پایا۔ بڑھ کر میرا ہاتھ تھا، اور دوسرے انگریزی میں کہا: ڈو نوٹ ہائنڈ اٹ۔ (DO NOT HIND IT)"

اُس وقت چاہے منٹو اور وہ گالیاں ہی دے دیتا تو شاید میں ہاتھ نہ اٹھاتا، لیکن دوسری بار مجھے یاد ہے، منٹو نے گالی دی اور میں ہاتھ اٹھا نہ لے کر تیار ہو گیا، اگر وہ اندر بھی نہ کھوتا تو سر پھٹل ہو جاتی۔
 فلستان کے زمانے کی بات ہے۔ آٹھ دن کی فوٹو شنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا تھا، چنگر دکن کو سٹوڈیو نکالی تھے اور اشوک کمار نے زبردستی پروڈکشن سے مل لی تھی اس لیے آٹھ دن کی بیشتر شوٹنگ رات کو ہو جاتی۔
 منٹو رات کو سیٹ پر آنے کا عادی نہ تھا۔ اُس کے اشتغال دوسرے تھے، لیکن جب سے میں نے سکریم بھڑکنا شروع میں دال لے لیا تھا اور منٹو کے لکھے مکالموں میں رد و بدل کرنے لگا تھا تو منٹو رات کو بھی سیٹ پر آنے لگا تھا۔ رات کو وہ پیلا پیلا کر آتا تھا اور سب سے پرانا ہے یہ بھاشا گزرتا تھا۔ لیکن میں اُن کے مکالموں کو سمجھ نہ کر دوں، اس بات کا اُسے ڈنکا اشوک کمار کی کہانی کے سلسلے میں دوسرے ساتھ اس نے جھڑپائی کی تھی، اُس سے صدمہ بے حد پڑا ہوا تھا، اُس کو تنگ کرنے کے وہ بے تحاشہ ٹیکویری یہ عادت ہے کہ وہ اپنی ہی شاذ ہی غلطی اپنے سر پہاں ہوں۔ سو شام اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسروں کے سر پہاں۔ اس موقع پر بھی میں نے منٹو کو اتنا بڑھو یا کہو دے اختیار ہو کر گالی دینے چھوڑ دی، لیکن شے واہوں کو غلطی اُس کی معلوم ہوتی۔
 "آٹھ دن کی شوٹنگ کے بعد میں یہاں مرکز بھی لگتی چلا گیا تھا اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھی، اس لیے مجھے اس کا اندازہ نہ

اتنا دوسے کلمات کی شوٹنگ تھی، شادی کا سیٹ تھا، بچہ پنڈت کی حیثیت سے سیر کی شادی کرنا تھی اور میں کہیں دھوئی کے لگے بلی پر بیٹھ رہنے، عام نامی دوپٹے لگے میں ڈالے دھر پر پنڈتوں کی ہلائی سبائے دیدی پر بیٹھا تھا اور سیر کی ماں سے لڑ پڑاٹ لیتا تھا کہ میری حقیں، میرا جگر، میرا دل تھا اس میں کیس فرقہ آگیا۔ تو کیا میں جھک مارا ہوں۔ یا شاید یہ فرقہ تھا۔ میں ہرگز جھک نہیں مار سکتا۔ بہر حال جھک مارنے کا محاورہ غلطی استعمال کیا تھا، شوٹنگ ہدایت دے رہے تھے۔ غصہ نہ ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا میں شوٹ رہے تھے پھر ہاتھ کر پانچ بجے فروٹ سُر بھی اور جی بھیند کی کسے کہا۔ میں یہ ڈیلاگ نہیں بول سکتا۔ ”کیوں بچا شوٹ کرتے پوچھا۔

”جھک مارنا ہنسا بھرا شدید ہے۔ دیدی پر بیٹھا ہوا، دیدوں کا کوٹا، دھرم پرائن برہمن ایسا دیکھ کر نہیں بول سکتا۔“ لیکن یہ تو محاورہ ہے۔ ”شوٹنگ کرنا تھا۔

بست سے ایسے محاورے ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں، لیکن شریف لوگ نہیں بولتے، اسی طرح دیدی پر بیٹھا ہوا پنڈت یہ ہنسا بھرا محاورہ نہیں بول سکتا۔ میں بولا۔

”لیکن محاورے کا مطلب تشدد بھرا نہیں۔“

”جھک کیا ہے، پھیل۔ جھک مارنا، پھیل مارنا۔“ مطلب اس محاورے کا کہ میں بھی ہوں، لیکن کوئی پنڈت اسے نہیں بول سکتا۔

”جنگال کے پنڈت پھیل مارتے ہی نہیں، کھاتے بھی ہیں۔“

”لیکن پنڈت طوطا رام جنگالی نہیں، نہ یہ کافی جنگالیوں کی ہے۔“

”تم کہیں کرتے ہو۔“ ٹوٹ جھٹا اٹھا۔ تمہیں یہ فرقہ بولنا ہو گا۔

”میں نہیں بول سکتا۔ میں دیدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں۔“

”میں بھی برہمن ہوں۔“ غصہ کر رہا۔

”برہمن تمہارے بعد دو ہوں۔ اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو۔“

اور غصہ نے بے اختیار ہرگز زور سے مجھے گالی دی۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سوچتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ وہ حقیقت دل میں مجھے اُس وقت بھی ہنسی آ رہی تھی، لیکن اوپر سے میں بے حد سنجیدہ بنا ہوا تھا اس بات پر زور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرائن پنڈت دیدی پر بیٹھ کر ایسا محاورہ نہیں بول سکتا۔ اعتراض نہایت پُر تھا لیکن جو لوگ غلطی کرنا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے اعتراض وہاں سیٹوں پر قبضہ و زور ہوتے ہیں میں جانتا ہوں کہ اعتراض پھر ہے لیکن برہمن یہ بول سکتا ہے یا نہیں اس سوال نے اُسے ایک دم ذہن بھٹا کر دیا۔ غلطی کرنا اسے نہایت ڈر لگ آ رہی ہوتی ہیں۔ بڑے سے بڑا نام تک وہاں صورت کرتا ہے دھماکا ایسا صورتوں کے باوجود آئے دن محاورے ہوتے ہیں، غلطی نہیں ہوتی ہیں اور نہ ان خسارہ اُٹھاتے ہیں، میری بات شوٹنگ اور دواچاکو

ٹھیک مکی غٹو نے گالی دی تو میرا پلہ اور بھی بھاری ہو گیا اور چونکہ میں بعض مذاق نہ کر رہا تھا اور لڑائی پر آمادہ تھا اس لیے میں نے کہا تو کیسے منظرہ میں پہلو بن نہیں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی پہلو بن نہیں ہو اور تم نے سب بھی کھوئے تو میں تمہیں اٹھا کر سٹو ڈلو کے باہر چھینک دوں گا۔

مداغ نے کچھ ایسا رن اختیار کیا کہ اس کو کچھ لگے۔ شوٹنگ رک گئی، انھیں نکر ہوئی کہ ہم دونوں اٹھ رہے تو شوٹنگ نہ ہو سکے گی اور چار چھ بڑا کی ڈر پڑ جائے گی۔ وہ منظر کو باہر لے گئے اور شاید مجھے لے گئے۔ یہ مجھے یاد نہیں، لیکن کچھ روز بعد جب ہم میسٹری پر آئے تو شوٹنگ میرے ہاتھ کو بہت سے دہلے ہوئے انھوں نے کھار کیا۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا۔ گھر چلا گیا، کچھ کبھی وہ رات کو سیدھے رہ نہیں آیا۔ میں نے نکالے ہی نہیں، مگر خرمک بدل ڈالے لیکن پھر اس نے میرا راستہ نہیں لایا۔

منظر کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اس نے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدمی خرید لے گا لیکن اسے اسے دلائے تو کہا جی رہتا تھا، لیکن کرشن کبھی ایسا موقع نہ آنے دیتا تھا۔ منظر مجھے بھلا لایا دیتا تھا۔ وہ صوموں کا تو میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اس نے اور مجھے گالی دی۔ راتوں میں میں تھکاؤ نسبتاً کم تھا۔ کبھی نے اس کو اور منظر کو روک دینے کے لیے سٹو شکی کو پھر لایا تھا اور اٹھ دن کے لیے اس کا ایک گیسٹ منظر کر لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی، لیکن منظر شوٹنگ لایا وہاں آنا پسند نہ کرتا تھا اس لیے وہ ایک گیسٹ بھر سے کھار رہا تھا، ہم میوزک روم سے دفتر کی طرف آ رہے تھے، کریٹریاں چڑھتے ہوئے منظر نے جاک بک مجھے ہٹا دیا تو میں دھیر سے گالی دی۔

کسی زمانے میں میں خود بڑی گالیاں بکتا تھا۔ والد محترم نت نئی گالیاں تصنیف کرنے میں لگتا تھے۔ یہ وہی جالندہ گالی خیر خند جسے دوست جب ملتے ہیں تو بڑی بھاری بھر کم گالیاں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ مجھے اکی طرح یاد ہے۔ میں عیش شرم لاہور کے دفتر میں کام کرتا تھا، اور اپنے سینئر ایڈیٹر جناب ساگر چند گورکھا کے ساتھ دو مہینوں میں روزنامہ پر تاپ کے دروازہ نکال کر حیثیت سے بہت مشہور ہوئے تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبہ میں گمان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جالندہ سے دو بہار ہاتھ کا سامنے سے لایا لیکن کا دوست کلانت سنگھ آجوا لکھا لایا۔ اور یہی سنا اس نے ایک سوئی سی گالی سے میرا حال پال رہا تھا اور میں اس سے بھی بولی گالی دیتا تھا اس سے بھلیکھ ہو گیا۔ آج یہ بات کچھ خواب کی سی معلوم ہوتی ہے، اور حالانکہ میری بولی اب بھی مجھے خاصا غیر مہذب لگتی ہے، لیکن جالندہ سے لاہور آئے دے اسٹاک اور لاہور کے اسٹاکس میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اگر کاما صاحب جی رن دشتہ رکھتے دیکھتے رہے۔ بعد میں میں نے انھیں سمجایا کہ وہ میرا لنگھ لایا تھا اور جالندہ کے لنگھ لایا ہوں میں خیر مقدم کرنے پر آمادہ رہا۔ لاش منظر میں اور مجھ میں ایسا باران ہوتا اور ہم دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالیاں دے سکتے۔ لیکن دفتر کی بیڑیوں پر پڑتے ہوئے اس نے دھیر سے مجھے جگائی دی تھی، اس میں بے تکلفی نہ تھی، باران نہ تھا، سر پر تھی کا خیر ہم سا جہز تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی خود شکی سے سن لی تو مجھے اور بھی گالیاں سننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے

پامش میں گالی جسے نہ سکوں گا۔ میں نے فوراً کہا: ”دیکھو منٹو! تم ہر ست سر کے پو تو میں جاننا نہ کر رہا ہوں میں گالیاں دوں گا تو تعساری طبیعت صاف ہو جائے گی۔ دوبارہ تم مجھے کبھی ست کافی دینا۔“

اوپر منٹو نے مجھے پھر کبھی گالی نہ دی۔ اس کی یہ بڑا ہنسنے والا بیٹا میری کپال کر یا کرنے کی خواہش میں منور و غلام ہوئی لیکن گالی دہرائے مجھے نہ دے سکا۔

خوشحساب گمانی دینے پر معافی مانگ لیتا تھا، اتنا ماہر اس میں تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم میں برابر کشیدگی رہی اور ہم مل جاتے رہے۔ میں نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہمیں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا ہے اور ہم ملنے پر نہیں رہتے بلکہ ہمیشہ ہی تو ایک دوسرے سے خبردار رہنا، ایک دوسرے کے خیر خرابے کا کٹاؤ کرکٹ دینے والے سروں کی طرح !

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہر دلی بات نہیں۔ لیکن جہاں ہی انایا امتیاد کھل کر ہمارے غم کے راستے کی ہمیشہ دیوار بن گئی۔ میں نے غم کی کوشش کی تو منٹو تیار ہوا، غم نے غم کی کوشش کی تو میں تنہا ہوا۔ غم کے سن یا نہیں، لیکن کوشش لکھنؤ چکا تھا۔ ماشد پروگرام ڈائریکٹر کی کسی پر جا رہا ہے تھے۔ رچ پڑا صاحب کو بھی غم نے پہاں نہیں تھا، غم کو کتنا لذت کا ساتھ اپنے گرد تنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ دینے بل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کوئی ڈراما یا کمانی کھو رہا تھا۔ کوشلیا اندر باورچی خانے میں کھانے کا انتظام کر رہی تھی کہ اچانک باہر طرک پر سے سخت ہونٹیں آواز آئی۔ "اشک!"

"خیر! — مجھے خیال آیا — اور میرا دل دھک سے رو گیا۔ کیونکہ اگرچہ میں اس کے گھر اور حسن بلڈنگز کثوری گیٹ، میں تین چار بار گیا تھا، لیکن وہ گزشتہ ڈیڑھ برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا۔ ملائکہ میں تیس ہفتوں میں پھر وکے مندر کے سامنے رہتا تھا اور ہمارے گھروں میں نصرت میل سے زبانیہ کا نااصلہ تھا میرے ہاں تو دور رہا، وہ کبھی کوشن چند کے ہاں رہی نہ آیا تھا جیسے نزدیک ہی رہتے تھے۔ (میرے آنے سے پہلے آیا ہو تو میں نہیں جانتا،

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا۔ سنا اٹھ کر دوسرا زہ کھولا کہ کوئی کلمہ ادا نہ کرچے منظر کی معلوم ہوئی لیکن یقین نہ آیا کہ غلط ہے۔

”اشت بازمی کوخت ریشگی، قندے پڑی آواز۔“

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ منظر صاف بھابی ہوا ان کے ساتھ ایک گورا چٹا، بڑی خوبصورت آنکھوں اور کھمبے ناک نقشبے والا نوجوان — یہ تو افسانہ ہے۔

خٹو نے تعارف کرایا یہ مسعود پر دیر ہے امیر اختیار کیا یہ اور مست مشورے کیا کہا، مجھے یاد نہیں نام سے ملتا چاہتا تھا۔
 صدف نے کہا ”جیلو ملا نہیں“

میرے پاس اُس وقت دو چھوٹے چھوٹے کمرے، ایک کوٹھڑی اور ایک کچن تھا۔ منوہر لال پجارا گوپی نسل کا شہر دہلی نے کمال ہربانی کر کے ہم جیسے غریب الوطنوں کے لیے بارہا جیسے ۴۰ کوارٹر بنا رکھے تھے جس وقت کا ذکر ہے، ادا شدہ ایک فرس، نہیں

یقیناً میری اندکوشی پر پانچ نمبر کے گوار میں رہتے تھے۔ ایک کمرہ سولے گاؤں ایک بیٹھے کا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں میں نے ایک کرسی پر کام کرنے کے لیے دیکھ چھوڑی اور بیٹھنے کے لیے ایک دروازے پر کھڑا کرسی پر بیٹھا۔ اسی کی حالت اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ بیٹھو بیٹھو۔ اور کوشیا کو آواز دی کہ دیکھو نمبر اور وقت بھائی آئے ہیں۔ نمبر اور پر تیز بیٹھ گئے، صفیر بھائی اندر باہر جانے کی طرف چلی گئیں اور میں اُس وقت تک بات چلانے کی کوشش کرتا رہا جب تک صفیر کوشیا کے ساتھ جینک میں نہیں آئیں۔

مجھے اس جینک کی کوئی بات یاد نہیں۔ سراسر اس کے کمرہ پر پور کی آنکھیں پڑی خواہورت تھیں، اُس کا ناک نقشہ بھی دیکھ لیا تھا اور میں نے کئی بار وہ دیر نہ گزری تھی کہ میں نے اُس کی حالت دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً غلطی دنیا میں میرا ایک طبیعت سے مشور ہو گا۔ اشارہ وہ اُس وقت کسی غم کی صورت میں کر رہا تھا یا جیلنے کی کوشش کر رہا تھا، نمبر اور دھڑکی پڑی اور پری باتیں کرتا رہا اور میں حلائی تھا۔ بات کو میں نے اپنی طرف نہیں موڑا۔ پر پور سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے کس پر یہ چیز فرمائی ہے۔ وہ کب دہلی آیا ہے، کیا کر رہا ہے، کب تک رہے گا، بات چیت کو میں نے فانی پانچ نہیں دیا۔ نمبر کو باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا، بلکہ جب کوشیا آئی تو ان لوگوں کو باقوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا ناک ٹک کر رہا۔

میں نے ایسا کیوں کیا، جب میں نے ان کے بارے میں سوچا ہوں تو رہا ہوں کہ مجھ سے بات کلا ایک منٹ کو بھی نہیں آیا کہ پر پور سے ملتا چاہتا تھا اور نمبر نے شام کے شغل سے خوشی کو چھوڑ کر اسے مجھ سے ملنے چلا آیا تھا۔ صفیر بھائی کوشیا سے ملنا چاہتی ہوں گی، یہ بات میری سمجھ میں آ سکتی تھی، صفیر کوشیا کو چاہتی تھیں اور کوشیا بھی صفیر اور نمبروں کی عزت کرتی تھی لیکن نمبر نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور میرے ہاں نے کام بہانہ اُس نے بنایا، اُس کا مجھے یقین نہ تھا۔ پر پور کے اس طرح آنے میں، اُس کے اس طرح آواز دینے میں میرے ہاں بیٹھنے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاں آکر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھ سے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ باقوں میں اُس نے جتنا بھی دیا کہ وہ اس ٹوٹر پر میں کس شے کے ٹکڑے بھی نہیں دیا اور مجھے اُس کا انداز کمال گیا تھا۔

نمبر کی بات میں نہیں جانتا، لیکن اس ملاقات کی بے کیفی مدتوں میرے دل پر حاوی رہی۔ میں چٹکوا آئی ہوں، نمبر بھی ازل درجہ کا چٹکڑا ہے، لیکن ایک دوسرے کی جھڑکی جاتے ہی انسانیئت کے کچھ تمدن کو چھوڑ دیتی تھی کہ وہ بے ساختہ تنہا ہوتے تھے مجھے اسی طرح یاد ہے کہ جب میں کرسی پر بیٹھا تھیں کاہلہ کر رہا تھا، اور پاس ہی درزی پر بیٹھے نمبر اور مستور، صفیر بھائی اور کوشیا باتیں کر رہی تھیں، میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا، جب وہ میرے گرد تھے میں تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں نہ کرنا چاہیے اور جو کر میں نمبر کے لئے کامیاب تھا، جسے اُس نے حساس برتری کے زیر اثر دوبار کہا تھا، اس لیے میں کھل نہیں سکا۔ بلاواسطہ کاہلہ نمبر کی بندویں سے فوریہ چھا اترتے دیکھ کر میرے دل میں خود پیدا ہوا، لیکن اُن بندویں سے اُسے اتار لانے کی کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوتی۔

نمبر میرے ٹکڑے نہ دیا۔ دہلی میں بھی نہیں آئی، میں بھی نہیں اور اُس نے دہلی میں چھوڑ دیا، لیکن اندر دہلی کے آواز سے غور ہوا (اور نہ تھا تھا شک)

جو بک نہ سکا

یہ غالباً سنگتہ کا ذکر ہے کہ کشتی میں ایک بیچ کو ایک پولیس والا میرے گھر کا دروازہ اپنے ڈنکے سے کھٹکنا، ہاتھ اور لمبے میرے نام سے پکار رہا تھا۔ پچیس سال کا یہ عجب صاحب دیر سے بڑی درشت ناک شکل اختیار کر گیا کیونکہ میں جس اصول کی پابندی کرتا تھا کسی طرح کی کام گھر کے اندر بھی اور بیچن آواز سے پکارنا لمبے حیاتی سمجھتے تھے میں ان دنوں جگر کی تھکات میں مبتلا تھا اور بہتر پرچہ پڑھنے چاہتے تو دے کے لیے خدا کر کے دیوا کرتی تھی۔ بہر حال معلوم ہوا کہ ہر کسی کی عدالت کا میں میرے نام آیا ہے۔ بظاہر یہ یاد رہتے ہوئے کہ مجھے ہاتھوں سے من دیا ہوا پڑھا۔ غرض صاحب نے دوسراں کے مقدمے میں گواہ صفائی کے طور پر مجھے بلوا تھا۔ میں نے گھبرا کر دھنک کر دیے لیکن من کی غرض کی عبارت نے جو اس بانٹ کر دیے تھے۔ ایک قانون دان جن کو فوراً بلوایا تو کہیں جا کر عدم ممانعت کی صورت میں وارنٹ گرفتاری کا خوف دل سے نکلا۔ — اسی قانون دان جن سے مسلم بڑا کر میری گواہی عدالت تسلیم نہیں کی گئی کیونکہ گواہ کے سلسلے میں کچھ عذر و دفعہ کی بھی قید ہوتی ہے۔ — اس بات سے اوس سدا پڑ گئی میرے بھلے میٹر کیل ٹریفکٹ گیا۔ — لیکن اس سارے قصے سے خواہ مخواہ مارے، محبت کے بڑا حال ہو گیا۔ ضرورت سے فوراً جواب دیتے اپنے آپ کو بڑی کر کے سبب کہے جا رہے ہیں، کہ جناب یہ منظر بھی عجیب ہیں۔ مجھ سے تو پوچھا ہوتا کہ کچھ یوں جیسے منظر صاحب اپنے لیے انسانی نظریہ قسم کی چیز ہیں، مگر اس قصے کے قیسے یا چوتھے دن جبکہ مجھے دہسور میں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے منظر صاحب کا خط اور ان کے عدالتی بیان کی نقل ملی، انھوں نے نہایت پُر تکلف انداز سے بلا اجازت میرا نام گواہان صفائی میں دکھنے پر معذرت کی تھی۔ یہ ان کا میرے نام پہلا خط تھا۔ — (دوسرا اور آخری خط لاہور میں ملا، جبکہ وہ آئندہ ادب مرتب کر رہے تھے)۔

منظر صاحب کا اس وقت تک میں نے بہت کم پڑھا تھا۔ حتیٰ کہ دوسراں میں اس کے بعد پڑھ سکی، مگر نیا قانون میرے دل پر بری طرح نقش تھا اور میں اس زمانے میں محض اسی ایک مسئلے کی وجہ سے انھیں بہت بڑا مسئلہ نگار مانتی تھی۔ — منظر صاحب کو میں نے معذرت کا ایک مطلقاً سا خط لکھ ڈالا جس میں میں نے اپنی بیماری کا ذکر کیا، لیکن عذر و دفعہ کی کافی باتیں کی کو ٹال گئی۔ اس خط کا کوئی جواب نہ آیا۔ مجھے تو کمر سا ہوا کہ شاید منظر صاحب جیسے بڑے انسان نگار میرے عدالت میں ماحضرتہ ہونے سے ناامض ہو گئے ہوں۔

پھر جب مجھے یہی چلنے کا اتفاق ہوا تو میں نے وہاں مقیم کئی مشہور و بے غرضیتوں کو خط لکھے جس کا مقصد کچھ یوں تھا کہ سالہ کافی عرصے بعد جب کہ منظر صاحب ترقی پسندوں سے بہت ناامض تھے میرے اس مطلقاً سے خط کو نقل کر کے ایک کتاب اس خط کے نام معنون کر دی۔ وہ خط شائع ہوا مگر میرا نام غائب تھا۔

آپ جیسے بڑے انسانوں کا رے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔۔۔ سب کا خواب آیا، مگر منظر صاحب کا خواب نہ آیا۔۔۔ میں اس بات کو بٹول سکی تھی۔ کچھ روز بعد ایک صاحب نے مجھ سے نہایت بے شکے چار چارہ انداز سے سوال فرمایا۔ آپ نے غصہ کو مٹانے کے لیے غصہ کھنکھا ہے۔۔۔ ان کا لہجہ کچھ اس قدر تنبیہ افغانی ملیں گے کہ آٹھ کمرے منہ سے بلا ارادہ نہیں نکال سکتے۔۔۔ اپنے مخصوص قسم کے چار دیواری ماحول سے باہر آ کر کھلی ہوا تک اپنے اوپر حملہ آور ہو سکتی تھی۔۔۔ میں انہیں پرٹاری رہی۔ اور ان سے کہنے لگی کہ انہوں نے غصہ کو مٹانے کے لیے غصہ کھنکھا ہے۔۔۔ میں اس بات پر بہت پریشان تھی کہ منظر صاحب بھی کیسے غصہ آوری ہیں۔ آخر بڑے افسوس سے کہنے والوں کو بتوایا ہے۔ اس میں غلبہ بات کیا تھی جو انہوں نے سب سے تذکرہ کرنا تھا۔۔۔ اس کے بعد غصہ صاحب سے نہ قوی ملاقات ہوئی نہ خط و کتابت۔۔۔ اور اب اگر وہ ہم میں نہیں رہے تو ان کی یہ بات بھی بڑی ہی مسلم ہو جاتی ہے۔۔۔ لاکھوں گریں نے کئی بار انہیں دوسرے دیکھا، مختلف ادبی جلسوں میں،۔۔۔ وہ ہمیشہ اتنے زور دیتے کہ بے ساختہ ان کی زندگی کی ناگمان پڑتی۔ بڑی بڑی بے چین آنکھیں اور بھونکنے کے درمیان سطوٹیں جیسے ان کی نظریں ایسی چیز کی تلاش میں ہوں جیسے اور کوئی نہ دیکھ سکے۔ ایک دفعہ ایک ادبی مجلس میں جہاں منظر صاحب کے فن کے بارے میں ایک صاحب مضمون پڑھ رہے تھے۔ مجھے کئی صداوت یا صحیح الفاظ میں کوئی حماقت پر مبنی پڑا ہے شرف خود اپنی جگہ، ہم جیسے پچھلے اظہاروں میں چھپ کر بیٹھنے والوں کے لیے بے حد اذیت بخش ہوتا ہے، اس پر وہاں کا قاضی کا احوال اور سب سے بڑا منظر صاحب کی موجودگی۔۔۔ میں نے بہت لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ منظر صاحب اپنے فن پر کسی قسم کی تنقید نہیں کر سکتے اور وہاں تنقید ہی ہو رہی تھی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر اتنا ہی حیرت ہوئی کہ منظر صاحب تنقید پر تنقید کے دوران میں ایک غلط ٹک نہ بولے۔ وہ بیز پر کنیاں رکھے اپنے چہرے کو دھندلا تھوں میں لیے بیٹھ رہے۔۔۔ ان کے چہرے پر بڑی اذیت تھی۔۔۔ اور ہر نئے دے کی طرف ان کی بے چین آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے کچھ بڑا ناچا جاتی ہوں۔ لیکن جب بات ختم ہوئی تو یوں بٹھیں جیسے وہاں اپنے مطلب کی بات نہ پائی ہو۔ اس دن غصہ کے اکٹھے بہت سے غصہ کچھ آپے میں تھے ہی نہیں اور منظر صاحب کا چہرہ اس کا شاہد تھا۔۔۔ غصہ صاحب کی اس دن کی مضطرب خاموشی سبھی کے لیے حیرت انگیز تھی۔۔۔ منظر صاحب غصہ بھی کر سکتے ہیں، یہ بڑی غلبہ بات تھی۔

آخری بار میں نے انہیں ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں دیکھا۔ وہ جس وقت اپنی پوری صفیہ کے ساتھ آئے، تو کسی مضمون پر تنقید ہو رہی تھی۔۔۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ اور ذرا سے گھٹے ہوئے کمرے میں بغیر کپڑے کے بہت سے لوگ چند سویم بیروں کی روشنی میں بیٹھ گئے۔۔۔ غصہ صاحب آتے ہی اپنے مخصوص انداز سے استیضائیں چڑھا کر ایک پاؤں ہتھ پڑا کر دھڑکے اور تنقید میں حصہ لینے لگے۔۔۔ ان کی حالت بہت خراب تھی۔ بے حد دھواں بھرا ہوا تھا۔۔۔ صفیہ کے قریب بیٹھ بیٹھ، مجھے ادیب غصہ کے بجائے صوفیہ کے طور پر سعادت حسن کا خیال آنے لگا۔۔۔ صفیہ ان کی صحت کے بارے میں سخت فکر مند تھیں اور بڑی دایوس تھیں۔ لیکن آج جبکہ غصہ صاحب اپنے انسانیوں کی طرح اچانک موت کی دایروں میں جا کر ختم ہو گئے ہیں تو میں سوچتی ہوں، اب صفیہ کی ایک فکر موت نے لوٹ لی، تو وہ اپنی تین بہنوں کے ساتھ

تہائی میں بیٹھ کر کئی ڈھیر سی ٹکڑیوں میں تقاریر لکھتی رہی ہوں گی — غرض صاحب کے مداحوں کو یہ بات بھی ضرور سوجھنا چاہیے۔
میر سے غرض صاحب پر مضمون لکھنے کو کہا گیا ہے — مگر ذاتی طور پر ان سے میرا اتفاقا واسطہ نہ ہے میں ابھی بمبئی پہنچا ہوں۔ ان کی ذات کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق غرض صاحب کو دیکھتے اور پھر کہتے — ان باتوں میں خود غرض صاحب کس حد تک جوتے تھے میں کیا کچھ جانتی ہوں — اس لیے ان کی ذات کا واسطہ لایا جا کر چھوڑ دیتی ہوں۔

اب رہا غرض صاحب کا فن کیا اگر اس کا تجزیہ ہی درکار ہو تو اس خدمت کے لیے باقاعدہ نقادوں کی کمی نہیں کہ نہ تو وہی لوگ فنی اصطلاحیں برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں سیدھے سادے انداز سے کہی ہوئی بات کا شمار تنقید میں تو ہوتا نہیں اس لیے غرض صاحب کے فن پر اگر کسی کچھ کہوں تو اس کی وقت ہی کیا ہو سکتی ہے! غرض صاحب کے فن پر لکھنے کا جواں ناکہ گریں دھندلوں میں کسی نے ہی چند افسانے لکھے ہیں تو یہ فکری ضروری نہیں کہ جس نے افسانے لکھے ہوں وہ غرض کے فن پر کوئی عالمانہ رائے بھی دے سکے — ہاں فنی و فاضل دوسری چیز ہے۔ اور میں چند سطروں میں اس ادراک کو بیان کرنے کی کوشش کروں گی جو غرض صاحب کے افسانوں سے میں نے قبول کیا۔

غرض صاحب محدود و محدود افسانہ نگار تھے۔ اگر افسانہ نگاروں کا ان کے فن کے مد نظر شرعیہ، شریعت اور طبع افسانہ نگار کہنے کی حرمت ہو تو غرض صاحب کا شمار افسانہ نگاروں میں ہی۔ غرض صاحب اپنے دور کے بہت بڑے حقیقت پسند تھے اور ہر اس چیز کو شدت سے محسوس کرتے تھے جو انہیں کھینچتی تھی۔ اور اسی شدت سے اکثر چیزوں کو اندازہ انداز بھی کر دیتے تھے۔ دیشم کی لمبائی میں اگر سوت کا ایک ٹھکڑا، لالہ کی نظر جاتا تو اس کے گرد اپنے مدلل کا ایک ایسا جال تیار کرتے تھے کہ ان کی زندگی کی خوبی اور نفاست ایک آدھوا افسانہ نگار کی بہت کم شادابی سے مل سکتی ہیں۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ غرض صاحب موضوع کے انتخاب میں قدرے شدت پسند تھے مگر موضوع کو اظہار میں منتقل کرتے وقت حدود سے کہ با شعور اور متوازن فن کار بن جاتے تھے۔ غرض صاحب افسانہ نگاری کی تکنیک کی پوری تکمیل اور احتیاط سے برتنے کے فن میں اگر اندوہ کا کوئی دور افسانہ نگار غرض کے مقابل لایا جاسکتا ہے تو وہ راجندر سنگھ بیدی ہیں۔

غرض صاحب بے مدح و تحری افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے کسی قسم کی مخالفت سے کبھی شکست نہ کھائی۔ انھوں نے حکومت کی مخالفت کا مقابلہ کیا۔ انھوں کی مخالفت پر ہفتے سے مہینہ پھر لیا۔ اور ان کی مخالفت پر حقارت پھر ہی نظر نہ لائی معاشرت کے ٹھیکیداروں اور ادباء و ادب کے اجارہ داروں کی مخالفت کو ٹھکرا دیا اور زندگی کے کسی لمحے میں ان کی کسی سے باز نہ آئی — یہ سند یہ پھر یہ کیلئے قسم کا غرض صاحب کا فن کار کو نقصان بھی پہنچاتا ہے کہ وہ نہ صرف مخالفت کی بنیاد پر غرض نہیں ہوتی۔ بعض اوقات غرض بھی ٹھکے چھین کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اس قسم کی ٹھکے چھین میں غرض صاحب کے اپنے کام کی چیز بھی نکل آتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ ہر مخالفت کو ٹھکرا دیا پس جو بدلے پر مجبور کرنے کے لیے کسی شخصیت کو اپنے ارد گرد ایک حصار بنا لیا کرتا ہے۔ اور یہ حصار نہ صرف مخالفت کا ٹھکانہ ہے بلکہ اس کا مشاہدات اور مصورات کو بھی محسوس کر کے فحش و فحاشی تازہ ہوتا ہے — لیکن اگر یہ حصار نہ ٹھکے اس لیے بنایا گیا ہو

کون "کو کہیں اس سے کمتر ہے کاغذی جھوس نہ کوڑے تو اس قلعہ بندی کا ہوا زریعہ ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ منتر صاحب کی ان ضد ٹری جوتنگ اسی زمرے میں آتی ہے۔ انھوں نے معاشرت کے چہرے پر داغ دیکھ لیے تھے۔ اور اس لیے وہ معاشرت کے خشن پر ایمان لانے کو تیار نہ تھے۔ وہ اپنے مشاہدات کو کھٹکانے سے انکار کرتے تھے اور اخلاق کی اس افواہی قدر کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتے تھے کہ ان کو نظر انداز کر کے معاشرت کے خشن کا قصیدہ کہو۔ ————— راجہ راجوں کو بھی عوامانہ خشن قرار دو۔ یہ درست ہے کہ منتر صاحب نے دن کی نصیحتوں سے کیا کر بلائے مستقیم منزلت ہی گئے تھے۔ اس لیے وہ معاشرت اور اخلاق کے ان مطالبات کا مذاق اڑانے کے لیے شدت پر بھی اترتے تھے۔ لیکن اس انتہا پسندی میں بھی ثلوت کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ البتہ شدت ضرور موجود ہے۔ اور فن میں شدت کوئی غرم نہیں۔ ————— بعض رنگوں کو گمراہی پر تھپے، گمراہی کی گمراہی کا کوئی بھی رخ نہ پاتا نہیں۔ جو رنگ جسے غریبہ رنگوں کو فن کا راج قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی دراصل رنگ کے چلنے کی کوہاں سطر گمراہ کرتے ہیں۔

منتر صاحب سے پہلے بھی طوائف اور بگڑی ہوئی لڑکیاں اور ان کے دلال، اور ادیب ہیں کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ ————— لیکن ان میں (اور اوجان آدا کو الگ رکھنے کے بعد) بہت کم ایسی تصویریں تھیں، جن انھیں یا تو نہایت جھوٹا نہیں یا محض ساج کا ٹھوس جی پر ادیب تصور کر کے آگے بڑھ جاتے۔ ————— دلال بھی جھک دکھا جاتے، مگر صحت اپنے لباس کی۔ منتر صاحب کا سب سے بڑا اور زندہ رہنے والا کا زما یہ ہے کہ انھوں نے اور ادیب میں پہلی بار تجدید کی، اس کو بے ہوشی سے دیکھتے کہ دلال ہونے لیا۔ ————— اور کوئی صادر کرنے کے بجائے، اس طبقے کے ساتھ ساتھ نظر آئے۔ وہ تو کچھ ہونے لگے، کچھ کچھ رہے، جیسا کچھ ہے اسے بغیر لایا چند نے ٹانگے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اور پھر ٹپھنے والے کو اجازت تھی، وہ چمکے چاہے قائم کرے، جو علاج مناسب سمجھے کرے منتر صاحب کی طوائفیں، گڑھی ہوئی لڑکیاں اور دلال، بدعاش، غمگین، ہمارے سامنے اپنے حقیقی رنگ میں آتے ہیں۔ اور ہم آسانی سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بھی انسانی ہیں۔ ہماری ہی طرح ان کے بھی لطیف انسانی احساسات ہیں۔ انھیں بھی دکھ پہنچتے ہیں، ان کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ یہ محنت بھی کر سکتے ہیں اور ترقی یافتگی دے سکتے ہیں۔ ————— بے روزگاری کا زخم بھی کھاتے ہیں، دوسروں کے دھن بھی ہنر ہیں اور بدوا گار بھی۔ ————— اس سے کوئی انکار نہیں کہ منتر صاحب نے ان گرتے ہوئے رنگوں کو پہلی بار اور ادیب میں پوری ایمان لایا کے ساتھ پیش کیا۔ ————— اسی سلسلے میں منتر صاحب پر انزم دکھا جاتا ہے کہ وہ عوامانہ پرتوتے تھے۔ ————— اب یہ الگ بحث ہے کہ عوامانہ کیلئے کیا نہیں، البتہ اتنا ضرور کہیں گی کہ آؤٹ اور ادیب کے بڑے بڑے شاہکاروں پر بھی یہ انعام عاید ہوتا ہے۔ ————— مگر لفظ کوئی اتنا تو بتائے کہ کیا عوامانہ میں ایک دلکش، ایک بے داغ، محسوسیت، ایک رنگ، ایک داغ، سانس نہیں ہوتا جو تخلیق اور فنل انسانی کی بقا کے مقدس تفسیل کو قائم رکھنے کے لیے فطرت کی طوط سے دویمت کیا گیا ہے۔ اب یہ تو محض مذکور بات ہے کہ کوئی حزم یا حزم دس لوگوں کے ماں باپ بن کر بھی لذتیت اور عوامانہ کے نام سے بھڑکیں اور اپنے جگر گوشوں کو مغلی جنرات یا اسی قسم کے دوسرے جنس افلاک یا قہر قرار دیں۔ ————— مگر یہ بحث بھی منتر صاحب کے مخصوص فن رنگ سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی، کیوں کہ منتر صاحب کو میں جس قدر پڑھ سکی ہوں دیکھ کر چھوڑ کر اس میں دھرم طوائف سے متعلق انسانوں میں، ان کتاب لذت و یا ویسا ہی بھٹنے کی کساہٹ کہیں نہیں پاتی۔ ————— اب بھلا ہنگامی پرووی ہی کو دیکھو مجھے اپنے غلیظ مبستر پر ٹوٹی ہوئی پڑی ہے۔

ایک گروہ کے گرد رکھے جوتے۔ غلو نے اس عام انداز کے لیے چاند کے گرد ہائے کی خواہجہ صرت تشبیہ لکھ کر ساری عورتوں کو لوں خیر آستیں کے پڑے پس کر سونے کی تزیین نہیں دی۔ بلکہ تشبیہ دی جس تو غلوں کی کمال کے متعلق پر بھی مبنی کی گھناؤنی کمال کی خدا جانے وہ کس دل گروے کے بزرگ ہیں جنہیں پر بھی مبنی کی کمال دیکھ کر لذت کا زور وہ ڈھٹ سکتا ہے۔ — یہی کاغذ کی طرح سفید، زخا کی شکار، بڑی بڑی کھوئی ہوئی آنکھوں والی سراج کو دیکھیے جو روایات سے روایات جنس پر تو کڑی پر اور پھر بے جا ہر بات جاتی ہے۔ اور اپنے آپ کو بکنے کے لائق بنانے کے لیے جس والی سگریٹ کے دم لگاتی ہے۔ کیا کسی کو یہ ادا آئے بڑھنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ — میں نے تو جان تک غلو صاحب کے شہسور و معروف نثریوں گروادوں کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی بھی نادر اہل انسان انہیں پڑھ کر لذت حاصل نہیں کر سکتا بلکہ جنسی فعل کے خلاف ایک شدید قسم کی نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ — جلد ایک ساور انسان کے لیے ایک مسئلہ بن سکتی ہے۔ — جنس کے خلاف یہ نفرت، اس لیے بھی پیدا ہوئی ہے کہ غلو صاحب ان جنس میں ڈوبے جوتے گروادوں، پر تشبیہوں اور استدلال کا رنگ و روغن نہیں پڑتے۔ — یہ سب پوت غلو صاحب کی فطرت کے خلاف تھی، اس لیے وہ اتنی چٹائی سے ان کی تصویر آتے کہ وہ بڑی ہوئی تصویریں بنی نہیں بلکہ ایسی بے فوٹو بن جاتیں۔ — ایک سے فوٹو کی طرح صراحت غور سے دیکھیں تو دیکھیں، ان سے لذت اٹھانے کا عام ذہن کا کام نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد غلو صاحب نے اقتصادی اعتبار سے اپنے بہترین دن گزارے۔ یہ طرہ زمانہ غلو صاحب کی فنی بلندی اور فنی تخیل کے عروج کا زمانہ تھا لیکن افسوس کہ اسی زمانے میں، اقتصادی پریشانیوں نے ان سے ایک ایک دن میں تین تین افسانے لکھوائے۔ — ہمارے مغرب زدہ نقاد جو اپنے ملک کی ہرج و مرج کو تخریب گودھنے کے علوی ہیں، ذرا بتائیں تو کر کیا یورپ اور امریکہ کے ادیبوں نے پچھتر روپے کا نئے کے لیے ایک دن میں تین تین افسانے لکھے ہیں کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہاں کے معمولی سے معمولی ادیب کی ایک کتاب بائز میں آجائے تو وہ بڑی شان سے سال دو سال کچھ نہ لکھ کر، صرف سوچ کر گزارا کر سکتا ہے۔ — غلو صاحب نے تقسیم سے قبل اپنے اس قلم کے بہتے پر بہتوں گن رے تھے، اور پاکستان آکر بھی وہ اپنی جیوری اور بہتوں کا سیارہ زندگی قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ — مگر ہمارے ملک میں صرف قلم ذریعہ آمدنی نہیں بن سکتا یہی وجہ ہے کہ چند دلوں کی خاطر نہایت گھٹیا قسم کے رسالے میں لکھتے رہے۔ غلو صاحب کو اس زمانے میں کثرت سے کھانا پڑا، اکثر بھرنا پر شاید، وہ بیسی کے دوران قیام میں بھی قلم نہ اٹھاتے۔ یا اگر اٹھاتے تو دوسرے انداز سے۔ — مگر لاہور آکر ضروریات زندگی کی طلب نے ان سے بھی کچھ لکھوا دیا۔ — بہت سے افسانے جو لکھے گئے انہیں بہتر حالات میں شاید تصویر اور سوچ کر لکھا جاتا۔ — مگر ان تمام پریشانیوں کے باوجود غلو صاحب کی عظمت سے کون منکر ہو گا کہ وہ دانستہ بچے نہیں، ایک ذرا ماضی آفرین کے طور پر چچا سام کے ایک نمائندے نے ان سے تین سو روپے فی افسانہ طے کر لیا، مگر غلو صاحب کی رگ طنز و طعنے اور افسانوں نے تین سو روپے (مگر اصل) ادب پرانی انسان کے بجائے (غالباً) بچپن میں (دکن) روپے فی خط کے حساب سے چچا سام کے نام خطوط لکھ ڈالے۔ — غلو صاحب کبھی یک نہ سکے اور نہ ہی کوئی انہیں لکھے بندوں اپنے حق میں استعمال کر سکا۔ — وہ طبیعت کے کھرے تھے، اس لیے کسی قسم کی پابندی انہیں گوارا نہ تھی۔

آج غٹو صاحب ہم میں نہیں، وہ اپنی انٹل جلدی کے ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن ان کا فن، اور ادب میں ناقابل فرہوش کارنامے کی طرح دھڑکتا رہے گا۔ غٹو صاحب کے فن اور موضوع پر سینکڑوں اعتراض بھی ہو سکتے ہیں مگر غٹو صاحب کی ایک خصوصیت سے کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا اور وہ خصوصیت تھی انسانیت دوستی اور زندگی کو صاف اور بے داغ دیکھنے کا جذبہ جو ان کے فن کا بھرپور تاثر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کو قریب کار کی چیز معلوم ہو، لیکن کیا تاریخ کے دل میں ہر ایک گھاٹی کے لیے یکون نہیں جو گچ اٹھتی ہیں کیل اور گندی ساری بھی ایک جنسی بدبھنی کے شکار توجہ ان کے لیے باجے کشش ہوتے۔ کیا غٹو صاحب سے کوئی شخص نفرت کر سکتا ہے۔ کیا سڑکوں کے کچے کچے کھنڈے والی بھولی بھالی لڑکی سے آپ کو محبت نہیں ہو جاتی جسے یہی نہیں معلوم کہ وہ گناہ کرتی ہے۔ یہ بھڑادی اور انسانیت دوستی کی ہر ایک دو افسانوں تک محدود نہیں ان کے زیادہ تر افسانوں میں موجود ہے۔

یہ انسانیت دوستی مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ اور مختلف اٹھنا میں نظر آ سکتی ہے اس کے لیے کوئی سا پتھر مقرر نہیں کہ یہاں غائب ہو کر گھو، یہاں پریم چند کو رہا یاں سعادت حسن منٹو نہیں سا سکتے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس انسانیت دوستی پر کون سی مرثیت ہے۔ دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسانیت دوستی ہے۔ بھلیت نہیں انسانیت سے نفرت نہیں، انسان کو فطری اور حیاتی طور سے کینہ اور دیرینہ قہر دینے کی عادت نہیں۔ یہاں پریش بھری تھکن، انجھلاں اور بالواسی نہیں بلکہ یہاں تو یہ جذبہ کارفرما ہے کہ انسان بڑی ہی پیاری مخلوق ہے۔ یہ طوائف کے بار بار ہیں اگلی انسان ہی رہتی ہے۔ اگر اس کے معاشرتی زخم مندمل ہو جائیں جن کی طرف فن کار اشارہ کر رہا ہے تو یہ دنیا کتنی پیاری اور یہ زندگی کتنی لطیف ہو جائے اور غٹو کے فن کا بھرپور تاثر یہی جیتی جاگتی انسانیت دوستی ہے۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے ذرا اتنا سوچیے کہ سعادت حسن منٹو اگر بہتر دنیا میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کے موضوعات کیا ہوتے۔ اور ان کا جامہ از قلم کیا کیا مٹھی نہ بکھیرتا۔

باجرہ مشرود

رحمدل دہشت پسند

آنادی کی تقریب سعید پر امرتسر میں جب پہلا فساد بھارتیوں اور ہندوؤں میں تھا، سعادت جی نے انہوں نے انہوں کی خوشی میں اپنے جہانوں کے گھروں کو آگ لگا لگا کر چراغاں کیا۔ اور اس اعلان سے قبل کہ امرتسر پاکستان میں شامل ہو گا، ہندوؤں میں آدھا شہر بجے کا ڈبیر ہو گیا۔ اس جشن کے نامک کا جب پہلا سین تم بھارتیوں کی بری نے کہا کہ باؤں کو کچھ لاکھتے ہوئے آؤ۔ لیکن جب میں امرتسر پہنچا تو میرے عزیزوں نے مجھے چوک فریڈ میں ہی روک لیا یہ مسلمانوں کا چوک تھا اور میرا گھر ہندوؤں کے علاقے میں تھا۔ مجھ سے کہا گیا: ”وہاں جانا خطرناک ہے۔“ غلبہ یہی ہے کہ تم راستے ہی میں دھریے جاؤ گے۔ ہاں اگر مسلم لیگ کی لاری آگئی تو شاید کچھ ادھر جانے کا بندوبست ہو سکے۔“ لیکن مسلم لیگ کی لاری نہ آئی، میں نے اپنے عزیزوں سے پوچھا: ”کیا کٹڑہ پھل سنگھ تک بھی نہیں جا سکتا؟“ جواب ملا: ”صرف شہابے شیر فروش کی دکان تک، اس کے آگے ہندوؤں کا راج تھا، میں نے یقین دلایا کہ شہابے کی دکان سے ادھر ہی رہوں گا، ادھر نہیں جاؤں گا۔“ کٹڑہ پھل سنگھ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر برہمن کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ شہابے کی دکان سے دھڑکچہ وکیلان کے سامنے بجے کا ایک پٹا دکھتا تھا۔ اس گلی میں منتر کا مکان تھا۔ گلی کے دہانے پر بجے کا ڈبیر مجھے اپنے اٹھی اور مال کے درمیان آٹن کٹن کی طرح آؤریاں نظر آیا، جس کے اس پار دیکھنا محال تھا۔ لیکن میرا دوست زندہ تھا۔ دل نے کہا: ”یاد زندہ صحبت باقی۔“ میں نے اینٹ پتھر کے اس انبار کی طرف سے منتر پھیر لیا، جو کچھ وکیلان کی ناگہندی کیے ہوئے تھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا: ”آؤ چلیں۔“ لیکن آج میرا دوست ڈینا میں نہیں ہے۔ بجے کا وہ ڈبیر آپ سے آپ اٹھ گیا ہے۔

کوچہ وکیلان ہندوؤں کا محلہ تھا۔ سعادت کا کتا کرمنٹ کشمیری نرہن میں ترانہ کو کہتے ہیں۔ کشمیر میں ہائے اب و بعد کے یہاں دولت و تواضع سے تلخی تھی، اس رعایت سے ہم منتر کلائے، میں نے منتر کے اس بیان کی تصدیق نہیں کی۔ دوستوں کو آؤ دیکھو کمریوں اور تھانوں میں تیس بجے پیر پڑتا۔ عجیبہ جس طرح چاہئے، وں محبوب کے خدو خال کو کتا بی میاؤں کے مطابق مسطوروں سے نہیں لڑتا۔ یونہی تار و دو نے اگر مو تار کے بوڑھوں کو شیشہ بھدب سے دیکھا ہوتا تو مستوری کی ڈونیا ڈھکیں ترین مسکراہٹ سے محروم ہو جاتی۔ ہاں تو کوچہ وکیلان منٹروں کا محلہ تھا۔ گلی میں قدم رکھتے ہی درمیں طوط مسعود پتویر کے والد خواجہ حفیظ اللہ وکیل کا مکان تھا۔ اس کے باہر ایک چھوڑا سا کنواں تھا، اس سے آگے خواجہ عبدالحمید ڈی، اس پتی کا مکان، اس مکان کے سامنے ایک عریلی تھی، خواجہ عبدالحمید صاحب کے والد نے کوئی سو سے اوپر ہی عمر پائی ہوگی وہ امرتسر کے بچے بچے کو جانتے تھے۔ انھوں نے جب مجھے پہلی بار سعادت کے یہاں دیکھا تو پوچھا: ”جس کے بیٹے عریلی میں

نے بتایا تو ان کی آنکھیں سچک اٹھیں۔ "اوسے اوسے اسے تو تو اپنا بچہ ہے۔ تیرے دادا جب گاؤں سے اٹھ کر شہر آئے تھے۔ تو شروع شروع میں ہی تو ایسا تھا مکان۔ جہاں گھگھکے سامنے جو حویلی ہے۔ نا۔ خشتی مٹھوایا ہوئے تھے ہم تمہارے گھر سے۔ اور برسوں کو کیا زمانہ تھا۔ کیا لوگ تھے۔۔۔۔۔ اس حویلی کے سامنے شمال کی طرف سعادت کا مکان تھا۔ اس کا ایک دروازہ جنوب کی طرف کھلنا تھا۔ دوسرا مشرق کی طرف۔ اور یہی سعادت کے کمرے کا راستہ تھا۔ ٹیڑھی سی میں قدم رکھتے ہی وہیں باتھ روم بھی کمرہ ٹھوکی حجرہوں میں دارالامیر کے نام سے مشہور ہے۔ دروازے کے قریب ہی دیوار کے ساتھ دو کھوکھے رکھ کر ان پر گدا اور گدے کے پر لٹائی تھیں۔ پھاڑا گیا تھا۔ سامنے شمالی دیوار کے ساتھ کھڑکی کے قریب کھنے کی میز تھی۔ اس کے دائیں جانب دیوار میں ایک چھوٹی لکڑی، جو کتابیں، امارت میں نہیں سہا سکتی تھیں میز پر دیواروں کے سارے پر ہی رہتیں۔ کتابوں کے علاوہ حکم دوات، کاغذ، بیٹلیں۔ میز کے بائیں جانب آفتخان تھا جس پر بھکت سنگھ کا مجسمہ رکھا تھا۔ مجسمے کے ایک طرف تل کا ٹیبلیمپ تھا اور دوسری طرف پرانی وضع کے ٹیلیفون کا ریسیور۔ ایک سچک ٹیلیفون سے جب متحدہ کوششیں کرنے کے بعد بھی اسے مطلوبہ فیڈبک نہ مل سکا تھا تو اس نے یہ کہتے ہوئے ریسیور کو کھینچ کر اوپر کوٹ کی جیب میں لٹال لیا تھا کہ یہ کیا فراڈ ہے۔ اس نے خود اپنے لیے بھی کئی بار فراڈ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن میں ایک چیز جتنی جو اسے نہیں آتی تھی۔ اس کا ظاہر یا ظن ایک تھا۔ وہ بڑا سعادت شغاف آدمی تھا۔ اس اہلی چاندنی کی طرح جو کمرے کی خشری کھڑکیوں کے پاس کبھی رہتی تھی۔

میں اس کمرے میں پہلی بار ۱۹۷۷ء میں گیا۔ میں ان دنوں ہندو بھالکے میں سائنس سٹوڈنٹ تھا۔ ایک روز میں نے اسے کالج کے جنوب مشرقی برآمدے میں دیکھا۔ اس نے نمرنگ دھاریوں کی بوسکی کی تھیں یہی دیکھی تھی اور سفید بوسکی کا پانچھاس پاؤں میں چل تھی۔ اور تھیں کے اوپر اوچھا سا ارتیش لے مطابق نرم نوٹ۔ وہ میرے ایک ہندو بھالکے پر کاش کی تصویر پر تھیں۔ ہار کاش کو دیکھ کر کالج کے فارسی دان سینئر بڑے خالی ہندو اشڈ خشم سمجھ کر غدارانگے حال میں مبتلا ہو جاتے اور مصرع اولی کے آکر کی ہلچل بائیں سے ایک دوسرے کے سر چھوڑنے کو تیار نظر آجاتے۔ پر کاش کو خشری کے کمرے میں آتے تو کھڑکے تصویر پر دستوروں کو خشم سے فیکیریا میں نے خمر کو اس سے پچھنے میں دیکھا تھا۔ یہ کون ہے؟ میں نے اپنے ایک بڑے بھالکے سے پوچھا جواب ملا۔ اسی میں نے یہ نام سن رکھا تھا۔ وہ اپنے سکول۔ محلے اور کالج میں اسی نام سے مشہور تھا۔ اس کی وجہ تھی اس کی شرافتیں تھیں۔ خیر یہ ملائی ہو اس وقت گویا پری کو شیشے میں آئینہ رہا تھا، جیسے کچھ عجیب وضع قطع کا آدمی نظر آیا۔ میرے وہم و گمان میں وہی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی مستقل آدمی بوسکی کا پانچھاس اور لال دھاری کی تھیں گویا میٹ سوٹ میں کالج بھی آسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے اور قریب سے جاننے کی کوشش نہ کی اور بات آتی ہی ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تصویر کی اینڈر جینٹ کے عیر میں عاشق علی فوڈرگ فرکی دکان پر گیا جس کے نام کائن دنوں بہت چرچا تھا۔ اس کے پاس اب سے ایسے کمرے تھے۔ جو ہمارے شہر کے فوڈرگروں نے دیکھے بھی نہیں تھے۔ وہ بھی کی فلمی دنیا سے بھی کھوم آیا تھا اور اس کے شریکوں میں فلمی تصویریں، روشنیوں اور سایوں کے عجیب و غریب امتزاج سے چمک رہی تھیں۔ کاروبار کی بہ نسبت اسے اپنے آرٹ کی زیادہ توجہ تھی۔ اس کے سٹوڈیو میں ہالک کی قسملٹ ٹائوٹی مشیت رکھتی تھی چنانچہ وہ

اکثر ایسی تصویریں بھی عیاں آتا جو گاہک تو خوشی سے بے جا تھے۔ لیکن وہ تصویر بھی کیا ہوتی کہ مصور کا اپنا ہی خوش و غم۔ وہ اعلیٰ تر شہر ہے۔
 پتیا۔ اور اس کا آؤ گزٹھپ گراس کی سپرٹ۔ عاشق علی نے میرے والد کی دو تہیں تصویریں بنائیں اور پچاڑ ڈالیں۔ کچھ بات نہیں ہوئی۔
 بات بنانے کے لیے وقت دو کار تھا۔ اس لیے یہ دو اکڑ وہاں پھیرا رہتا۔ میں بھی سے میری ملاقات ہوتی۔ کیسے پرکاش کی تصویر کیسی
 آئی۔ میں نے پوچھا۔ جواب ملا۔ ”علم ہی ایک جتنی کیمبرے میں۔“

ہمارے یہ ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ مار میں ڈیڑھ گھنٹہ کی ٹانگوں پر ترنا تھا اور اس کا ہر ایک جس بناؤں
 کو دیکھ کر آہیں بھرتا تھا جس مقام پر میں اب پہنچا تھا وہ اسے چار برس پہلے چھوڑ آیا تھا۔ وہ سنی ۱۹۷۱ء میں پیدا ہوا تھا اور اس سنی
 ۱۹۷۱ء میں خیر علی مسعود کی کشش ان کے دو مغلوں اہمال غائبہ و عشاق کو دونوں میں قریب سے قریب تر لے آئی۔ غالب نے
 کہا تھا کہ

”دکرا سس پری دوش کا اور پھر بیاں اپنا

ہن گیا و قیہ آخبر جو تھا ازناں اپنا“

لیکن کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ دکرا سس پری دوش کا نہ قیہوں کو ازناں بنا دیتا ہے۔ عشق سے اپنی دوستی کے لیے جس میں گناہ گار ہوا۔ یا میں
 ڈیڑھ گھنٹہ کا احسان مند ہوں۔ ان کی تصویروں کی کشش مجھے پہلی بار کوڑ و کیلاں میں لے گئی۔ آبی داڑھے سے ہر قسم کے غاصے، انکھ جھپکتے ہیں
 ملے ہوئے۔

سعادت کی بیڑ کے پاس الماری میں رنگا رنگ کے غلی رسالوں کے کنارے لگے تھے۔ اس نے اپنا یہ ذخیرہ میرے سامنے چاندنی
 پر بچھا دیا اور کہا جو غلی تصویر بچا ہو لے سکتے ہو۔

پہلے حیدر حیدر تصویروں کو فریم کرنا شروع کیا۔ فریم کے لیے ان دنوں باغیچہ ٹک میں بھی بنایا ہوا تھا۔ غلی قسم کی
 نوڈلرانی کی طرح اسے بھی عاشق علی نے ہر قسم میں دودھ دیا۔ ہلا شوق اس کا جیتا جاگتا اشتہار تھا۔ ہائی وگ کی پٹلیاں اس پہ
 کوڑک کی ٹوٹ۔ نتیجہ آپ خود تصور کریجیے۔ لیکن یہ عشق ہمیں بہت منگوا ڈرا تھا چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ خود باغیچہ ٹک کریں
 گے۔ مگر گوٹ اب بھی منگلی تھی۔ نوڈلر کو بھی کرسٹل پینر (CRYSTAL PAPER) آزمایا جاسیے۔ تجربہ کامیاب رہا۔

سعادت کے والد کا ان دنوں انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے انھیں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ایک بڑی ہی تصویر رینگت سنگھ
 مار میں ڈیڑھ گھنٹہ اور جون کا نوڈلر کے سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی۔ بند کار کا کوٹ۔ سر پر کٹری و صنع کی چٹائی۔ عشقی غلامی بڑی بڑی
 خشکیاں آنکھیں۔ یوں لگتا جیسے ہمارے مشاغل کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید ان کی غضب آلود نگاہوں
 کی زد سے بچنے کے لیے ہی سعادت بھاگ کر ایک بار بھی چلا گیا تھا۔ ان دنوں وہ میٹرک میں داخل ہو رہا تھا۔ کہا کرتا تھا۔ ”میاں ہی اللہ
 جیسے بڑے سخت گیر آدمی تھے۔“ سعادت کی بہن تاجا رہی تھیں ”جان غلاما ہوتی تھی اس کی میاں ہی کے ٹوڑے سے چٹنگ آڑا۔ ہاتھ
 ایک دوڑ کوٹھے پر۔ میاں ہی آگئے اتنے میں۔“ چست سے کوڑ ڈرایا۔ برابر کے کوٹھے پر چوٹ آئی۔ لیکن کیا بھال ہے جو کسی نہک
 کی جو۔ وہ میٹر میں اور مسعود کا بھی قاتل نہیں تھا۔ دم کی اچھا کرنے والوں سے اسے نفرت تھی۔ وہ زندگی بھر چٹنگ آڑا نہ رہا۔

اور اس طرح کو تیار کیا۔ ایسے میں کئی بار لوگوں کے سروں پر بھی آہن گرا۔ لوگ صفائے جیتے تھے، گالیاں دیں، تلافیوں کو دے کے لیے پٹکارا۔ لیکن منظر نے کہا مجھے بھی چنگ آٹھنے لگتی ہے۔ آسمان کی دستبرد پر غصے کا اجاڑ نہیں۔ جو لیے گرنے کی کوشش کرتے گاہیں اس کے سر پہ کوڑ جاؤں گا جو میرے چنگ پر لگائی "پھینکے گائیں" اس کی کھوپڑی پر مٹی کی اینٹ اداں گا۔

معاشرے کے اس سکیل کے دور اور میں اس نے متعدد چرٹیں کھاتیں۔ لیکن رجم کی درخواست کبھی اس کی زبان پر نہ آئی۔ بعد اذ طلب تھا فریاد کی نے سے اس کے لب نہ آتا تھے۔

اس کے والد مصطف تھے۔ انھوں نے اوشار یاں کہیں۔ سعادت کی والدہ ان کی دوسری بیوی تھی مصنف صاحب نے اپنی پہلی بیوی کی اولاد کی تعلیم و تربیت پر اتنی توجہ کی کہ ان کی وفات کے بعد چھوٹی بیگم، ان کی اولاد — سعادت اور اس کی بڑی بہن ناسرہ اقبال کے لیے کچھ باقی نہ بچا۔ تلخ یادوں کے سوا، غم کی خبریں میں ہی کوثر ہاٹ نکلی ہوئی ہے۔ جیسے قند کی گڑبوں میں لگا لپک کر خون کا گڑھا آجائے۔ یہ تلخی کتنی دیر پاتھی اس کا اندازہ منٹو کی موت سے ہو سکتا ہے۔ معاشرہ آدنی کا دھڑا باپ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سے انصاف نہ کر سکا۔ اخلاق کے شیکے دار اسے ستر پر کچر یوں میں پیسے کر کے طر یان لڑیں ہے۔ غش نگار ہے، ایہ جتنی باتوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ انھوں نے کبھی نہ سوچا کہ مرد و زن کے تعلقات اگر ناپاک ہیں تو حضرت آدم جب پہلے تھاپیں تھے (تو زبا نڈا) لیکن منٹو کے ہاں جتنی محاذ تھا ہی کہاں۔ اس نے قوم کی گویاں کبھی نہیں سچیں، اس کی ناک میں کوثر تو سرور تھی تو کہیں نہیں تھی۔ اس کا منہ کڑوا تھا۔ کوثر ہٹ کے احساس کو کندہ کرنے کے لیے اس نے اور کڑوا ہٹ اپنے اندر ڈال لی۔ بولی کو منہ لگایا۔

عجائب پو آئی تریں ششپری ہوا زمین

از بس که تکی نفسم بر آن چشیده ہوں

دو سال کے وہ بے تحاشا پانی رہا تھا۔ وہ ہر وقت مدہوش رہتا تھا۔ شراب سے اس کا جگر بھٹکتا رہتا تھا۔ سڑھڑ کے اداخرو میں وہ مکتے سے تھرپلاٹھا ٹھکڑوں نے اسے بجز کھچا اور کہا، سال یا دو سال اور۔۔۔ گلاب بھی نہ چھوڑی تو۔۔۔ لیکن اس نے پھر بوتلی کو منہ لگا لیا۔ گلاس کی بھی خصوصیت عموماً نہ کی۔ اس کی ٹھکی ہوئی نوح کو سیلو سے ساغر تک خامسدرمی بہت نظر آیا اپنے اور ایدرت کے درمیان وہ بلور کا پردہ بھی برداشت نہ کر سکی۔ درگندہ زمیت کا تھکا ہوا راہی جس پر معاشرے نے قدم قدم پر سنگاری کی تھی جلد بجلد اس منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں وہ کوثر آب سنگ کے نام سے نہیں بلایا جاتا جہاں چٹائیں نہیں جو مٹی، پتھروں کے سوراگر نہیں ہوتے۔ ۱۸ جنوری سڑھڑ کی صبح کو اس کی طبیعت یکایک بگڑ گئی۔ لیکن وہ ہسپتال تک بھی نہ پہنچ سکا۔ اسے خون کی تہ آئی۔ یلپٹوں کا رُسے راتے سے ہی دل پس لے آئی۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ وہ صلیب کے سایہ میں جیا اور صلیب کے سایہ میں جان لے لی۔ مٹی سڑھڑ میں کراچی سے پشاور راتے وقت جب میں اس سے ملے گیا تو لمبے ہونٹوں کے لیے عجیب سی زچہ پایں سکا۔ مجھے دیکھ کر وہ جھٹک پڑا۔ اس کی آنکھوں سے پتھر پل رہا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ میں خٹک گیا۔ اتنے میں اس کی پس نے کہا۔ سعادت! ستید آوا ہے۔ اس کا چروچک داٹھا اور انھیں جو کہیں غلاموں میں دیکھ رہی تھیں۔ یکایک میرے چہرے پر اتر آئیں۔ آ آ آ۔۔۔ خواجہ۔۔۔ میری نظریں گلاس پر گڑ گئیں۔ وہ کچھ گیا میں کیا سوچ رہا ہوں۔ لیکن اس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا۔ ٹھیک ہے

یاد سب شایک ہے۔ مگر اس مت کرنا اس کی پہلی پہلی لکائی آنکھیں لگا کر ہی نہیں کر لیں گی۔ اس کی کیفیت سے بجا کر قریب نے پناہ لی ہے۔ تجھ سے مجھے بہتر سلوک کی توقع تھی۔

اس کی بڑی بڑی بے بسی آنکھوں میں بلا کاٹھن تھا۔ ایک زمانے میں اسے پنجاب کی دیہاتی یوڑیاں بیچ کرے کا شوق ہوا تھا۔ جنہیں وہ اپنے جانے والوں کے سامنے کھڑو ہوا کرتا۔ ان کے مقابلے میں باقی سب شامیری فراڈ تھے۔ آنکھوں کی تعریف میں یہ شامیری نے کس کس کو نہیں سنا یا ہو گا۔

گودا رنگ تے شرقی لکھیاں گھنڈ وچ قسہ کہتیاں

اس کی اپنی آنکھوں میں بھی میں ہی خیر کی کیفیت تھی۔ سگریٹ کے دھڑکن کتے تھے وہ دھند میں چٹی برقی جھیلیں دکھائی دیتیں گی کی تر میں نہ جانے کتنی سورتوں کے پیچھے دفن تھے۔ وہ عمر بھر اس محبت اور بھدڑ کی جستجو کرتی رہیں جس سے وہ بچپن میں غمور ہو گیا تھا۔ اس کے دوستوں کا خلوص اور دعاؤں کی تعداد اتنی ہی اس کی کھائی نہ کر سکے۔

بھکت منظر کے بت کے سامنے ادیب اس تصویر کی آنکھیں پھر پھر تری چشم تصور میں ابھر رہی ہیں۔ ان کی آنکھیں نگاہوں کے سارے میں پھر بڑی مصروفیت کا پتہ چلتا ہے۔ مگر موضوع گفتگو بدل چکا ہے۔ فلمی ستاروں کی بجائے ادب و انقلاب پر بحث ہیں۔ گھر سے سالوں رنگ کا ایک بھاری آدنی کا لائیکل اور لکھی کے انداز تحریر میں گفتگو کر رہا ہے۔ رتھن نوجوانوں کے ہمتا تھے جو بڑے بڑے مس کی تاثیر سخن کے شاہد ہیں۔ مگر اس کی فضا ایک شہر کے تھیں دلوں کی بجائے دلیخرا، لاہور، ٹانسی، مارکس، ریتھن، ٹراٹسکی، شائین اور گورگی کے تذکرہ سے گونج رہی ہے۔ اس بزرگ کا نام باری (علیگ) ہے۔ اس کے ریوں کے نام سعادت حسن جتوئی بھی ادا و سعید قریشی۔

باری صاحب سے مجھے اپنی پہلی ملاقات یاد نہیں۔ یہی احساس رہتا ہے جیسے میں انہیں ہمیشہ سے جانتا تھا۔ ہر حال یہ منظر سے ملاقات سے بعد کی بات ہے۔ ان سے ہمارا اختلاف علم و ادب اور جب الوطنی سے تفاوت تھا۔ اعلیٰ رسالوں کی جگہ اب ہم کتابیں خریدتے تھے۔ تحریک تصویروں کی کامیابی پر بحث کرنے کے بجائے انگریزوں کو ملک سے نکلانے کے پانچ سوچے۔ بدست پسندی کی داستانوں میں ہیں۔ طبع آنا مستند حکمرانوں کا تختہ اٹھانے والوں کے آنکھوں میں ہیں۔ اپنا عکس نظر آنے لگا۔ ہم نے اپنی چشم تصور میں امرتسر کے گلی کوپوں کی بار بار مچر بندی کی اور انقلاب زندہ باد کے نعرے نکالتے ہوئے انگریزوں پر نوٹس ڈرے۔ انہیں بدو باؤنگستان ملک دھکیلنے ہوئے لگے۔ مارجی مارجی کی طرح قید کر دیا۔ تاکہ پھر نوبیا کو تخت و تاج نہ کر سکیں اور عظمت انزاس کے لازوال آفتاب کو تاجے کے پرانے ہیچے کی طرح گردش سے نکال بیٹھا۔ انصاف بات۔ روس دفرانس کی داستانیں بچوں کی کہانیاں بن گئیں۔ سنو آس زمانے کے بارے میں گفتا ہے۔

آب سوچا جاتے تو اس زمانے کی یہ سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں لیکن

اس وقت یہ کھلونے ہی عظیم الجثہ اور قوی رکلی تھے۔ ان سے پیچھڑانا اگر کسی دیو سے

زور آنا ہی کرنا تھا۔ ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری صاحب اگر نڈل نہ ہوتے تو فیضانِ اہم

چاند اس زمانے میں ان کھلونوں سے دنیا ہی بھلنے کے جُرم میں پھانسی پا گئے ہوتے اور اگر کسی غریب یا سیرنگ میں ایسے شیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا جابِ غلوں، دل سے کر سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے لرغ کا بھی صحیح علم نہ تھا۔

باری صاحب بزدل تھے خدا کی قسم بہت بزدل تھے۔ زیادہ کھا جیتے تو ڈرتے، دہتے تھے کو تو نہ نکل گئے۔ حالانکہ ناقوں کے زمانے میں بھی ان کے جسم کا یہ حقہ رُخا رہا۔ زیادہ تیر نہیں بھگتے تھے کہ ان کے دل پر اس کا اثر پڑے گا۔ حالانکہ ان کے جسم کے اس دیکس عضو نے ان کا ستر چھوڑا۔ بڑی بڑی شریخ جلداتوں کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے اور شانے کی آواز میں کہ زور دہراتے تھے۔ — الشکر کی لار ب باری تمام عمر اپنی زندگی کی کلی اور غنی سرخیاں بھاتا رہا۔ لیکن وہ ان کے نیچے وہ صنفوں نہ لکھ سکا۔ جو اس کے ذوق میں پرورش پاتے تھے۔
(باری صاحب از غلوں۔ مجبورہ گئے فرشتے)

اگر بار بار شہر بزدل نہ ہوتا تو دارالاحمر کے آتشخانہ پر کے برے بھگت سنگھ کے جُت کے سلیب میں چارویسے بچے کھیل رہے تھے جن کے مجھے تو انھن، راجس پیری، میزنی، ایملن اور ڈاکشی کی گیلری میں دکھڑے ہوتے۔

لیکن بقادت کی وہ چنگاری جو سعادت کے سینے میں سلگ رہی تھی، دہلی نہ رہ سکی۔ باپ کی بے نفی بجائیوں کی بے اعتنائی اور بزدلی کی تمام عمرانی سے جو شعلہ بظلم کا تھا، زمانے کے جہر دشت نے اُسے ہوا دی۔ اور وہ معاشرے کے دیک خودروہ شہریوں کو چاٹنے لگا۔ اس کے ظلم کی دشمنی اور اس کی بے نکلی جی لوگوں کے گھر اس کے راستے میں آئے وہ پیچ آٹھے۔ انھوں نے تارن کدو کے لیے پکارا۔ مذہب اور اخلاق کے فائر بریگیڈ کو حرکت میں لائے۔ لیکن لاوارز لڑکا، آگ نہ بجھی۔ حتیٰ کہ اس کی حدت میں اس کی اپنی زندگی کے سوتے بھی شعلہ گئے۔ وہ آتش نشان پہاڑیاب خاموش پڑا ہے۔ اس کی آگ سے ڈرنے والے اب اس کے دامن میں پھول نکال رہے ہیں۔ لڑاے کی مٹی بہت ندر غز ہوتی ہے۔

منشور پرست کچھ لکھا جا رہا ہے۔ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ نہج ہر کوئی اس کا شناسا ہے۔ ہر ایک کو اس کی دلایک باتیں ضرور یاد ہیں۔ ہر کوئی اس سے اپنی پہلی ملاقات کا حال کھود رہا ہے۔ اس کی شخصیت اور فن کو نفسیاتی اور جالیاتی کسوٹیوں پر پرکھا جا رہا ہے۔ ایک صاحب نے اس کی خود پسندی پر دو صفحے سیاہ کر دیے ہیں۔ ایک نے اس کا موازنہ موپاساں سے کیا ہے۔ ایک اور بزرگ نے اسے سمرٹ کا تجربہ دیا ہے۔ ان تعزاتی قریوں میں حیفظہ ہوشیار پوری کے ہاں مجھے بہت غلوں نظر آیا ہے۔ لکھتا ہے:-

”منشور کی زندگی موت اور اس کے فن کے بہترین ترجمان، اس کے محبوب شاعر غالب کے یہ اشعار ہیں:-

جنود آئینہ ندیم اثر سنی خیال ہر قدر ہر طلب گارنی انسان رقم

ساز بنگار نہ اندھ غلطی کرم راہ آستین بہ اندازہ سامان نہ تم
تاسک دوشی من رنج کافی نہ کشد شب وصل شدم زندوں پیاں رنج
نغم نقد یہ گنجیہ داسی زو شروہ باہولی دیا را کہ ز میدان رنج
خینے آگے بل کر لکھا ہے۔

اس نے اپنی تاریخ وراثت کی فرمائش کی تھی راج میں اس فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔
چوں سعادت زمانہ فت ہی گشت جیتد تشہد از شکوہ عالم مکان رنجتم
خود این مصرع گویہ ز غائب آہ شروہ باہولی دیا را کہ ز میدان رنجتم
۶
۱۳۶۸ + ۶ = ۱۳۷۴ھ

اپنی لوگ قلم سے دھڑ بھڑا کاری کے پیر میں تار تار کرنا دیا۔ ان میں ایک پیر میں فریب کا بھی تھا۔ ہمارے ملک میں راجپوتوں کے بھی باپ بستے ہیں۔ جلال نواب بزرگ جن کی شہر میں داریوں، گولڈی چھوٹی، مقدس دساروں، بے درخ جواں اور دھڑوں نگاہوں کو دیکھ کر شیطان بھی بہو پ بھڑنا بھول جاتے۔ خوش عقیدہ علماء ان کے دھم فریب میں اس بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ انہیں سننے سے دلوں کی مرادیں پھری کرتے ہیں۔ راگھو کا سونا بکتے ہیں۔ ان کی ناک پالا علاج مریضوں کا علاج ہے۔ ان کے دیپا گشت، ایکس وچمنی بے روزگاروں کو روزی دلاتے ہیں۔ ان کی دکانوں پر حسب کے توفیر فروخت ہوتے ہیں جن سے منگول جھرب دام ہوں۔ ان کے کالے علم سے دشمنی زبردوں اور مقتدے جیتے جایش۔ یہ بانجھ کو بچے دیں اور کنواریوں کے آسیب داریں۔ غم کا صاحب کرنا مات (مجموعہ) خاک کے کنارے، بھی ایک ایسا ہی بزرگ ہے جو ایک سادہ لوح کسان کی جو جلد بازی میں اپنی بیوی چھاتاں کو طلاق دے چکا ہے۔ لیکن اس سے دوبارہ بسانا چاہتا ہے۔ صاحب کرات اسے بھل دے کر پہلے اس کی کنواری بیٹی جیناں اور پھر اس کی بیوی چھاتاں (دوئی کی ماں) کو فخر پر کارپنے جواں کی آگ بجھاتا ہے۔ اس کے کندھے پر زرد وردہاں ہے (جو سبھی لوگ فخر کرتے ہیں) اس کی لال لال آنکھوں میں سرسے کی تحریر ہے خود زرخیز بزرگ، لمبے لمبے پٹے، ہن کے اور تاروں کے بال پکڑی..... ہاتھ میں چاندی کی مشد وادھوا..... مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھاکر اس کی پیشانی پر دم لی۔ اس نے اٹھنا پیا۔ گھران کی گرفت مضبوط تھی مولوی صاحب نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور توجہ سے کہا۔ چودھری تیری بیٹی کا نصیب ہاگ اٹھا۔ لیکن اس روز جیناں کا نصیب سار گیا۔ یہی چھاتاں وہ مطلق ہے اور مولوی صاحب فراتے ہیں۔ تب جب کوئی انکی رنجی بیوی کو طلاق دے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور پھر اس کو اپنے گھر سنانا چاہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ پہلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ اس سے طلاق لے۔ پھر بائیس ہے۔ بہن نہ داکے حضور راگراگرا دھانگی کر اس کی سزا نہ دی جائے..... توجہ چودھری کو اپنی بیوی سے محبت ہے۔ ارشاد ہذا خدا کی طرف سے جو مولوی صاحب سے ہم کلام ہے، تو ہم اس کی محبت کا امتیاز دینا چاہتے ہیں۔ ایک دن کے لیے تو اس سے نلاج کرے۔ دوسرے طلاق دے کر توجہ کے اے کر دے..... مولوی صاحب نے کٹھنی بند کر دی۔ اور چھاتاں سے کہا۔ تم آج کا دات میری بیوی ہو..... صبح جلتے وقت مولوی صاحب اپنی دالھی اور

کی داکھ میں پٹی ہوئی جہت کی چنگر بالچٹیں جن کی اپنی کانٹھوی جھڑا ہر ہنگامہ دھوم دھیمو کے پلے کی ماری ہوئی رو میں اپنا سینہ گرم کر سکیں۔ سراج کی سرور مری۔ ہنرمند اللہ کی آواز انھوں اور شاد تھا کے سرکٹ کے لپے میں اسی آگ کی چنگریاں پریشہ ہیں۔ سڑک کے کنارے کے چھوٹے جن پر یہ جگے مہمان کی خاطر دایاں بڑھی ہیں۔ اسی آگ کی دھیمی آگ سے گرم ہیں۔ وہ اپنے پھولے ہوئے پیٹ میں یہی کانٹری چھپائے ہوئے ہے۔ وہ خود بھی اسی پلے کا شکار تھا۔ اس نے پرمیتھس (PROMETHEUS) کی طرح دیوتاؤں کے آستانے کی آگ چرائی۔ اس جرم کی پاداش میں اسے جہنم کا زندہ دیا گیا اور عذاب کے گودھاس کا ہنگر فونچنے لگے۔ آگ کی جگہ لگا ہوا ہے۔ غلو کا نقشہ وہاں اسی آگ سے روشن ہے۔ لیکن اس کے اوپر جھلک مٹکے ثابت کیا کر رہا ہے۔ ————— تحریر و تفسیر کو شایہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

منٹو کی تخلیقی کلاشوں کی ابتدا ترجموں سے ہوئی۔ پہلا ترجمہ جہاں تک مجھے یاد ہے، ایک پرامر اور طویل انسا از دستہ بروہہ بھوت تھا۔ اپنی قسم کو یہ پہلا اور نئی ترجمہ اور ترجمہ تھا۔ باری صاحب تاریخ و معاشیات کے طالب علم تھے۔ انھیں انسانی ادب سے کچھ ایسا شغف نہیں تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو اچھے بُرے کی پہچان نہ بتا سکتے۔ فوقی سلیم نے دو کی اور طار الا حرمین و کثر تیرگو، داروہن، گور کی میچرٹ، پرتھوگ، گورگو، اور ستودہ کی، اندر لیت، اور سکرو نیٹل اور مہاساں کی کتابیں نظر آئے تھیں۔ دو کٹر سگور، باری صاحب کے نزدیک دونا کا سب سے بڑا ناوا لٹ تھا۔ ہم نے اس کی تصانیف اُنڈل سے منگوا لیں اور انھیں دوسری کتابوں کی طرح پڑھا۔ باری صاحب چاہتے تھے کہ اس کی (LES MISERABLE) کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اس کی شہادت دیکھ کر بہت نہ ہوئی۔ منٹو نے البتہ سرگزشت امیر کے عنوان سے (LAST DAYS OF A CONDEMNED) کا ترجمہ کر دیا۔ یہ کتاب سزائے موت کے خلاف پربوش احتجاج ہے۔ مصنف صاحب کا چھوٹا بیٹا بڑا انسانی کنٹات احتجاج کرتا ہے۔ آسکرو نیٹل کی دیر نا کا ترجمہ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ منٹو نے باری صاحب کے بارے میں اپنے مضمون میں اس کتاب کی اشاعت کا مفصل ذکر کیا ہے۔ ————— یہ ڈرامہ روس کے درشت پسندوں اور ترجموں کی مراکموں سے متعلق تھا۔ جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ امر قسمیں ان دونوں اگر کوئی جوانی بندوق سے بھی مسلح ہونا چاہتا تو لوہ پم کر دیا جاتا۔ پچھلے عرصہ اس کے شہکار شہر کی دیواروں پر نظر آئے اور لوگوں کو مستند حکمرانوں کے عبرت ناک انجام۔ روس کے آگ کی کوچوں میں عدائے انتقام کی خبر دی گئی اور تزاریت کے تباہیوں میں آخری کیل کا ڈالیا تو کوچہ و گلیاں میں جھلک مٹکے اور دت کے آواز جیلوں کے بارے میں پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ جہاں قمر کے آگ کی کوچوں میں، اسکو کا نامک کیلٹ چاہتے تھے اور ہندوستان میں انگریز کی شہنشاہت کے خاتمے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن خراج و عہد صاحب دیشا نڈل ہی۔ امیں۔ پی نے پریس کے سفید پوشوں کو یہ کہہ کر لٹا دیا کہ یہ تو اپنے بچے ہیں میاں۔ جائزہ نام کو اور دیا گئی تھی۔ اکثر سچا ہوں کہ اگر پریس نے بچوں کے اس کیل کا پی دیا تھی تنہی سے تعاقب کیا ہوتا تو مشر میں جھلک مٹکے بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس کا انسا ز تھا شاد (مجموعہ غلو کے نسلے) انہی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اس میں شاد لڑکے کا رائل لاء کے جھلکے کو ایک بچے کی نظروں سے دیکھا گیا ہے۔ اس کا یہ خود غلو منٹو ہے۔ اس وقت وہ کوئی سات برس کا تھا۔ انھوں کی بے اعتنائی نے اس بچے کو بڑا ہونے سے روک دیا۔ بیانیوں کی بے اعتنائی کیا کچھ تھی کہ وہ ادھر کا رخ

کرتا اس کے علاوہ اسے پٹے ہوئے راستوں سے نفرت تھی۔ لیڈوں کی خود مرضی سے یہ نفرت ابھر کر گئی وہ خلوس کا بھوکا تھا۔ لیکن ان لوگوں میں خلوس کہاں تھا۔ وہ بیخ آٹھا ہندوستان کو لیڈوں سے بچاؤ۔

ہندوستان کو ان لیڈوں سے بچاؤ جو ملک کی مضابطہ کار ہے ہیں۔ یہ نام نہاد لیڈ اپنی اپنی جگہ میں ایک ایک صندوق دہاتے پھرتے ہیں جس میں یہ لوگوں کی جیبیں کھڑکھڑا کر پیسے جمع کرتے ہیں..... ان کے ہر سانس میں آپ ریاکاری اور دغا بازی کا تلخ محسوس کرتے ہیں، لہجے جلوس نکال کر منوں بھاری آدموں کے نیچے دب کر چڑا ہوں یہ طویل طویل تقریروں کے کھوکھلے الفاظ بکیر کر یہ نام نہاد رہنما اپنے لیے راستہ بناتے ہیں۔ جو عیش و عشرت کی طرٹ جاتا ہے..... یہ لوگ چند سے اکٹھے کرتے ہیں، مگر کیا انھیں نے آج تک بے کاری کا بل پیش کیا ہے..... یہ لوگ جن کی روح فکڑی، دباؤ، اپاہج، زبان مفلوج اور اتھیرا شل ہیں۔ ملک و ملت کی دہری کیسے کر سکتے ہیں..... ہندوستان کو بے شمار لیڈوں کی ضرورت نہیں، صرف ایک لیڈ کی ضرورت ہے جو حضرت ٹکڑا کا سا اخلاق رکھتا ہو جس کے سینہ میں آنا ترک کا سپا بیا زنجیر ہو.....
دنٹو کے مضامین مہمودہ ۱۹۴۷ء

یہ مضمون جیسا کہ اس کی تاریخ اشاعت سے ظاہر ہے۔ آزادی سے بہت پہلے لکھا گیا اور منشو کی زندگی میں ہی لکھے گئے پہلے فوراً ہی پیدا ہوا ہے۔ دارالاحمر کے زمانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن دسے پڑھنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ سیاست اور لیڈوں کی دنیا کے بارے میں اس کا کیا رد عمل تھا اسی مجھ میں آگے چل کر اس نے اپنا خیال اور واضح کر دیا ہے۔

”سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیڈوں اور دغروشنوں کو میں ایک ہی ذمہ سے میں شمار کرتا ہوں۔ لیڈری اور دغا فروشانہ دونوں پیچھے ہیں خیر کرتا ہے کہ سیاست سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سینما سے۔ گاندھی جی سینما میں دیکھتے ہیں خیر نہیں پڑتا۔ اصل میں ہم دونوں غلطی کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنے چاہئیں اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں۔“

(بیاتیں، منشو کے مضامین)

بادی، منظر میں یہ چند سطریہ شوخی تحریر ہے اور پس۔ درحقیقت گاندھی جی اور فکروں کا بکند لیڈوں میں تو ذہنی توازن اور انداز میں ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کو بے نقاب کرنے کا کام آیا ہے۔ تضاد کو ابھارنا ان کی خاص ٹیکنیک ہے۔ منشو

کا اہر تھا۔

گرمی میں تھا، جہاں کا گرس نے اس کا راج شراب کا قانون پاس کر کے اپنی ہزار ہا مندروں کو
بیکار کر دیا تھا۔ تازی نکالتے تھے وہی عروس البلاد تھی جس کے گھونگھٹ کا ایک قطرہ
حیرت ہی ہے اور دوسرا گھوڑے کا ٹانگہ کا — وہی اپنی جہاں اُمّی اور بچی خرمبرست
عمارقوں کے تختوں میں خٹ پاتھوں پر ہزار ہا مخلوق رات کو سوئی ہے۔

تسلیم ایک مسجد ہے۔ کا گرس مند ہے۔ کا گرس سواج چاہتی ہے۔ مسلم ایک بھی۔
لیکن دونوں مل جل کر کام نہیں کر سکتے..... ان کے خون کا ٹاپ مورموں اور پردوں
میں ہرگا۔
(باتیں)

ایسے میں سیاسیات سے اس کی برعکس قدت بات تھی — لیکن میں امرتسر سے پہنچی پہنچ گیا — جلیانوالہ باغ کے شہر
میں اسکو کا منشا اپنے اشتہار کے بعد ہی ٹوٹ گیا۔ اس کی سین سینری پر دے پلٹے شاؤ وکٹر کے گرس میں مشتعل ہو گئے اور بیویں کھاڑ
کے بجائے لاہور کے ایک کتب فروش نے خریدے۔ ڈنگلوں، مویشیوں کے سیلوں، انشیا کے ٹیکوں، عصمت فروشی اور اس طرح
کے دوسرے کھیل تماشوں کی طرح کتاب چھاپنا بھی ایک نیا شاقہ اور یہ کتاب (دیرا) تو پہنچ کا نالک تھا جس کے پے لائنس
ضروری تھا۔ لیکن لائنس زلا اور پروڈر اور مہجائی گیا۔ باری صاحب غائب تھے! انھیں اس نالک کا انجام بھی یاد نہیں رہا
تھا۔ وہ بھٹول گئے تھے کہ (PICTURE OF DORIAN GRAY) کا صنعت دہشت پسندی سے اتنا ہی دور تھا جتنے
گاندھی جی سینا سے نالک کے اختتام پر زورنا آسکرہ ایلنڈ کی بیرونی وہی تھوڑے سے وہ زار وچ کے سینے میں گھونپنے کے لیے
لائی تھی۔ اپنے سینے میں گھونپ لیتی ہے — اسے زار وچ سے عشق تھا۔ محبت نجات اب برائی۔ فرض مزد کھینچا رہا گیا۔

لیکن تاشا بھی ختم نہیں ہوا۔ بچوں کا کھیل ابھی جاری ہے — پندرہ دن غائب رہنے کے بعد ویرا کے پڑ پڑوٹر
باری صاحب پھر امرتسر ہوئے اب کے ایک مہتر دار اخبار کے وکٹر پبلشر کے ایک آپ میں۔ اخبار کا اُمّی غلطی تھا۔ یہیں
حکم تھا کہ فوراً کام شروع کیا جائے تاکہ اخبار کی اشاعت میں مزید تاخیر نہ ہو۔ منٹو کا افسانہ تاشا خلق کے پہلے شاوے میں شامل
تھا۔ میں نے بھی اپنی دانست میں ایک بڑا انقلاب انگیز مضمون لکھا تھوڑے جس میں جذباتیت کی خاکساری بدرجہ اتم موجود
تھی۔ اور مراد دار کو خوب سوتے تھے تفرس و مترب الفاظ میں کوسا لیا تھا۔ یہ مضمون آدم کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ منٹو
نے بھی اسے لکھنے کے صنعت کا اعلان نہ کیا۔ باری صاحب نے بیکل دار گرس کے بارے میں اپنے خاص
خیلیانہ انداز میں کچھ لکھا۔ جیسے میں شاید آج بھی نہ سمجھ سکوں۔ مگر وہ ہمارے پرورد شد تھے جن کے روحانی فیض نے ہیں اپنے
تمام ہم عمروں سے ممتاز و تمیز کر دیا تھا۔ اور تو اور ہمارے پروفیسر بھی جن میں فیض احمد فیض اور صاحبزادہ عمودا انظر جیسے لوگ
بھی شامل تھے، ہمیں ادب و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسے میں ہمارے استاد باری کو کوئی بے معنی اور بے صورت

بات کیونکر کر سکتا تھا۔ اس مضمون کا مطلب کسی کی سمجھ میں آیا جو رانہ آجہو رانہ منور میں کر کے نام سے پولیس کے کان کھڑے ہو گئے۔ لیکن ملحق آپ نے پہلے ہی شمارے کے بعد مالی مشکلات میں مبتلا ہو چکا تھا اور باری صاحب کا اخباری دنیا میں انقلاب بپا کرنے کا خواب بھی چھوٹا چور ہو گیا۔

باری صاحب بڑے بڑے منصوبے بناتے اور انہیں چائے کی پیالی میں گھول کر پی جلتے۔ وہ عجیب غریب خواب دیکھا کرتے۔ وہ کہا کرتے کہ بجز انقلاب کو چلا دینے کے یہ قید ہونا ضروری ہے۔ لیکن سعادت کہا کہ تھا۔ باری صاحب آپ بگو اس کہتے ہیں۔ آپ وہاں دو دن زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن باری صاحب کا خواب ضبط کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ تم دیکھ لینا وہ دن نہ نہیں جب تم مجھ سے جیل میں ملنے آیا کرو گے۔“ جیل میں۔ وہ اپنی ٹائری کھٹا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہلکے گلابی۔ اچھے رنگ اچھی طرح یاد نہیں۔ رنگ کا نایت ہی عہدہ کا خدے کر شمر کے بستر میں جلد ساز سے کالے علی چڑھے کی ایک ٹائری بنوائی گئی۔ اس کے پہلے ورق پر، نئی سلاخوں والے خدازے کی ایک کٹنگ نایت نفاست سے چھپائی گئی۔ اس تصویر کے اوپر کا سب سے دور پھر نڈائی کا عنوان نایت ہی عہدہ خط میں لکھ دیا گیا۔

اشتراکی ادیب باری بہت بڑا دماغ پسند تھا؛

اس کے چیلے اپنے گرو کی طرح مارکس اور ایٹلر کا چلتا نہ پھرتے۔ مادہ پرستی کا یہ دینیہ ان کی سبک اور نازک دعووں کے لیے بہت رحیل تھا۔ ان کی انفرادیت، اجتماعیت سے کجوتر نہیں کر سکتی تھی۔ غلو کی آواز، ہجوم کو خدا نہیں مان سکتی تھی۔ ”خدا ان کی منزل ابھی دور تھی۔

ابوسعید قریشی

منٹو مائوں کی موت

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ منٹو مائیں میانیاں صاحب کے قبرستان سے اٹھ کر گھر چلے آئے تو میں ان سے کیا کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی حیاتِ ثانی کے مجوزے کو نظر انداز کر کے ان سے صرف آنا کہیں گا۔ منٹو صاحب آپ نے آج تک جتنی خبریں دروازہ حرکتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ حرکت آپ کی موت تھی۔

بہاول پور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا سٹیمپ بورڈ تھا اور میں ڈننگ سٹیڈیم میں بیٹھا طالع یا خدایں کو بچ کا چشم دید حالِ فترت کو نہیں دیکھ سکا تھا کہ ہمدرد سے میرے نام کو یک ٹونگ کال آئی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ میں فوراً غم سے بے قابو نہیں ہو گیا بلکہ جو میں شدید پر غور و فکر میں رہا ہو گا۔ مجھے منٹو مائوں پر انسانی شدید غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے چرمی بچوں کے ساتھ یہ سلوک کس طرح کر سکتے ہیں؟ بالیکس میں کس کس کا شمار نہیں کیا اور جب میں پورا توہمیں آواز سے غیر معمولی تشویش لگایا تو میں نے پوچھا کہاں انتقال فرمایا جواب ملا گھر پر۔ اس جواب سے مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ کوئی مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنا تک گھر سے باہر کسی اور مقام پر موت سے بچا غور نہ ہو گئے ہوں۔ عین ممکن تھا کہ کسی تنگی پر کسی رستہ تواری میں کسی پیشہ کے دفتر میں بیٹھ بیٹھے یا کسی فلم سٹوڈیو میں انھیں اپنا تک موت لگتی ہو۔۔۔۔۔

جب میں اپنی جگہ پر واپس آیا تو سچ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے والے ساتھیوں کے اشاروں سے پوچھا کہ کیا بات تھی۔ میں نے ایک کاغذ پر جملہ لکھ دیا۔ آپا نے سہ سہاوت حسن منٹو کو آخر آؤٹ دے ہی دیا۔ آج صبح ان کا انتقال ہو گیا۔

منٹو مائوں کو آؤٹ دینے کے لیے اسپتال سے کئی بار ایڈمٹیشن کی جا چکی تھیں لیکن ہر بار ایڈمٹ شدہ کو دی گئی تھی۔ اب ان کی بچہ اور سٹاف اور اڈل انٹیکس ختم ہو گئی تھی۔ وہ کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی طبعیتِ ملکِ طرح ہوشیار اور محنت کا کھلاڑی نہیں بن سکتے تھے جسے وہاں کے تیسرے فٹسٹریچ میں کیسے ہوتے دیکھنے کے لیے حشراتِ حق سے اس کا علم مجھے ان کی موت کے چوتیس گھنٹے بعد گھر پہنچ کر ہوا۔ وہ حقیقت ان کی زندگی کی آخری دو خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے انھوں نے ایک رستہ تواری میں اپنے دوستوں سے کہا تھا حامد جلال کو پولیس آجانے دے میں کسی کے ساتھ فٹسٹریچ میں حذیت کا کھیل دیکھنے جاؤں گا۔

ان کی دوسری خواہش اس لیے بار بار دہرا کر موت کی موت پر ناساز گھنے کی تھی جس کی رہنمائی گجرات میں حاکم کے کارڈ پالی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس حرکت اور اس کی نشانی کسی کو اس کے آگے سے اخرا کیا گیا اور نصف درجی کے قریب جوں پرستوں نے اپنی بیساز خواہشات کی تکمیل کی اور جب وہ کوکڑائی مردی میں ان کے پرچل سے نکل

کر بھاگی تو اس کے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا چنانچہ دونوں اس بیٹے نے نجد کے مینے والی سردی میں دم توڑ دیا۔ اس المیہ سے منٹو اموں نے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو گھڑات سے کچھ لوگ ان کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے ساراٹک کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔ اس سے ان میں خود اشتغال اور حیران پیدا ہوا ہوگا اور خیال ہے کہ اس کے بعد منٹو اموں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی ہوگی جہاں کے لیے ملک ثابت ہوئی۔

وہ کافی شام گزارنے کے بعد گھوڑا پس پڑے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں خون کی تہہ ہوئی۔ میرے چھ سالہ بچے نے جہاں کے قریب ہی کھڑا تھا، خوں کی دھاریوں کی طہ انہیں متوجہ کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں یہ تو پاؤں کی پیاک ہے انہوں نے اسے یہ بتا کر بھی کر دی کہ وہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس کے بعد انہوں نے سب معمول کھانا کھایا اور سو گئے۔ گھر میں کسی کو کورم گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بات خلاف معمول ہوئی ہے۔ کیونکہ میرے اڑنے کے منٹو اموں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ لیکن بے خود غصہ مریاں کہیں اس کے متعلق کوئی کشمکش نہ ہوئی ہو۔ یوں ہی وہ گھر والوں کو ایسے معاملات سے بے خبر رکھنا ہی پسند کرتے تھے کیونکہ ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو رہا تھا۔

سات کو بجھلا پر تھا کہ انہوں نے اپنی بری کوٹا خاگر بنایا کہ وہ شدید درد محسوس کر رہے ہیں اور اب تک بہت ساقی ضائع ہو چکا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا بگڑ چٹ گیا ہے۔ ان کی چری نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس صورت حال کا قی نہتا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو انہوں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو بلا لیا اور انہیں صحت کے نند سے نکالنے کی ہدایت شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کئی شدید علاجوں کے بعد وہ ضعیف اب ہو چکے تھے اس لیے کسی کو یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اب وہ صحت چند گھنٹوں کے ممان ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ انہیں آؤٹ مینے کے لیے اسپازک انٹلی اسی وقت سے منسا میں بلند ہوئی شروع ہو گئی تھی۔ جب منٹو اموں کو تھکی کی پہلی تہ آئی تھی۔

منٹو اموں کے آخری لمحات کے متعلق میں نے نو کچھ لکھا ہے۔ اس سے پہلے ہی اندازہ لگا سکا کہ ہنگامی دیر تک انہیں تھوڑی قیاس نہیں تھا کہ ان کا وقت اب آگیا ہے۔ ڈاکٹر کے تجویز وغیرہ لگانے کے گھنٹہ ڈیرہ بعد تک وہ ایروس نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اس علاج کے بعد بھی ان کی حالت خلوت معمول نہیں سنبھلی۔ ان کی تھن براہِ روتی گئی اور درمیان مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ خون کی تہ بھی بند نہیں ہوئی۔ صبح کو ڈاکٹر نے تجویز پیش کی کہ منٹو اموں کو ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

اس وقت منٹو اموں کے گوش و حواس بالکل بجا تھے اور ہسپتال کا نام نکلنے ہی وہ لول اُٹھے اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ اور وہیں سکون سے گزارنے دو۔

گھر کی عورتوں کے لیے یہ خطرناک حالی برداشت تھا۔ انہوں نے وہ ناشروع کر دیا یہ دیکھ کر منٹو اموں خود اشتغال ہو گئے اور انہوں نے عقیناک آواز میں کہہ کر دبا دھو کوئی دوا نہ دے کہ انہوں نے اپنا دم نہائی سے بند کر لیا۔

منٹو اموں اصل رُوب تھا جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اُسے مزاحیہ دیکھیں۔ منٹو اموں مسرہ و غضب بنے ہوئے تھے معلوم نہیں وہ اپنے آپ سے

ناراض تھے یا شراب سے — جوان کی قبل از وقت موت کی ذمہ داری تھی۔

ویسٹمن آئے سے پہلے موت ایک بار اور انھوں نے اپنے منہ سے رضائی بٹائی۔ انھوں نے کتا مجھے ٹری سروی ملک رہی ہے۔ اتنی سروی شاید قبر میں بھی نہیں گئے گی۔ میرے اور پر اور رضائیاں نکال دو۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ انھوں نے آہستہ سے کہا میرے کوٹ کی جیب میں ساٹھ سے تین دوپے لپٹے ہیں۔ ان میں کچھ اور ایسے ملے گا تو تو ٹری سی وہ سب کی منگا دو۔.....“

شراب کے لیے ان کا اصرار جاری رہا اور ان کی تسلی کے لیے ایک پورا منگا لیا گیا۔ انھوں نے بڑی کڑی جیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے میرے لیے دو پیگ بنا دو۔“ اور یہ کہتے ہوئے دھواں دھندہ دھندہ نکلتی دودھ کے باعث وہ کاتب سے اُٹھے۔

منٹو ماموں کی آنکھوں میں اس وقت بھی اپنے لیے رقم کا کوئی شانہ موجود نہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا وقت آج بچا ہے لیکن ایک بار بھی اس کا ایک ٹکے کے لیے بھی انھوں نے اپنے آپ پر جبر بائست نہیں طاری ہونے دی۔ انھوں نے اپنے بچوں یا کسی اور کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ ننگا واپس یا وحیت کے کبھی نکلی نہیں تھے۔ ان جیسی شخصیتوں کے لیے زندگی اور موت کے درمیان حد فاصل بہت ہی بھم اور غیر واضح ہوتی ہے اور یہی مزما بھی چاہیے کہ چونکہ ان کی زندگی اور دوج تو پہلے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے — وہاں پہنچ کر انھیں غیر فانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے وہاں وہ ابد تک زندہ رہتے ہیں۔ جتنے بڑے رہتے ہیں۔ جنت کو تے رہتے ہیں۔

بستر مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سرا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انھیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے اور وہ اسے موت کا بزم منی سمجھنے لگے تھے جس پر سمانی فتح کسی صورت میں ممکن نہیں ہے جس طرح موت کے آگے کوئی انسان پیش نہیں پاسکتا اسی طرح منٹو ماموں شراب کے سامنے بالکل بے بس ہو جاتے تھے۔ لیکن ان کی غلط فہمی ہمیشہ سے باقی رہی تھی اس لیے انھوں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی۔ انھیں شکست سے بھی سخت نفرت تھی خواہ وہ موت کے احمقوں ہی کہوں نہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں پھاڑ کر نا چاہتے تھے جہاں کوئی انھیں سزا نہ دیکھ سکے جہاں کوئی ان کی شکست کا انکار نہ کر سکے۔

ان سے کم درجے کا آدمی شاید ایک ڈولہائی موت کا اہتمام کرنا تاکہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا پرچہ چاکریں اس پر منٹا میں لکھے جائیں اور اس کے اعزاء و احباب کہہ سکیں کہ اس کی زندگی غمزدہ یا تھی جسے ہم پسند نہیں کرتے تھے، لیکن مرنے سے پہلے وہ منتقل ہو گیا تھا اور اچھا آدمی بن گیا تھا۔ لیکن منٹو ماموں یہ کار نہیں تھے۔ انھوں نے اس خواہش کا انتخاب سے مقابلہ کیا مگر ان کی موت کے وقت موت ایک پہلو ڈالائی تھا یعنی شراب طلب کرنے کا منظر۔ لیکن اس کا نازہ بھی مرکوز کردار کو پہنچ سکتا تھا کہ ان کی اس طرح منٹو موت وہی کہہ سکتا تھا۔

میں اس وقت مجدد ہوتا کہ مجھے یقین ہے کہ اپنے ذہن کو ایک حد تک میرے سامنے بے نقاب کر دیتے۔ اور کچھ

شکل بھی تھا کہ کمزور تھیں صرف اتنا کہنے کی ضرورت تھی۔ سانپ اور انسان کی کافی نہ بھولنا میں اپنے سرکشاہات میں جنبش دیتا اور شراب کا آخری جام انھیں پیئے کو روک دیتا۔ صرف میں ایک جلد ہر بات واضح کر دینے کے لیے کافی ہوتا۔ سانپ اور انسان کی کافی صرف اتنی تھی کہ ایک آدمی نے اپنے دوستوں کے شیع کرنے کے باوجود ایک زہریلا سانپ پال رکھا تھا اور ایک دن سانپ نے اپنا سارا زہر اس کے جسم میں اُتار دیا، تو اس نے بھی سانپ کو پکڑ لیا اور اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا۔ ایسوسس جیسے ہی دوا دے پر اُٹھری ہوئی دامنوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک عجیب و غریب کی ان کے منہ میں نکال دی گئی۔ لیکن ایک قطرہ شکل سے ان کے حلق سے نیچے اُتر سکا ہر گاہ۔ پانی شراب ان کے منہ سے گر گئی اور ان پر غشی طاری ہو گئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے جوش و خاشاں کھوئے تھے۔ انھیں اسی حالت میں ایسوسس میں لٹا دیا گیا۔ ایسوسس ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر انھیں دیکھنے کے لیے اندر گئے تو منٹروا میں سر جکے تھے۔ دوبارہ جوش میں آئے بغیر داسے ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

حامد جلال

منٹو کی موت

منٹو کی موت پر مجھے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا کیونکہ کچھ دنوں پہلے ہی سے میں نے یہ بڑی خبر سننے کے لیے جی کڑا کر رکھا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اُس کی کیفیت پر کچھ سرکس کے اُس تماشاگر کی سی ہو گئی تھی، جو عمر بھر بہت جلدی پر تار پر پھٹنے کا خوف ناک کھیل دکھاتے دکھاتے تھک چکا ہو۔ اور ہر لمحہ اُس کے گڑبڑنے کا اندیشہ ہو۔ منٹو منٹو تھا کہ وہ کبھی نہیں گرے گا، مگر اُس کے ہاتھوں میں لڑشیں پیدا ہو گئی تھیں۔ سب جانتے تھے کہ وہ قہقہے سے کھیل رہا ہے اور یہ کھیل منتریب ختم ہوا چاہتا ہے۔ منٹو زبان سے خواہ کچھ بھی کہتا رہا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کھیل سے آگیا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس سے غصہ کیا جائے۔ غصہ نگاری کے سلسلے میں کراچی میں اُس پر سب آخری مقدمہ چلا، اُس کی کارروائی چند ہی دنوں میں ختم ہو گئی۔ منٹو نے نہ اپنی مصاحبت میں کوئی دُعاؤں و دعاؤں تقریر کی، اور نہ قانونی مشیروں سے ہنگامہ سازی برپا کر پاپا۔ یہاں تک کہ احتجاج میں ایک منٹو بھی اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ چپکے سے جرمانہ ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔

وہ متحدہ عرب امارات ہی سے نہیں ادب سے بھی بلکہ زندگی سے بھی آگیا گیا تھا۔ وہ گھر میں بندھنوں، سماج کے دھکے دھکاؤں اور عام ڈینوری ملاقاتی سے بیگانہ سا ہو گیا تھا۔ گراوٹ لایا وہ درجہ ہے کہ کمرہ دار انسان خود کشی کر لیا کرتے ہیں، مگر منٹو کلامِ سما و نمِ نم آڑے آ گیا۔ اُس نے خود کشی نہیں کی۔ یہ اہد بات ہے کہ اُس نے اپنے کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جو انجام کار خود کشی ہی کا مترادف بنا۔

ادب کے تعلق یہ حکم دگانا کہ کوئی چیز زندہ رہے گی اور کوئی مٹ جائے گی، بہت مشکل ہے، مگر منٹو کے تعلق یہ بات پورے و حقوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک باقی کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا اور اُس کے کردار کے جنرل اس دور کی داستانِ ادب کھلی نہ ہو سکے گی۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ اُس کے ہم عصروں کو باوجود بوسیا و نویسی اور شہرت کے حاصل نہیں ہو سکا۔

منٹو نے آزدادی تحریر کے لیے جو ہنر و کلاوت کی وہ سب ادبوں کے لیے، خواہ وہ کسی گروہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، بہت فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ اس سے ایک تو ادب پر مقاسب کی گرفت اتنی کڑی نہیں رہی، جتنی کہ پہلے تھی، دوسرے لکھنے والے چاہے کتنے درجے کا ادب ہی کیوں نہ بنیں گے کہ وہ جوں، مگر جہاں تک فن کے ساتھ خلوص اور صداقت برتنے کا تعلق ہے، وہ پہلے سے کہیں نشہ اور بے باک نظر آتے ہیں۔

منٹو کی ایک اور خصوصیت جو اُسے دوسرے ادبوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ تھی کہ اُس نے عمر بھر کبھی سیکنڈ ہنڈل

(SECOND FIDDLE) بجنے یعنی کسی کے ماتحت محض شگت کا فرض ادا کرنے کی کوشش نہیں کی یہی وجہ ہے کہ اُس نے خود کو کسی جماعت یا گروہ کے ساتھ فسلک نہ ہونے دیا۔ وہ اپنا راگ، بلند یا پست جیسا بھی وہ تھا، ایکلا ہی الاپتا رہا۔ اُس کو نہ کسی کی اعانت کی ضرورت تھی نہ پردا۔ یہی وہ بے نیازی تھی جس نے زندگی میں اور ادب میں اُس کے بہت سے مخالف پیدا کر دیے تھے، مگر اُن کی مخالفت اُس قبول عام کے سامنے سرچ ثابت ہوئی، جو اپنی زندگی میں اُسے حاصل ہو گیا تھا اور جس میں آج اُس کے مرنے کے بعد اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

غلام عباس

منٹو کا ایک خط

برادرم، السلام علیکم

مجھے یہاں آنے پر نئے ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں لیکن میں تمہیں خبریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماحول میرے لیے نیا تھا، ہر حال میں ماحول سے یقیناً بہتر ہے جس میں میں نے ۴۲ برس تک بھلک ماری تھی — وہاں جب تک رہا سولی پر لٹکا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں، نہ صغیر نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نکستہ، نزہت اور نعمت میں سے کسی نے، وہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ بااطلاں چیز دادو، غلاں چیز دادو، تھیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچپن سے بے انتہا جنت تھی، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی فرمائش اپنی تلکدستی کی بنا پر پوری نہیں کر پاؤں تھا تو خون کے آنسو رو یا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض خاص سال ایسے بھی آئے تھے کہ کچھ کی سالگرہ تھی اور صیب میں پھوٹی کڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں میں کب تک رہ سکتا تھا، قدرت تو مجھے ایسے انسان کش ماحول میں داد رکھنا چاہتی تھی لیکن میں نے خود ایسے دوساں اختیار کر لیے تھے کہ آپ کے منہ زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا، آپ لوگوں ہی کٹھنوں میں لٹکتا رہا۔ نہ صحت ٹھیک رہا بلکہ بہت آہستہ معذور ہو رہا تھا میں بھی قصاصت و کھوں اور غموں کو اس لیے رقم کرتا رہا ہوں تاکہ اپنے مالی سلیس تم سب کو منظم کی حیثیت سے یاد رکھ سکوں۔

میں یہاں ہر وقت ہی ڈمکیا کرتا ہوں کہ زندگی میرے تمام مصلحتی فائدوں کو جلد صیب ہو اس لیے کہ وہاں وہ کہیں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی۔ وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی جب مجھے کو وہاں سے آنا پڑا۔ تو نہ ہانپنے وہ کہیں کچھ نہ کہیں آپ کے تمام کھنے والوں سے تعلقات ہیں جو لاہور میں موجود ہیں۔ ان سے نہایت کدیں جو لاہور سے باہر ہیں، انہیں بند پڑنے خط مطلع کریں کہ وہ سب کے سب جیوی بکوتی حیمت میرے پاس آجائیں۔ میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لیے ہیں اس لیے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

فرمانے نے سرسری تمدنی اور مذہب سے اہل علم کی تمہیں علم ہے، اگرچہ لوگ تمہارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم، ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے، منہ میں ہے۔ اکثر ظالموں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری ہی طرح ٹھوٹے بیٹھے ہیں۔ بعض نے تو تمہارے غائبی آباد کی شاخ میں ایسی ایسی جہازات سپرد علم کی ہیں کہ جب تک گھر کو دونوں انھوں سے نہ تمام لیا

جائے۔ مگر یہ نہیں چاہ سکتیں۔ اگر وہ چاہیں گئیں تو تمہارے ہاں کے بعض سرگرمی سے سہ بازار چلیں گے۔
 بہر حال ہجرات کا وہ تجربہ جس میں خدائے عز و جل نے اس کار کا ایک نسخہ فرمایا ہے۔ اس کا تصور کرنا۔
 تمہارے ہاں کے ارباب و تمہارے پڑوسی ملک کے ارباب اپنے اپنے ممالکوں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی سیوری و وابستہ
 کیے بیٹھے ہیں۔ وہ سارا سہما قصہ ہے۔ ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیش میں تو صوفی بہن خوش فہمی میں تانے سدا رہی ہے۔
 تمہارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تحتہ قسم کی ہے۔ آج کوئی ڈر ہے تو کل بیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا
 اور ساتھ ہی غداروں بھی، تو آج ناما ناڈری ہو جاتا ہے۔ یہاں ڈر ہے کہ اباب چاہے تمہارے ہاں کی سیاست کے باعث میں گنگو کر رہے ہیں تو
 یقین چاہنا میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تھیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ ہفتے سے سرت فاشی کے غم میں چلے تھے۔ ملازمین نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس شخص میں مجھ پر کیا حکم نہیں ڈھائے گئے تھے کبھی وارنٹ نکلے کبھی گرفتار ہوا کبھی دوستوں سے اور سارا ملک کربلا نہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا نعشہ لگایا تھا اگر میں کچھ دن اور ہاں رہ جاتا تو بہت ممکن تھا مجھ پر قتل، ڈاکہ زنی اور لٹا بھجور کے مجھے ملے ہفتے بنا دیے جاتے جہاں ناکر وہ لگا ہوں کہ سزا ملتی ہو وہاں کوئی سزا دے رہے۔

اگر حکومت کے خلاف سے بچ جائیں تو انکو بھیچا نہیں چھوڑتے۔ تم کو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر تقاضوں سے قدیم ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض نقاد بھی تم سے دُور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو بچنے کے ہوئے انسانہ نویس اور بگڑے ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب کبھی کسی کی اُمت سے محروم ہوتے ہیں۔ تو تنقید میں غلو برن جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا یہ رعب ہے۔ اس لیے کہ جب یہ تکلم کا ہنرمیں لے کر بیٹھتے ہیں تو یہ بھی اصلی چیزیں سو سو عیب نکالتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے مجھے ان بے تحاشا ٹھکے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے بوجہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے تکلم تیز کر لیں اور میرے فن کی دو چیزیں کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب بھی ترقی کرے گا کہ غرضقاؤں کے، اُس کا اُن کا یہی جائے نقائص کا منشا بھی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اسے میرے سوا کچھ کرنی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی معاوضہ ملے تاکہ میں اُس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے ان تینوں نقطوں کا صحیح استعمال کر لیا تو سمجھو مجھے بازی ملے گیا۔ دو تین الفاظ یہ ہیں۔ اگر مکر اور سبک۔

جب تک اتفاق و تخلیق کی قوتوں سے وہ مال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ تو اذن پیدا ہوگا اور نہ واقعیت کے ساتھ خلوص، جب فن کار کے دل کے ساتھ اتفاق کا بھی دل و دھڑ کے گلا توچہ کھجور کھجور جابائے گلاباں پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔ یہاں شراب طور عام ہے۔ پانی نہ چھینے، شراب طور نوش کر بیچے، تمہارے ہاں تو بڑی تھوڑا کلاس قسم کی شراب

ملہ نقادوں کے بارے میں منظر کے جو خیالات ہیں، عجیبے ہی سے اتفاق نہیں ہے۔ ایک تو مجھے اس کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترسیم کرنے لگائی تھی۔
نہیں۔ (محمد طفیل)

ملتی تھی اور اس منکر پاش شراب کے لیے بھی مجھے کیا کیا تہن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لیے ذیل تک ہوا دوستوں میں زیری عزت نہ رہی۔ جو ہر جاتا تھا۔ احباب بڑے موثر لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مل جھڑ جھڑائی تو وہ میرے منہ پر چھوٹی ہتھیلیوں سے لکھا کر گستاخا کر میری جیب میں دھیلے تک نہیں جے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس کی جیب میں دھیلہ چھوڑ دیتا مگر وہ بچے میں کہہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں نے شراب کو خانہ خراب اسی لیے کہا ہے کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مکرانہ کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا، ورنہ پڑے۔ یہاں مختصری روکیاں ہیں وہ سب ہزاروں برس پانی ہیں۔ لیکن ان کنھنوں کا جسم اور بانگیس تقدس توڑ ہے۔ اس مسند پر تم سے ہاتھ نہ ملے گا۔ اس کے لیے کہ تم اس مسئلے میں نہ پھنساؤ۔ جو تھے ہو تھادی چندیت کا احکام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پروردگار کشش اور سحر و جادو کی پانی جاتی ہے کہ تمہارے ہاں کی لولکیاں ان کے سامنے بالکل کھاس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال اور لڑکے بھی ہیں کہ تمہارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اس گفت کے لیے ہوش برونے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جانہری نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بھی کہ میرے مقابلہ میں کون تھا۔ لیکن یہاں کیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا ہی جتنی بات ہے کہنے لگا تو تو میرا چر ہے۔ میرے حضور سے تو نے اپنے ہاتھوں کے ٹھکان چھینے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ شرجے تو میرے شعروں کو دھوڑا اور حسن لکھی کسی کی کہ میرے بارے میں جو غلطی کافی تھی۔ اس میں پہلے میری شک گذاری کے کنارے میری خرابی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ اپنی میری کڑواہاں گھڑا کے رکھ دیں کہیں بڑا وہ تھا، ہندی باز تھا، ہوا کیلے تھا اور اس کی پاداش میں جیل تک ہو گئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

نقصیں علم ہے کہ میں تمام کھینے والوں میں صرف غالب ہی کو توڑتا تھا۔ جب اس نے بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کیں تو میں نے دل میں کہا صحت ہو سہادت حسن منظر تھا۔ میری حقیقت نگاہی پر۔

لیکن غالب سے بڑا زندہ دل قسم کا انسان میری اتنی زیادتی کے باوجود گامی نہیں ہے۔ ہم کشوریک ساتھ بیٹھے ہیں۔ اور بیٹھے ہی میں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری انامیدوں ہوتی ہے تو غالب کہتا ہے۔ میں تم سے بڑا انسانہ نگاہ ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے فضل خیر سمجھ کر ہاتھ نہیں لگاؤ تھا۔ اور میں اس سے کہتا ہوں۔ شعر کہنا کو کسا کمال ہے مگر صابا۔ میری تو مڑ کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کا پوری نزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے۔ — بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اسے بھی تھا۔ اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

ہمچا سام کا دہرہ تو تمہارے ہاں دن و نونی رات چمکتی تھی کر رہا ہے۔ مبارک ہو!

جنوں کی عزت ضرور کرنی چاہیے۔ لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں ہیں کہ تم اپنی تختی میں جان میں خطرے میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبر دیکھی تھی ہے کہ اب تو تمہارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں۔ اور تم سب انھوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھتے

اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی ہی آسانی اچھی نہیں، ورنہ پچھتاوے — حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودمختاری تک کو قفل لگا کے ملاویوں میں دھک دیا ہے۔

حیثیت یہ ہے کہ میں یہاں سے چھ ماہ کے نام کوئی خدا نہیں کھو سکتا۔ ورنہ میں اس سماجی حدود میں رہنے کا اہل ہوتا۔ وہ کہتا کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد بائیں ہاتھ کو تھام رہی ہوں تو ان سے غصہ ہی ہوں گا۔ فوٹو کو فوٹو ہی پہنچاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی ٹھنا ہے کہ جب سے یہاں آ کر ہوں۔ تمہارے پاس میرا بڑا سوگ منا یا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کہاں ہو گیا۔ اس لیے کہ جب تک میں وہاں رہا، سب نے مل جل کر مجھے اپنے ہاں سے دور نہ کیا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی آواز کھڑی ہوئی تو میں نے آگیا ہوں۔ تو ریلوے پر اس ناچیز کی گھنڈگی کے اعلانات کیوں کیے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریلوے ہے جس نے مجھے اپنے ہاں تاک تک صاف نہیں کرنے دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار دے دے بھی میرے درپوش ہوتے۔ یہ خصوصیت قائم کیوں کر ہے۔

ان کا بلیویر سے ساتھ یوسٹ کے بجائے ٹرین جیسا سلوک تھا — ان حالات میں تمہیں اپنے اس مشاعرہ زدہ رویہ پر شرم آتی چاہیے۔ یہاں میرے کچھ تعداد پیدا ہو گئے ہیں۔ ان پچھلے دنوں انھوں نے میرے ذمہ کام کیا تھا کہ میں یہاں کے بارے میں اپنی سماجی رپورٹ پیش کروں، یہ فریضہ میرے سپرد اس لیے ہوا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ٹوٹ کر مخالفت بھی کی ہے اور اس کا جو معاشرہ اندھیری اندھیل رہا تھا اس کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو ڈرامی زندگی کا دستور ہے، وہ بیضر تعلیق قسم کی طبیعتوں پر لگا کر رہتا ہے۔ اس لیے اس کی اجازت ہوتی چاہیے کہ جس کا دل چاہے ڈرامی رنگے جس کا دل نہ چاہے نہ رکھے۔ انتہے بڑے حاکم کے سامنے تاکہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا، خالہ جی کا گھر تھا۔ تمہارے ہاں ایسی کوئی کھری بات کہہ دینا تو میری ذرا بھی گڈی سے نکلوا دی جاتی۔

اطلاعات عرض ہے۔ یہاں میری کتاب گنجے فرشتے کافی پسند کی گئی ہے — جو کہ تو میری جیوی پتروں کا خیال رکھنا۔

نکاس

سعادت حسن منٹر
۲۰ مارچ ۱۹۵۵ء

محمد طفیل

منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط

میرے اور منٹو مرحوم کے تعلقات کی کہانی اٹھارہ برس پر پھیلی جرتی ہے اور اس دوران میں منٹو نے اگر مجھے ایک سطر کا بھی خط لکھا ہے تو میں نے اسے منٹو کو کر دیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ مجھے منٹو کی شخصیت سے بھی پیار تھا اور اس کے فحشے بھی عقیدت تھی اور ایک ادیب کے خطوط میں اس کی شخصیت اور اس کے فن کی جھلکیاں کچھ اس طرح نکلی ہو کر دکھائی دیتی تھیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے جتنی غیر انورسے بتایا ہے کہ وہی میں نے رسالہ شک میل میں منٹو کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی تھی تو منٹو نے اس چٹھی کو پڑھ کر بھیغیر ایک سطر میرے ان خطوط کا بشڈل نکالا اور میں نے گزشتہ دس برس میں اسے لکھے تھے انہیں ایک ایک حکم کے ذریعے تلاش کر دیا۔

۱۹۳۲ء میں انگریزی دینی مجرم کے توسط سے ہمارا تعلقات ہوا اور چار برس کی خمد و کتابت سلمہ ہمارے درمیان غلوں کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جس کے بارے میں منٹو کو شک و شبہ نہ تھا۔ یہ طور نگاہ ہا کر اگر کہیں ہم دونوں کی ملاقات ہو گئی تو یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ میری کچھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ منٹو اس انداز سے کیوں سوچتا ہے۔ شاید میرے خطوط سے اس نے زندگی اور مطلق سے متعلق میرے نظریات کا اندازہ لگایا ہو اور اسے محسوس ہوا کہ ہم ایک ہی راہ پر گامزن ہیں۔ متنازعہ راہوں پر بھی نہیں چل سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دستخط منٹو میں منٹو پہنچتی سے دہلی آیا اور مجھے ملتان سے دہلی بلا دیا تو مجھے اس کے وہ تمام خطوط یاد آئے جس میں اس نے ہماری ملاقات کی خطرات کی کاوندہ ظاہر کیا تھا۔ میں دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اتر کر آتا ہوں۔ اس کے دے کو رتی منزل کا پتہ بتایا تو وہ مسکراتے ہوئے نکلیں بھائی شخص میری بڑی سی گھیبے دار شلو اور میرے اس کوٹ کے نظارے سے غلطوہ مرہا ہے جسے اگرچہ چنگوں پر پہننے کے لیے تیار کیا گیا ہے لیکن جسے میں نے شلو پر دکھارکھا ہے۔ ان دونوں میری صحت پسندوں کی بھی اور کوئی انہیں مختص قسم کا آدمی تھا اس لیے میں نے سوچا کہ میں ہے اس جسمانی تغیر سے اس کے پیچھے چھوڑوں میں اور تعاش پیدا کیا ہو۔ مگر کوچران کی مسکراہٹ کا راز اس وقت کھلا جب ہم اپنی منزل کے قریب پہنچے۔

میں دہلی میں پہلی بار آیا تھا اس لیے کوچران کے رحم و کرم پر غنا۔ پہلے تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کوچران کوئی غنڈہ ہے اور میرے اجنبی۔ اجنبی شخصوں کی شبہ گلاس باز میں آ نکلا ہے جہاں ہر طرف ہارمونیج رہے ہیں۔ بکھرے بالوں کا لپ اسٹک سے چپے ہوئے جوشنوں کی چھاؤں چھا رہی ہے۔ خواتین کھڑکیوں اور دروازوں میں لڑکیوں میں جیسے ہر راہ پر اپنی جہاں پر ہاں کیٹھی کے کھلاڑی اپنے دوستوں کے کندھوں پر بیٹھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک کھینے جڑوں کے ٹھکے اندے ٹھکے اور ہاں کی بیکس اور جھانے ہوئے پھول کھڑے ہیں اور کوچران کہہ رہا ہے کہ کوئی میاں بکھا آپ دلی میں پہلی بار آتے

ہیں یہ چاؤڑی ہے۔ آپ نے چاؤڑی بازار جانے کو کہا تھا تا کہ اسے گاؤ

منٹو نے مجھے چاؤڑی بازار کی کھاتھ اور میں حیران تھا کہ کیا پندت کر یا رام کو رسالہ توڑنے کے دفتر کے لیے ساری دقتی میں چاؤڑی سے بستر کوئی جگہ نہیں مل سکی؟ لیکن اب لوگوں سے اس دفتر کا پتہ پوچھتے ہوئے عجیب محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ تیاں یہاں رسالوں کے دفتر کہاں، یہاں تو دوسرے دفتر کھلے ہیں۔ تو میں سوئے جھینپ جانے کے اور کیا کر سکوں گا۔ میں نے سوچا کھاری باؤلی میں رسالہ ساقی کا دفتر ہے۔ وہیں چلے ہیں مگر اچانک نمودار نظر آگیا اور میں تانگے سے اتر کر اندر چلا گیا۔

میں نے منٹو کو پہچان لیا۔ وہ رطو سے شام ٹیبل میں سے اس کاٹھی کا وقت دیکھ رہا تھا جس سے اتر کر میں چاؤڑی میں پہنچ چکا تھا۔ منٹو سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ عام جسمانی صحت پر مبنی سی تھی مگر انکھوں میں چمک اور نگاہ میں سفریوں تھا۔ شام کو تم کوئی دہائی کے ایک انڈیا ہاؤس سینا ہال کی چوتھی منزل پر بندید غٹ منتقل کر دیے گئے، جہاں میں نے ایک مرشد ادیب کھانڈیکر کی ملی کمانی تحریک تھی کے مکالمے اور گیت لکھنا شروع کیے اور منٹو نے ان مکالموں اور گیتوں کو ٹاپ کرنے کا کام سنبھال لیا۔ دن بھر ہم یہ تخلیقی اور تکنیکی کام کرتے اس شام کو نیچے بازار میں چلے جاتے، منٹو شراب پیتا اور میں بوٹیو پیس کھاتا۔ دو تین دن کے بعد اس نے کہا۔ تعاف کرنا احمد ذیم تاحی تم میری شراب کے مقابلے میں آؤؤں کی یہ کڑی نہیں کھاتے ہوئے پیلے نہیں لگ سکتے۔ اور دوسرے دن اس نے تھائی کوختم کرنے کے لیے شادیہ لطیف کو برائے دونوں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے، دہلی بلا لیا اور ہم سینا ہال کی چوتھی منزل پر دس بارہ روز تک مقیم رہے۔

میں اس دوران میں سوچتا رہا کہ آخر منٹو محض میری خاطر اپنی محنت کبوں کر رہا ہے۔ کافی کھانڈیکر کی ہے۔ مکالموں اور گیتوں کا معاوضہ مجھے ملے گا مگر غٹ کیوں دن بھر بیٹھا رہوں صفحے ٹاپ کر ڈالتا ہے بلکہ اکثر غلی ٹیکنیک کے سلسلے میں میری رہنمائی کرتا ہے اور بعض لمبے سین تو اس نے خود ہی لکھ کر ٹاپ کر ڈالے ہیں۔ یہ عجیب ہے کہ وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے مگر ننگوہ جانتا ہے کہ مجھے حیثیت سب اسپیکر بکاردی صرف ساٹھ بستر روپے ماہانہ تھے میں گریس بھی تو یہ جانتا ہوں کہ غٹ بی بی کے ہفت روزہ مصور کی ادارت کا تھی الخدمت صرف پچاس روپے ماہانہ کی صورت میں حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ کونسا بندہ ہے جس نے منٹو کو بی بی سے دہلی لا کر اسے میری خاطر اندھا دھند شفقت پر مجبور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بندہ اس بے لوث غلوس کا تھا جو منٹو کی اور میری افتادہ بی بی میں واحد تفریق کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک دوسرے سے پیارا اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کے سوا ہم اپنی اپنی زندگی کی بیشتر گریسوں میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے۔ بلاتح کے اس واضح اختلاف کے باوجود ہمارے دو تہ تہ تعلقات ہمیشہ قائم رہے۔ میں ایک دوسرے سے شکایتیں ضرور لیتیں اور ان شکایتوں کا حل الاطمان انتظار میں ہوتا رہا۔ مگر ہم جب بھی ایک دوسرے سے ملنے نہ مل گیا اور ہم آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کے منٹو اور ذیم ہم گئے۔

منٹو سے میری دوسری ملاقات اس سے اگلے سال ہوئی۔ وہ بمبئی کو چھوڑ کر مستقل طور سے دہلی آ گیا تھا۔ یہاں وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا اور نکلسن روڈ پر بس بلڈنگ کے ایک غیثت میں رہتا تھا۔ ان دنوں دہلی ریڈیو سٹیشن میں

اور وہ کہ بہت سے ادیب اور شاعر جمع تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت شاید نوز سیکش سے متعلق تھے۔ ان کے علاوہ کرشن چندر، میراجی، اوپندر ناتھ اشک اور ڈی۔ ایم۔ راشد بھی موجود تھے۔ اردو شاعری کے نئے دھات کے نمائندہ شعرا کرشن چندر، مولانا نے مدعو کیا تھا۔ تاثیر مرحوم اس محفل کے صدر تھے اور شرکائے محفل میں فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، راشد، میراجی، بھارتی، تصنیف حسین خاں، ایما ب مرحوم، روشن صدیقی اور سائر نظامی کے ناموں کے علاوہ اپنا نام یاد ہو گیا ہے۔ منظر کا فن اسی دنوں انتہائی مروج پر تھا۔ صحت بھی بری نہیں تھی۔ طبیعت میں شرمیلی اور بے باکی تو ہمیشہ سے تھی لیکن ان دنوں اس شخصیت کے یہ پہلو بھی اپنے عروج پر تھے۔ ایک دن اچانک بولا۔ آؤ، ہمارا، قنا حنیف صاحب کو چھوڑیں۔ چھوڑ دو بھری محفل میں حنیف صاحب کے پاس گیا اور نہایت ادب سے بولا۔ شاہنشاہ اسلام کے ایک شعر کے سلسلے میں آپ سے استفادہ کرنا ہے۔ بہت گرا شعر ہے۔ آپ نے فلسفہ کا کوئی نکتہ نظم فرمایا ہے۔ میں نے ہزار ہا سوراہے سے نکلے دوستوں سے بھی مشورہ لیا مگر وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ آپ کا وہ شعر ہے۔

یہ دلا کا جو کر بھیجا ہے وہ لڑکی جو کر بھیجی ہے

یہ پیغمبر کا بیٹا ہے وہ پیغمبر کی بیٹی ہے

ساری محفل کشت زعفران بن گئی اور حفیظ صاحب بھی شکوہ کر ٹال گئے۔

پھر ایک دن منظر نے مولانا چراغ حسن حسرت کو چھوڑنے کا پروگرام بنایا۔ مولانا شاید میراجی کے کہنے میں تھے۔ کرشن، اشک اور میں منظر کے ہمراہ ان کے پاس پہنچے اور منظر نے بیٹھتے ہی علامہ اقبال پر برسنا شروع کر دیا۔ بانگ درا کے پہلے حصے نے آگے کے اقبال کو میں شاعر کے بجائے مولانا سمجھا سوں۔ آخر میراجی کوئی شاعر ہی ہے کہ فلسفہ کے تعریات کو منظر کسی مقصد کے نظم کہتے جاؤ اور ہر نظریے کے کٹ کے کالر میں خودی کا پھول سماتے چھوڑتے۔ پہلے تو مولانا حسرت صاحب نے اقبال کی حرارت میں چند نہایت مخصوص باتیں کہیں مگر انھیں منظر کے توروں سے اس کی نیت کا بدلہ ہی پتہ چل گیا اور انھوں نے کسی ایسی شگفتہ چٹکیاں ایسا شروع کہیں کہ منظر کی تجویز کے مطابق ہم دہاں سے پہنچ جھاگ آئے۔

میں چند منظر منظر ہی کے ہاں رہا۔ منظر کے گھر میں مجھے سلیقہ، صفائی اور سادگی کا وہ معیار نظر آیا جو بڑے بڑے گھروں میں بھی محض ذوق طبیعت کی کمی کے باعث غائب ہوتا ہے۔ منظر کے گھنڈے کے کمرے میں سفید چاندنی کا فرش، بھاری ہٹا، فٹ ڈیزائنڈ آؤپن ڈریسنگ میں منظر کے سروے بند ہوتے۔ اتنی ہی لہجہ تپائی پر منظر کا ٹاپ رائٹر دکھا رہا تھا کہ میں نہایت سلیقے سے ایک لمبے سلیف سے کئی ربتیں اور دو گرا چٹا منظر سفید براق لباس پہنے وہاں بیٹھا گفتگو کرنا ٹاپ کرتا نظر آتا تھا۔ وہ اپنی خراب کی ہوئی کبھی اس ڈریسنگ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اس لیے کہ ان دنوں منظر کی بڑی ہنس اس کے ہاں مقیم تھیں اور منظر کو تھا کہ اس دن ہی ہنس سے ڈرتا ہوں اور پھر آج کل کے بچے اتنے تر ہیں کہ انھیں ہزار ہا بھلا بھلائے کہ اس بوگ میں تیل بھرا ہے۔ وہ بچل بیٹل آنکھوں سے اُسے گھنوبے جائیں گے۔ سوان سے بھی چھپنا نا چرتا ہے۔ وہی سفید قوجب اُس نے دیکھا ہے کہ میں چھوڑ نہیں سکتا تو اس نے ایک پیارا مقرر کر دیا ہے اور اس پر جانے سے میری میری نہیں ہوتی۔ میری فراڈ کرنا بھی پڑتا ہے۔

منظر کے مکان کی اس نہایت خوبصورت سادگی سے مجھے ۱۹۴۷ء کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا ہے۔ منظر میرے پاس آیا۔ ہم

ڈراؤنگ دوم میں بیٹھے چند منٹ تک باتیں کرتے رہے کہ اچانک اس نے چونک کر کہا مظلوم ہوتا ہے اس کمرے میں تازہ تازہ سفیدی ہوتی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ سفیدی کو میں ایک بندوق ہی گزرا ہوا گا۔ وہ بولا۔ تم شاعر ہو کر ایسی بندوق ہی سفیدی کو برداشت کیجے بیٹھے ہو۔ میں نے اسے اطلاع دی کہ سفیدی خود میں لے کر ہے۔ اس لیے عدم برداشت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر مجھے اپنے کمرے گیا اور اپنے ڈراؤنگ دوم میں داخل ہو کر بولا۔ سفیدی اسے کہتے ہیں آپ تیسری مرتبہ خود منٹوں کے لیے دیلی بلا بھیجا۔ غصہ اور کوشش چند دفعہ سنبھالنے کے نام سے ایک نئی کہانی تھیں تھی اور مجھے اس کے گیت کھانا تھے۔ مجھے کوئی ایک مہینہ منٹوں کے ہاں رہنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں منٹوں نے مجھ سے رڈ لکے کے لیے ایک طویل آواز اور غیر منظم ڈرامے بھی کھسکوائے۔ آخرت کے معاملے میں رڈ لکے کے حکام سے خوب لڑائیاں کیں۔ پھر جب مجھے خاصی منتولی رقم دیا چکا تو مجھے چاندنی چکر میں لے گیا۔ وہاں اس نے ایک امرتسری کا ڈانڈا سے میرے لیے پتولوں اور کٹوں کے کپڑے خریدے۔ وہ تین دفاتر میں میرے پاس قیام ہو گیا اور یوں میں نے زندگی میں پہلی بار پتولوں یعنی اورٹائی لگائی۔ جو ملحق ملاقاتیوں پر مقدمے کے مسئلے میں ہوئی۔ جب منٹوں ہی میں تھا اور میں ادب لطیف لاہور کا ایلیٹر تھا۔ پانچویں ملاقاتی اندر کی ناز میں محض اتفاق سے ہوئی۔ جب میں تیسرا کے حالات ایک مقدمے کے مسئلے میں لاہور آیا ہوا تھا اور غرض مستقل طور سے لاہور آ گیا تھا چند روز کے بعد وہ پشاور میں میرے پاس پہنچا اور وہاں چندہ میں روز تقسیم رہا۔ چارے نظر ملتی اختلاف کی ابتدا وہیں سے ہوئی۔

ہم دن بھر ڈیڑھ میٹروں میں گرہ لے، شام کو منٹوں کی دیکھی شخص کو اپنے ساتھ لے آتا اور پھر شراب کے ڈور پیتے۔ ادب میں حقیقت اور جس پر بحثیں ہوتیں غلو کو ان تمام مقدمات پر پھر حاصل تھا جو زندگی کے ٹرے ٹرے ملاک میں فطرت اور یوں پروریاتی کے الزام میں چلائے گئے۔ وہ ان مصنفین اور ان کی تحریروں کی شائیں دیتا ہوا اس وقت اس کی زبان اتنی تیز ہوتی کہ اس پر ایک ضلع اور محرق کا دھوکا ہوتا۔ ایک روز میں نے کہا۔ تاسفاتی نے موبیساں کے کسی افسانے کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر موبیساں کو اپنی منگی رسوائی کو نہاتے ہوئے دکھا، تھا تو کیا اتنا کہ دینا کافی نہیں تھا کہ وہ خدا ہی تھی۔ یا پہلے یہی کہہ دیجیے کہ وہ نہا چکی تو اس کے جسم پر پانی کے بے شمار قطرے تھے۔ رو گئے۔ لیکن موبیساں کو یہ ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ پانی کے ان قطروں کا رنگ ہر دہائی کے جسم کی رنگت کی طرح جیسا سفیدی یا بلیا کا ملائی تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب میں لذت کی ابتدا ہوئی ہے۔ اور جس کو منٹوں نے اٹھا۔ جو لا تم کیا جانو عزت کے جسم کے راز۔ تم نے تو ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم نے تو شراب تک نہیں پئیں۔ تم تو اس روز چاؤ ڈی میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے راجہ جنسوں کے مجرم میں کوئی شخص آئے۔ تم کیا ہوا موبیساں نے قطروں کی رنگت کا غما کر مہر خردی کیا۔ اگر وہ رنگت کا ذکر نہ کرتا تو یہ عورت کیسی چٹنی چٹنی اور سیاٹ مٹی۔ ان لکڑی قطروں ہی نے تو اسے زندگی کی شکل بخشی دی ہے۔ تم کسانوں کی کہانیاں لکھتے ہو تو یہ خردی نہیں کو تم کسان عورتوں کی نفسیات کو بھی کچھ سمجھو۔ عزت پر لکھتے وقت عزت ہی جانا پڑتا ہے۔ اور کبھی تم تخلیق کے غور میں عورت بیٹے ہو یہ قیاس بھی کسی نے چھیڑا ہے؟ کبھی کسی جنسی نے قتل کے جسم پر ہاتھ رکھا ہے؟ کوئی کبھی عورتی محسوس کی ہے؟ تمہارے اعصاب بھی اس اجنبی لمس کے

مضارب سے بھی جھنجھٹائے ہیں؟ سو میری جان بٹاسٹائی گئی کبھی اسی طرح کا مذہبی چنے پر اڑا تا تھا مگر کیا تھا اسے خیال میں اس نے اپنی ریتا کر سنیٹیا کے ننگے پاؤں پر لکھتے ہوئے وہ کیفیت محسوس نہیں کی ہوگی جو مرہاں نے اپنی بیرونی کے جسم پر پانی کے گلابی قطرے دیکھنے میں محسوس کی؟ سو اس حود ندیم قاسمی - بات یہ ہے کہ تم ادب کے وزیر خارجہ اور ہم ادب کے وزیر داخلہ ہیں۔ ہماری اپنی اپنی باتیں اور اپنی منزلیں ہیں۔ نہ تم نہ میں سکتا ہے نہ منظرِ قدیم۔ بٹاسٹائی علامتائی ہے اور مرہاں مرہاں ہے۔ اور میرے خیال میں نے ایک پبلک زیادہ بڑھا لیا ہے، علیہ اب سوجاؤں۔

ان دنوں میں نے تیز کر لیا کہ منظر سے اس کے بعض افسانوں کے غرائز ٹکڑوں کی عربائی کی حقیقت تسلیم کلاں میں چنے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا اور آخر ایک روز منظر اسی سطح کلائی پر اتر آیا جس کا میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ایک دفع میں نے اُسے وہیں پشاور میں بہت زیادہ شراب پینے سے روکا تو وہ تنگ آکر بولا: یہ میرا پائو ریٹ معاملہ ہے اور تم میرے دستِ خدوہ ہر گز میں نے تمہیں اپنے غیر کی سبھ کا اہام مقرر نہیں کیا۔

دوسرے ہی دن اُسے اپنے اس خوبصورت فقرے کی تعلق کا احساس ہو گیا کیونکہ اس کی باتوں اور تھوڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے منارہا ہے۔ پھر یہاں لاہور میں جب ہمارے درمیان میٹوں تنگ کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک دفع میرے ہاں آیا۔ مجھے اپنے کمرے گیا اور اندھا دھنئی کر شمسٹو سے لے کر شمسٹو تک کی تمام باتوں کو اپنی تفصیل سے دہرانا رہا کہ میں اس کی بے پناہ یادداشت پر حیران ہو گیا۔ پھر وہ بولا: یہ باتیں لوٹ کر لو میری جان۔ شاید چند دنوں بعد تمہیں یہ مرحوم ملٹو کی باتوں میں گھسنا پڑیں۔ یہ سن کر میں غلاب سمول آپ سے باہر ہو گیا اور میں نے یہ سوچے بغیر کہ منظر ٹھٹھے میں ہے کہنا شروع کیا: اگر آپ کو میری دوستی اتنی عزیز ہے تو پھر آپ کو شربِ جھوڑی پڑے گی۔ آپ تو باگوں کی طرح پیٹے ہیں کیا آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ جس گھر میں آپ رہے ہیں اس میں نکست بیٹی بھی رہتی ہے۔ یہ وہی بچی ہے جس کی ایک نہایت پسندیدہ تصویر آپ نے مجھے بھیجی تھی اور جو میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ آپ تو اب کے وزیر داخلہ ہیں لیکن کیا آپ نکست کے اس داخلی رد عمل کو بھی سے محسوس نہیں کر سکتے جو چند برس کے بعد آپ کو اس کیفیت میں دیکھ کر اس کے ذہن پر داد ہو گا؟ اور اگر آپ کو اس بات کا احساس نہیں تو آپ اپنے آپ کو ادب کے وزیر بنے بغیر ان کا کیجیے کیونکہ جہاں ادب صرف اپنے اندر بند رہتا ہے۔ اور منظر لے گا۔ اس فراڈ کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔ اور اس کے بارے میں مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کی ذات کے ماحول میں داخل ہونے کا مجھے کوئی دھور دراز کا بھی حق حاصل نہیں۔ میں خفا ہوئے بغیر یہ لایا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کل ہوش میں آکر ان باتوں پر کھینٹائے گا۔ مگر وہ نہیں کھینٹا یا بلکہ چند روز بعد سرا ہے ملاقات ہوئی اور میں نے شکایت کی تو معلوم ہوا کہ اس روز جو کچھ اس نے کہا تھا وہ حریف آخر تھا۔ اور وہ نشے کی نہیں، ہوش کی باتیں تھیں۔

تب میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس دور میں میں گا بے گا ہے ملاقات ہوئی مگر حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ منظر کو اپنی امسا پسندیوں میں میری رفاقت گوارا ہے اور نہ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ اسے آہستہ آہستہ ختم ہوتے

دیکھوں اور کچھ نہ بولوں میں نے بولی کر دیکھ لیا تھا۔

گلاب مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں تیرے بڑی دکھائی تھی۔ میں اس کا پہرہ دار بن کر گئیوں نہ بیٹھ گیا۔ میں اس کی جڑیاں اور گلابیاں تک سستا مگلا سے زندہ رکھنے کی کوشش کرتا۔ اسی صبح میں اس کے گھرانے کے افراد اور اس کے چند بیک نفس دوست میرا ساتھ دیتے تھے۔ ہم سب مل کر قوم کی اس سماج کی اتنی جلد ناپ بردہ ہونے سے پہلے تھے اور منٹو نے ایک بار مجھے یہ بھی تو دکھایا تھا کہ مجھے آپ کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ سو اب دوبارہ تم میرے سپرد ہو گئے ہیں۔ ایک منٹو کا اور دوسرا نیا عورت نفس کے تحفظ کے ڈھونڈنا۔

آج میں منٹو کے چند خطوط ایک عظیم فن کار کی ایک نہایت پیاری یادگار کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ منٹو کے کوئی ایک منخط میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کے منٹو کی نہایت پرگی جھلکیاں جمع ہیں۔ میں انہیں کتابی صورت میں بھی بچانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور ان کے حقوق منٹو ہی کے نام محفوظ رہیں گے، مگر یہ سب خود فراموشیاں اور جی بھلا ہے ہیں۔ کیونکہ کسی شخص کو کسی وقت بھی میرے غیر سے نہیں نکل سکتی کہ میں نے اور میرے جیسے کتنے کم حجت اور شکست خوردہ و خیر خواہوں نے منٹو کو زندگی کے ورانے میں بولی اکیلا چھوڑ دیا تھا کہ ۱۱

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاس ہے رکاب ہیں

(۲)

معرفت ہفت روزہ سماج
۳۰ جون ۱۹۳۲ء
۱۰ مئی ۱۹۳۲ء

بلوہ مکرم

وعلیکم السلام۔ آپ کا انارش نامہ ملا اس سے قبل میں آپ کی خدمت میں ایک خط روانہ کر چکا ہوں، امید ہے وصول فرمایا ہوگا۔
نامک سے واپس پر میں معتد سے ملوث ہو گیا تھا اور یہ بات کوئی اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کے تعلق میں کچھ کہوں یا سنوں، بلکہ
معتد سے میرے تعلقات دوستانہ ہیں۔ معتد جو نے پر بھی میں اُن کے قریب ہوں — یہ میری حقیقت ہے۔

آپ کی اشوری میں سب سے بڑی غامی ہے کہ وہ علمی نہیں۔ وہ اُنکی کس طرح نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لیے
کئی صفحات دکا رہی اور میرا خیال ہے کہ یہ صفحات لکھ کر بھی میں آپ کو پتا نہ دے سکتا ہوں کہ جس نے کیا سکھایا۔ شاید میں اس سے قبل
عرض کر چکا ہوں کہ اُنکی افسانہ نگاری کو لکھنے کے لیے اسٹوریو بہتر ہیں، افسانہ ہے۔ آپ پر پے پر لکھوں کہ خود دیکھ کر بھی کچھ بہت حاصل کر سکتے
ہیں مگر پھر بھی سینا ہال میں چند ضروری نقطوں پر روشنی ڈالنے والا ضرور ہونا چاہیے۔

آپ اچھے افسانے لکھ سکتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے آپ کے ”بے گناہ“ سے ہو گیا تھا۔ مجھے بہت کم افسانہ یاد ہے جس میں
آپ کا بے گناہ مجھے اُنکی طرح یاد ہے۔ وہ چند معمولی نامیوں کے باعث آپ کا بہترین افسانہ تھا۔
گو میں خود حوصلہ ہارتا رہتا ہوں مگر میری استعداد ہے کہ آپ ہرگز حوصلہ نہ ہاریں۔

مجموع میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں، اس لیے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں
میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں اور اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اُنکی کمزوریوں کے باعث مجھے کئی حد سے اٹھانے
پڑے ہیں۔ میں اسی تلخ حقیقت کے پیش نظر شاید آپ سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آپ میرے تعلق کوئی دانتے مرتب نہ کریں۔

میں یقینی میں پچاس روپیہ اور ادا کرنا چاہوں ہر بے حد معمولی خرچ ہوں، مگر آپ یہاں پلے آتش تو میرا خیال ہے کہ ہم
دونوں گزر سکیں گے۔ میں اپنی معمولی خرچیاں بند کر سکتا ہوں۔ مجھے آپ کی مجبوریوں کا کمالی احساس ہے، اس لیے کہ میں ان
مجبوریوں سے خود گزر چکا ہوں۔ میں آپ کو گناہ دے دیتا ہوں وہ نہ کر سکتا تھا، اس لیے کہ اُنکی آٹھ لکھ روپے میرے پاس پہنچ
سود پلے تھے اور اب یہ حالت ہے کہ صرف بیس روپے باقی ہیں۔ مجھے گناہیں خریدنے اور کوئی روپیہ زیادہ کرنے کا خطا ہے
اور میں اس سے لطف اٹھاتا ہوں۔ خیر اندازہ لگ رہے تو روپیہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ آپ یہاں تشریف لا سکتے ہیں مگر یہ بات

یاد رکھیے کہ آپ میری زندگی کی دھوپ چھاؤں میں رہنا ہو گا۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں ہم دونوں رہ سکتے ہیں کھانے کو لے ڈالے مگر آپ کو کتابیں پڑھنے کے لیے مل جائیں گی اور اگر آپ کو شش کمرے کے قریب مکان ہے کہ اگرچہ یہی کتابوں کے ساتھ چھے اچھے کھانے کی مل جائیں۔ اگر میرا آپ کا کھانا ہوا افسانہ کوئی غریب کوئی غریب سے تو دو تین مہینے عیش میں گزرتے ہیں۔ کیسے کیا ارادہ ہے ؟

”سناچ تمہارا یہ چہ نہیں۔ یہ پرچہ دراصل میرے ایک عزیز دوست یہاں سے نکال رہے پہلی بار شائع ہو گئی ہے، آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔

آپ کی نظم میں تین ہیروئنیں ہیں۔ افسوس ہے کہ نہ مجھے شہر چھٹنا آتے ہیں اور نہ میں ان کو (APPRECIATE) کر سکتا ہوں۔ چونکہ آپ نے نظمیں جیسا کہ یہ یقیناً اچھی ہو گی۔ شغل کے متعلق رائے عاید کا شکریہ۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو

۱۴۔ ڈیفنی پیمبرز

کلیر روڈ، یمنی شاہ

نمبر ۱۰

براہ کرم

و علیکم السلام۔ آپ کا افسانہ نگار، نگینوں اور تصویر کا شکریہ۔ آپ کو تاحی اتنی زحمت اٹھانا پڑی۔

”نوم“ میں کے آئندہ آپ نے پسند کیا۔ شکریہ۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ سے پسند کریں گے میں نے اس کو کچھ وقت انسانی کوشش کی تھی کہ کوئی عقلمانی چیز ضروری نہ ہو اور جیسا کہ آپ نے اپنی رائے میں لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں۔

ہمارے ادبی رسائل صحیح ادب کے تحمل نہیں ہو سکتے، اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت کچھ لکھا جاسکتا تھا۔

پتی دیتا استریوں اور نیک دل بیرونیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اب ایسی داستانیں فضول ہیں کیوں نہ ایسی صورت کا دل کھول کر بتایا جلتے ہوئے پتی کے انوش سے نکل کر کسی دوسرے مرد کی شکل گمارہی ہو اور اس کا پتی کمرے میں بیٹھا سب کچھ ایسے دیکھ رہا ہو گویا کچھ ہو رہی نہیں رہا۔

زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ وہ جیسی تھی، یا جیسے ہو گی اور یا جیسے ہونی چاہیے۔ دیوانی نثر میں کیا آپ نے تو کمال کے دیے پڑھا۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

آپ کے گیت خوب ہیں خاص کر جوگی سرگ دالہ اس میں ایک مصرع ہے سہ تو کیا بدلے کس کی خاطر۔ اگر کس کی خاطر کے بجائے کس کے کارن ہو جائے تو میرزا خیال ہے کہ آپ کے گیت میں خاطر کا تیز تر نکل جائے گا۔ مجھے آپ کے نسلے کا انتظار رہے گا۔

میری صحت اب تندرست اچھی ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ میں نے غم کے لیے ایک افسانہ تحریر کچھ کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ افسانہ کچھ کرک گیا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے مطالعہ کے لیے بھیج دوں، شاید آپ کوئی بدلے دے سکیں۔

نکسار
سعادت حسن منٹو

۱۰۔ ایڈیٹر گلبرگرز
گلبرگرز۔ بمبئی ۴۰
۳۰ جنوری ۱۹۶۲ء

برادرِ مکرم

وعلیکم السلام جس روز آپ کا خط ملا میرا موڑ بہت اچھا تھا آپ کے تعریفی الفاظ سے مجھے ذرا وہ ہو گیا۔ میں لوگوں سے کہلاتا ہوں کہ میں اپنی تعریف سے خوش نہیں ہوتا لیکن یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ نے میرے افسانوں کی تعریف کی تو دانش مند سا ہو گیا۔ اگر کسی سے کیئے کا نہیں کر لیں یہ کمزوری ہے۔

کل رات سے میرا موڑ ٹھیک نہیں طبعیت پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا ہوں۔ ایک عجیب و غریب تھکان سی طاری ہے۔ میں اس اضمحلال کا سبب جانتا ہوں مگر اس سبب کے پیچھے اتنی چیزیں کارفرما ہیں کہ میں فرداً فرداً ان پر غور نہیں کر سکتا اور اجتماعی صورت میں یہ ایک اُحد سی معلوم ہوتی ہیں۔ میں دراصل آج کل اس جگہ پہنچا ہوا ہوں جہاں قیاس اور انکشاف میں تمیز نہیں ہو سکتی جہاں آپ سمجھتے تھے جہاں اور نہیں سمجھتے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کی ساری کھلی میں چلی آئی ہے اور بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم باہمی کے جسم پر چڑھائی کی مانند رنگ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا (COMPLIX) ہے جو تشکوک میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اس سے شروع اور داغ کو سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے پاس ایک ایسا سوچ اور ڈائجٹ جس سے میں سب خواہش و دشمنیاں پیدا کر سکوں جس وقت چاہوں ٹھیک اندھیرا کروں اور جس وقت چاہوں روشنی کا سیلاب بہا دوں۔ کیا ایسی چیز مل جائے گی؟ — کچھ کہہ نہیں جا سکتا

کچھ بھی مجھے اطمینان نصیب نہیں ہے۔ میں کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوں۔ ہر شے میں مجھے ایک کئی سی محسوس ہوتی ہے
میں خود اپنے آپ کو مکمل سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے کبھی تسکین نہیں دیتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا
اندر ہے، وہ نہیں جوتا پاتا ہے اس کے بجائے کچھ اور رہتا ہوتا پاتا ہے۔

عشق و محبت کے متعلق سوچتا ہوں تو صرف شہر و رست ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہر سے الگ کر کے میں دیکھتا
ہوں کہ وہ پتھر کی ایک صورتی رہ جاتی ہے۔ مگر شلیک بات نہیں، میں جانتا ہوں، انہیں میں جانا پاتا ہوتا ہوں کہ پھر اٹھ گیا ہے؟
— کیا ہوتا پاتا ہے؟ — اگر نہیں تو پھر اور کیا ہو گا؟

لیکن میں عورتوں کے بارے میں وثوق سے کچھ کہ بھی تو نہیں سکتا۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہوتا ہے۔ عورت
کا وہ تصور جو ہم لوگ اپنے دماغ میں قائم کرتے ہیں شلیک نہیں ہو سکتا — کسی قدر افسوسناک چیز ہے کہ عورتوں کے بارے
میں کچھ ہم ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ منت ہے اسے ملک پر جو عورتوں کو ہم سے ملنے کے لیے روکے
..... مگر..... گرا گیا ہے؟ — کچھ بھی نہیں! — سب بکواس ہے۔

آپ کے عزیز کی ناگہانی موت سے بہت صدمہ ہوا۔ خدا آپ کو صبر عطا فرمائے۔
آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اگر ہو سکے تو اس خط کا جواب جلد کھود دیجیے گا۔
"MUD" میں نے لکھ لیا ہے۔ مگر کمال لکھنا باقی ہے جو میری لکھا جائے گا۔ آج گزشتہ اپنے افسانوں کی ترتیب میں
مشغول ہوں۔ کتابت شروع ہے۔

فیض صاحب آپ کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ وہ آپ کی نگلیں بہت پسند کرتے ہیں۔ میں وجہ ہے کہ وہ انہیں
طور پر اس کا ڈیزائن بناتے ہیں۔ تازہ پرچے میں آپ نے آپ کی نظم کو ریت خونی سے (ILLUSTRATE) کیا ہے۔
ادب لطیف میں آپ کا منظوم مکالمہ پڑھا۔ بہت خوب ہے۔ آئندہ پرچے میں اس پر ریویو لکھنا شروع ہے۔
یہ داجندر سنگھ صاحب۔ بیدی کون ہیں؟ — یہ بھی منشی کے ذمے معلوم ہوتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں ان کے افسانے
آپ غور سے پڑھا کریں۔ ادب لطیف کو آپ اور بیدی صاحب پر نازاں ہونا چاہیے۔

دفتر میں کمال انا تو ک فبر کی ایک کاپی بھی نہیں پکی۔ بہر حال آپ کے لیے بڑی مشکل سے ایک پرچہ حاصل کیا گیا ہے
جو کل بھیج دیا جائے گا۔ دفتری کو دایت کر دی گئی ہے کہ وہ آپ کے پرچے کا پکینگ اسٹیمپ سے کیا کرے۔
نذیر صاحب اور غلطش آپ کو آداب عرض کرتے ہیں۔ یہاں ہم سب لوگ آپ کی باتیں کیا کرتے ہیں۔
انسان ضرور سمجھے گا۔

بہاولپور کے تازہ پرچے میں (افروزی) میں میرا ستر پڑھ کر اپنی راستے سے آگاہ فرمائیے گا۔
میں بخیریت ہوں۔ امید ہے کہ آپ بھی بصحت ہوں گے۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ریلوے ٹرک چھوڑ
کلکتہ ریلوے سٹیشن پر
۱۲ فروری ۱۹۴۷ء

برادر عزیز

محبت نامہ ملا۔ مضمون کا شکریہ۔ میں اس کے آگے ہی قسم کے چند اور بھی الفاظ لکھنے والا تھا کہ آپ کے خط کی درج ذیل سطر پر نظر پڑی۔

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں نے ہوش سنبھالا ہے پر سب نہیں کیا۔ اب تو یہ وقت آگیا ہے کہ پرہیز لفظ ہی میری دلکش نثری سے غائب ہو گیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی اگر پرہیز میں گذری جائے تو بھی قید ہے، اگر بد پرہیز میں گذری جائے تو بھی قید۔ کسی نہ کسی طرح ہیں اس آونی جواب کے دھماگے کا ایک سراپا لگا کر اسے اُدیشہ کرتے جا رہے ہیں۔ انا کام آدمی سے زیادہ کر چکا ہوں۔ باقی آہستہ آہستہ کروں گا۔ اس لیے میں بہت جلد مرنا نہیں چاہتا۔ جس روز مجھے معلوم ہو گیا کہ میں کیا ہوں تو موت کو بلا لے کر میں کوئی پس و پیش نہ کروں گا۔

میری زندگی ایک دیوار ہے جس کا پستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ کبھی پاتا ہوں کہ اس کی تمام ریشیں پرانہ کر دوں، کبھی یہ بھولتا ہوں کہ اس لیے کے ڈیپر پر ایک نئی عمارت کھڑی کروں۔ اسی ادھیڑ لڑی میں لگا رہتا ہوں۔ دماغ بفرقت کام کرنے کے باعث چتا رہتا ہے، میرا نامہ لی دوجہ حرارت ایک ڈگری زیادہ ہے جس سے آپ میری اٹھوٹی پیش کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر قناعت۔۔۔۔۔ وہ مستقل تھکاوٹ جو میرے اوپر طاری رہتی ہے کچھ کرنے نہیں دیتی۔ اگر مجھے تھوڑا سا سکون بھی حاصل ہو تو میں وہ کچھ لکھتا ہوں جو رسات کے پتھلوں کے ماتہ ڈاڑھے رہتے ہیں مگر..... اگر اگر..... کرتے ہی کسی روز مراؤں گا اور آپ بھی یہ کہہ کر خاموش ہو جائیں گے منظر گر گیا!..... منظر تو گر گیا ہے..... مگر انفس اس بات کا ہے کہ منظر کے وہ خیالات بھی میرا نہیں گئے جو اس کے دماغ میں محفوظ ہیں۔

اگر کوئی صاحب میرے ساتھ وہ دیکھ کر دوہرے سے دماغ میں سے سارے خیالات نکال کر ایک بوتل میں ڈال دیں گے تو منظر آج مرے گا تیار ہے۔ منظر، منظر کے لیے زندہ نہیں ہے..... مگر اس سے کبھی کیا با؟ — منظر ہے کیا با؟ — پھوٹے اس فنون قیصہ کو — آئیے کوئی اور بات کریں۔

کوش چند صاحب خوب لکھتے ہیں۔ ہالیوں، ادبی دنیا وغیرہ میں ان کے افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

آپ کا افسانہ پڑھا۔ بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ آپ کا فقرہ مجھے بہت پسند آیا۔

اُس کے دل سے آواز آئی اُس سے شبہ ہونے لگا کہ شاید اسے کھلنے بھی یہ آواز ملتی ہے۔

اچکے اس انسان میں تجھے حیرت کا رنگ نظر آیا۔ تازہ پرچے میں چھپ جانے لگا۔ آپ اسی طرح کبھی کبھی اپنا افسانہ بھیچ دیا کرتا تھا۔ آپ نے ستر لپٹ کر دیا۔ شکریہ!

رفیق صاحب آپ کی ایک غزل اس میں نے ریڈیو پر گوارہ دی ہے۔ انڈین مسٹریز میں آپ کا نام دیکھا تھا۔ امید ہے کہ آپ بخیر رہتے ہوں گے۔

نکاح
سعادت حسن منٹو

نعلش صاحب اور ندیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔

۱۴۔ ایڈیٹنگ بمبئی
کلیرنٹ ڈوٹ پیجی مش
۲۶ جون ۱۹۷۲ء

بیاد سے غیم

تھمارے دونوں خط ملے۔ سرج رہا ہوں کہ تم میں اتنا اطمینان کیوں ہے؟ میں ڈرتا ہوں۔ اندھیرے میں رہنے والا زیادہ تیز روشنی کو دیکھنے کی تاب نہیں دکتا۔ تمہارا ہر خط مجھے ڈراتا ہے۔ کیا کون دھڑکنے کے ساتھ تجھ میں بھی آتا ہوتا ہے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب میں گھٹنوں کے بل بیٹوں گا اور تسلا تسلا کے باتیں کروں گا۔ لوگ پھیلنے میں نہیں سکڑ رہا ہوں۔ زندگی کے سبھی احوال سے میں گھڑبا ہوں اُس پر غور کرنے کا ہر سے پاس فرصت نہیں کہنی ایشیئن آتے ہیں جن پر یہ زندگی کی کاڑی پھرتی ہے۔ مگر میں تھکاوٹ سے چور سفر کے آغاز ہی سے تنگ آیا ہوا وہ بوڑھی پڑھ سکتا جس سے مجھے ایشیئن کا نام معلوم ہو جائے بلب حالت ہے۔ کچھ گھر میں نہیں آتا گھر میں آئے بھی کیسے جب کہ گھنٹے کی فرصت ہی نہیں۔

کرشن چندر کہتے ہیں اُن کے لیے نیا افسانہ لکھوں۔ جی چاہتا ہے اُن کو اپنا تازہ نوک کچھ کر بیچ دوں۔ انگلیوں والے آسے رکھ کر کئی نئے افسانے چھو لیں گے۔

تم نے بہت تاکید کی ہے کہ تم نئے زاویے کے لیے کچھ نئے مضامین لکھوں۔ مجھ سے بڑھ کر تو یہ افسانہ نگاری بالکل بکواس ہے جس کے عوض صرف شکریہ ملے۔ میرا ڈاکٹر سب روز مجھے دوا بھیجتا ہے شکر ہے کہ علاوہ دوپے ہی لگتا ہے۔ کل اُس نے ایک دوپہ دی جس میں بیچ دیا تھا اس لیے کہ اُس میں کھٹکنا ہٹ کم تھی۔ خیال تھا کہ کل افسانہ شروع کروں گا مگر اس کم کھٹکنا ہٹ والے دوپے کو استعمال کر سکا تو میری سب کھٹکنا ہٹ خائب ہو گئی۔

بہر حال افسانہ لکھ دوں گا اس لیے کہ تمہاری سفارش ہے کہ کرشن چندر سے بھی مجھے یاد ہے۔ کرشن چندر صاحب کو اتنا غور و فکر دیکھ کر میری ماں مر گئی ہے اُس کا اتم کرنے کے لیے مجھے جو فرصت مل سکتی ہے وہ میں اُن کے حوالے کر دوں گا۔

مکتبہ آندو والوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دس جزیں کو ۱۵ روپے میں سے پہلی تھپ پلاس روپے کی بیچ دیں گی کہ اب تک

مختصر ہوں — مجھے اس تاثر کی ہوتی چاندی کی آمد کا شریعہ انتقاد ہے۔ دیکھیے وہ جہر پر کب کرم کرتے ہیں۔
 قاضی جی کا فیصلہ ٹکھنڑ بھیجا تھا کہ واپس آ کر آداب دہائی بھیجا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے عید آباد والوں نے تو ابھی
 تک رسید سے مطلع نہیں کیا پہنگٹھ پڑ جولاہی میں بک ہو گیا ہے۔ قاضی جی کا فیصلہ گسٹ میں ہو گا۔ (یہ دونوں بے سے
 براڈ کاسٹ ہوں گے)

طبیعت بہت اُداس رہتی ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ کروں — یہ کچھ کیا ہے؟ — سوچ رہا ہوں۔
 اس وقت کہ پارام صاحب کے گھر میں میٹھا ہوں۔ بارش ہو رہی۔ پنکٹ جی سلام کھواتے ہیں۔ وہ ٹیچر ٹیچری کہیں گے۔
 صفیہ بصیرت ہے۔ آداب عرض کرتی ہے۔ اس وقت سانس ٹیچلی بچے کے لیے دودھ بنا رہی ہے۔
 میں بہت ڈکھی ہوں۔

(۱) پہنگٹھ پڑ ۲۳ جولائی گریجے سے براڈ کاسٹ ہو گا اس کا قیام اختتام میں روپے ملے گا۔ خواجہ غفر اللہ کے نام
 سے نشر ہو گا۔

(۲) مکتبہ اندو والوں نے آج ۵۰ روپے مئی انڈر کے قریب بھیج دیے ہیں۔
 خاکسار
 سعادت حسن منٹو

دہلی
 ۲۱ جولائی ۱۹۷۲ء

محترم عزیز

اسلام علیکم۔ آپ کا محنت نامہ مل گیا تھا۔ افسوس کہ اس عداوت میں میری طبیعت ناساز نہ ہو۔ پرسوں سے پھر شدت کا درد
 ہو رہا ہے۔ اسی حالت میں قدرِ آب ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہاں کے سولی مرجھ کے زیرِ علاج ہوں۔ وہ کتا ہے ہسپتال
 میں داخل ہو جاؤ مگر دھر چھٹیاں ملتی ہیں تو تھوڑی دیر میں ملتی۔ عجب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ ایک صرت کرشن کی ہمدی مجھے
 یہاں میسر ہے مگر کیا ہمدی کیا کر سکتی ہے۔

آپ کا خط ملنے ہی میں نے بے لکھو دیا تھا۔ وہاں سے آج جواب آیا ہے۔ انھوں نے پندرہ روپے بھیجے ہیں، باقی پندرہ
 اگلے مہینے بھیجیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہاں بھی مشکلات پیدا ہو گئی ہوں گی۔ سوچتا ہوں یہ پندرہ میں خرچ کروں اسلئے آپ کو کچھ نہ بچوں
 اگلے مہینے جب پندرہ آئیں تو اگلے تیس لگا کر دوں گا کیا خیال ہے آپ کا۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکا۔ میں خزانہ کا طور پر غفلت ہو رہا ہوں۔ اس کا اہل ثروت میں نے آپ کو ملے
 دیا ہے۔ یہ معلوم کر کے غصہ ہوئی کہ آپ نے کئی لوگ پسند کیا۔ میں حالات کے باعث آپ کا کوئی نامزد انسان نہیں پڑھ سکا۔
 جتنی جیسے ملتی ہوئی تھی آداب واپس آگئی ہے۔ آپ کو سلام کھواتی ہے۔

خط کھینچتے رہا کریں۔ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔
جواب آل انڈیا ریڈیو کے پتے سے دیجیے گا۔ یہاں خط مجھے آسانی سے مل جاتے ہیں۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ایڈیٹنگ کمپنی
کلیئر روڈ، ممبئی ۴۰
۲۱۔ فروری ۱۹۵۷ء

پیارے ندیم
مجھے سعادت کر دینا بھائی۔ میں سخت غمزدہ تھا اسی لیے خط نہ لکھ سکا۔ تمہارے گیت منگواتے، مگر یہاں وہ صاحب
ہی غائب ہو گئے جو لینا چاہتے تھے۔ ناچار مستند میں بچا پنا پڑا۔ میری تعقیر سعادت کر دینا۔ میں بہت غمزدہ ہوں تھا۔
یہاں ہر روز تمہاری باتیں ہوتی ہیں۔ صوفیہ کہتی ہے کہ ندیم بھائی کر یہاں اپنے پاس بلا لیں بھی یہی سوچتا ہوں۔ شاعرانہ
اور صحت میں یہی بات چلی ہے۔ میں نے تمہیں خط بلکہ تاریخ بھی دیا ہوتا گا۔ صراحت کم نعت گا نہ میں نے دوزخ رکھ لیا اور بات کھٹائی
میں پڑ گئی۔

ہاں تم یہ لکھو کہ لاہور میں تمہارے گیارے کی کامیابیت ہے۔ مجھے تمہاری بہت فکر ہوتی ہے۔ خدا و دان جلد لائے۔
جب ہم تم دونوں ایک جگہ رہ سکیں۔

بالہ صحتی، وہ تم نے ماہنامہ مضمون کے لیے جو مضمون شروع کیا تھا بجا ہی نہیں۔ پہلا نمبر شائع ہونے میں اب بس کچھ دیر
نہیں۔ تمہارے واسطے اپنا مضمون جو کہ شاید مضمونوں پر تھا، ابھی چند تازہ غزلوں یا نظموں کے ہمراہ فوراً بھیج دو اور مجھے مضمون کرو۔
تمہارے مضمون اور تمہاری غزل کے بغیر رچ شائع نہیں ہو گا۔ اس نمبر میں تم اپنے تمام دوستوں کو پانڈو گے۔

نذیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔

مضمون اور غزلیں جلد بھیج دو۔

صوفیہ سلام کھنکھاتی ہے۔

تمہارا بھائی
سعادت

۱۷۔ رطلی صحران
کلیر دودھ بھینٹ
۱۸۔ مٹی سسکتی

نورم بیا

آپ کا جست نارمل ہے۔ آپ کے غلوس پر نہ پہلے کسی شک تھا اور نہ اب ہے۔ اگر میرے دل میں ذرا برا برسل بھی آپ کی طرف سے موجود ہوتا مجھ سے پہلے آپ کو شاید اس کا علم ہو جاتا میرے دل کی کوئی بات بھی نہیں رہ سکتی اور نہ میں اس بات کو چھپانا چاہتا ہوں۔

چند روز ہوئے جبکہ صغیر بہتر حالت پر پڑی تھی، دروند دستیار تھی کا ٹیلی فون آیا میں نے اس کو گایاں دیں میرے دل میں اس کے متعلق جو خیالات بھی تھے ان کا اظہار کر دیا اور اس سے کچھ غلطوں میں کہہ دیا کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا اس نے اس کے بعد کمال ڈھٹائی سے دوسری مرتبہ پھر فون کیا میں نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا بلکہ اس کی اس ڈھٹائی نے مجھے اور متفق کر دیا۔ اگر وہ جاہ میں مجھے گایاں دیتا اور اس مجھے کا جواب دیتا جو میں نے اس پر کیا تھا تو بہت ممکن ہے میں خود اس کے پاس جا کر اپنے یہاں سمان عطر لیتا۔ صغیر نے فون پر میری تمام باتیں کہیں، مجھے بھلا کر کہا، لیکن میں نے اس سے کہا کہ میں دل میں نفرت رکھتے ہوئے زبان پر پیار و محبت کے الفاظ نہیں لا سکتا۔

یہ واقعہ میں نے اس لیے بیان کیا کہ اگر مجھے آپ سے کوئی شکایت ہوتی تو میں نے بے کھٹکے اس کا اظہار کر دیا ہوتا۔ بات یہ ہے کہ اب میری وفاقی حالت میں بہت بڑا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ سینکڑوں چیزیں بیک وقت سوچنے سے میں انفرادی تفری کے عالم میں رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں میں کوئی قابلِ توجہ چیز نہیں لکھ سکا۔

بہت زیادہ شراب پینے لگا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ کچھ لکھوں پنی کریں کچھ ہی نہیں سکتا۔ دراصل میں اپنے اندر وہ بات ڈھونڈ رہا ہوں جو مجھے کرنا ہے۔ اگر مجھے یہ کچھ کرنا ہے جو میں اب تک کر چکا ہوں تو کچھ بھی نہیں یعنی کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ مگر مجھے ایسے ہی افسانے لکھنا ہیں تو یہ ایک خاص لا محضہ عمل مرتبہ کروں گا اور اس کے مطابق کام کروں گا۔ زیادہ غور و خردی کی کیا ضرورت ہے۔

مگر چھوڑ دیتے اس قصے کو۔

آپ کو نے بلدا زبلم بھیجے۔ میں نے آپ کے لیے بیوٹر کوشش کی ہے اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ مصیبت یہ ہے کہ میری کوششوں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز حائل ہوتی رہی ہے۔ خدا کو ہے کہ اب نہ ہو۔

کہانی کے چند مناظر اور بھیج رہا ہوں۔ اس میں ٹائپ کی بے شمار غلطیاں ہیں مگر آپ فوراً مجھ سے گے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں ایک رگت کی ضرورت ہے۔ وہ آپ لکھ دیں۔

یہ رگت بھی خاص طور پر اچھا ہونا چاہیے۔ آپ متظر کو ایک دو بار پڑھیں اور غور کریں تو آپ مطلب کی چیز لکھ

سکین گئے۔ سوال جواب بنیاداتی قسم کے ہیں (SITUATION) کے ساتھ چسپاں ہو جائیں۔ یاد رکھیے کہ حق ایک کوئی مخلوق کا عہدت ہے اس کو سہارے کی ضرورت ہے لیکن یہ خطہ بھی لائق ہے کہ ممکن ہے یہ سہارا جواب نہ دے جائے اور وہ زیادہ گراؤ میں خرق ہو جائے۔ محبت میں غلو کرنا کہ جسم کے ساتھ اس کی روح بھی مخلوق ہو جائے۔ دوسری طرف خشک کو لپٹیں دانا چاہیے کہ وہ اپنا ذخرا آؤی ہے۔ یہ مضمون آسان اور بنیاداتی مضمون میں اگر آپ نے باندھ دیا تو سمجھ لیے کہ آپ غلطی محبت کھنے کا کر پائے۔

صغیر آپ کے غلوں کی بہت شکر گزار ہے۔ اب اس کی طبیعت اچھی ہے۔ سلام عرض کرتی ہے۔
جوئی حضور کا ماہ نامہ چھپایا میں آپ کو نئے پتے سے بھیج دوں گا۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔
کوشن چند رشتہ جی ہو کر یہاں بیٹے زیادہ تھکا اور دودھ کر پڑ چلا گیا جہاں وہ ایک فلم کی پیش میں ملازم ہو گیا ہے۔
آپ کا جبرٹو لغافل گیا ہے۔ ٹیگتوں اور کمائی کے متعلق پھر لکھوں گا۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ایڈیٹری مجسٹریٹ
کلیئر روڈ، ممبئی ۴۰
ستمبر ۱۹۶۲ء

یار سے نہیں
تم اپنے دل میں خدا ہلے کیا مجھے جو کہ مجھے کیا ہو گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ عرصے سے بہت ہی شست ہو گیا ہوں۔ کئی بار دل چاہا ہے کہ تمہیں خط لکھوں، بہت ہی مختصر خط لکھوں مگر کھنے سے طبیعت اچاٹ سی ہو گئی ہے۔ طائفے کیوں؟
تمہارے انعام پر مجھے تازہ بری جان۔ خدا کے لیے دل میں بھی اس خیال کو بگڑ دینا کہ میں تمہیں قبول کیا ہوں۔
تمہاری یاد سے میرا دل خوش رہتا ہے۔ اور میں ہمیشہ ایسے موقع کی تاک میں رہتا ہوں کہ ہم تم آکھیں وہ سکیں۔
تمہاری حالات بہت افسوسناک ہے مگر یہ بھی زیادہ افسوسناک بات ہے کہ میں اب کسی کی حالات کے ڈکھو کو حسرت نہیں کر سکتا۔ شاید اس لیے کہ میں خود کو خدائی اور مددگارانی طور پر غلیل رہتا ہوں۔ اللہ میرے حال پر رحم کرے۔
میں اس کوشش میں ہوں کہ تمہیں یہاں بلوں۔ گوما کر دیکھیں اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں۔
شاید طبیعت نے تمہاری حالات کا متناظر سے بہت ڈکھ دیا وہ تمہیں سلام لکھتا ہے اور تمہاری صحت کے لیے دعا کرتا ہے۔
صغیر بچے دنوں بہت یاد رہی ہے مگر اب خدا کے فضل سے صحت ہے تمہیں سلام عرض کرتی ہے۔

میں آنکھ نکلتی تھی تو کہہ جوں جہاں شاد و طیف ملازم ہے۔ صبح ساڑھے دس بجے جاتا ہوں اور رات کو گیارہ بجے لوٹتا ہوں۔ مجب زندگی ہے۔

”پھول اخبار میں تم کیا کرتے ہو؟“ سے چھوڑ دو اور یہاں چلے آؤ۔ مجھے اُمید ہے کہ تم یہاں ۵ ہجرت سے زیادہ کا کیا کرنا گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ تم نے آج تک میری نہیں مانی۔

میری صحت اچھی تو نہیں لیکن ٹھیک ہے، یعنی سینے کا درد اب کچھ عرصے سے نہیں ہو رہا۔
امید ہے کہ تم اب ہجرت ہو گے۔ اپنی صحت سے فوراً مطلع کرو۔
ہمیشہ تمھارا

سلامت حسن منشا

فلستان لینڈ۔ بمبئی

اکتوبر ۱۹۴۵ء

میرا دے ندم
میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ تو مجھ سے اتنی محبت کریں اور میں آپ کے خطوں کا جواب بھی نہ دے سکوں کچھ کچھ میں نہیں آتا کہ کیا عذر پیش کروں۔ سوا سٹاس کے کہ میں بے حد شست اور کاہل ہو گیا ہوں۔

جس روز آپ کے دوست چٹھی لے کر میرے پاس آئے میں اپنے مقدمے کی پریشانیوں میں غرق تھا۔ یہ کیفیت میرا دل نہایت ہی دایمات انسان ہے۔ اُس نے مقدمے میں دتا برابر دلچسپی نہیں لی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ صفائی کا کوئی گواہ پیش نہیں ہوا اور فیصلے کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ ۲۰ اکتوبر کو ماضی حالات ہونا تھا مگر میں بیمار ہوں۔ نو ممبر کے وسط میں اگر کوئی تاریخ لئی گئی تو قطعاً جاؤں گا۔ میرا پروگرام یہی ہے کہ لاہور پہنچ کر آپ سے ملوں۔ یہ کوئی نگر آپ کے دوست کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ آپ نو ممبر میں لاہور آنے والے ہیں۔

یہی کسی کو خوشی ہوئی کہ اب پہلے سے آپ کی صحت بہتر ہے۔ خدا آپ کو تندرست رکھے۔
مجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ خط لکھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بیکار کی جسمانی مشقت کر رہا ہوں کیا ہی اچھا ہوتا اگر آدمی کھسے بغیر اپنے خیالات دوسرے تک پہنچا سکتا۔

لاہور اگر آپ سے مفصل باتیں ہوں گی اور وہیں مجھے مستقبل کے متعلق کوئی پروگرام بھی سہیجے گا۔ اصل میں اس اثراہم نے میری زندگی کو بہت حد تک سنبھالا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر شے ضلوع ہے۔ مستقبل کے متعلق کیا سوچیں گے میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ حال اور مستقبل اب بالکل بے معنی سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہر حال دیکھیں ہم کیا سوچتے ہیں۔

میں نے ابھی تک کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔ ارادہ ہے کہ ساتھی کے لیے ایک اخبار لکھوں۔ نتیجہ مجھ سے سخت ناراض ہے کہ میں نے اتنی دیر آپ کو خط نہیں لکھا۔ یہ خط میں اُسی کے اصل پر لکھ رہا ہوں۔ بڑے سٹ کرنے کا ذرا سس

یا ہے۔

خدا آپ کو جزائے فیروزے آپ کے اخلاص کی مجھے ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

آپ کا بھائی

سعادت

احمد ندیم قاسمی

شخصیات نمبر

کے بارے میں
اجاب کے تاثرات

(ابتداءً)

شخصیات نمبر میری ایک برس کی محنتوں کا حاصل تھا پڑھے مکھڑوں کی کٹدی میں جب دام ٹکوانے کے لیے لایا تو وہاں بے دلو سے اس کا استقبال ہوا — زمیں دار سے اچھا اور زبیر دے آندوہ خاطر تھا جنہوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی ان کا ہمیشہ کی طرح شکر گزار رہا جو اپنی ذاتی مصلحتوں کی بنا پر جتنا ہرے ان سے ہمدردی پیدا ہوئی۔

میں نے اعلان کیا تھا کہ منٹو نمبر کے بعد شخصیات نمبر (حصہ دوم) شائع کروں گا۔ یہ وعدہ ایفانہ ہو سکے گا۔ ایک تو میں آئے دن ہی نمبر نکال نکال کر نکال رہا ہوں۔ دوسرے حصہ دوم کے لیے میں نے اپنی حالت کے مطابق پھر ایسا بل پوز اپد گرام بنایا ہے کہ اسے کسی صورت میں بھی جلد پیش نہیں کر سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ اس نمبر کے بعد اس موضوع پر حتمی (اور مکمل) کوئی تشکیلی باقی نہ رہے۔ جی سمجھا رہی تلم پر کھینے والے موجود ہیں ان سے شخصیات نوعیت کے مسئلہ میں کھوٹوں اور جن پر اس نوع کا کوئی کھینے والا نہیں ہے ان سے ساختی اخلاذ کے مضامین کھوٹا کر دوسرے حصہ کو ابتدائے اب تک مکمل کر دوں۔

شخصیات نمبر سے متعلق چند درخواستوں کی آراء کو ان کی اجازت سے پیش کر رہا ہوں :-

بابائے اردو:

تسلیم آپ کی شکایت بہادر میں غائب کے لیے رسلے پر رائے غلام ہر نہیں کی۔ یہ پوٹ کی پوٹ اکٹھے سات سو صفحے، خدا کی بناوہ اسے رسالہ کوئی سطرہ کہتا ہے۔ یہ تو لاکھ سال ہے۔ اس پر غلام ہر رائے آسان نہیں۔ اتنی ساری شخصیاتیں اور ان پر کھینے والوں کی شخصیاتیں اور ان پر کھینے والے ایک طوار ہے۔ یہ نہر حقیقت کا اس شخصیات

ہے جو دلوں یا درہے گا اور لوگ حوالے اور استناد کے لیے اسے ڈھونڈ کر س گئے۔

آپ کا ہر کسی خاص موضوع پر ہوتا ہے اور یہ آپ کا کمال ہے کہ ہر موضوع پر اچھے کلمے دے آپ کو مل جاتے ہیں مگر آواز و غیر شخصیات کا سب پر سبقت لے گیا ہے۔

مبدائی

نیاز فتحپوری

تسلیم آپ نے سالہر پسند فرمایا خوشی ہوئی۔ لیکن جس وقت نقوش کے سالانہ کا خیال آتا ہے تو مجھے شرم آتی ہے۔ کہاں شخصیات خبریں کا کچھ قرآن سے بھی زیادہ ہے اور کہاں علماء اسہ منہر کسی عمر کی حدود و ضوابط کی کتاب ہے بھی شخصیات میں کم ہے۔ جس وقت میں مرتقا ہوں کہ آپ نے اپنے سالنامہ کی ترتیب میں سختی روحانی اور دینی کو رفت رسالت کی ہر گئی تو سالنامہ سے زیادہ آپ کے صبر و تحمل کی علامت دیکھنے کو ہی چاہتا ہے شخصیات خبر پر سالہر کے نگار میں تبصرہ ضرور شائع ہو گا۔

نیاز

عبدالمجید سالک

نقوش کا شخصیات نمونہ کے ادبی رسالوں کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں دکھاتا۔ شخصیات کی تعریف ان کی بقولوں، رسالے کی شخصیات، اس کی جبین طباعت فرض ہر چیز طفیل صاحب کی خوش ذوقی، ان کی بے پناہ محنت اور اولوالعزمی کا پتہ دیتی ہے۔ بلاشبہ قابل ذکر شخصیتوں کا تذکرہ محض ہو گیا۔ لیکن ادب و شعر کی تمام شخصیتوں کا ایک جملہ میں اس طرح جمع کرنا کوئی بھی نہ چھوٹ کے قریب قریب محال ہے اور طفیل صاحب آفر انسان ہیں۔ کوئی قانونی انسان ہستی تو نہیں ہیں۔ یہ نمونہ روزانہ کے آئندہ مؤرخین کے لیے قابل قدر ماتخذ کا کام دے گا۔ اس لیے گرامر و شعراء کا اہتمام تو ہر وقت دستیاب ہو سکتا ہے۔ ان کی شخصیتوں کی زندگی کے مختلف معلومات آسانی سے نہیں مل سکتیں۔ اس نمونہ نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ ہر طفیل صاحب کا بہت بڑا کام ہے اور اس کی تحفہ کرنا ہرے درجے کی مشکل ہے۔

سالک

اعتیاد علی عوشی (راہپوری)

مکرمی تسلیم۔ رسالہ نقوش کا شخصیات نمونہ اس گراں اور تحفے کا ولی شکر یہ قبول فرمائیے میں نے اس نمونہ کو بال بار دیکھا اور حیرت میں رہ گیا۔ اور جب اسے پڑھ دیا تو درشت طاری ہو گئی۔ اشاد کبریا اپنی شخصیتوں کے متعلق اسی دلچسپ اور مفید معلومات، اتنی کم مدت میں آپ نے جمع کر کے پیش کر دیں اسے ادبی کامت یا سحر و تکرر کہہ سکتا ہوں سعی و کوشش کا نتیجہ کہ اس کی غیر معمولی اہمیت کو کم کرنا پسند نہیں کرتا۔ ان ادبی و علمی شخصیتوں میں سے جو جن سے صرف ملاقات محال ہے ان کے بارے میں بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں انہیں اب تک زیادہ نہیں جانتا تھا اور جو کچھ جانتا تھا وہ اس سے سوتجہ میں کہیں کم تھا۔ اب معلوم ہوا ہے میں نے اپنے بچوں سے کہا ہے کہ اس رسالے کو محفوظ کر لو اور وقتاً فوقتاً اس کے مضامین

پڑھا کر دیکھو بڑھتے سے زیادہ تھا۔ سہ سے بڑے کارآمد ہے۔ میری انتظار ہے کہ آپ اس کے دوسرے نسخے کو ضرور اور جلد شائع فرمائیے۔ یہ ادبی دیرنی ہر دو لحاظ سے بڑی کامیاب اور مفید کوشش ہے اور بے شمار فائدہ لگے پڑتا جائے گا۔ اس مجھے کی اہمیت برابر اُستستی ملی جائے گی۔ بعید نہیں کہ یہ مضامین آپ کو آمدہ کتابی شکل میں بھی چھاپنا پڑیں۔ ایسی کے متعلق ہیں۔ سبحان اللہ! کتنے سنجیدہ، کچھ علم افزا، کس درجہ عقل افزا اس اہل کس قدر تجربہ آموز! اگر نقوش دیر سے دماغ پر اپنا نقش بٹھاتا ہے تو یہ ہے حمت! مگر ہر آنقت خود بہ چندہ اندازوں کا اندازہ متاثر نہیں گا۔ ہاں دعا ہے ترقی و علم و صحت جس قدر کہیں کر سکتا ہوں۔ والسلام مع الاکرام۔ احقر:

امتیاز علی حشری

رشید احمد صدیقی:

محترمی، تسلیم! نقوش کا شخصیات نہ بہت اچھا نکلا۔ اسنے بڑے پرانے جو کام کیا جائے گا نکلا ہے اس میں کہیں نہ کہیں ایک اور نقص بھی رہا۔ پاجائے کا لیکن اُن خاتمہ کو دیکھتے ہوئے جو اس نے اُنڈوں میں بٹھ کر کچھ دنوں تک میسر نہیں کئے۔ اس نمبر کے گراں بہا نمونے میں شبہ نہیں۔ اُنڈوں کے خدمت گراں کے بارہ میں بڑی مفید، دلچسپ اور مستند باتیں اکٹھی کر دی گئی ہیں اور آپ اس خدمت اور کارنامہ پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے آپ کے طریقہ کا نتیجہ ہوں گے۔

خیر طلب:

رشید احمد صدیقی

مالک رام:

کرم بندہ جناب محمد طفیل صاحب! آداب و تہنات میں نے آپ کا شخصیات نہ دیکھا ہے چشم بے بندہ شاہد اللہ اگرچہ بعض ایسے مضامین شامل ہو گئے ہیں جو چھوڑے جاسکتے تھے لیکن جو کام آپ نے کیا ہے اس کی قدر اور زبان کا آنے والا مترجہ کرے گا۔

بعض نئے شخصیتیں ایسی ہیں جن پر لکھو، لے کی ضرورت ہے۔ اطرا پور دی، دل شاہ جہان پوری پر لکھو، لے مڑو، میں ایک اور خانہ لکھیے، بخش پر شاہ گراں، اور علی تاروں کا بھی چند دن ہوئے ان سے متعلق ایک مضمون ہونا چاہیے۔ وریا ادا ہی نے اپنے وقت اور زماں صدیق جدید میں کیا تھا۔

بہر حال جو کام آپ نے کیا ہے اس کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔ والسلام خاکسار

مالک رام

سید اعجاز حسین:

برادر محمد طفیل صاحب! تسلیم۔ نقوش کے خاص نمبر کی داد کس طرح دوں میں تو یہی حیرت کرتا ہوں کہ آپ نے یہ سات سو مضمون کارساز کس طرح شائع کیا، مضامین کس طرح حاصل کیے۔ یہ بے شمار ادب کی نگار میں اپنی مثال

آپ ہے۔
منازین کے متعلق اس وقت یہی کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک جتنے پڑھے ہیں ان میں سے اکثر پسند کئے مفصل
تفصیل تو اسی وقت ہو سکے گی جب تمام مضامین پڑھ لیے جائیں گے۔

میری صحت برابر خراب رہتی ہے اور چونکہ گزرا ہوا ہوتا ہوں نہیں کر سکتا
مخلص :
انتقام حسین

سید مسعود حسن رضوی :

کرمی تسلیم : نقوش شخصیات فیروز سول بخارہ ولی شکر یہ قبول فرمائیے۔ رسالوں کے خاص نکلاہری کرتے ہیں
آپ اپنی نکال چکے ہیں لیکن مجھے انسائیڈل ادب سے زیادہ معلوماتی ادب سے دلچسپی ہے اور آپ نے شخصیات فیروز
اور مستند معلومات کا تذکرہ اخیرہ فرم کر دیا ہے کہ اگر انجی مالت پر تیس کرنا دوست ہو تو کر سکتا ہوں کہ اس کا ہر جادہ
آپ کا احسان مند ہو گا اور اس قابل قدر تذکرہ ادب کو سینے سے لگا کر رکھے گا۔ اس قیمت کا خاص فیروزگانے کے لیے
آپ کو کتنی محنت کرنی پڑی ہو گی اس کا قصور سنا تذکرہ مجھے اس طرح ہزار محنت حضرت دکانہ کھنوی پر مضمون حاصل کرنے
کے لیے کتنے خط آپ نے بھجوا رکھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب رسالہ چھپ کر سامنے آگیا ہو گا تو آپ نے جتنی محنت کی تھی
اس سے زیادہ محنت ہوئی ہو گی۔ آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دینا تو رسی کی چیز ہو گی۔ میرے خلوص کا اظہار ہے کہ
اپنے احسان مندی کے جذبات کا بدیہ پیش کروں۔ والسلام
دعاگو :

سید مسعود حسن رضوی

کرشن چندر :

براہم : تسلیم : آپ کا شخصیات فیروزیت خوب رہا۔ ابھی پڑھنا شروع کیا ہے۔ فراق، مجنوں، ہشتو، نیم بجاس اور
تسلیم پر مضامین پڑھ لیے ہیں۔ مستقل رائے بعد میں لکھوں گا۔ اس وقت تو اس تاریخی کام کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے
آپ کا : کرشن چند

ڈاکٹر سید اعجاز حسین :

عزیزی فیصل صاحب : نقوش کا شخصیات فیروز کئی لحاظ سے قابل قدر ہے اور آپ سختی مبارکباد دیں۔ اس شمارے
میں انہی وحال کے ادیبوں کے نئی حالات و ذاتی خصوصیات سے مستقبل کے ادبی موضوع کو ایسا مواد بھی مل جائے گا
جو ابھی تک دستیاب نہ تھا اور جو نفسیاتی مطالعہ کے لیے بے حد مفید ثابت ہو گا۔ ان ادیبوں پر تعمیلاً اٹھانے والوں
کے لیے یہ شمارہ چھوڑا ہوا کتب خانہ ہے جس کی وجہ سے آئندہ مضمون لکھنے والوں کو درد بردہ پھڑپڑے گا۔ ایک ہی
جگہ بہت کچھ حالات مل جائیں گے۔ میں ابھی تک پورا فیروز نہیں پڑھ سکا، اس لیے کہ اول تو اس کی ضمانت دینی ہے
کہ جلدی رقم نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ میں ادیبوں کا ذکر اس فیروز میں آیا ہے ان میں بہت سے جانے پہچانے ہیں۔

دورانِ مطالعہ میں کبھی کبھی یہ غور کرنا پڑتا ہے کہ مضمون نگار فلاں ادیب کے بارے میں ذاتی تاثرات سے مخلص ہو کر یہ لکھ گیا ہے کہ یہ امر واقعہ ہے۔ کیسں کیسں اختلاف رائے سے بھی مجھے رکھا پڑتا ہے۔

نکاح آپ کا یہ فضا بھی نہیں کہ انسانے کی طرح اس بزرگ لوگ بغیر غور کیے چرچہ کر ختم کر دیں۔ بہر حال کچھ اور سے کچھ اور سے پڑھا ہوا میں جگہ جگہ شبہیت سے رسا بہت پسند آ رہا ہے۔ کیسں کیسں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ مضامین لکھنے والے حالات واقعات کا اپنی تدریج یا عقائد یا سوچ نگار کے لحاظ سے نہیں ٹھوکتے۔ ادیب کو موضوع کچھ کہ شمع تصنیف لکھ گئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی لکھنے والے اس فہر میں نظر کرنے جو درپردہ اپنی تعریف چاہتے ہیں۔ بار بار اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کاش آپ اطلاع کر دیتے کہ اگر موضوع طرز تحریر سے مضمون نگاروں کو بھی نقوش میں کبھی جگہ دی جاتی گی۔ ان پر بھی مستقل مضمون کوئی لکھ دے گا تو شاید ایسے مضمون نگار بے چین ہو کر درمیان میں اپنی تعریف ذکر کرتے یا کرتے۔ اسی طرح کچھ ایسے بھی مضمون نگار اس شمارہ میں ہیں جو اپنی طرز تحریر کو نمایاں کرنے کی دھن میں زیر بحث ادیب کے حالات ذہنی نشیں نہیں ہونے دیتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ یہ نظر ہے کہ اصل ادیب کے حالات واقعات سامنے نہ آ سکیں لوگ میری طرز تحریر کے حاکم ہو جائیں۔ برخلاف اس کے کہ لوگوں نے سید سے سادے انداز میں ادیبوں کے حالات تصنیف کر دیے ہیں وہ اس فضا کو چھوڑ کر لے جیں کا سیلاب نظر آتے ہیں جس کے لیے یہ فہر نکالا گیا ہے

ڈوگاؤ:

اعجاز

معین الدین احمد ندوی:

کرمی اسلام علیکم نقوش کا شخصیات غیر معمول ہوا۔ اس کو دیکھنے سے پہلے یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنا کامیاب ہو گا۔ آپ نے ایک بڑا کام انجام دیا۔ طبقات و تراجم مسلمانوں کا خاص فن ہے جس کے ذریعہ مضمون نگار مختلف اصنافِ علوم کے ہزاروں اصحاب کمال کے حالات مختصراً کر دیے۔ مگر اردو میں اس کی بڑی کمی تھی۔ اس لیے آپ نے یہ فہر نکال کر ایک بڑی کمی پوری کی اور نہایت مفید علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔ یہ فہر آئندہ نوزائیں کے لیے بڑا کارآمد ہو گا۔ البتہ اس میں بعض ناموں کا اندراج کشتک ہے۔ بہر حال یہ اپنا پتا فوق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک فہر میں اردو کے تمام اصحابِ کلم کا احاطہ ممکن نہ تھا۔ امید ہے کہ اس میں جو اہم و ضروری شخصیتیں چھوٹ گئی ہیں۔ ان کے حالات دوسرے فہر میں آجائیں گے اس طرح دونوں فہر کی اردو کے سنجیدہ تصنیفی ذوق سے لے کر اس زمانہ تک کے اصحابِ کلم کا جامع تذکرہ مرتب ہو جائے گا۔ والسلام۔

معین الدین احمد ندوی

ایس۔ اے رحمن (چیف جسٹس)

کرمی اسلام علیکم نقوش کا شخصیات غیر معمول کی روش خبر شگافی کے مترادف ہے۔ ہو سکتا ہے

ہے کہ آپ کے انتخاب شخصیات سے اختلاف ہو لیکن جو خیال اس فہر کا محرک بنوا ہے نہایت قابلِ قدر ہے۔ اتنی اپنی
 شخصیات اپنی مباحث کو آف کا یکا کر دینا میری نظریں اُن کا ادب کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ آپ نے ادیبوں کو
 نام بخشے کی ترکیب سے نقوش کو کبھی حیرتِ عالم پر ثبت کر دیا ہے۔

عالمِ بریت
 خالص، ایس اے مین

خواجہ احمد فاروقی:

محبتِ کرم! شخصیاتِ غیر ملکہ دیکھ کر کبھی خوش ہو گید یہ آپ نے بڑا کام کیا جو بغیر فائدہ کے سے عوامِ مستفیل کے
 ممکن نہ تھا۔ یہ خشک مضامین کا نمبر دہنیں۔ اس میں وہ لطف ہے جو انسان میں ہوتا ہے اور وہ بھی
 انسانہ آں شے کہ بایاد گزشت

ریاض کی زبان میں سے

باجم شبِ صبا اٹھائے ہیں کیا کائنات
 وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو
 یہ موداد دود کے شمع کے لیے بہت مفید ہو گا۔ بڑا اچھا ہو کہ آپ شرکی اس داستان کو غیر میں مکمل کر دیں۔ ابھی بہت سی اہم
 شخصیاتیں رہ گئیں۔ ٹی ٹی کٹر باجرجی، خواجہ غلام السیدین، قاضی عبدالغفار۔ تیار جیسے رتبہ خرابائی پر آپ نے ایک
 زابہ مانا جاتی ہے مضمون کیوں لکھو یا بہ تصویریں بھی بہت کم ہیں۔
 آپ کا:

خواجہ احمد فاروقی

غلام عباس:

براہم طفیل صاحب! اسلام علیکم۔ نقوش کو دیکھ کر خوشی ہوئی مگر یہ کہ بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ صحت مند توانا
 کے بجائے موٹاپے کا مریض معلوم ہوتا ہے۔

میراجی، فیض، تاثیر، نیا، فتح پوری سے متعلق مضامین اور خاص طور پر حامد جلال کا اسکے شعرا میں تھوڑا
 دلاؤ بڑا کامیاب ہیں۔ ان کے علاوہ میں نے بھی اور کچھ نہیں پڑھا۔ پہلے میں جسکری، راشد، عزیز احمد، احمد علی، اشک
 وغیرہم کی عدم موجودگی بری طرح کشمکش ہے جسے کئی مضمون بھی پورا نہیں کر سکتے اور یہ پڑچیش بہا موداد کو بے راہ دہی کی عمدہ
 مثال ہے۔ غلام

خاکسار:

غلام عباس

آغا محمد اشرف:

کرمی طفیل صاحب! السلام علیکم۔ شخصیاتِ فہر کی کامیابی پر شکریہ و مبارک باد قبول کیجیے۔ آج تک اسلوبِ زبان میں اس
 شان سے کسی دوسرے نے خاص نہیں لکھا تھا۔ مضامین کے اعتبار سے فہر کا ادب کی افسانہ نگاری ہے۔
 خاکسار: (آغا) محمد اشرف

شاد و عارفی

عقربے طفیل صاحب اسلام علیک شخصیاتِ فہر کے متعلق بتانا کہ میں کیا جا سکتا ہے وہ اس کی خبریوں کا اہل نہیں کر سکتا۔ ایک عالمیادسی بات تو ہے کہ جو بات کی خدا کی قسم لاہو اب کی مگر اس طرح وہ نہ کہہ سکا جو مجھے کہنا تھا اس لیے کہ میں غالب مرحوم سے شہرہ کیے بغیر جو کچھ کہتا ہوں وہ مجھے خود نہیں چھتا جب معاملہ یہاں پہنچ جاتا ہے تو غیب سے مضامین خیال میں آئے لگتے ہیں اور میں انھیں یوں تبلیغ کرنے لگتا ہوں جیسے کہ ان کا تعلق میری ذات سے ہو یہ غالب مرحوم نے ہی تو کہا تھا ہے

حریص طلب شکل نہیں فسونی نیاز
و عالمیاد خضر کو دیتا ہوں، مخضر و راز

جس کا کھلا تھا مطلب یہ ہے کہ فضول بات پر بھی موصافح کی جا سکتی ہے۔ اب اگر میں نقوش کو خضرانوں اور اسے وراثی ہونے کی دہائیوں میں تو اس کے یہی معنی ہوں گے کہ جو کچھ نقوش کو پچھلے سے حاصل ہے اس پر طبع آزمائی کر کے میں نے کوئی مفید اور نئی بات نہیں کی۔ اور کھلا اگر واقعی کوئی چیز ہے تو اسے نقوش کے ہنر میں دکھایا جا سکتا ہے، مگر ہنر ہنر ہمارے سامنے ہوا ہی ہوتے ہیں۔ مگر اس قدر استقامت و سعی و محال سے ان کی بالیدگی اور فروغ و خفا نہیں کھینچا جا سکتا۔ لیکن نقوش کا حال اس خضر یا در عقلمند فخران سے ملتا جلتا ہے جو جنگ و دشمنی کے شوق میں کئی کئی میٹر عیاں اولاد لگ کر چھپت پر چڑھ رہا ہو کسی شے پر انے اور عیاش شام کے اس شعر سے بھی نقوش کے حالات و سکنات پر حقیقت دے جیسی معقوری کی جا سکتی ہے کہ ہے

وہ چال چلنے میں چلے ہا ہٹ کر لکھیں ہے نظر کہیں ہے

کہاں کا اور دنیا کہاں کا دنیا خیال کس کو تو دم کی جا کا

اس کے بعد ہی غلطوہ رہ جاتا ہے کہ کہیں نہ جوں چھوٹ نہ چلے۔ ادب پر اسے ادب لائے میرے اس فقرے پر کہیں مجھے نہ کوئے لکھیں کہ لکھیں جس کے تو اس ہانک میں لکے رہنے ہیں کہ کوئی جوں پست نہ ہے تو وہ اسے اندھیرے میں لٹھٹے لکھیں اس لیے آپ کو میرا بخیرہ خصوصاً یہ ہے کہ آپ اپنے نقوش کے گرد ان میں تعویذ و خال دیں تاکہ وہ لٹھٹے نہ لٹھٹے جوں کے گھبراؤ، سو رہا جس۔

تیار نہ مند :

شاد و عارفی

حجاب امتیاز علی :

عقربے طفیل صاحب تسلیم آپ کا اس نوعیت کا فہرہ تب کرنے کی خوب ضرورت ہے اس خوش فہمی اور انجی محنت کا دوسرے کے لیے آپ کا دل سدا نشانی ہیں بہت دلچسپ اور دیدہ و زیب فہرہ ہے۔ میری دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ شاید یہ فہرہ اور بھی دلکش اور پر معنی ہو جائے اگر بعض شخصیتوں پر کہ کئی معضوں نگاہوں سے طبع آزمائی کی فراہم کی جاتی۔ ہر ایک کی اپنی اپنی خطا و پاناہ خیال ہوتا۔ پھر تو ناظرین کو ایک ہی شخصیت میں قوس و قزح کی کئی رنگینیاں نظر آتی ہیں

اور یہ بھی واضح ہو سکتا کہ جیسے سوانح نگاری کی فکر تخلیقی انداز اختیار کرتی باقی ہے۔

میں فقوش کا شخصیات نمبر پر تنقید کرتی رہی کہ اچانک میری نظر سے ایک مضمون کی چند ایسی سطروں گزریں جنہیں پڑھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ **۱۹۵۹ء** میں اس قسم کی ناشائستہ بات کسی تعلیم یافتہ شخص کے قلم سے نکل کر فقوش جیسے ترقی پسند اور معیاری رسالے میں شائع ہو سکتی ہے؟ وہ یہ کہ سطور ۳۳ کی ساتویں سطریں میں ایک مضمون نگار نے لکھا ہے کہ شاید اسی وجہ سے عورتوں کو ناقص اعتقل کیا گیا ہے۔ نادان مضمون نگار نے یہ جملہ کچھ اس بے نیازی اور جرأت سے لکھا ہے جیسے ان کی عمر عریضہ و عورت کی ذہنیت پر صریح کرتے گزر گئی ہے۔

حجاب اختیار علی

فکر تونسوی:

پیارے طفیل! اقتصاد شخصیات نمبر مل گیا۔ دیکھتے ہی ڈر بھی آیا اور پیار بھی۔ نہ جانتے تھے تم اردو ادب میں طوفان برپا کرنے پر کیوں مائل ہوتے جا رہے ہو۔ یہاں جس نے بھی یہ نمبر دیکھا، اچھائی ہوئی نظریں ڈالیں۔ یہ نظریں تصدیق اس پر ہو گئیں کہ عظمت کا گریانا مارش انہوں نے کر رہی تھیں۔

کسوا ب کیا ارادے ہیں؟

فکر تونسوی

ابن انشا:

برادرِ طفیل! صاحبِ اسلام شخصیات نمبر کے متعلق میں نے مخدوہی عروسی عداوت سے پرہیز کیا کہ آپ کے زمانے میں یہ ادب سے پہلے اس زبان میں کسی چیز میں شائع ہوتی تھیں؟ انہوں نے اس پر آپ کی محنت اور سلیقے کی داد دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مجھے بڑا کام ہیں۔ نے فقوش پر موافق و مخالف رد و دیکھے ہیں۔ منتخبات کے متعلق اختلاف رائے کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔ آپ نے جن لوگوں کو چھوڑ دیا ہے ان میں سے بعض کے نام واقعی کھٹکے تھے۔ خود کا منہ ہر انتظار ہوں باعجاز، مدہم ہوں یا سبوت، بخران میں سے سب کی نہیں تو بعضوں کی نفاقانی آپ دوسرے نمبر میں کر دیں گے۔ لیکن جن لوگوں کو زبردستی آپ نے شخصیت بنا دیا ہے ان کو نکالنے کے لیے بھی آپ کوئی الگ نمبر چھاپیں گے؟ قرۃ العین نے بہت اچھا لکھا ہے کہ شخصیت تو ہمارا نامزدودی کی ہے یا ہم رعنا یا قات علی خاں کی، لیکن وہ مذاق کی بات ہے۔ آپ کو اس معاملے میں فقوشی سی فہمت برتنی چاہیے تھی۔ ہر سال میں ایڈیٹر اور اس کے احوال کی کچھ پیاں جاتا ہوں۔ انسان ہر کام میں اتنی سی مجبوری یا خرابی تو رہتی ہی ہے۔ بہر صورت یہ بہت بڑا کام تھا اور آپ ہی کے کرنے کا۔ واقعی جرأت انگیز کارنامہ ہے۔

ابن انشا

فادرغ بخاری:

طفیل بھیا! شخصیات نمبر بڑا موقع ہے اور آپ کا ایسا کارنامہ ہے جو مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں

بعض مضامین تو بے پناہ ہیں لیکن مجھے ماعہ جلال اور ایس فیض کے خاک کے بہت پسند آئے۔ اس نمبر کا دوسرا حصہ شائع کرنے کا جو آپ نے ارادہ کیا ہے اس سے بہت سی مدد گاہیں رقع ہو گئی ہیں اور اس نمبر پر نقوش نے بہت احترام دیا ہو سکتا تھا۔ ان کی اب گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ توقع ہے اس نمبر میں جو کی رہ گئی ہے۔ دوسرے نمبر میں آپ اسے پورا کرنے کی طرف خاص طور سے توجہ دیں گے۔ مثلاً ایک بڑی مٹی قومی ہے کہ سرحد کی ادبی شخصیات کے دلکے پر نمبر غلام رو گیا ہے۔

مخلص،
خارن بخاری

جیلانی بانو:

مکرمی! "نقوش" کا شخصیات نمبر ملا، شکریہ! آپ کے حوصلوں کی داد دینا تو چھوٹا مزہ بڑی بات لگتی ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو کتنا ہی بڑے گا۔ یہ نمبر اتنا مکمل ہے کہ اس میں ٹھونڈے سے بھی کوئی مٹی نظر نہیں آتی۔ البتہ چند نام نظر نہیں آتے جو ایک طرف سے کافی کم ہیں۔ لیکن حصہ دوم میں یہ مٹی بھی پوری ہو ہی جائے گی۔ شخصیات میں جو دلچسپی ہے وہ اس نمبر کو اور دلچسپ بنا رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نمبر اتنا خفا ادبی سرا ہے جو ہمیشہ نقادوں کے پیش نظر رہے گا۔ لادھ چندر سون میں نقوش نے ادب و ادب میں وہ کام کیا ہے جس نے اسے نقوش یا ادب آباد کیا ہے۔ ترتیب اور خوبصورتی بھی بے مثال ہے۔ لیکن ٹائٹل اتنا اچھا نہیں جتنا مکمل "غزل" کا تھا۔

جیلانی بانو

مختار صدیقی:

شخصیات نمبر شائع کر کے نقوش نے ہر طبقہ میں بحث کی راہیں کھول دی ہیں۔ انسانہ غزل وغیرہ پر اور ادب و شخصیات کے اعتبار سے غزل و نمبر شائع کرنے میں نقوش پہلے ہی سے اور مسائل میں امتیازی شخصیت حاصل کر چکا ہے۔ اب کے نقوش نے اس صدی بلکہ گزشتہ صدی کے راج آخر کی ملی اور ادبی شخصیتوں کے بارے میں ذاتی حالات اور ان کے شخصیات خاکیوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کام اپنی جگہ بڑا کام ہے۔ مدد دلچسپ اور مفید ہے۔ اس سلسلے میں خوشحالات پیش آ سکتی ہیں نقوش کا یہ شمار بالواسطہ طور پر ان کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

"شخصیات" کا موضوع فی نقب بے حد نازک اور کٹھن موضوع ہے۔ ویسے تو ہر شخص کی شخصیت میں دلچسپی کے رنگ رنگ پس منظر ہوتے ہیں اور ان پہلوؤں میں ٹکراتوں کے سامان تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم بڑی بڑی ملی اور ادبی شخصیتوں کے تحریری کارناموں کا واسطہ دہریہ جاننے کی خواہش پیدا کرتا ہے کہ وہ لوگ جو شعور و ادب یا علمی تحریک میں اپنے بلند مرتبہ ہیں، بحیثیت انسان کے کیا کچھ ہوں گے اور کیسے ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ عام انسانوں کی سطح سے اتنی بلند یا کم سے کم مختلف لوگوں کی شخصیت کو انعام میں آ جا کر ان اور ان کی شخصیتوں کا ہرگز نہ بھرپور جائزہ لینا ہیے حد مشکل کام ہے۔ اس کے لیے گہری نظر، بے جاگ رائے، موضوع کے ساتھ گہری واقفیت اور پھر ہمدردی کے علاوہ انسان شناسی کا گہرا سلیقہ و دکار ہے۔ شخص خاک کھینے کے لیے اس شخصیت کے دل و دماغ سے گہری واقفیت ہی کافی نہیں بلکہ وہ توبہ وادی بھی چاہیے جو انسان کو صاحب نظر کہلاواتی ہے۔ شخصیت نگاری ہی نہیں کہ زیر نظر شخصیت کے ذاتی سوانح اس کی علمی اور ادبی اہمیت کا راناموں اور زندگی اس کے عام رنگ و کھارے کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔ علمی اور ادبی شخصیتیں نفسیاتی اعتبار سے بے حد پیچیدہ شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ان میں عام انسانوں کی کمزوریوں اور خوبیوں کے پردوں کے نیچے بہت کچھ پنہاں ہوتا ہے۔ ان کی خصوصیات و تفریکات ذاتی میہیات، واقعات اور مقامات کا دخل، ان کی زندگی کے مشاہدات اور تحریکات غرض ان کا ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ان کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہوتا ہے جس کی آئینہ داری لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ ظاہر و باطن کے اس متوازن تذکرے کو ہی ایک اچھا شخصی خاکہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

نقوش کا شخصیات پر اس لحاظ سے ضرور تعالیٰ قدر ہے کہ ہمارے ادب میں شخصیت نگاری پر بہت کم مواد موجود ہے۔ شخصیتوں کے علمی چہروں، ان کے علمی خصائص اور ان کے کردار پر ہمارے تو کم تذکرہ نویس نوا آقا، اشاد، اللہ کی پکڑ پیر میں ہیں گی۔ البتہ اس مسئلے میں آپ حیات نے بڑی کی چڑی کی ہے۔ ویسے خاصا شخصیت نگاری پر اردو میں چند ہی چیزیں ملتی ہیں۔ ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون "مروی" یا "رحمد کی کافی" پکڑ پیری کچھ ان کی زبانی "مروی" عبدالحی کی کتاب اور میرے چند مضمون "شیر احمد صدر لقی" کا شاہکار "تغنی" ہے۔ گراں مایہ اور بعض متفرق مضامین اور شوکت تھانوی کی "شیش محل" مہم دیدہ آج راجا حسن حسرت اور مجھے فرشتے "از سعادت حسن منٹو خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مغربی ادب میں شخصیت نگاری کا کافی اعلیٰ پایہ کی تصانیف ملتی ہیں اور ان میں ملکی شریکی پر چلے جانے جی کا ڈنڈا، جاج ساوا، آٹکے سوہدا جیسے بین الاقوامی شہرت کے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس فن کو انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔

ہمارے ادب کے کامیاب شخصیت نگاروں میں سے برو فیروز "شیر احمد صدر لقی" اور شوکت تھانوی ہی نقوش کے اس نیرس شخصیت نگار اور موضوع سخن دونوں حقیقتوں سے موجود ہیں۔ ویسے بڑے بڑے نامور لوگوں پر بڑے بڑے نامور ادبی علم اور صاحب قلم لوگوں نے لکھا ہے۔ ان کے علاوہ چند ایسے بھی شخصیت نگار ہیں جنہوں میں جانے پہچانے نہیں اور دلچسپ موضوع سخن کے یا تو رشتہ دار ہیں مثلاً: بکرم اخلاق حسین جنہوں نے اپنے بزرگ والد چودھری محمد علی دودھوی پر مضمون لکھا ہے یا اپنے موضوع سخن کے ساتھ گہرے تعلقات رکھتے ہیں۔ مثلاً ابوالخیر مودودی صاحب جنہوں نے "نارنج پوری" میں دلچسپ اور متنازعہ قسم کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے۔

کل ۸۸ کے ایک جگہ شخصیتیں ہیں جو "شیش محل" میں ہیں وہ جھلکیاں ان کے علاوہ ہیں جو شوکت تھانوی کے تعالیٰ قدر مضمون "مضمون کی چند ادبی شخصیتیں" شاہد احمد بلوی کے مضمون "دل کی چند ادبی شخصیتیں" اور برو فیروز "عابد علی عابد کے مضمون" لکھی

چند ادبی شخصیتیں اور لوگوں کی چند ادبی شخصیتیں (از مختصر قطب انسا۔) ہاشمی میں جلوہ گر ہیں۔ شخصیتوں کے اس شاہد میں بہتر مولانا محمد حسین آزاد میں اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید عظیم آبادی، جلال کھنسی، دستا و داغ، ایتھریٹائی، رتن ناتھ مرشد، پنڈت چکیت، دستور جہاں آبادی، دیانا ناتھ، نواب نصیر حسین نیالی، روحانی دشت، اکبر الہ آبادی، بلوڑاق صاحب، ابلوگنہ اور ایسے کئی نامور لوگوں کو نہ جانے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔

یہ تو بزرگوں کا حال تھا اس صدی کے ادباء اور وسط کے بعض اہم لوگوں مثلاً غرضی محمد نادر، حبش شاہ دہی، ہایوں کا بھی نام نظر نہیں آتا۔ ماسٹرنا موروں میں کئی لوگوں کے علاوہ جن میں راشد اور اوپنڈ ناتھ دشت وغیرہ کا نام بھی کیوں نظر نہیں آتا۔ ان شخصیات قبول میں غالباً سب سے کمزور وہ نقیب ہیں جو ریلوے ملازمتوں نے اپنے نامور ارباب دوستوں کی شخصیت کے نیچے ہیں۔ ایک استغناء سمجھو تو ہاشمی کا مطالعہ ہے۔ ہمتا، مفتی کے متعلق جو بڑا بھرپور ہے، بے حد کمزور اور نہایت چابکدستی سے مفتی کے کردار کے بنیادی تضاد، ان کی جدت، دائری اور ساری خوبیوں اور ان کی کمزوریوں پر عادی ہے۔ اس کے بغیر شناسائی اور تعمیری نگاہت کا غالباً سب سے افسوسناک مظاہرہ محمد نادر صاحب کا مضمون شفیق الرحمن ہے جس میں شفیق رحمانی سے اپنی تکمیل کی دوستی کے تذکرے ہیں۔ ان کی فوجی زندگی کا ذکر ہے۔ ان کی ڈاکٹری اور کھیلوں سے شغف کی طرف اشارے ہیں اور وہی باتوں کا تذکرہ ہے جو یادگار لوگوں نے محمد خالد کو کبھی شہرستانا بنائی جوں کی جس کا تحریر میں لانے کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان میں سب سے زاروں کو فاش کر کے خالد صاحب خود اپنے نام کی تشریح جاتے ہیں۔ کیونکہ ان باتوں سے شفیق رحمانی کی شخصیت کا کوئی اہم پہلو ابھار نہیں سکتا۔ زیادہ دائریہ یا تھریج مان لی جائیں یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک کھٹکڑے اور ایسے فوجیان نے ہرنو جوان کی طرف کچھ دل چاہت ہوئے کی کوشش کی تھی۔ اس مضمون کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ آخر میں خالد صاحب نے شفیق رحمانی کو اپنے فن اور مضمون نگاری کے بارے میں مشورے دیے ہیں اور کچھ امیدیں بھی ان کے مستقبل سے وابستہ کی ہیں۔ شخصیت نگاری سے اس کا جو واسطہ ہے وہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اگر شخصیت نگاری ہی ہے تو پھر پسند نامزد فریادیں غلط، لادجہ، تہذیب سناٹی اور اخلاق جلالی بھی شخصیت نگاری کے شاہکار ہیں۔

یہی اس شاہد میں شخصیت نگاری کے علاوہ کچھ بھی موجود ہیں اور ان کی طرف سے ان بے پناہ ادبی اور ادبی شخصیتوں کے خصائص و کردار اور ان کے ظاہر و باطن کی نہایت خوبصورت تصویر سامنے آجاتی ہے جس کے ادبی اور ادبی کارناموں تک ہی عام قاری نہیں بلکہ اکثر سے بڑے لوگوں کی۔ ساقی برہی ہے۔ اس کی شائیں کچھ تو وہ نہایت مختصر جملہ کیا ہیں جو لاہور، لکھنؤ، دہلی اور حیدرآباد لوگوں کی نامور شخصیتوں پر سید عابد علی صاحب، شوکت تھانوی، شاہد احمد بریلوی اور مختصر قطب انسا، ہاشمی نے بیان کی ہیں۔ ان میں سب سے خوبصورت اور کامیاب شوکت تھانوی کا مضمون کھنسی کی چند ادبی شخصیتیں ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر شرافتی پرنٹا کٹر سید عبداللہ کا مضمون ایک کٹر انٹیلیجنٹ مگر محدود فن شخصیت کی نہایت کامیاب حکایت ہے۔ مولانا پروفیسر علی عباس حسین کا مضمون فاضل بریلوی اور ڈاکٹر ذاکر حسین پرنٹا کٹر سید عابد حسین عابد کا مضمون اور شاہد احمد وطنی کا کھنسی کا عظیم بیگ چغتائی، نہایت اللہ مرحوم کے تاثرات پر سید احمد

کے متعلق بھی مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔

بحرِی طور پر نقوش کا یہ نمبر اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر ہمارے عہد میں یہ پہلی کوشش ہے۔ اس میں مجروری اور کلازیم کی ہر گئی ہے اسے نقوشِ ثانی میں بڑی مدح و ثناء کی جا سکتا ہے۔

مختار احمد نقی

اختتامیہ

- ۱) شخصیات نمبر اردو رسائل کی تاریخ میں جاودانی حیثیت رکھتا ہے۔
- ۲) شخصیات نمبر بیش بہا مواد مگر بے راز روی کی عمدہ مثال ہے۔
- ۳) شخصیات نمبر کی قدر آفے والا دور کرتے نکلا۔
- ۴) شخصیات نمبر اردو ادب کی انسانی کلچر پیڈیا ہے۔
- ۵) شخصیات نمبر جانیدری کی بہترین مثال ہے۔
- ۶) شخصیات نمبر کی قدر نہ کرنا پرے درجہ کی سنگدلی ہے۔
- ۷) نقوش ابوالرسائل ہے

وغیرہ وغیرہ :